مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
کے فکر انگیز خطبات کا مجموعہ

خطباتِ علی میاں رحمۃ اللہ علیہ

جمع و ترتیب
مولوی محمد رمضان میاں صاحب
جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن - کراچی

۵

دار الاشاعت
اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی ۱

خطباتِ علی میاںؒ

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
کے فکر انگیز خطبات کا مجموعہ

خطباتِ علی میاں رحمۃ اللہ علیہ

جلد پنجم

احکام و مطالبات

جمع و ترتیب:

مولوی محمد رمضان میاں نیپالی

جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن۔ کراچی

دارالاشاعت
اردو بازار ایم اے جناح روڈ
کراچی پاکستان 2213768

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی دارالاشاعت کراچی

طباعت : اکتوبر ۲۰۰۲ء علمی گرافکس پرنٹنگ پریس، کراچی۔

ضخامت : 448 صفحات

........ملنے کے پتے........

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور

مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور

مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان

مکتبہ رحمانیہ ۱۸۔ اردو بازار لاہور

ادارۃ اسلامیات موہن چوک اردو بازار کراچی

بیت القرآن اردو بازار کراچی

بیت العلوم 20 نابھہ روڈ لاہور

کشمیر بکڈپو۔ چنیوٹ بازار فیصل آباد

کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور

بیت الکتب بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی

........نیپال میں ملنے کے پتے........

مکتبۃ الحرمین، مدرسۃ الحرمین للت پور (کاٹھمنڈو) نیپال

حاجی بک شاپ نیپالی جامع مسجد، دربار مارگ، کاٹھمنڈو

دارالعلوم ہدایت الاسلام، انروا بازار، ہنسری، نیپال

فہرست عنوانات

انتساب

بندہ اپنی اس حقیری کوشش وکاوش کا انتساب..... مادرِ علمی جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے رئیس اعلیٰ اور حضرت بنوریؒ کے مایۂ ناز تلمیذ رشید، سفر وحضر کے رفیق، ہزارہ کی وادیوں سے اٹھ کر علم کی دنیا پر چھا جانے والی ہستی کی جانب کرنے کو سعادت دارین کا موجب سمجھتا ہوں، جو اپنے کردار و گفتار میں سلف صالحین کا پرتو نظر آتے ہیں، میری مراد حضرت الاستاذ مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق سکندر دامت برکاتھم العالیہ کی ذات بابرکات ہیں، جن کی دلنواز ہستی میں مجھے بیک وقت ایک مربی، استاذ اور مشفق باپ کا عکس نظر آتا ہے۔

محمد رمضان میاں نیپالی عفا اللہ عنہ

خطبات کی اہمیت

قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم :

علیکم بمجالسة العلماء واستماع کلام الحکماء ، فان الله تعالیٰ یحی القلب المیت بنور الحکمة کما یحی الارض المیتة بماء المطر۔ (الحدیث)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا!

اہل علم کی ہم نشینی اور اہل حکمت کا کلام سننے کو خود پر لازم کرلو، اس لئے کہ حق تعالیٰ جل شانہ قلبِ مردہ کو نورِ حکمت سے ایسے زندہ فرماتے ہیں جیسے مردہ زمین کو بارش کے پانی سے۔

بحوالہ منبہات ابن حجر عسقلانیؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف گفتنی

خطباتِ علی میاںؒ کی پانچویں جلد بعنوان ''احکام ومطالبات'' آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں، اللہ جل شانہ کا بے انتہا فضل واحسان میرے ساتھ رہا اوراس ذات عالی نے ان منتشر خطبات کی ترتیب کے سلسلے میں ہر مرحلہ پر غیبی مدد ونصرت فرمائی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مولانا علی میاںؒ کا درد بھرا، بصیرت افروز پیغام بطور دستاویز آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

خطباتِ علی میاں نہ صرف خطبات وتقاریر ہیں بلکہ ایک تاریخی دستاویز اور روحانی مجالس ہیں، جہاں ہر قسم کے رنگ وبو اور اشخاص واماکن سے قاری لطف اندوز ہوتا ہے، اور ہر خاص وعام اپنے دل میں ایک روحانیت محسوس کرتا ہے، کیونکہ آپؒ کے خطبات میں علمیت کے ساتھ صداقت وحقیقت، فضیلت وحکمت، فصاحت وبلاغت بدرجۂ اتم کارفرما نظر آتی ہیں، آپ کی تقاریر وخطبات نے دور حاضر کی فکری ونظریاتی گتھیاں سلجھانے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے، آپ نے اپنی تقاریر کے ذریعے صرف برصغیر ہی نہیں بلکہ تمام دنیائے انسانیت کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اپنی ایمانی قوت سے عرب وعجم کو یکساں جھنجھوڑا، اسی کو کسی نے یوں بھی کہا............ ؎

اس کے لہجے میں قیامت کی فسوں کاری تھی
لوگ آواز کی لذت میں گرفتار ملے

آپ حضرت مولانا علی میاں قدس سرہ کے ان فکر انگیز خطبات کو پڑھیں گے تو محسوس ہوگا کہ حضرتؒ کے اپنی تقاریر سے سوئے ہوئے دلوں کا جگایا ہے، پھول کی پتی سے ہیرے کے جگر کو کیا خوب کاٹا ہے اور سوئے ہوئے جذبات کو اپنے مسحور کن انداز میں بیدار کیا ہے اور پھر ایسا بھی نہیں کہ سو کر اٹھنے والوں کو جذبات کے رد میں بہہ جانے کیلئے چھوڑ دیا ہو

بلکہ ان کی باگ کو شریعت محمدیہ ﷺ کے ہاتھ میں تھما دیا تا کہ اب وہ اپنے جذبات کو شریعت سے ضوء پہنچاتے رہیں، وہ جذبات جوان خطبات کے مطالعے سے جنم لیتے ہیں دل کو ایسی نرمی اور دماغ کو ایسی بالیدگی بخشتے ہیں جو انسان کو پہلے سے زیادہ دین دار اور دانا بنا دیتے ہیں، جس کے ثمرہ میں وہ اپنے اوپر ایک مسؤلیت محسوس کرتا ہے کہ میں بھی مسئول ہوں مجھے بھی نیابت رسول کے صدقے بحیثیت آخری امت ذمہ داری سونپی گئی ہے اور یہ عزم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ میں بھی اس ذمہ داری کو ضرور بالضرور پورا کروں گا۔

یہ خود غرضی، نفس پرستی، خود سری، بے حسی، مفاد پرستی میں ڈوبی ہوئی انسانیت کو اطاعت وفرمابرداری، آداب واخلاق، دیانت داری وامانت داری، بیداری واحساس ذمہ داری کا حضرت مولاناؒ نے درس دیا، اپنے اکابرین واولیاء اور اتقیاء کے نقش قدم سے بھٹکی ہوئی معصوم انسانیت کیلئے پرانے چراغ کی صورت میں میدان عمل واضح کیا، اتنا ہی نہیں آج کے اس پُرفتن اور پُرآشوب دور میں جبکہ دنیائے انسانیت ایمانی دولت سے محروم ہوتی چلی جارہی ہے، ایسے نازک مرحلہ پر حضرتؒ نے جذبۂ ایمانی، قربانی اور دینی جدوجہد کا سبق دیا، دنیا کے عالم گیر سیلاب میں بہہ جانے والوں کو راہِ ہدایت کا علمبردار بنا کر شاہراہِ دعوت وعزیمت پر گامزن ہونے کا راستہ بتلایا ہے۔

اخیر میں بندہ ان تمام حضرات کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے خطبات کی ترتیب میں دامے درمے، قلمے سخنے، معاونت فرمائی، خصوصاً برادر محترم مولوی سید عدنان کا کاخیل سلمہ اللہ نبیرہ حضرت مولانا عبدالحق نافع گل نوراللہ مرقدہ نے جو معاونت فرمائی وہ قابل ستائش ہے، اللہ ان کو بہترین جزا عطا فرمائے، اسی طرح حسب سابق رفیق محترم محمد رشید سلمہ اللہ نے بھی پروف ریڈینگ کے مرحلہ سے لے کر کتاب کی طباعت تک ہر مرحلہ میں میری معاونت فرمائی، اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو اپنے دین کی خدمت کیلئے قبول کرے۔ آمین۔ یارب العالمین۔

والسلام

کتبہ محمد رمضان میاں نیپالی عفا اللہ عنہ

۲۵/شوال ۱۴۲۳ھ/۳۰/دسمبر ۲۰۰۲ء یوم الاثنین

دعوت واصلاح کا کام

شریعت اسلامی نے اجتماعی زندگی اور اجتماعی اصلاح اور اجتماعی ترقی کو اصل بتایا ہے، اور امت مسلمہ کو ایک جسم قرار دیا ہے کہ اگر ایک عضو میں درد ہو جائے تو تمام جسم بے چین ہو جاتا ہے، اس وجہ سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو ایمان کا خاصہ اور لازمی جز قرار دیا ہے تاکہ اس کی انجام دہی کے لئے اپنے اندر خوبی وکمال پیدا کریں، ظاہر ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک افراد خوبیوں اور کمالات کے زیور سے آراستہ نہ ہوں، اب ہمارے اوپر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ فریضۂ تبلیغ کو اس طرح لے کر کھڑے ہوں جس سے ہم میں قوت بڑھے اور اسلامی فتوحات ابھریں، ہم خدا اور رسول کو پہچانیں اور احکام خداوندی کے سامنے سرنگوں ہو جائیں، کیونکہ یہ کام خدا کی ایک اہم عبادت اور سعادت عظمیٰ ہے اور انبیاء علیہم السلام کی امانت ہے اس کام کا مقصد دوسروں کی ہدایت نہیں بلکہ اس سے خود اپنی اصلاح اور عبدیت کا اظہار مقصود ہے، اگر ہم اس کو صحیح طور پر انجام دیں گے تو عزت وآبرو اور اطمینان وسکون کی زندگی پالیں گے۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ)

زندہ رہنا ہے تو...... میر کارواں بن کر رہو

انگریزی استبداد نے جب برصغیر میں اپنے ناپاک عزائم سے اسلام کی راہیں مسدود کر دیں اور مسلمانوں کا جینا محال کر دیا، ایسے حالات میں سرزمین ہند میں دارالعلوم دیوبند کا قیام بلاشبہ مسلمانان ہند کیلئے امید کی کرن تھی، یہ شعلہ جوالہ ملت اسلامیہ کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوئی، دارالعلوم دیوبند کی دینی وملی خدمات سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔

ان ہی خدمات کو اجاگر کرنے کیلئے مورخہ ۲۱/۲۲/۲۳ مارچ ۱۹۸۰ء کو دیوبند (ہندوستان) صد سالہ اجلاس منعقد ہوا، جسمیں دنیا کے کونے کونے سے فضلاء دارالعلوم، متوسلین اور مشاہیر شریک ہوئے، اس بابرکت جلسہ میں عالم اسلام کے ممتاز شہرۂ آفاق عالم، دینی وروحانی ہستی علامہ سید ابوالحسن علی ندویؒ بھی جلوہ افروز تھے، حضرتؒ نے اس جلسہ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا

ع زندہ رہنا ہے تو میر کارواں بن کر رہو

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذبالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهد الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا الله ونشهد ان محمد اعبده ورسوله الذى ارسله الله تعالى بالحق بشيرا ونذيرا وداعيا الى الله باذنه وسراجامنيرا .اما بعد. فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم. واذكروآ اذ انتم قليل مستضعفون فى الارض تخافون ان يتخطفكم الناس فاوٰاكم وايدكم بنصره ورزقكم من الطيبت لعلكم تشكرون.

میرے بھائیو اور عزیز دوستو: میں نے آپ کے سامنے سورہ انفال کی یہ آیت پڑھی جو فوری طور پر میرے ذہن میں آئی، کسی غیبی طاقت نے میری کان میں کہا، اس عظیم مجمع کو دیکھو جو لاکھوں کی تعداد میں تمہارے سامنے ہے، اس غیر معمولی تعداد کا تصور پہلی صدی ہجری میں بڑے سے بڑا جنگ جو، غیر معمولی دور میں، حوصلہ مندی، صاحب فراست اور بڑے سے بڑا

ایسے قصبے میں، جو جزیرۃ العرب سے سات سمندر پار ہے اور جو زبان، تہذیب، قانون، قومیت اور نسل و مذہب، کسی بھی رشتہ سے جزیرۃ العرب سے منسلک نہیں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد جمع ہو سکے گی، قرآن مجید کی اس آیت پر دوبارہ غور کیجئے اور پہلی صدی ہجری کے ان حالات کو یاد کیجئے جو مسلمانوں کے ساتھ مدینہ طیبہ میں پیش آنے تھے۔

قرآن مجید مسلمانوں کو مخاطب کر کے (جن کی تعداد اس وقت چند ہزار سے زیادہ نہ تھی) کہتا ہے: ''جب تم تھوڑے تھے، زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے، ہر وقت ڈرتے تھے کہ تم کو کوئی جھپٹا مار کے اچک نہ لے جائے یہاں پر قرآن مجید نے تخطف کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کے معنی جھپٹا مارنا اور اڑا کر لے جانا ہیں) حالت یہ تھی کہ تم لقمہ تر تھے، دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو چھوڑ یئے کہ حجاز بلکہ صرف قریش کا قبیلہ ہمیشہ کیلئے اس چراغ کو گل کرنے کیلئے کافی ہوتا، قرآن مجید کے اندر مندرجہ ذیل آیت میں پھونک مار کر بجھانے کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔

''یریدون لیطفو اتور اللہ بافو اھھم''۔

یہ صرف ادبی لفظ نہیں ہے، اس کے سارے الفاظ معجز ہیں، اس لفظ میں ایک سچی اور صحیح تصویر ہے، حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کی زندگی کا چراغ اور اسلام کے چراغ نور کو ہر وقت گل کیا جا سکتا تھا، اس کے بجھانے کیلئے کسی پنکھے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ وہ منہ کی پھونک سے بجھایا جا سکتا تھا، اللہ تعالیٰ نے دو تین جگہ قرآن میں یہ الفاظ استعمال کئے ہیں اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کے حالات کی صحیح اور سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

'' فاوا کم و اید کم بنصرہ و رزقکم من الطیبت لعلکم تشکرون''

اور تم کو پناہ دی اور تم کو نصرت خداوندی اور آسمانی مدد کے ذریعہ تمہاری تائید کی اور صرف یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے حلال و پاک چیزوں میں سے تم کو عطا فرمایا تاکہ تم شکر ادا کرو، طیبات کا لفظ عام ہے، سلطنت سے لے کر مطلق العنان و با اختیار سلطنت تک اور سلطنت کے دنوں میں جو عزت ہوتی ہے، جو اعزاز و اختیارات حاصل ہوتے ہیں، جو قانون سازی کی طاقت، آزادی و خودمختاری اور بلندی و برتری حاصل ہوتی، یہ سب طیبات میں آتا ہے۔

''و رزقکم من الطیبت لعلکم تشکرون''

کہ شاید تم شکر کرو، اور تمہارے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہو۔

آج میں انسانوں کا جنگل دیکھ رہا ہو اور اس وقت کو یاد کر رہا ہوں، جب چند ہزار مسلمانوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے یہ احسان جتلایا تھا، لیکن آج ہماری کیا حالت ہوگئی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے ایک قصبہ میں دین کے خادموں کی ایک آواز پر دنیا کے دور دراز گوشوں سے کتنے انسانوں کو جمع کر دیا ہے، ہر مسلک کے لوگ یہاں اس طرح جمع ہو گئے ہیں، اگر بے ادبی نہ ہو تو بلا تشبیہ میدان عرفات کا نقشہ یہاں دکھائی دے رہا ہے، جو طاقت مسلمانوں کو میدان عرفات میں جمع کرتی ہے، وہی طاقت اور سنت ابراہیمی کی وہی کشش ہے، جس نے آج اس قصبہ میں لاکھوں مسلمانوں کو یکجا کر دیا ہے۔

" واذن في الناس بالحج ياتوك رجالاً وعلى كل ضامرٍ ياتين من كل فج عميق"

تیسری سپہ انس و جن تو ہے امیر جنود

مکہ مکرمہ میں اگر مسلمان جمع ہوتے ہیں تو سنت ابراہیمی اور سنت محمدی کی وجہ سے، مدرسہ میں اگر مسلمان جمع ہوتے ہیں تو اس میں بھی سنت ابراہیمی اور سنت محمدی کی کشش کو دخل ہے اور آج بھی اس آواز میں وہ غیر معمولی طاقت اور کشش ہے جس کو اگر مسلمان سمجھ لیں تو دنیا کی کسی بڑی سے بڑی حکومت میں وہ اثر اور طاقت نہیں جو اب بھی ایمان کی آواز میں ہے، اقوام متحدہ سو بار جئے، سو بار مرے، امریکا اور روس جیسی بڑی بڑی طاقتیں مر مر کے زندہ ہوں، پھر بھی ان کی آواز میں وہ طاقت و تاثیر نہیں، جو اسلام کی آواز میں ہے، جس طرح مقناطیس لوہے کے ٹکڑوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے، اسی طرح آج بھی اس آواز میں وہ کشش توانائی اور مسیحائی ہے جو دنیا کی کسی چیز میں نہیں ہے، ہمیں اور آپ کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے قلیل تعداد کو کثیر تعداد پر غالب کر دیا۔

میں نے عربوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو لاشئی سے کل شئی بنا دیا، اور میں آپ سے ایک بار نہیں چار بار کہتا ہوں کہ آپ کچھ نہ تھے، سب کچھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسلام کے طفیل عطا کر دیا۔

ذرا سوچئے تو سہی:

آپ ہندوستان میں کسی چیز کی پرستش کررہے تھے؟ شجر وحجر سے لے کر ہر چیز آپ کے لئے معبود و مسجود بننے کے لائق تھی، پستیوں، ذلتوں، جہالتوں اور شقاوتوں کے اس بحر ظلمات سے آپ کو کس نے نکالا ہے؟ یہ وہی انبیاء کرام کی دعوت تھی جو آخری طور پر قیامت تک کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اس دنیا کو پہونچی، اگر عربوں پر یہ احسان ایک مرتبہ ہے تو آپ پر اللہ تعالیٰ کا یہ احسان سو بار ہے۔

میں عربوں سے بار بار خطاب کرتا ہوں اور ان کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑتا ہوں، یہ انکا عالی ظرفی اور کریم النفسی ہے کہ میں نے ان کو جھنجھورا تو جھک گئے اور جب بھی میں نے ان کا پکارا تو انھوں نے آواز دی اور جب بھی ان کا ایک محتسب کی طرح احتساب کیا، انھوں نے اس کو برداشت کیا، حالانکہ مجھے اس کا کوئی حق نہ تھا، میں تو ایک میخوار ہوں، اب میں آپ سے کہوں گا اور سو بار کہوں گا کہ خود کو یاد کریں کہ آپ کہاں تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو کہاں پہونچادیا۔

میرے دوستو اور بزرگو: آپ اپنی حقیقی عظمت کے راز کو سمجھئے کہ دنیا میں اب تک ہزاروں طوفان، آندھی اور سیلاب کے باوجود آپ اب تک کیوں باقی ہیں؟ ایک ہندوستان ہی کی تاریخ کو دیکھ لیجئے، یہ زمین جس کو حالی نے اکال الارض اور ہندوستانی تہذیب ومزاج کو اکال الامم سے تعبیر کیا ہے، یعنی جو قوم یہاں آئی وہ تحلیل ہوگئی اور اس نے اپنی قومی خصوصیات وامتیازات کو کھودیا، اور ''ہر کہ درکان نمک رفت نمک شد'' کا منظر سامنے آتا رہا، اس میں نہ تو آریائی نسلیں باقی ہیں، نہ دوسری قومیں، جو بھی یہاں آیا وہ اس کے رنگ میں رنگ گیا، لیکن وہ کیا چیز تھی جس نے اپنے آپ کو اپنے تشخص کے ساتھ باقی رکھا ہے؟ وہ ہے عقیدہ توحید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستگی، اللہ کی عظمت کا اقرار اور اس کے سامنے ساری طاقتوں کا انکار اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کی محبت کا طوق اپنے گلے میں ڈالنا۔

یہ تھے وہ اسباب جن کی بنا پر ہم اس قابل ہوئے کہ اس منظر کو دیکھ سکیں، ہم ان عربوں کو اس لئے جمع کرتے ہیں کہ ان سے ملیں اور ان سے کہیں کہ اے ہمارے مرشدو، اے ہمارے استادو، تم نے ہم کو جو سبق پڑھایا تھا اور جو مبلغ ہندوستان بھیجے تھے ہم ثابت کرتے ہیں کہ ہم یہاں ہیں اور ہم کندہ، ناتراش نہیں ثابت ہوئے، محمد بن قاسم الثقفی اور دوسرے بزرگان دین

(خواہ براراست عرب سے آئے یا دوسرے ملکوں سے ہوکر) جو سبق لے کر آئے تھے وہ سبق ہم نے یاد رکھا اور ہم نے آپ کو اسی لئے بلایا ہے کہ ہم اپنا سبق سنائیں اور یہ زبان حال سے سن رہے ہیں اور حیرت زدہ ہیں کہ اس ہندوستان میں اتنے غیور مسلمان، شمع اسلام کے اتنے پرانے اسلام کی شمع کو اسطرح جلا سکتے ہیں اور علم کی شمع پر اتنے پروانے جمع ہو سکتے ہیں، ہم نے ان عربوں کو دارالعلوم کی تاریخ سننے اور اس کے کارناموں کی عظمت سے باخبر کرنے کیلئے جمع نہیں کیا ہے بلکہ ہم انھیں کے مشہور شاعر ابوفراس ہمدانی کا وہ شعر سنانا چاہتے ہیں، جس میں اس نے کہا تھا۔

صنائع فاق صانعها فضاقت
وغرس طاب غارسه فطابا
وكنا كالسهام اذا اصابت
مراميها فراميها اصابا

(کارنامے جن کو بنانے والے بڑے بلند وعالی مرتبہ تھے، وہ بڑے روشن ہیں، وہ پودا جس کا لگانے والا بڑا کریم، بڑا شریف، بڑا عالی استعداد تھا، وہ پودا خوب کامیاب نکلا اور خوب برگ وبار لایا۔

ہم تو تیر تھے، جب تیر انداز نے کمان میں جوڑ کر ان تیروں کو چلایا تو وہ اپنے نشانے پر بیٹھے، تو تیروں کی تعریف ہے اور تیر انداز کی بھی تعریف ہے)۔

حضرات: میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی عظمت اور تشخصات کے ساتھ اس ملک میں باقی رہیے، ہم مسلمان ہیں، ہم کو اس کا اقرار ہے ہم اس ملک میں پورے اسلامی امتیازات اور مکمل اسلامی تشخصات کے ساتھ باقی رہیں گے، ہمارا فیصلہ ہے۔

بزرگو اور دوستو: ہجرت کا فلسفہ کیا ہے، ہجرت کا شرعی حکم کیوں ہے؟ اسی لئے کہ جس زمین پر احکام اسلام پر عمل نہ ہو سکے اس سرزمین کو چھوڑ دینا فرض ہے، ہم اس ملک میں اس حالت میں نہیں رہ سکتے کہ ہم اپنے تمام تشخصات وامتیازات سے دست بردار ہو جائیں اور اپنے مابہ الامتیاز عقائد کو چھوڑ دیں، اپنے عقیدہ توحید ورسالت، ایمان بالآخرۃ سے دست کش ہو جائیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعقیدت اور آپ کی سنت پر چلنے کے جذبہ سے

ہم خالی اور عاری ہو جائیں۔

ہم صاف اعلان کرتے ہیں، اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی اعلان کریں کہ ہم ایسے جانوروں کی زندگی گزارنے پر راضی نہیں جن کو صرف راتب چاہئے اور ان کو SELF SECURITY چاہئے کہ ان کو مائی مارے نہیں، ہزار بار ایسی زندگی گزارنے اور ایسی حیثیت قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں، ہم اس سرزمین پر اپنی اذانوں اور نمازوں کے ساتھ ہیں گے بلکہ ہم تراویح اور اشراق وتہجد تک چھوڑنے کیلئے تیار نہیں ہوں گے، ہم ایک ایک سنت کو سینے سے لگا کر رہیں گے اور رسول اکرم کی سیرت کو سامنے رکھ کر کسی ایک نقش بلکہ کسی نقطہ سے بھی دست بردار ہونے کیلئے تیار نہیں۔

لیکن۔عزیزو اور دوستو: اس وقت جبکہ پورے ملک اور عالم اسلام کا جوہر اور دل ودماغ ایک جگہ جمع ہے اور یہاں ایسے لوگ جمع ہیں جن کا فتوی سکۂ رائج الوقت کی طرح چلتا ہے، میں ان تمام حضرات کی موجودگی میں کہتا ہوں، آپ یہاں سے عہد کر کے جائیں کہ ہم کو اس ملک میں مسلمان بن کر ہی رہنا ہے اور ہم کسی قیمت پر اس سے دستبردار ہونے کیلئے تیار نہیں۔

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے

میرے بھائیو: آپ اپنی طاقت اور اپنی قوت سے آشنا ہوں۔

اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

آپ اپنے ساتھ تو انصاف کیجئے، مسئلہ ایک مدرسہ یا کسی جامعہ کا نہیں، نہ کسی مکتب خیال کا مسئلہ ہے، اور نہ کچھ منصوبوں اور عمارتوں کی تکمیل کا مسئلہ ہے، مسئلہ صرف علوم اسلامی کے باقی رکھنے اور اسلامی شخصیت کے تحفظ کا نہیں، آج مسئلہ ہے، اس ملک کی قیادت کا، آپ دوسروں کے پیچھے چلنے کیلئے ہرگز نہیں پیدا کئے گئے، اور نہ خدا نے آپ کو اس ملک میں اس لئے بھیجا ہے کہ آپ دوسروں کا حاشیہ بردار ہوں اور آپ لوگوں کے اشاروں کو دیکھیں اور ان کے چشم وابرو کو پہچاننے کی کوشش کریں کہ ملک کس رخ پر جا رہا ہے، ہم کسی قومی دھارے سے واقف نہیں، ہم تو دنیا کی قیادت وامامت کیلئے پیدا کئے گئے ہیں۔

حضرات: آج ملک خودکشی کے لئے قسم کھا چکا ہے، وہ آگ کی خندق میں گرنے کے لئے تیار ہے، وہ بداخلاقی اور انسانیت کی کے دلدل میں ڈوب رہا ہے، آپ ہی ہیں جو ہندوستان میں کیا پورے ایشیا میں اس ملک کو بچا سکتے ہیں، آپ اللہ اور رسول کی بات کہئے، آپ کو کوئی ضرورت نہیں کہ آپ نیلام کی منڈی میں اتر آئیں اور آپ سودا کرنے لگیں کہ ہماری بولی بولی جائے، آپ متاع نایاب ہیں، اللہ کے سوا آپ کی خریداری کا کوئی حوصلہ نہیں کرسکتا، اسلئے میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں، کاش میں آپ کے دلوں اور دماغوں پر چوٹ لگا سکتا، میں صرف آپ سے کہتا ہوں کہ اس ملک کو صرف تنہا آپ بچا سکتے ہیں، اس لئے آپ کے پاس عقیدہ توحید اور انسانی اصول ومساوات ہے، آپ کے پاس اجتماع عدل کا مکمل نظام موجود ہے، آپ ہی ہیں جو ہر چیز سے بالاتر ہیں، آپ ہی ہیں جن کے پاس ایمان بالآخرۃ ہے اور جو العاقبۃ للمتقین پر یقین رکھتے ہیں۔

آپ ان لوگوں میں سے نہیں جن کی نظر طاقت اور قوت پر رہا کرتی ہے، جن کی نگاہ میں مال ومتاع اور اکثریت ہی سب کچھ ہے اور نہ آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو انتخابات میں کامیاب اور پارلیمنٹ تک پہونچ جاتے ہی کو سب سے بڑی معراج سمجھتے ہیں۔

بزرگو اور دوستو: جو دولت کے فلسفے پر ایمان رکھتا ہے اور ہر چڑھتے سورج کو پوجنے لگتا ہے وہ ڈوب کر رہے گا، اس کو کوئی بچا نہیں سکتا، مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ عرب ممالک اس سے بہتر حالت میں نہیں اور یہ میں آپ سے اردو میں اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں ان سے ڈرتا ہوں، میں نے ان سے بارہا کہا ہے:

" لاا لفقر اخشیٰ علیکم ولکن اخشی ان تبسط علیکم الدنیا کما بسطت علی من کان قبلکم فتنا فسوھا کما تنا فسوھا فتھلککم کما اھلکتھم"۔

اس کو میں نے مکہ اور مدینہ میں کہا اور ہر جگہ میں نے یہی صدا لگائی کہ وہی بچ سکتا ہے جو اللہ کے وعدوں پر یقین اور اس کی نصرت پر بھروسہ رکھتا ہے، اگر ہندوستانی مسلمان اپنے اندر ایمانی خصائص پیدا کرلیں تو آج بھی آتش نمرود سرد پڑ سکتی ہے، اور وہی انداز گلستان پیدا ہوسکتا ہے۔

میرے عزیزو اور دوستو: میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ مولانا قاسم نانوتویؒ اور ان کی روح کا یہی پیغام ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ اسی پر چلتے اور جھلتے رہے۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور مولانا مدنی اپنے اپنے خاص طرز اور اسلوب سے اس کے لئے ہمیشہ سوزاں اور لرزاں رہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنی خصوصیات اور ملی تشخیصات کے ساتھ اس ملک میں باقی رہیں، قرآن وسنت کو سینے سے لگائے رکھیں، اخلاقی مسائل چھیڑنے کے بجائے توحید وسنت پر زور دیں، دیوبند کا یہی پیغام ہے اور اس کی یہی خصوصیت رہی ہے کہ انھوں نے سرمایہ ملت کو بچانے کی کوشش کی اور اخلاقی مسائل کو عوام کے سامنے نہیں لائے۔

یہ دیوبند وارث ہے حضرت مجدد الف ثانی کا، اگر اور اگر کوئی نہیں سمجھتا تو اس کو سمجھنا چاہئے، یہ میرا مقام نہیں ہے، لیکن میں کہتا ہوں، اور حضرت مجدد الف ثانی کے وارث ہیں، حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، مقتدر بزرگوں میں سے کسی کو بھی اس میں کلام نہیں کہ یہ حضرت شاہ ولی اللہ کا گلستان اور ان کا مکتب فکر ہے جو دیوبند کی شکل میں اس وقت سامنے ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں جہاں جہاں صحیح العقیدہ درس گاہیں ہیں وہ شاہ ولی اللہ کی شمع فروزاں اور اسی کی تجلیات ہیں۔

منصب قیادت حفاظت ملک وملت کا فریضہ

حضرات: میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے لئے قائد کا مقام اختیار کیجئے، آپ سمجھئے کہ آپ کی حیثیت ملک میں قائد کی ہے، میرے لئے یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ کوئی یہ کہے کہ مسلمانوں کو یہ کرنا چاہئے، کون یہ کہنے کا حق رکھتا ہے، کیا نبی عربی کے بعد کوئی اور پیغمبر پیدا ہوگا، کیا کتاب اللہ کے بعد اور کوئی کتاب آسمان سے نازل ہوگی، کیا شریعت محمدیؐ کے بعد کوئی اور شریعت آئے گی؟ ہم سے کہنے والا صرف اللہ اور اس کا رسول ہے، ہمارا ساتھ دینے والی ہماری آسمانی کتاب اور سنت رسولؐ ہے، آپ یہ عہد کر کے یہاں سے جائیے کہ آپ کو ان خصوصیات کیساتھ ملک میں رہنا ہے، اور کتاب وسنت کو دل جان سے زیادہ عزیز رکھنا ہے، اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کیلئے تیار رہنا ہے، اگر آپ ان خصوصیات کے ساتھ اس ملک میں ہیں تو انشاء اللہ آپ عزت کے ساتھ سربلند سرخرو ہیں۔

"ولا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان كنتم مؤمنين"۔

حضرات: یہ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء جن کو دستار فضیلت ملنے والی ہے ان سے اس درسگاہ کی تین چار اہم خصوصیات کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔

(۱) اس درسگاہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اخلاقی مسائل کے بجائے توحید وسنت پر اپنی توجہ مرکوز کی (اور یہ وہ وراثت اور امانت ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کے وسیلہ سے اس کو ملی اور ابھی تک اس کو عزیز ہے)۔

(۲) اتباع سنت کا جذبہ اور فکر۔

(۳) تعلق مع اللہ کی فکر اور ذکر و حضوری اور ایمان واحتساب کا جذبہ۔

(۴) چوتھا عنصر ہے اعلاء کلمۃ اللہ کا جزبہ اور کوشش۔

یہ چار عناصر مل جائیں تو دیو بندی بنتا ہے، اگر ان میں سے کوئی عنصر کم ہو جائے تو دیو بندیت ناقص، فضلائے دارالعلوم دیوبند کا یہ شعار رہا ہے کہ وہ ان چار چیزوں کے جامع رہے ہیں، اب میں عام آدمیوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ اس میں آپ کا بھی حصہ ہے اور یہ صرف فضلائے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، آپ بھی یہاں سے پیغام لے کر جایئے کہ عقیدہ توحید کو سینے سے لگانا ہے، اور آپ کے گرد جو شرک اور فتنہ کا دھارا بہہ رہا ہے، اس سے الگ رہنا ہے توحید پر آپ قائم رہیں، اتباع سنت اور فرائض کی پابندی کا جذبہ آپ کے اندر ہو اور تعلق مع اللہ کی کوشش کرتے رہیں، آپ کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ذاکر و مذکور، محبّ ومحبوب اور عبد ومعبود کا ہونا چاہئے، یہی تعلق آپ کے دل ودماغ اور آپ کے اعصاب پر حاوی ہونا چاہئے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امت مسلمہ کا فرض منصبی

اور اس کے انقلابی اثرات

یہ تقریر مولانا حضرتؒ نے اسلامی فاؤنڈیشن پارک فیلڈ لسٹر شائر برطانیہ میں ۱۸/ستمبر ۱۹۹۲ کو کی، جس میں اس شہر اور قرب وجوار کے مقامات کے چیدہ اور منتخب حضرات شریک ہوئے تھے۔

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذبالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهد الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا الله ونشهد ان محمد اعبده ورسوله الذى ارسله الله تعالى بالحق بشيرا ونذيرا وداعيا الى الله باذنه وسراجامنيرا

حضرات! میں قرآن مجید کا ایک حقیر طالب علم ہوں اور آپ سب جانتے ہیں کہ قران مجید روزانہ پڑھا جاتا ہے اور حسب توفیق بار بار اور زیادہ سے زیادہ پڑھا جاتا ہے، قاعدہ یہ ہے کہ جب آدمی کسی چیز کو حیرت سے دیکھتا ہے اور اس سے وہ متعجب ہوتا ہے تو اسکا یہ تعجب ہمیشہ قائم نہیں رہتا، وہ زائل بھی ہوجاتا ہے، لیکن میں اپنا حال آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں (اسی سے میں نے اپنی بات کہنے کا مضمون اخذ کیا ہے) جب میں قرآن مجید میں سورۂ انفال کی یہ آیت کریمہ پڑھتا ہوں:

الا تفعلو تكن فتنة فى الارض و فساد كبير.

تو مومنو! اگر تم یہ کام نہ کروگے تو ملک میں فتنہ برپا ہوجائے گا اور بڑا فساد مچے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان مہاجرین اور انصار کو مخاطب فرمایا ہے، جو مشرف بہ اسلام تھے، جہاں تک ان مہاجرین کا تعلق ہے جو مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے مدینہ طیبہ آئے تھے، وہ چند سو کی تعداد میں تھے، آپ جانتے ہیں کہ ہجرت کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے، ہجرت میں آدمی کو

گھربار چھوڑنا پڑتا ہے، اعزہ واقرباء سے دور ہونا پڑتا ہے اور ان سہولتوں کو خیرباد کہنا پڑتا ہے، جو موروثی اور مقامی طور پر اس کو حاصل ہوتی ہیں، ظاہر ہے کہ ان مہاجرین کی تعداد محدود تھی، اور جن لوگوں نے مدینہ طیبہ میں اسلام قبول کیا تھا ان کی تعداد بھی اس وقت تک کچھ زیادہ نہ تھی، حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ مدینہ طیبہ میں رسول اللہ ﷺ کے حکم سے تین مرتبہ مسلمانوں کو شمار کیا گیا۔ پہلی مرتبہ شمار کرنے میں مسلمانوں کی تعداد پانچ سو، دوسری مرتبہ چھ سو، سات سو کے درمیان تھی، تیسری مرتبہ شمار میں مسلمان ڈیڑھ ہزار تھے، اس تعداد پر مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اطمینان کی سانس لی کہ اب ہم ڈیڑھ ہزار ہوگئے، اب ہمیں کیا ڈر ہے؟ ہم نے تو وہ زمانہ دیکھا جب ہم میں کوئی اکیلا نماز پڑھتا تھا، پھر بھی دشمنوں کا ڈر لگا رہتا تھا۔

گویا یہ مٹھی بھر انسانوں کی آبادی تھی جس نے اسلام قبول کیا تھا اور جس نے اس کی ذمہ داری قبول کی تھی کہ اس کے چاروں طرف انسانی ابدی کا جو سمندر پھیلا ہوا ہے، اس میں وہ ہدایات وتبلیغ کا کام کرے گی اور اسکا آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ساری دنیا میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جنھوں نے اسلام کا نام بھی نہیں سنا تھا، قبول کرنے کا کیا ذکر؟ پھر اس وقت دنیا کی دو عظیم الشان سلطنتیں تھیں جن کو (EMPIRE) کہنا چاہئے، وہ صرف امپائر ہی نہیں تھیں، ان کی حیثیت محض انتظامیہ اور حکومت ہی کی نہیں تھی، ان کے ساتھ مستقل تہذیب تھی، مستقل تمدن، طرزِ زندگی اور معیار واقدار (IDEALS & VALUES) تھے، متمدن دنیا کا سب سے بڑا حصہ جس پر یہ دونوں شہنشاہ یہاں بلاواسطہ یا بالواسطہ قابض تھے، وہیں سے وہ تہذیب لیتے تھے، وہیں سے فیشن اخذ کرتے تھے، وہیں سے قانون لیتے تھے، آپ کو معلوم ہے کہ (ROMAN LAW) دنیا میں کتنی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اور ایرانی تہذیب ہندوستان اور دور دراز ملکوں تک پہنچ گئی تھی۔

حضرات! میں جب آیت پر پہنچتا ہوں تو ہمیشہ تصویر حیرت بن کر رہ جاتا ہوں، سوچنے لگتا ہوں کہ یا اللہ یہ کس سے کہا جا رہا ہے، کب کہا جا رہا ہے اور کہاں کہا جا رہا ہے؟ یہ آخری مسلم شماری جس میں مسلمان ڈیڑھ ہزار نکلے، بعض شراح حدیث اور محققین کی تحقیق میں جنگ احد کے موقعہ پر ہوئی جو ۳ھ میں پیش آئی اور بعض کے نزدیک جنگ خندق (جس کو غزوۃ الاحزاب بھی

کہا جاتا ہے) کے موقعہ پر ہوئی ۵ ھ میں پیش آئی اس طرح یہ مدت زیادہ سے زیادہ پانچ سال کی ہوتی ہے، جس میں مسلمانوں کے شمار کرنے کا یہ کام ہوا اس طرح یہ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو ہزار مسلمان تھے جن سے کہا جارہا تھا کہ تم اپنی شیرازہ بندی کرو اور ایک نئی وحدت (UNIT) قائم کرو، جس کی اساس ایمان پر ہو، قرآن پر ہو، صحیح عقیدہ پر ہو اور وہ آنحضرت ﷺ کی سرپرستی میں ہو۔

یہ وحدت اس لئے قائم کرنے کے لئے کہا جارہا ہے کہ تم اس وحدت کے زریعہ دنیا میں اسلام کا پیغام پہنچاؤ اور دنیا کو ''جاہلیت'' (من مانی آزادی اور نفس پرستی) کی زندگی سے نکال کر دنیا کو اسلام (خدا پرستی اور کامل خود سپردگی) کی دعوت دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو دنیا میں فتنۂ کبریٰ اور فساد عظیم برپا ہوگا۔

میں اس موقع پر سوچتا ہوں کہ جن سے کہا جارہا ہے اور جو اس آیت کے مخاطب ہیں میں اور ان پر جس کام کی اور دنیا کی جس آبادی کی ذمہ داری ڈالی جارہی، دونوں میں کیا تناسب تھا؟ لیکن فارسی میں ایک محاورہ ہے، اور ہم اس کو عربی میں بھی ادا کردیا کرتے ہیں کہ ''بقامت کہتر و بقیمت بہتر'' یعنی قد وقامت کے لحاظ سے چھوٹا لیکن قیمت کے لحاظ سے کہیں بڑا اور بہتر، میں نے اپنی عربی تقریر میں بھی اس کو اس طرح ادا کیا تھا کہ ''العبرة بالقيمة لا بالقامة'' یہ اس جماعت سے کہا جارہا ہے جو بقامت کہتر تھی لیکن بقیمت بہتر اصل چیز جو فیصلہ کن ہے وہ ''قیمت'' ہے ''قامت'' نہیں چنانچہ اس کہتر قامت اور بہتر قیمت نے اپنی انقلاب انگیزی اور عہد آفرینی ثابت کردی، ایرانی سلطنت کا چراغ گل ہوگیا، صرف سلطنت کا نہیں ایرانی تہذیب کا ان کے معیاروں کا اور ان کی قدروں (IDEALS & VALUES) کا جو حقیقی طور پر حکومت کرتے اور زندگی کی تشکیل کرتے ہیں، جن کو عربی میں المثل والقیم کہتے ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دور یا زیادہ سے زیادہ خلافت راشدہ کے اختتام تک دنیا کا متمدن ترین حصہ جو مہذب اور ترقی پسند انسانوں کے لئے نمونہ اور معیار (IDEAL) کا درجہ رکھتا تھا، وہ بدل گیا تھا یا برابر بدل رہا تھا، معیار بدل گئے تھے، سوچنے کی طریقے بدل گئے تھے، ایران اور روم کی ذہنی وفکری غلامی سے آزاد ہورہے تھے، معیار مہذب اور ترقی یافتہ کہلانا، احترام اور وقعت کی نگاہ سے دیکھا جانا معیار نہیں رہا تھا، حکم خداوندی کی تعمیل

اور سنت نبویؐ کی پیروی اور عہد رسالت اور اس کے معتبر نمائندوں سے مشابہت لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ فرمائیے۔

حضرات! میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے اس مرکز (ISLAMIC FOUNDATION) کے قیام کے لئے صحیح جگہ کا انتخاب کیا، آپ یہاں مغربی تہذیب کے سینہ بیٹھ گئے، اگر یہاں سے یا کسی بڑے مغربی ملک یا مغربی تہذیب کے بڑے [illegible] سے انقلاب شروع ہوا، تو وہ طاقت میں اور گہرائی میں، وسعت میں بھی اور [illegible]، [illegible] ہوگا، خدا کرے وہ وہ دن آئے کہ ان ملکوں میں بھی لوگوں میں حق کی طلب اور [illegible] زندگی [illegible] کا احساس پیدا ہو، اور کہیں کہ آپ ہم کو اس تاریکی کی زندگی، نفس پرستی کی زندگی، اور [illegible] کی زندگی سے نکالئے، یہاں پر یہ نکتہ یاد رہے کہ قرآن مجید میں تاریکی کے لئے [illegible] صیغہ ''ظلمات'' آتا ہے اور روشنی کے لئے واحد صیغہ ''النور'' آتا ہے۔

یخرجھم من الظلمات الی النور

وغیرہ وغیرہ، اس سے معلوم ہوا کہ ظلمتیں بے شمار ہیں اور نور ایک ہے، [illegible]

[illegible]

اور یہ بات جب تک [illegible]

[illegible] نے ایک واقعہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اور بعض کئی کئی سال سے اپنا گھر چھوڑے ہوئے ہیں، شادی شدہ ہیں یا شادی کی عمر ہے، لیکن ہم نے آپ میں سے کسی کو کسی نامحرم کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہوئے میں دیکھا، تو ہم نے کہا کہ ایک ہو دو ہوں تو ہو سکتا ہے، لیکن سب کے سب کیوں نہیں دیکھتے؟ ادھر جوانی ہے ادھر حسن ہے، لیکن کسی کو بدنگاہی کرتے ہوئے نہیں دیکھتے۔

اس ہندوستانی نے جواب دیا کہ الحمد للہ ہم سب کی نظر بالکل ٹھیک ہے، مگر قرآن کی تعلیم ہے۔

قل للمنومنين يغضوا من ابصار هم ويحفظوا فروجهم

اہل ایمان سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

پھر یہ ہمارے امام کی تربیت کا بھی نتیجہ ہے اس خصوصیت کی طرف اس آیت بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ۔

يا ايها الذين امنو ا ان تتقو الله بععمل لكم فرقاناً

اے ایمان والو! اگر تم اللہ کے معاملہ میں تقویٰ و احتیاط کا عمل اختیار کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے اندر ایک شان امتیازی پیدا کر دے گا۔

اگر آپ نے اس ملک میں رہتے ہوئے زندگی کا ایک نیا ماڈل (MODEL) ایک نیا سانچہ اور ایک نیا نمونہ پیش کیا، جس میں یہاں کی زندگی، طرز معاشرت، نفس پرستی اور دولت پرستی اور ہر قسم کی آزادی سے امتیاز ظاہر ہوا، تو لوگوں کے اندر اسلام کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوگا، وہ آپ کے یہاں آئیں گے اور کہیں گے کہ ہمیں کوئی کتاب دیجئے جس سے ہم سمجھیں کہ اس انقلاب کا سرچشمہ کہاں ہے؟ کہاں سے یہ تبدیلی آئی اور آپ میں امتیاز پیدا ہوا۔

میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری حقیر ذات اور میرے رفقاء کا اعزاز کیا، خاص طور پر ڈاکٹر خورشید احمد صاحب اور مناظر احسن صاحب اور سب حضرات اور اس ادارہ کے ذمہ داروں کا کہ آپ نے ہمارے ساتھ برادرانہ ہی نہیں کریمانہ اور فیاضانہ سلوک کیا، اللہ تبارک وتعالیٰ توفیق دے کہ یہ مرکز زیادہ سے زیادہ ہدایت اور نفع کا سرچشمہ بنے، اللہ وہ دن نہیں دکھائے کہ جیسے پہلے اس ملک سے دنیا پرستی اور نفس پرستی اور مادیت کی ہوا چلی تھی، الحاد اور لادینیت کا رجحان پیدا ہوا تھا ویسے ہی اب ایمان کی، اخلاق کی انسانیت اور شرافت کی اور

آخر میں اقبال کے ان چند اشعار پر اس خطاب کو ختم کرتا ہوں، جو اس مقام و ماحول، عہد و زمانہ، اور مسلمانوں کے مقام و پیغام سے بھی خاص مناسبت رکھتے ہیں۔

ناموس ازل را تو امینی تو امینی
دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی
صہبائے یقین در کش و از دیر گماں خیز

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

فریاد ز افرنگ و دل آویزی افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ
معمار حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کاروانِ ملت کا جلیل القدر مسافر

رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی طرف سے پہلی ایشیائی کانفرنس منعقدہ کراچی کے اختتام پر ۹ جولائی ۱۹۷۸ء کو ایک استقبالیہ جلسہ میں یہ تقریر کی گئی۔

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور انفسنا
ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له
ونشهد ان لا اله الا الله ونشهد ان محمدا عبده ورسوله الذي ارسله
الله تعالى بالحق بشيرا ونذيرا وداعيا الى الله باذنه وسراجا منيرا

دل کی باتیں دل سے

حضرات! میں سب سے پہلے تو آپ کی اس محبت اور اعتماد کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کا آپ نے مجھے اہل سمجھا اور اس لگاتار بارش کے موسم میں یہاں تک تشریف لانے کی زحمت گوارا کی۔ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ انسان الفاظ اور زبان کو جو جذبات اور خیالات کے اظہار کا عام ذریعہ ہے، ناقص سمجھنے لگتا ہے۔ آپ سب کو معلوم ہے کہ میں اپنے خیالات کا اظہار زبان و قلم سے مختلف موقعوں پر کرتا رہتا ہوں لیکن میں بے تکلف آپ کے سامنے اس احساس کا اظہار کر رہا ہوں کہ مجھے الفاظ کا بڑے سے بڑا ذخیرہ اور زبان کی بڑی سے بڑی روانی اس وقت ناکافی معلوم ہوتی ہے، جب سامعین کا خلاصہ تعلیم یافتہ اور صاحب فکر طبقہ کا عطر، اور ملت کا دل و دماغ سامنے ہو تو پھر جی چاہتا ہے کہ دماغ کہے اور دماغ سنے، یہ دل کہے اور دل سنے لیکن ابھی تک سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ میری آواز کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنیں بھی آپ تک منتقل ہو سکیں، یہ تو پچھلے اہل دل کا معمول یا خدا کا انعام تھا کہ دل سے باتیں کرتے تھے۔

میں اس وقت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوں کہ بات کہاں سے شروع کروں اور اپنی بات کو کس طرح سمیٹوں، میں نے کل اسلامی ایشیائی کانفرنس کی اختتامی تقریب میں جو عربی میں تھے، تین اشعار انتخاب کئے تھے، میں تھوڑی دیر عالم تحیر میں رہا کہ کس زبان کا انتخاب کروں، سب سے پہلے تو مجھے خیال آیا کہ اردو زبان میں خطاب کروں کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد اس کو سمجھتی اور بولتی ہے، لیکن پھر مجھے عربی زبان سے شرم آئی کہ میں اس کو کیا جواب دوں گا، وہ قرآن کی زبان ہے، ایمان کی زبان ہے اور رابطہ عالم اسلامی کی بھی سرکاری زبان ہے جس کے اسٹیج سے میں تقریر کر رہا تھا، اس لئے میں نے اس کا حل تلاش کیا کہ میں ان تین زبانوں سے جن میں شد بد رکھتا ہوں ایک ایک شعر منتخب کر لوں، چونکہ آپ حضرات اس وقت تشریف نہیں رکھتے تھے، اس لئے میں ان کو پھر دہراتا ہوں۔ میں نے عربی کا یہ شعر انتخاب کیا:

حمامة جرعی حومة الجندل اسجعی

فانت بمرأى من سعاد ومسمع

(اے حومۃ الجندل کے ریگزار کے کبوتر: اس سے بہتر چہکنے کا کوئی موقع نہیں [illegible] سعاد (محبوبہ) قریب ہے، وہ دیکھ بھی رہی ہے) میں نے کہا آپ سب [illegible] ہی [illegible] سعاد [illegible]۔

فارسی میں عرفی یا نظیری یا حافظ یا جامی کا کوئی شعر انتخاب کرتا اور پڑھ سکتا تھا [illegible] اقبال سے شرم آئی [illegible] زمین کا سب سے بڑا فارسی گو شاعر ہے، مگر اس کو [illegible] نظیری کی [illegible] یوں جاؤں، میں نے [illegible]

[illegible]

[illegible]

پھر میں نے کہا [illegible] اردو کو [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

موقع کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

حضرات! میں سمجھتا ہوں کہ ایک صاحب پیغام، صاحب امر ونہی اور سیاسی وزن رکھنے والی اور دنیا میں ظلم وزیادتی کو روکنے کی صلاحیت رکھنے والی، عدل ومساوات کا سبق سکھانے والی اور خدا کا پیغام بلند سطح پر پہنچانے والی ملت کی حیثیت سے فیصلہ کی دو گھڑیاں تھیں۔ میرے نزدیک ایک تو وہ دن تھا جب سلطنت عثمانیہ کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا، یعنی یہ کہ سلطنت عثمانیہ نہ صرف باقی رہے گی، بلکہ اس طرح باقی رہے گی کہ دنیا کے سیاسی نقشہ پر وہ کوئی اثر ڈال سکے گی، یہ حیثیت امت کے پاسبان اور خادم کے اس کا وجود برقرار رہے گا یا نہیں؟ [illegible] میں یہ عثمانی ملت کی تقدیر کا فیصلہ نہیں بلکہ ملت اسلامیہ کی تقدیر کا فیصلہ تھا، اور [illegible] اوقات پیغاموں کی قسمت ملتوں سے وابستہ ہو جاتی ہے، اس لئے کہ پیغام [illegible] خلا میں [illegible] ہوتا، اور ملت بھی خلا میں نہیں ہوتی، اسی زمین پر اس کا وجود قائم ہوتا ہے۔ امت [illegible] سیاسی وزن قوموں پر، وقت کے اہم فیصلوں پر، تاریخ کے دھارے پر ڈال سکے [illegible] کا موقع یا تو اس دن تھا، جب سلطنت عثمانیہ کی قسمت کا فیصلہ ہونے جا رہا تھا یا [illegible] ہے جو [illegible] ہے۔

یک لحظہ غا[illegible] [illegible] و صد [illegible] [illegible] شد

پاکستان آج ایک موڑ پر آ [illegible] ہو گیا ہے، [illegible] تقدیر [illegible] [illegible] ہے [illegible] بہت سے ایسے موڑ ہوتے ہیں [illegible] ہمارے [illegible] تھیں عالم [illegible] [illegible] دیکھیں گے کہ کاتب تقدیر فیصلہ [illegible] [illegible] فیصلہ الٰہی [illegible] [illegible] کا [illegible] [illegible] اخلاص ہے [illegible] بدل [illegible] [illegible]

ہوتا ہے، اس کی ایک لغزش پوری پوری قوم کے سفینہ کو غرق کردینے کے لئے کافی ہوتی ہے، فارسی کے ایک شاعر نے کبھی کہا تھا:

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

شعراء اپنی ذہانت اور قوت تخیل سے بہت سے ایسے مضامین بیان کردیتے ہیں جن کا اصل مصداق ابھی تک پیدا ہی نہیں ہوا، وہ اپنی طباعی اور مضمون آفرینی سے بعض باتیں کہہ جاتے ہیں، بعض مرتبہ برسوں کے بعد، بعض مرتبہ صدیوں کے بعد وہ وقت آتا ہے جب اس شعر کی صحیح تشریح ہوتی ہے، اور اس میں جان پڑتی ہے، مجھے اس میں بڑا شک ہے کہ شاعر نے جس وقت یہ اتفاقی شعر کہا تھا اس وقت اس کے سامنے ایسا واقعہ تھا کہ کسی مسافر کو، کسی شریک کارواں کو اپنے تلوے کے کانٹے نکالنے کے لئے بیٹھنا پڑا ہو اور کارواں نکل گیا ہو، وہ کارواں کیا تھا، وہ مسافر کیا تھے؟ کہنے والے نے کیا سوچ کر کہا تھا اور کس واقعہ کی طرف اس کا اشارہ ہے؟ میرے خیال میں وہ واقعہ اس لازوال شعر کا ہرگز مستحق نہیں ہوگا، شاعر کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ ایک ملت ابھرے گی، ایک طاقت ابھرے گی، ایک کارواں، ملت اسلامی کا ایک کارواں رواں دواں ہوگا، اور اس ملت کے کاروان حیات کا ایک مسافر جس کا نام پاکستان ہے، اپنے پاؤں کی کوئی پھانس نکالنے کے لئے کارواں سے بچھڑ جائے گا (میں ان پھانسوں کی طرف اشارہ نہیں کروں گا، ان کا تعین نہیں کروں گا، اس لئے کہ یہ اس شعر کی عظمت اور اس کی مثال کی اہمیت کے خلاف ہوگا، اس شعر کو یہ بات مجروح کرے گی کہ میں کسی پھانس کا نام لوں، اس لئے یہ تو میں آپ پر چھوڑتا ہوں کہ آپ کے دل کن کن پھانسوں کا تصور کریں) لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر یہ شعر صحیح طور پر منطبق ہوتا ہے تو ہماری اور آپ کی موجودہ صورت حال پر۔

کاروانِ ملت کا جلیل القدر مسافر:

پاکستان اس کاروان حیات کا ایک جلیل القدر مسافر ہے، ملت کا کاروان سفر کی منزل میں ہے، پاکستان اس کی صف اول کا ایک مسافر جس کے پاؤں میں کچھ کانٹے چبھ گئے ہیں، یا کچھ پھانسیں لگ گئی ہیں، ان پھانسوں کو دور کرنے میں اگر اس نے تاخیر سے کام لیا، اگر اس حالت

میں اس کو نیند آگئی، اگر اس حالت میں وہ کسی اور مسافر سے دست وگریباں ہوگیا تو اندیشہ ہے کہ ملت کا کارواں بچھڑ کر رہ جائے، اس وقت آپ کی ذرا سی لغزش ملت کی قسمت پر مہر لگا سکتی ہے، ملت اسلامیہ پر آپ کا صحیح یا غلط فیصلہ اس طرح اثر انداز ہوسکتا ہے کہ ایک صدی دو صدی تک اس ملت کی قسمت پر پھر ایک اور قفل پڑ جائے اور اس کی زبانی خدانخواستہ گم ہو جائے، اس لئے کہ آپ بڑے نازک مقام پر کھڑے ہیں۔

اس مقام پر بڑی قربانی کی ضرورت ہے، مجھے افسوس ہے کہ قربانی کا لفظ اتنی کثرت سے استعمال ہوا ہے، اور ہماری سیاسی تحریکوں نے (لکھنؤ کی زبان میں کہوں گا) اس کی مٹی پلید کی ہے اور علمی زبان میں کہوں گا کہ ایسا غلط استعمال کیا ہے کہ وہ اپنی طاقت کھو چکا ہے، قربانی تو وہ چیز ہے کہ اس کو سنتے ہی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، لیکن ہم قربانی کا لفظ جب استعمال کرتے ہیں تو ملازمت کی قربانی کو، تنخواہ کی معمولی سی قربانی کو اس کا مصداق سمجھتے ہیں، لیکن قربانی وہ باعظمت اور مقدس چیز ہے جس کی تاریخ ابراہیم علیہ السلام کی قربانی پر ختم ہوتی ہے، ہر چیز کا شجرۂ نسب ہوتا ہے، مسجد کا شجرۂ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد کعبہ، بیت اللہ سے ملتا ہے، اور جس مسجد کا نسب مسجد ابراہیمیؑ پر جا کر ختم نہ ہو وہ مسجد خانہ خدا کہلانے کی مستحق نہیں، وہ مسجد ضرار ہے اور جس مدرسہ کا شجرۂ نسب صفۂ نبوی ﷺ پر ختم نہ ہو وہ مدرسہ دانش کدہ نہیں، جہالت کدہ ہے، تو اس طرح میں کہوں گا کہ جس قربانی کا شجرۂ نسب ابراہیم خلیل اللہ کے جذبہ ایثار و حب خدا اور حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کی بے نفسی و تسلیم و رضا پر ختم نہ ہو وہ صحیح النسب نہیں ہے۔

تین قسم کی قربانیاں:

آپ کو تین طرح کی قربانیاں دینی ہیں، ہماری ہر قربانی کے لئے ہماری تاریخ میں ایک امام موجود ہے، ایک قربانی وہ ہے جو سیدنا خالد بن ولید نے یرموک میں دی تھی، دوسری قربانی وہ ہے جو حضرت حسن بن علیؓ نے حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں امت کے انتشار کو ختم کرنے کے لئے دی تھی، تیسری قربانی وہ ہے جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے (اسلامی مملکت اور معاشرہ کو اسلامی زندگی اور اسلامی سیرت کی راہ پر لگانے کے لئے) اپنی زندگی کو بدل کر اور اپنے خاندان کے مفاد سے آنکھیں بند کر کے دی تھی، اب یہ تینوں قربانیاں پاکستان کی اس ملت

اسلامیہ کو درپیش ہیں۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کی قربانی یہ پیغام دیتی ہے کہ عین میدان جنگ میں اگر معزول کردیا جائے تو پیشانی پر شکن نہ آئے اور یہ الفاظ تاریخ کے ریکارڈ نے اسی وقت محفوظ کر لئے تھے کہ ''اگر میں عمر کے لئے لڑتا تھا تو اب نہیں لڑوں گا، اور اگر اللہ تعالیٰ کے لئے لڑتا تھا تو میرے جوش وسرگرمی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔'' اور دنیا نے دیکھ لیا کہ اللہ کے سچے بندے نے اس کو سچا کر دکھایا کہ اس کے جوش جہاد اور شوق شہادت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے کہ جس شخص کا نام فتح کے ساتھ اس طرح گھل مل گیا تھا کہ ان میں فرق کرنا مشکل تھا وہ نام فتح کی علامت واثر (Symbol) بن گیا تھا، لوگ پوچھتے تھے معرکہ میں خالدؓ ہیں یا نہیں؟ اگر جواب ملتا کہ وہ ہیں تو دل امیدوں سے بھر جاتے تھے، اصل بھروسہ خدا پر تھا، لیکن ان کی موجودگی کو نیک فال سمجھتے تھے، دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کرسکتی، فاروق اعظمؓ کی عظمت کے سامنے، خدا اعتمادی اور خود اعتمادی کے جوہر کے سامنے مورخ حیران ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ اس خدا کے بندے نے اس ملت کے لئے اور قیامت تک کے لئے ایک نظیر قائم کرنے کے لئے یہ قدم اٹھایا، اتنا خطرناک قدم کہ میں سمجھتا ہوں کہ جنگوں کی تاریخ میں اتنا خطرناک قدم نہیں اٹھایا گیا، اور اتنا بڑا خطرہ (Risk) مول نہیں لیا گیا کہ عین اس وقت جب سب سے بڑا فیصلہ کن معرکہ (یرموک کی جنگ) درپیش تھا، مدینہ سے ایک شخص آتا ہے اور حضرت خالدؓ کی معزولی اور حضرت ابوعبیدہؓ کے تقرر کا پروانہ ہاتھ میں دیتا ہے اور لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ خالد اب کمانڈر انچیف یا قائد افواج اسلامی نہیں رہے۔ انہوں نے سر جھکا دیا اور سب سپاہیوں نے دیکھا کہ خالدؓ معزول کردیئے گئے اور خالدؓ نے اس وقت کہا کہ ''اگر جہاد سے میرا مقصد عمر بن خطاب کی خوشنودی ہوتی تو میں آئندہ سے رک جاتا، لیکن میں چونکہ اللہ کے راستے میں، اس کی رضا جوئی کے لئے اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید میں جہاد کرتا تھا، اس لئے میرے زور بازو میں کوئی فتور اور قتال کے لئے میرے جوش وسرگرمی میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔''

ملت کا مفاد مقدم رکھیں:

ایک قربانی آپ کو اس ملک میں یہ دینی ہے کہ ملت کے مفاد کو اپنے مفاد پر، جماعت

کے مفاد پر، برادریوں کے مفاد پر اور یہاں تک میں عرض کرتا ہوں کہ ملت کی ضرورت کا جو عنوان اور راستہ ہم نے تجویز کیا ہے، اس پر بھی ملت کے مفاد کو مقدم رکھیں۔ اس لئے کہ جماعتیں ملت کے لئے ہیں، ملت جماعتوں کے لئے نہیں، مولانا محمد یوسف صاحب امیر جماعت اسلامی ہند یہاں بیٹھے ہیں، میں نے ہندوستان میں ''مسلم مجلس مشاورت'' کے پلیٹ فارم پر بھی یہ بات کی تھی، اس وقت بھی اس پر ایمان رکھتا تھا، اور اب بھی ایمان رکھتا ہوں کہ اگر ملت کے مفاد کا تقاضا ہو کہ حرف غلط کی طرح جماعتوں کو مٹا دیا جائے تو میرے اخلاص کا تقاضا ہوگا کہ سب سے پہلے میں اسے قبول کروں، یہ وہ قربانی ہے جس کا سبق حضرت خالد بن ولیدؓ کی قربانی ہمیں دیتی ہے۔

حضرت حسنؓ کی قربانی کی عظمت کو ہمارے اچھے اچھے مورخ بعض مرتبہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ قربانی بھی کسی قربانی سے کم نہیں کہ وہ نواسہ رسول ﷺ تھے، بڑے نواسے تھے، انصار علیؓ کی تلواریں نیام سے ابھی باہر تھیں، اس وقت جو شخص بھی صورت حال کا جائزہ لیتا وہ یہ پیش گوئی کرسکتا تھا کہ ابھی بڑی فوجی طاقت حضرت حسنؓ کے ساتھ ہے، اور مسلمانوں کی جذباتی وابستگی بھی ان کے ساتھ ہے، ان کے ساتھ شرعی دلائل تھے، وہ نواسہ رسول ﷺ تھے اور خلیفہ راشد تھے۔ ان کے ہاتھ پر بیعت ہو چکی تھی، انہوں نے دیکھا یہ کہ کشمکش بے نتیجہ ثابت ہوئی اور میرے جلیل المرتبت والد کی توانائیوں کا بڑا حصہ اس میں صرف ہوگیا، ان کا یہ ایک اجتہاد تھا کہ انہوں نے خلافت سے کنارہ کشی اختیار کی، ایک قربانی وہ ہے جو ان کے بعد ان کے عظیم المرتبت بھائی حضرت حسینؓ نے یزید کے مقابلہ میں دی، ایک اجتہاد ان کا تھا، میں ان دونوں اجتہادوں کو صحیح سمجھتا ہوں، ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں سمجھتا، یہ موقع نہیں کہ میں تاریخی اسباب بیان کروں، لیکن میرے نزدیک حالات کے بدلنے کے ساتھ احکام بدلتے ہیں، ان حالات کے مطابق حضرت حسنؓ کا فیصلہ صحیح تھا، ان حالات کے مطابق حضرت حسینؓ کا فیصلہ صحیح تھا اور دونوں نے عالی ہمتی سے کام لیا اور کسی نے کمزوری نہیں دکھائی۔ میں ایک منٹ کے لئے یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ حضرت حسنؓ نے کسی کمزوری کی بناء پر یا کسی بیرونی دباؤ کی بناء پر یہ فیصلہ کیا بلکہ یہ تو وہ فیصلہ تھا کہ جس کی پیش گوئی زبان نبوت ﷺ نے کی تھی:

ان ابنی هذا سید، ولعل الله ان یصلح بن بین فئتین من المسلمین

میرا یہ بیٹا سردار ہے، کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان مصالحت کرادے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی قربانی بھی کسی قربانی سے کم نہیں، وہ جب مدینہ کے گورنر تھے، اور حکمران خاندان کے ایک فرد تو اپنے اعلیٰ مذاق ونفاست پسندی کے لئے ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتے تھے، ان کا فیشن نو جوانوں میں نہ صرف قابل تقلید بلکہ منتہائے کمال سمجھا جاتا تھا، ان کی چال ڈھال کی نقل کی جاتی تھی اور ''المشیۃ العمریۃ'' کے نام سے اس زمانے کی سوسائٹی میں زبان زد خلائق تھی، بیش قیمت سے بیش قیمت کپڑا بازار سے خرید کر آتا، تو ان کی نظر میں نہ جچتا، لیکن جب خلافت کا باران کے کاندھوں پر پڑا تو ان کی زندگی یکسر تبدیل ہوگئی، انہوں نے اپنے اور اپنے قریب ترین اعزہ کی جاگیریں بیت المال کو واپس کردیں، ایک مرتبہ سستے سے سستا کپڑا ان کی پوشاک کے لئے آیا تو یہ کہہ کر انہوں نے واپس کردیا کہ یہ قیمتی ہے، ان کے خادموں کی آنکھوں میں پرانا زمانہ یاد کر کے آنسو آگئے کہ بازار کے قیمتی کپڑوں کو انہوں نے یہ کہہ کر واپس کردیا تھا کہ بہت معمولی ہیں، کھانے پینے اور گھر کی چیزوں کا معیار انہوں نے اتنا گرادیا کہ بوریا نشین زاہد بھی اس سے نیچے شاید نہ اتر سکے۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ سرکاری شمع جل رہی ہے، اور وہ حکومت کا کام کر رہے ہیں کہ ایک دوست باہر سے آتے ہیں، وہ ان کے علاقہ کے مسلمانوں کے حالات دریافت کرتے ہیں۔ جوں ہی وہ ان کے بچوں کی خیریت اور گھر والوں کی عافیت پوچھنے لگتے ہیں تو وہ پھونک مار کر شمع گل کر دیتے ہیں اور ذاتی شمع منگواتے ہیں کہ سرکاری شمع اور تیل اس لئے نہیں ہے کہ ذاتی سوالات اور خانگی حالات میں وہ صرف ہوں۔ میں نے یہ چند مثالیں دی ہیں، ورنہ ان کی خلافت کے بعد کی پوری زندگی اس عظیم قربانی کی ایک مثال ہے جو کوئی خدا ترس اور صاحب ضمیر اور صاحب ایمان انسان کسی ملت کے لئے پیش کرتا ہے۔

معاملہ ملت اسلامیہ کی تقدیر کا:

یہ میری خوبی ہو یا میری آزمائش ہو، یہ خدا کی نعمت ہو یا میرا امتحان ہو، میں نہیں کہہ سکتا، لیکن شاید اس مجمع میں (ان کے پورے احترام کے ساتھ) کوئی صاحب ایسے موجود نہ ہوں

گے، جن کو عالم اسلام کو اس طرح اور اتنے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہوگا، جتنا مجھے، کچھ تھوڑی سی بدقسمتی، کچھ تھوڑی سی خوش قسمتی، بدقسمتی اس لئے کہ میں نے اس عالم اسلام کو جس طرح دیکھا وہ جگر پر داغ ہے، جگر پر زخم ڈالنے والا ہے، خوش قسمتی اس لئے کہ مجھے مسلمانوں کو قریب سے اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا، اپنے جسم کے ان ٹکروں کو دیکھنے کا موقع ملا، بہر حال میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ معاملہ اس وقت پارٹیوں کا نہیں، معاملہ جماعتوں کا نہیں، معاملہ وقتی مصالح کا نہیں، معاملہ ملت اسلامی کی تقدیر کا ہے، ہوسکتا ہے کہ عبادات محفوظ ہوں، معاملات میں بہت سی شکلیں محفوظ ہوں، لیکن ملت دنیا کے سیاسی ترازو میں اپنا وزن نہیں ڈال سکتی، بیت المقدس کا مسئلہ ہو یا فلسطین کا مسئلہ ہو، لبنان کا مسئلہ ہو یا قبرص کا مسئلہ ہو، آپ دیکھئے کہ پوری ملت اسلامی اس بارے میں کوئی اثر نہیں رکھتی۔ سلطنت عثمانیہ کے بعد عالم اسلام کا کوئی ملت اور ملت اسلامیہ کا کوئی کنبہ، کوئی خاندان اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ عالم اسلام کے کسی مسئلہ میں اپنا سیاسی وزن ڈال سکے۔ کچھ فیصل مرحوم نے تھوڑا سا وزن ڈالا تھا اور کچھ ہمت دکھائی تھی، لیکن آ کر "آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند" آج کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں ہے کہ جس کی ناپسندیدگی، جس کا عدم اتفاق اور جس کا احتجاج کسی بڑی طاقت کو ایک سیکنڈ کے لئے بھی اس مسئلہ پر غور کرنے پر آمادہ کر سکے، آپ سب جماعتی مفاد سے بالاتر ہو کر صورت حال کا مقابلہ کریں، زمانہ کے چیلنج کو قبول کریں اور اس کا ہمت و جرأت سے سامنا کریں، اور اگر خدا کی طرف سے کوئی موقع ملا ہو تو آپ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں، اگر کوئی فرد، کوئی جماعت دس فیصد بھی اپنے کو اس کا اہم قرار دے کہ وہ آپ کی کوئی خدمت کر سکے تو اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ اسے موقع دیں کہ وہ اپنی صلاحیت کا اظہار کرے، مسلمانوں کی تقدیر کی یہ جو لکیریں ہیں، ان کو سامنے رکھئے، یہ نوشتۂ دیوار نہیں، نوشتۂ تقدیر ہے، آپ کی ذرا سی غلطی، ذرا سی نفسانیت، ذرا سی صوبائی یا لسانی یا طبقہ واری عصبیت، آپ کا انتشار و اختلاف مسلمانانِ عالم کے لئے نقصان دہ ہوسکتا ہے، آج یا کل جب بھی وہ موقع آئے تو آپ سارے مفادات پر ملت کے مفاد کو مقدم رکھیں اور آپ ہر اس موقع سے، ہر اس موضوع سے، ہر اس مسئلہ سے کنارہ کشی اختیار کریں، جو کسی قسم کا ذہنی انتشار پھیلائے، اگر اس کے لئے آپ کو اختلافی مسائل کو کچھ دنوں کے لئے بالائے طاق رکھنا پڑے تو ضرور رکھیں، فرض اور واجب ہے کہ آپ

غیر ضروری بحثوں کو نہ چھیڑیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر بعض دینی دعوتوں نے شروع سے یہ احتیاط برتی ہوتی اور انہوں نے جانبی اور ذیلی بحثوں کو کچھ دنوں کے لئے اٹھا رکھا ہوتا تو آج ان کے لئے راستہ اس سے زیادہ صاف تھا جتنا اس وقت آپ کو نظر آ رہا ہے، لیکن بہر حال یہ انسانی کوششیں ہیں، انسان اپنے علم اور عقل کا مکلّف ہے۔

موجودہ صدی کو کسی معتصم کی تلاش:

میں سمجھتا ہوں کہ میری تقریر کے مضمرات کو آپ حضرات نے پورے طور پر سمجھ لیا ہوگا اور اتنا کافی ہے، میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ آپ پورے عالم اسلام بلکہ دنیائے انسانیت کے لئے اور حق وانصاف اور عدل ومساوات کے لئے پشت پناہ بنیں اور آپ اس قابل ہوں کہ دنیا کے کسی گوشہ میں آپ کے اخلاقی اثر اور آپ کے احترام میں ظلم نہ ہونے پائے، جیسا کہ ایک بڑھیا عورت پر ظلم ہوا تھا، اس نے ''وامعتصماہ!'' کی صدا لگائی تھی اور عباسی خلیفہ معتصم اس کی دادرسی کو پہنچ گیا تھا، آج بھی کوئی ملک اس قابل ہو کہ کوئی مظلوم ''وامعتصماہ'' کہہ سکے، کوئی تو معتصم اس دنیا میں اس صدی میں پیدا ہونا چاہئے، جیسا ایک امام کعبہ کی ضرورت ہے، اور ہم، آپ سب ان کا احترام کرتے ہیں، جیسا کہ آج ایک بڑے عالم دین کی ضرورت ہے اور ہم آپ ان کا احترام کرتے ہیں، ویسے حق پسند، انصاف شعار، عدل گستار، دردمند، انسان دوست جماعت کی بھی ضرورت ہے، بس میں ان الفاظ پر اپنی بات ختم کرتا ہوں، آپ حضرات کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ حضرات نے مجھے ایسا موقع عطا کیا کہ اگر میں کوشش کرتا اور یہاں میرے احباب بھی کوشش کرتے تو شاید اس آسانی سے یہ موقع فراہم نہیں ہوسکتا تھا، اللہ تعالیٰ آپ سب کو بہترین جزا عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام ایک چار روزہ سیمینار منعقدہ ۲۲ تا ۲۵ جنوری ۱۹۷۷ء میں کی گئی ایک افتتاحی تقریر۔

جناب وائس چانسلر صاحب، اساتذہ جامعہ، فضلائے مجلس اور معزز حاضرین! میں سب سے پہلے اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ اس سیمینار کے داعیوں کا شکریہ ادا کروں کہ انہوں نے مجھے ایسی موقر مجلس کے افتتاح کے لئے جس کا ایسا سنجیدہ اور فکر انگیز عنوان ہے، دعوت دی اور عزت بخشی۔

بڑی ذمہ داری:

حضرات! یہ بڑی موزوں اور برمحل بات ہے کہ یہ سیمینار مسلم یونیورسٹی کے حلقے میں اور اس کے زیر سایہ منعقد ہو رہا ہے، جس نے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے بدلتی ہوئی دنیا اور تغیر پذیر عہد کا سب سے زیادہ جرات مندانہ اور واضح طور پر نوٹس لیا، لیکن تغیر کی حقیقت کو تسلیم کرنے والے اداروں اور تحریکوں پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، تغیر اور تبدیلی کی ضرورت کا تسلیم نہ کرنا آسان ہے، اس سے کوئی ذمہ داری اس ادارے اور اس تنظیم پر عائد نہیں ہوتی، جو تغیر سے انکار کر دیتا ہے، مگر تغیر کی ضرورت کو تسلیم کرنے کے بعد تو ادارہ ہمیشہ کے لئے اس کا ذمہ دار ہو جاتا ہے کہ حالات کا دیانتدارانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیتا رہے اور دیکھے کہ نئے تغیر کی حقیقت کو تسلیم کرنے اور اس کا سامنا کرنے کے لئے وہ تیار ہے یا نہیں؟

اس حیثیت سے مسلم یونیورسٹی پر اور اس کے بعد ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور حسن اتفاق ہے کہ ان دونوں اداروں کے ذمہ داروں کا یہاں ایک سنگم ہو رہا ہے، ان کو خود زمانے سے پہلے اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ ایک مرتبہ تغیر کو قبول کر لینے

کے بعد پھر کیا وہ کسی جائز تغیر کو قبول کر لینے کے لئے تیار ہیں یا نہیں؟

زمانہ ثبات وتغیر کا نام ہے:

حضرات! آج کا عنوان ہے''اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں''اس کے دو جز ہیں ایک تو ''اسلام'' اور ایک ''تغیر پذیر دنیا'' میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں کے بارے میں اپنے ناچیز خیالات پیش کروں اور ہم آپ ایک کھلی ہوئی فضا میں کھلے ہوئے دماغوں کے ساتھ اس پر غور کریں۔

زمانہ اپنی تغیر پذیری اور زیادہ صحیح الفاظ میں اپنی تغیر پرستی یا اقبال کے الفاظ میں ''تازہ پسندی'' کے لئے بدنام زیادہ ہے اور بدکم ہے، بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زمانہ تغیر پذیری ہی کا نام ہے، اس میں کوئی ٹھہراؤ نہیں، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، زمانہ ثبات اور تغیر کے متوازن، مرکب اور مجموعے کا نام ہے۔

جب کبھی اس کا تناسب بگڑ جائے گا، یعنی ٹھہراؤ تغیر پر غالب آجائے گا یا تغیر ٹھہراؤ پر غالب آجائے گا تو زمانے، سوسائٹی اور تہذیب کا قوام بگڑ جائے گا، ان دونوں کے تناسب کا معاملہ کیمیاوی اجزاء کے تناسب سے بھی کہیں زیادہ نازک ہے، زمانہ جہاں تغیر کی صلاحیت رکھتا ہے، اور اس کو بدلنا چاہئے اس لئے کہ بدلنا زندگی کی کوئی کمزوری، کمی یا عیب نہیں، وہ زندگی کی عین مزاج ہے، اور زندگی کی تعریف ہے۔

ہردم رواں، ہردم دواں، ہردم جواں ہے زندگی

وہ زندگی، زندگی کہلانے کی مستحق نہیں جس میں نمو کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہو، وہ درخت شاداب اور پرثمر نہیں کہلایا جاسکتا جو اپنی نمو کی صلاحیت کھودے۔

تغیر پذیری یا اس کے بجائے اگر آپ اس کو نمو یا ترقی کا نام دیں تو میرے خیال میں آپ اس کے ساتھ زیادہ انصاف کریں گے۔

زمانہ تغیر قبول کرنے کے ساتھ مقابلے کی بھی ایک طاقت رکھتا ہے، ہم یہ تو دیکھتے ہیں کہ زمانہ کتنا بدل گیا اور اس تبدیلی کے مظاہر بھی ہم کو صاف نظر آتے ہیں لیکن زمانے نے اپنی اندرونی صلاحیتوں کو باقی رکھنے اور اپنے صالح اجزاء وعناصر کو محفوظ رکھنے کے لئے کتنی کشمکش کی اور کس قوت مقابلہ سے کام لیا، عام حالات میں ہم اس کو نہیں دیکھ پاتے اس کے لئے

ایکجا ص طرح کی خوردبین کی ضرورت ہے۔

ایک دریا ہی کو آپ لیں جو روانی اور حرکت کے لئے سب سے بہتر مثال ہوسکتا ہے، دریا کی کوئی موج اپنی پہلی موج کی بالکل عین اور مماثل موج کی بالکل عین اور مماثل نہیں ہوتی، لیکن دریا اپنی گذرتی ہوئی موجوں کے باوجود، اپنے نام کے ساتھ، اپنے حدود کے ساتھ، اپنی بہت سی خصوصیات کے ساتھ ہزاروں برس سے قائم ہے، دجلہ وفرات آج بھی دجلہ وفرات کہلائیں گے، اور گنگ وجمن آج بھی گنگ وجمن کہلاتے ہیں۔

زمانے کے اندر ٹھہراؤ بھی ہے، اور بہاؤ بھی، اگر زمانہ ان دونوں خصوصیتوں اور صلاحیتوں میں سے کسی ایک سے محروم ہو جائے تو وہ اپنی افادیت کھودے گا۔

اسی طرح کائنات میں جتنے بھی وجود، شخصیتیں اور ہستیاں ہیں، سب کے اندر مثبت اور منفی لہریں برابر اپنا کام کرتی رہتی ہیں ان دونوں لہروں کے ملنے سے وہ فریضہ ادا ہوتا ہے، اور وہ منصب پورا ہوتا ہے جو ان کے سپرد کیا گیا ہے۔

مذہب زندگی کا نگراں ہے:

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، مذہب کے ایک پیرو اور طالب علم کی حیثیت سے میں مذہب کے لئے یہ پوزیشن قبول نہیں کرسکتا اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات بھی مذہب کے لئے یہ پوزیشن نہیں پسند کریں گے کہ مذہب ہر تغیر کا ساتھ دے یہ کسی تھرمامیٹر کی تعریف تو ہوسکتی ہے کہ وہ:۔

درجۂ حرارت وبرودت بتلائے یہ مرغ بادنما (WEATHER COCK) کی بھی تعریف ہوسکتی ہے جو کسی ہوائی اڈے یا اونچی عمارت پر لگایا گیا ہے صرف یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہوا کس طرف کی چل رہی ہے، لیکن مذہب کی تعریف نہیں ہوسکتی، میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا کہ مذہب کو اس کے بلند مقام سے اتار کر تھرمامیٹر یا مرغ بادنما کا مقام دینا چاہتا ہو کہ مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ صرف زمانے کی تبدیلیوں کی رسید دیتا رہے، اکنالج۔ (ACKNOWLEDGE) کرتا ہے یا اس کی عکاسی کرتا رہے، صحیح آسمانی مذہب کے تو کیا کسی نام نہاد مذہب کے پیرو یا اس کے نمائندے بھی اس پوزیشن کو قبول کرلینے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔

مذہب تغیر کو ایک حقیقت مانتا ہے، اور اس کے لئے وہ ساری گنجائش رکھتا ہے، جو ایک صالح، صحیح، فطری اور جائز تغیر کے لئے ضروری ہوں، مذہب زندگی کا ساتھ دیتا ہے، لیکن یہ محض ساتھ دینا یا محض رفاقت اور پیروی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مذہب کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ اس کا فرق کرے کہ یہ صالح تغیر ہے، اور یہ غیر صالح تغیر ہے، یہ تخریبی رجحان ہے، اور یہ تعمیری رجحان ہے، اس کا نتیجہ انسانیت کے حق میں یا کم سے کم اس مذہب کے پیروؤں کے حق میں کیا ہوگا؟ مذہب جہاں رواں دواں زندگی کا ساتھ دینے والا ہے، وہاں وہ زندگی کا محتسب، نگراں، گارجین (GUARDIAN) اور زندگی کا اتالیق بھی ہے۔

گارجین کا کام یہ نہیں ہے کہ جو ہستی اس کی اتالیقی میں ہے، اس کے ہر صحیح غلط رجحان کا ساتھ دے اور اس پر مہر تصدیق ثبت کرے، مذہب ایسا سسٹم نہیں ہے کہ جہاں ایک ہی قسم کی مہر رکھی ہوئی ہے، ایک ہی طرح کی روشنائی ہے، اور ایک ہی طرح کا ہاتھ ہے، جو دستاویز اور تحریر آئے مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس پر مہر تصدیق ثبت کردے۔

مذہب پہلے اس کا جائزہ لے گا، پھر اس پر اپنا فیصلہ صادر کرے گا، اور ترغیب کے اور بعض اوقات مجبوراً ترہیب کے ذریعہ اس سے اسے باز رکھنے کی کوشش کرے گا اور اگر کوئی ایسی غلط دستاویز اس کے سامنے آئی ہے، جس سے اس کو اتفاق نہیں یا جس کو وہ انسانیت کے حق میں مہلک اور تباہ کن سمجھتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے سے انکار کرے گا، بلکہ اس کی بھی کوشش کرے گا کہ وہ اس کی راہ میں مزاحم ہو۔

یہاں اخلاقیات اور مذہب میں ایک فرق پیدا ہو جاتا ہے، مزہب اپنی ذمہ داری اور فرض سمجھتا ہے کہ غلط رجحان کو روکے، ماہر اخلاقیات ونفسیات کی ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ وہ غلط رجحانات کی نشاندہی کردے، یا اپنا نقطۂ نظر ظاہر کردے، لیکن مذہب اس کی کوشش کرے گا کہ وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جائے۔

مذہب کی تاریخ کی بعض آزمائشیں:

مذہب کی تاریخ میں ہمیں بعض وقفے نظر آتے ہیں، جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب اور زندگی کا ساتھ چھوٹ گیا ہے، وہاں مذہب سے زیادہ پیروان مذہب اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں، جو مزہب کے اعلیٰ اصول، عملی زندگی میں جاری اور ساری کرنے میں کوتاہی برتتے ہیں، یہ

مذہب کی کوتاہی نہیں کہ وہ زندگی کا ساتھ نہیں دیتا، یہ پیروان مذہب کی کوتاہی ہے کہ وہ اپنی سستی اور کوتاہی سے زندگی کے قافلے سے بچھڑ جاتے ہیں، لیکن مذہب اور پیروان مذہب کا ایسا مستحکم رشتہ اور نازک تعلق ہے کہ ان دونوں کے درمیان بہت کم نگاہیں فرق کرسکتی ہیں کہ یہ کوتاہی مذہب کی ہے، یا پیروان مذہب کی، تاہم ایک عظیم ادارے اور ایک عظیم تحریک کے علمبردار حقیقت پسندانہ، ناقدانہ اور مذہبی، علمی اور گروہی عصبیتوں سے علیحدہ ہوکر تاریخ کا بے لاگ اور غیر جانبدارانہ جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اسلام بحیثیت دینی اور آسمانی تعلیمات کے اس کا ذمہ دار نہیں تھا، اور اس کے اندر کوئی ایسا نقص موجود نہیں تھا، جو اس کو زندگی کا ساتھ دینے اور اس کے مسائل حل کرنے سے باز رکھے۔

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب:

انسانوں کی پرانی کمزوری ہے کہ اپنی ذمہ داری دوسروں پر ڈال دیتے ہیں، جب بہت سے مسلمانوں سے قرآن مجید کی روشنی میں مسائل حاضرہ کے حل کرنے اور اپنی محنت وذہانت سے قرآن مجید کے رہنما ابدی اصولوں اور بدلتی ہوئی زندگی کے درمیان مطابقت پیدا کرنے میں کوتاہی ہوتی ہے تو وہ اپنے قصور کا اقرار کرنے کے بجائے قرآن مجید پر زندگی کے ساتھ نہ دے سکنے کا الزام لگاتے ہیں، یا مخالفین کو یہ تاثیر دیتے ہیں کہ قرآن مجید معاذ اللہ ناقص ہے، اس لئے کہ وہ ان کی ہر خواہش اور ہر ضرورت کے لئے سند جواز مہیا نہیں کرتا، علامہ اقبال نے اسی حقیقت کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

بعض لوگ اس سے ایک قدم آگے بڑھا کر خود قرآن مجید کو اپنی خواہشات اور اپنی کمزوریوں اور بے اصولیوں کا تابع بنانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اس کی ایسی تفسیر کرنے لگتے ہیں جس سے ان کی غلط زندگیوں کا جواز نکلے، وہ اپنے کو قرآن مجید کے سانچہ میں ڈھالنے کے بجائے قرآن مجید کو اپنے فکر وعمل کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش شروع کردیتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مقدمہ تفسیر میں اپنے مخصوص ادیبانہ اور بلیغ انداز میں اس صداقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

''انہوں نے جب دیکھا کہ وہ قرآن مجید کی بلندیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تو انہوں نے اس کو اس کی بلندیوں سے نیچے اتارنے کی کوشش کی تا کہ وہ ان کی پستیوں کا ساتھ دے سکے۔

باصلاحیت افراد کی کمی:

وہ سارے وقفے جس میں ہمیں مذہبی حلقے پر جمود طاہر نظر آتا ہے یا پیروان مذہب کی زندگی میں الجھنیں پیدا ہوگئی ہیں، یہ ان باکمال شخصیتوں کے فقدان یا کمی کا دور ہے، جو زمانے کے چیلنج کو قبول کر کے مذہب کی مؤثر نمائندگی کرتے ہیں، اسلامی تاریخ کے جس دور میں بھی مذہب کی بہتر نمائندگی ہوئی اسلام اور شریعت اسلامی پر معاشرے میں کبھی بھی بے اعتمادی نہیں پیدا ہوئی، اسلمای تاریخ کے مختلف ادوار میں ہمیں زمانے کی سطح سے بلند ایسی شخصیتیں نظر آتی ہیں، جنہوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیت اور عبقری (Genius) شخصیت سے اپنے دور کے فتنوں کا سدباب، اپنے زمانے کے پیدا شدہ نئے مسائل کے حل اور مذہب کی طاقتور نمائندگی کا فریضہ نہایت کامیابی سے انجام دیا، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اس دور میں پیدا ہوئے، جب ان کی ضرورت دین اور زمانے کو تھی، انہوں نے اسلامی شریعت وقانون کو منقح شکل میں پیش کر کے اسلامی سلطنت کی وسعت اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کیا، بعد کے دور میں امام ابوالحسن اشعریؒ اور امام غزالیؒ جیسے عالی دماغ افراد آئے اور انہوں نے ان خطرات اور فتنوں کا مقابلہ کیا جو ان کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔

آسان اور پر پیچ:

حضرات! اگر آپ غور فرمائیں تو بات بہت آسان اور قابل فہم ہے، لیکن اگر صرف منطقی اور فلسفیانہ نقطہ نظر سے مسئلہ سمجھنا چاہیں تو اچھا خاصہ معمہ بن سکتا ہے، بات بہت سادہ ہے، اور بہت آسان ہے اور بہت مشکل اور پر پیچ بھی ہے، سادہ اس طرح ہے کہ پہلے آپ زمانے کی حقیقت کو سمجھ لیں کہ زمانہ اس طرح تغیر پذیر نہیں کہ اس کی سرعت کا نہ نظام اخلاقیات ساتھ دے سکتا ہے، اور نہ کوئی نظام فکر، زمانے کی حقیقت ہم سمجھیں اور زمانے کا جو اصل مقام ہے اس کے ادارک کی کوشش کریں اور اس کے ساتھ ہم اسلام کو سمجھیں اور اس کا گہرا مطالعہ کر کے دیکھیں کہ قرآن مجید میں رہنمائی کے کیسے ابدی اصول دیئے گئے ہیں، اس میں زندگی کے تغیر کا

کتنا اعتراف کیا گیا ہے، اور عقل وفہم سے کام لینے کی کیسی دعوت دی گئی ہے؟ ہم دیکھیں کہ ابتدائی دور کے مسلمانوں نے جن کو پہلی مرتبہ نئی تہذیبوں اور فلسفوں کا سامنا کرنا پڑا تھا کس خوبی سے اپنی ذمہ داری پوری کی۔

عہد جدید کا ساتھ دینا کیا معنی، میں اس کو اسلام کی پوزیشن سے فروتر بات سمجھتا ہوں، اسلام تو عہد جدید کی رہنمائی کرسکتا ہے، اور اس کو راہ راست پر بھی لگا سکتا ہے۔

عہد جدید خودکشی پر آمادہ:

حضرات! مگر آپ یہ بھی دیکھیں کہ عہد جدید کس مہلک غار کی طرف جارہا ہے؟ کس طرح خودکشی پر آمادہ ہے؟ اور انسانیت کے لئے پیام موت بن رہا ہے؟ نسل انسانی کی افادیت کے خلاف خدا کی عدالت میں ثبوت پیش کررہا ہے کہ انسان کو زندہ رہنے کا حق نہیں؟ کیسے کیسے تخریبی رجحانات اس میں کام کررہے ہیں؟ اسلام اپنے ان اصولوں کے ذریعہ جو قرآن مجید میں مذکور ہیں، خواہ وہ اخلاقی ہوں یا تمدنی، خواہ افراد کے باہمی رشتوں سے تعلق رکھتے ہوں یا ان کی خارجی زندگی سے، ان اصلوں کی ذریعے عہد جدید کے نہ صرف جائز تقاضوں کو پورا کرسکتا ہے بلکہ عصر جدید کو اس تباہی سے بھی بچا سکتا ہے، جو تلور کی طرح اس کے سر پر لٹک رہی ہے۔

اب مسئلہ عصر جدید کا ساتھ دینے اور نہ دینے کا نہیں رہا اب تو عصر جدید کے بچانے کا مسئلہ سامنے آیا ہے، اب تو عہد جدید کی بات کرنے والوں، عصر جدید کے قصیدہ خوانوں، عہد جید کی دہائی دینے والوں اور عہد جدید کے نام پر ایسے سیمینار بلانے والوں کا ہے کہ وہ بھی رہیں گے یا نہیں رہیں گے؟ اس نقار خانے میں ان کی آواز بھی سنی جائے گی، جہاں صرف پیٹ اور نفس امارہ کی پرستش ہورہی ہو؟ آج دنیا میں اور خود ہمارے ملک میں دو ہی حقیقتیں زندہ نظر آتی ہیں، ایک دولت، دوسری قوت، کیا ایسے زمانے میں کسی سنجیدہ علمی حقیقت پر غور کیا جاسکے گا؟ اور کیا انسان اس موڈ میں ہوں گے کہ کوئی سنجیدہ بات ان سے کہی جاسکے؟ یہاں تو صرف ایک نعرہ ہوگا کہ بہتی ہوئی گنگا ہے اپنا اپنا ہاتھ دھولو اور اپنی اپنی جھولوی بھرلو، کوئی اخلاقی حدود، کوئی بلند معیار، کوئی انسانی خیرخواہی کی بات اور تہذیب کو بچانے کا مسئلہ قابل فہم نہیں رہے گا، لوگ اس موڈ ہی میں نہیں ہوں گے۔

اب تو اسلام کے بجائے عہد جدید کو بچانے کا مسئلہ زیادہ اہم ہے، آپ اس عہد جدید کی خبر لیجئے جو اتنا بدمست ہو چکا ہے کہ کوئی سنجیدہ بات سننا نہیں چاہتا، آپ اسلام کی طرف سے اطمینان رکھئے وہ ہر عہد اور تمام جائز تقاضوں کو تسلیم کرتا ہے، اس سے زیادہ انصاف پسند کوئی نظام نہیں، جب بھی کوئی مظلوم آواز یا انسانی فریاد بلند ہوئی تو اسلام نے اس کی طرف توجہ کی، اس نے ہمیشہ عقل انسانی کو سرگرم کار رہنے کی دعوت دی، علی گڑھ یونیورسٹی اور عربی مدارس کے لئے چھٹی ہے، جمعہ کی ہو یا اتوار کی چھٹی، لیکن عقل انسانی اور عقل ایمانی کو کبھی چھٹی نہیں، اس نے کہا کہ اہلک علم کے لئے سب سے زیادہ قربانی کی ضرورت ہے، اور سخت معیار زندگی گزارنے کے لئے اپنے کو تیار رکھنا چاہئے۔

غلط تشریح سے غلط فہمیاں:

بہت سی غلط فہمیاں غلط تشریح سے پیدا ہوتی ہیں، حضرت علیؓ مرتضی کرم اللہ وجہہ کا یہ کتنا حکیمانہ مقولہ ہے " كلموا الناس على قدر عقولهم اتريدون ان يكذب الله ورسوله ." "لوگوں کی عقل کے مطابق بات کرو، دینی حقائق کو اس انداز میں پیش کرو کہ ذہن اس کو قبول کرے، یہ مسئلہ صرف الفاظ کا نہیں بلکہ اسلوب، طرز فکر اور طریقہ بیان کا بھی ہے، اس کے بعد فرمایا: کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کی تکذیب کی جائے، خدا اور رسول ﷺ کی تکذیب اس لئے نہیں کی جارہی ہے کہ خدا اور رسول کی باتیں زمانے کے حقائق کے خلاف ہیں، بلکہ اس لئے کہ جارہی ہیں کہ ان کو دل نشین اور قابل فہم طریقہ پر پیش نہیں کیا جاتا ہے۔

اسلام تغیر پذیر دنیا میں اپنا مقام رکھتا ہے، یہ مقام کوئی ایسا نہیں کہ وہ آپ سے رحم کی درخواست کرے کہ اس کو باقی رہنے دیا جائے، بلکہ زندگی اسی کی نگرانی و رہنمائی میں صحیح راستے پر چل سکتی ہے۔

مذہب اور تہذیب:

اس موقع پر ذہن میں تہذیب کا تصور آتا ہے، یہ ایک مغربی تخیل ہے، بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک گزشتہ تہذیب کا نام ہے، اسلام پر لکھنے والے مصنفین LEGACY

OF ISLAM کا عنوان دیتے ہیں، اسلام ایک تہذیب ضرور رکھتا ہے، لیکن وہ محض ایک گذشتہ تذیب کا نام نہیں ہے، تہذیب کے لئے ہم جانتے ہیں کہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہزار برس پہلے کی تہذیب یا پانچ سو برس پہلے کی تہذیب کا اس بدلی ہوئی دنیا میں کوئی جواز ہے، لیکن مذہب صرف اخلاقی قدروں، محض کسی معاشرت، رہن سہن کے طریقے، تہذیب اور فن تعمیر کا نام نہیں، وہ تو غیبی حقائق، ایمانی عقائد اور ایمانیات کا مسئلہ ہے، وہ عبد و معبود کے باہمی رشتے اور زندگی گزارنے کے ابدی آسمانی اصولوں کا نام ہے۔

اگر اسلام کا یہ دائرہ ہے تو اسلام کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے کہ سانچے بدل جائیں گے تو وہ ان سانچوں میں فٹ ہوسکتا ہے یا نہیں، مغربی مصنفین خلط مبحث کرتے ہیں، زندگی چاہے کتنی ہی بدل جائے ان ابدی حقائق وعقائد کے لئے جگہ اور گنجائش ہے، اور پوری زندگی اس کے سائے کے نیچے آنی چاہئے اگر نہ آئے گی تو پھر اس زندگی اور سوسائٹی کے اندر ساری وہ خرابیاں پیدا ہوں گی جو ہم آج مغربی تمدن میں دیکھ رہے ہیں، اور اس کا کوئی حل وہاں کے بڑے سے بڑے مفکروں کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضرورت تبلیغ

۲۸ جون ۱۹۶۹ء بعد نماز عصر شیفلڈ (انگلستان) کے ایک چیدہ مجمع میں کی گئی یادگار تقریر۔

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذبالله من شرور انفسنا ومن سيّئات اعمالنا من يهد الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا الله ونشهد ان محمد اعبده ورسوله الذى ارسله الله تعالى بالحق بشيرا ونذيرا وداعيا الى الله باذنه وسراجامنيرا

اعوذ بالله من الشيطن الرجيم

بسم الله الرحمن الرحيم

وانفقوا فى سبيل الله ولا تلقوا بايديكم الى التهلكة.

میرے بھائیوں اور دوستو! میں نے آپ کے سامنے ابھی سورۂ بقرہ کی ایک آیت پڑھی ہے اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو، اور نیکی کرو، بے شک اللہ تعالیٰ اچھی طرح نیکی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ یہ آیت جس کا ٹکڑا بہت سے مسلمانوں کو یاد ہوگا، بہت جگہ اس سے صحیح اور غلط طریقہ پر کام بھی لیا جاتا ہے۔

اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔ اس آیت کی صحیح تفسیر اور اس کے نازل ہونے کا موقعہ اور اس کی اصل مراد اس واقعہ سے معلوم ہوگی جو میں آپ کو سنانے والا ہوں۔

ایک جلیل القدر صحابی سیدنا ابوایوب انصاریؓ:

ایک مرتبہ مسلمانوں کی ایک فوج جس میں صحابہ کرام بھی تھے، قسطنطنیہ (استنبول) کا محاصرہ کر رہی تھی، وہ قسطنطنیہ جو اس وقت خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں کے قبضہ میں ہے۔ مگر اس وقت اس کا فتح ہونا مقدر نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کو کسی اور زمانے میں، کسی اور سے یہ کام لینا تھا

اور اسے اسلام کے قبضے میں آنا تھا اس وقت اس فوج میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ تھے۔ انہیں میں سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے، جن کو صحابیت کے شرف اور دوسرے بڑے بڑے کمالات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی دولت سے بھی نوازا تھا۔ جس پر قیامت تک مسلمانوں کو رشک آئے گا اور رشک آنا چاہیے تھا یعنی کہ جو ساری دنیا کا میزبان تھا۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا کی ضیافت کرنے، اور اللہ کے خوان نعمت سے فائدہ اٹھانے کے لئے مبعوث فرمایا تھا، ان کے میزبان ہونے کا شرف اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابوایوب انصاریؓ کو عطا فرمایا یعنی میزبان عالم ان کا مہمان رہا ہے۔ یہ ایسی فضیلت تھی کہ صحابہ کرامؓ اس کا پاس رکھتے تھے۔ اور ان کو رشک اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کی ہر بات بڑی توجہ سے سنی جاتی تھی اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کے میزبان ہونے کا مطلب یہی نہیں ہے کہ انہوں نے آپ ﷺ کی ضیافت کی، اور آپ کی میزبانی کا شرف حاصل کیا بلکہ اس کا مطلب یہی ہے کہ ان کو سب سے پہلے زیادہ قرب کا موقعہ ملا۔ اس لئے اسلام کی روح سمجھنے اور اللہ تعالیٰ کے کلام کا منشاء سمجھنے کا ان کو وہ حق بھی تھا جو ہر مسلمان کو ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ ان کو رسول اللہ ﷺ کی طویل صحبت بھی حاصل ہوئی تھی۔ اسی لئے ذات نبوی ﷺ سے مناسبت اور قربت نے ان کی مومنانہ فراست اور ایمانی ذہانت کو جلا بخشی تھی اور انہوں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے، حضرت ابوایوب انصاریؓ بھی اس جہاد میں بہ نفس نفیس شریک تھے۔

دوران جہاد ایک آدمی کا غلط تفسیر بیان کرنا:

اسی دوران کہ محاصرہ جاری تھا اور بڑے گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی، یہ دیکھ کر ایک صحابیؓ سر بکف صف سے نکلے اور صفوں کو چیرتے پھاڑتے آخری صف تک جہاں عام طور پر فوج کو لڑانے والے ہوا کرتے ہیں، وہاں تک پہنچ جاتے پھر اسی طریقے سے صفوں کو درہم برہم کرتے ہوئے، واپس ہوتے، جیسے کوئی مشاق کھلاڑی اپنے کمالات دکھاتا ہے۔ اسی طرح وہ دور تک دشمنوں کی فوج میں پہنچ جاتے اور پھر چلے آتے دیر تک یہ منظر رہا۔ مسلمانوں کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ یہ کام تو صریحاً قرآن مجید کے حکم کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

ولا تلقو بایدیکم الی التھلکة.

یعنی تم اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یعنی جان بوجھ کر ایسا کام نہ کرو جس سے جان

جاتی ہو اور یہ تو ایک طرح کی خودکشی ہوئی، یہ شخص اس طرح کی خودکشی کر رہا ہے اکیلا آدمی اس طرح دشمنوں کے نرغے میں گھس جاتا ہے۔ گویا کہ دشمنوں کے سمندر میں چھلانگ لگاتا ہے۔ یہ اس کو مناسب نہیں، یہ کام جائز نہیں۔

سدینا ابوایوب انصاریؓ کا، صحیح تفسیر کی طرف متوجہ کرنا:

سیدنا ابوایوب انصاریؓ نے اس پر فرمایا کہ دوستو! اس آیت کی تفسیر ہم سے پوچھو، یہ تو ہمارے گھر کی آیت ہے۔ یہ ان آیتوں میں ہے، جس کا تعلق خاص طور پر حضرات انصارؓ سے ہے، صحابہ کرامؓ متوجہ ہو گئے، اور تمام مسلمان ہمہ تن گوش بن کر کھڑے ہو گئے کہ دیکھیں رسول اللہ ﷺ کے میزبان جلیل القدر صحابیؓ قرآن کا بہت علم رکھنے والے اس آیت کی کیا تفسیر بیان کرتے ہیں؟

صحابہ کرامؓ کی دینی جدوجہد اور اس کے نتائج:

انہوں نے فرمایا کہ اصل میں یہ آیت اس موقعہ پر نازل ہوئی کہ جب اسلام مدینہ پہنچا اور لوگ گھر کو چھوڑ کر اور سب سے آنکھیں بند کر کے دین کے کام میں ہمہ تن لگ گئے۔ کیسا باغ؟ کہاں کی کھیتی؟ کیسی دکان؟ کیسا مکان؟ کیسی اولاد؟ سب کچھ دین پر قربان تھا، اور ساری پونجی اس پر نثار تھی، بالکل ایک سرفروشی کی حالت تھی جو اسلام کی خدمت کے لئے سب پر چھائی تھی، کسی کو اپنے گھربار کا ہوش نہ تھا۔ اس ایثار و قربانی کا اس ظاہری دنیا میں جو قدرتی نتیجہ ہوا کرتا ہے، اور جو قانون خداوندی اور قانون تکوینی ہے، وہ ہوا۔ ہماری تجارت کے دیوالیے نکل گئے، ہمارے باغات ویران ہو گئے، ہماری کھیتیاں برباد ہو گئیں غرض یہ ہے کہ ہمارے کاروبار اس سے متاثر ہوئے لیکن اسلام گھر گھر پھیلنے لگا، اور جیسے نور پھیلتا ہے، اور بارش ہوتی ہے، اسی طرح اسلام مدینہ میں پھیلنے لگا۔ اب پہلی سی حالت نہ رہی۔ یعنی اتنا تو ابھی نہیں ہوا کہ سارا مدینہ مسلمان ہو جائے، لیکن ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہو گئے۔ بہتیرے دولت ایمان سے مالا مال اور سینکڑوں اس باران رحمت سے نہال ہو گئے۔

دینی جدوجہد کے دوران صرف چھٹی کا تصور:

اس وقت ہمارے دل میں یہ خیال آیا کہ پہلے کی طرح اب اسلام کو اس درجہ ہماری خدمات کی، ہمارے کل اوقات کی، اور ہمارے بالکل تن من دھن سے اس کی خدمت میں لگ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ احکام حالات کے ساتھ بدلتے ہیں۔ اس وقت یہ حکم تھا کہ کوئی اپنی گھر نہ بیٹھے، کوئی اپنی جان کو، اپنے، مال کو اور اپنی اولاد کو اسلام سے زیادہ عزیز نہ سمجھے۔ اور جب ضرورت تھی تو ہم سب کچھ چھوڑ کر اسلام کی خدمت کے لئے کود پڑے تھے، اللہ نے ہم کو توفیق دی اور ہم نے ایسا کیا۔ لیکن اب وہ پہلے کی حالت نہیں ہے۔ اب خدا کے فضل وکرم سے مسلمانوں کی تعداد میں بہت بڑا اضافہ ہوگیا ہے۔ اب اسلام کے خدمت گزار اور اس کے سپاہی اور اس کے مبلغ بہت ہیں۔ اس لئے اگر ہم تھوڑے دن کی چھٹی لے لیں تو کیا حرج ہے؟ چھٹی کا قانون تو ہر نظام میں ہوتا ہے۔

بدرجہ ضرورت عارضی چھٹی کا خیال:

یہ بات تو ان حضرات کے ذہن میں وسوسہ کے درجہ میں بھی نہیں آسکتی تھی اور یہ خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ ہم اپنے آپ کو مستقل طور پر سبکدوش کرالیں۔ کہ حضور ﷺ! اب اسلام کی خدمت کرنے والے بہت ہو گئے ہیں۔ ہم کو آپ چھٹی دے دیجئے تاکہ ہم اپنے گھر جا کر بیٹھیں، اتنے دن ہم نے کام کیا۔ اب دوسرے کام کریں، یہ بات تو ان حضرات کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی، صرف اتنا ہی خیال ہوا تھا کہ وقتی طور پر محض عارضی طور پر کچھ چھٹی لے لیں، آدمی محاذ جنگ سے چھٹی لیا کرتا ہے، اس کو گھر واپس کیا جاتا ہے۔ اسی طریقہ سے ہسپتالوں سے بھی چھٹی دی جاتی ہے۔ اور ایسے بہت نازک کام ہیں جہاں کوئی وقت آجاتا ہے کہ آدمی چھٹی لیتا ہے تاکہ ذرا تازہ دم ہو جائے، آرام کرے اور اپنے گھر کے ضروری کام انجام دے آئے۔

چھٹی لینے کا انجام یعنی دوز بردست نقصان:

حضرت ابو ایوب انصاریؓ فرماتے ہیں کہ ہمارے دل میں صرف یہ خیال آیا کہ ہم

تھوڑے دن کے لئے چھٹی لے لیں، بس اس خیال کا آنا تھا کہ یہ آیت نازل ہوئی کہ کیا یہ خطرناک زہریلا خیال تمہارے دل میں آیا؟ کیا یہ شیطانی وسوسہ تمہارے دل میں آیا؟ تم اللہ کے کام سے چھٹی لینا چاہتے ہو۔ جانتے ہو کہ اس کا کیا انجام ہوگا؟ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کا نتیجہ تم سمجھ رہے ہو وہ نہیں ہے بلکہ تم جو کچھ سمجھ رہے وہ وہ تو ہو جائے گا، یعنی کھیتیاں سرسبز ہو جائیں گی، اور یہ چھوٹی چھوٹی پونجی کی دکانیں جس میں کمی نہ ہو، کسی میں پانچ سو کا سامان ہے ، برائے نام معمولی سا کاروبار اس میں تمہیں کامیابی ہو جائے گی۔

تمہاری دکانیں جو بالکل بیٹھ گئی ہیں، جس میں خاک اڑنے لگی ہے، وہاں دو چار گاہک نظر آنے لگیں گے، اس میں روزانہ دس بیس درہم کی آمدنی شروع ہو جائے گی۔ تمہارے باغ جو بالکل سوکھ گئے ہیں اس کو پانی دو گے تو وہ ہرے بھرے ہو جائیں گے۔ لیکن اس کے دو نتیجے نکلیں گے ایک کا تعلق تمہاری ذات سے ہے، اور دوسرے کا تعلق پوری کائنات سے ہے، جہاں تک تمہاری ذات کے تعلق کا سوال ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا نام خدا کے یہاں خدمت گزاروں کی فہرست سے کٹ جائے گا اور تم بھی انہیں قوموں میں شمار کئے جانے لگو گے جن کی قسمت پر مہر لگادی گئی ہے، اور جن کو جانوروں کی فہرست میں لکھ دیا گیا ہے کہ ان کا کام گائے بیل گھوڑے کی طرح کھانا، کمانا اور پیٹ بھرنا ہے اور اس کے بعد حشرات الارض کی طرح زندگی گزار کر دنیا سے چلے جانا ہے۔

آج تمہارا نام رسول اللہ ﷺ کی سپاہیوں، ساتھیوں اور جاں نثاروں اور انسانیت کو سرسبز کرنے والوں میں لکھا ہوا ہے، دنیا کے معماروں میں، نیز دنیا میں دوبارہ بہار لانے کے لئے کوشش کرنے والوں میں لکھا ہوا ہے تمہارے لئے حیات نو اور دنیا کی حیات بخشی مقدر ہے کہ تمہارے ہاتھوں پر یہ دنیا جو کہ محض ایک قمار خانہ، محض ایک جانوروں کا اصطبل، محض انسانوں کا قبرستان بن کر رہ گئی ہے جہاں نا ؤنوش ہر وقت پینے پلانے اور کھانے کمانے کے سوا کوئی آواز بھی نہیں آتی، اس دنیا کو دوبارہ زندہ کرنا مقدر ہے اس فہرست سے تمہارا نام نکل جائے گا، اور یہ دنیا جو اللہ سے بچھڑ گئی تھی، خدا کو بھول گئی تھی، آج پھر تمہارے ذریعہ سے خدا کی چوکھٹ پر سر جھکانے لگی ہے اور جن کے نام باغیوں میں لکھے ہوئے تھے۔ ان کا شمار اولیاء اللہ میں، عارفوں میں، عبادت گزاروں میں اور علماء ربانیین میں، دنیا کے نجات دہندہ لوگوں کی فہرست

میں لکھے جانے والے ہیں ۔ یہ فیصلہ بدل جائے گا۔ اگر تم کاروبار میں لگنا چاہتے ہو تو پہلا نقصان تو اپنا کرو گے کہ اس قدسی اور نورانی فہرست سے کٹ کر محض اپنے لئے جینے مرنے والوں میں تمہارا نام لکھ دیا جائے گا۔

دوسرا نتیجہ جو اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے، وہ یہ ہے کہ دنیا کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو فلاح کا دروازہ کھولا ہے۔ اور یہ کہ دربار ہدایت کا دروازہ کھولا ہے، اور اس دنیا کے متعلق اب اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا یہ جو فیصلہ ہے کہ یہ دنیا دوبارہ خدا کو پہچاننے، دوبارہ خدا کے راستے پر چلے، دوبارہ خدائے واحد کی بندگی کرے، اور پھر اس دنیا میں آنے والے انسان کو اپنا حقیقی مقام معلوم ہو اور انسان کو اپنی زندگی کا مقصد معلوم ہو، یہ دروازہ بند ہو جائے گا۔

بلندیٔ ہمت و نظر یہ سب کچھ دینی جدوجہد کا ثمرہ ہے:

ہم چوپائے درندے نہیں اور ہم فرشتے بھی نہیں ہیں بلکہ ہم انسان ہیں۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اپنی ضروریات زندگی کو بقدرِ ضرورت مہیا کر کے ہم اللہ تعالیٰ کے کام میں لگیں، اللہ کے دین کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلائیں۔ اللہ کے پیغام کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچائیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کر سکے تو نقصان یہ ہوگا کہ پورا یہ عالم انسانی اور یہ پوری کائنات اس فیض سے محروم رہے گی۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو جو نعمت عطا فرمانا چاہتا ہے، اس نعمت کو روک لے گا۔ لہٰذا اس فیض سے محرومی ہلاکت ہے، تمہارے حق میں بھی اور دوسروں کے حق میں بھی، تم دین کو چھوڑ کر اس شاخ پر تیشہ چلاؤ گے، جس پر تمہارا آشیانہ ہے۔ تم تو دنیا میں کسی شمار وقطار میں نہیں تھے، اور معلوم نہیں تم کتنی بیماریوں کے شکار ہو سکتے تھے کتنے دشمنوں کے لقمہ اجل بن سکتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ہر موقع پر بچایا، اور اپنے نبی ﷺ کی صحبت کے لئے منتخب فرمایا، اور تمہیں ایسی طاقتیں عطا فرمائیں جو دوسروں کو نہیں ملیں، اور تم میں ایک نیا حوصلہ عطا فرمایا، تمہارے دست وبازو کو نئی طاقت عطا فرمائی، تمہاری ہمتوں کو بلند کیا، اور نگاہوں کو روشن کیا، یہ سب اس اسلام کے طفیل تھا۔

شان نزول کی مختصر تفصیل:

اب اگر تم اسلام کی خدمت سے ہاتھ اٹھاتے ہو، تو اپنا بھی نقصان کرو گے، اپنے حق میں

خودکشی اور دنیا کے حق میں بہت بڑی ہلاکت اور خسارے کا سامان کرو گے، دنیا ایک رخ پر جاتے جاتے فوراً دوسرے رخ پر پڑ جائے گی۔ ابھی اس کا رخ ضلالت سے ہدایت کی طرف، شقاوت سے سعادت کی طرف، ظلمت سے نور کی طرف، جہالت سے علم کی طرف پڑا ہے اور پڑا بھی کہاں ہے، پڑنے کی امید پیدا ہوئی ہے۔ لیکن اگر تم اسلام کی خدمت سے ہاتھ اٹھا کر اپنے پیٹ کی سیوا میں، اپنے اپنے بچوں کی پرورش میں اپنے گھر والوں کی خدمت میں لگ جاؤ، اور گویا تم اللہ کی عبادت سے ہٹ کر اپنے نفس کی عبادت میں لگ جاؤ گے تو پھر دنیا پر خیر کا یہ دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ یہ ہے تفصیل ان حالات کی جن میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تھی۔

اس آیت کے معنی وسیع اور اس کے نتائج دور رس ہیں۔ یہ آیت کسی ایک انسان کی انفرادی خودکشی کے بارے میں نہیں اتری ہے، کسی ایک فرد کی ہلاکت میں پڑنے کے متعلق نہیں ہے، بلکہ یہ ایک بہت بڑے اہم موقع پر نازل ہوئی تھی، جس کا تعلق پوری نوع انسانی اور اس کے مستقبل سے ہے یعنی وہ لوگ جو دنیا میں ہدایت کا کام کر سکتے ہیں، جس کی وجہ سے دنیا کو نئے حقائق کی طرف توجہ ہو سکتی ہے، نئی منزل کی طرف توجہ ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے، جن کے ذریعہ انسان اپنی موجودہ زندگی پر پشیمان ہو کر سوچتا ہے کہ "ہائے! میں کیا زندگی گزار رہا ہوں، یہ تو جانوروں کی، چڑیوں کی اور چوپایوں کی زندگی ہے۔ کھانا پینا اور بستر پر دراز ہو کر سو رہنا اور پھر اٹھ کر بیل، گھوڑے کی طرح اس کام میں جٹ جانا یہ کوئی انسانی زندگی ہے؟ جو جماعت انسانوں کو چونکائے، اس کی دعوت سے اس کے عمل اور کردار کی تاثیر سے اور اس کی تبلیغی سرگرمیوں کی وجہ سے لوگوں کے دماغوں پر چوٹ پڑے، لوگوں کے دماغوں پر یہ ضرب لگے کہ نہیں نہیں، یہ زندگی نہیں ہے۔ اگر اس عمل سے فرار اختیار کر لے تو دنیا والوں کو کون سنبھالا دے سکتا ہے؟ کون ہوگا جو دنیا والوں کو بلند حقیقت کی طرف متوجہ کرے گا اور ان سے کہے گا کہ اے انسانو! یہ کیا زندگی ہے؟ عمدہ سے عمدہ پہننا اور آراستہ ہو کر نکلنا زندگی ہے تو یہ مردوں کی زندگی ہے، اگر خوش آواز اور خوش آہنگی زندگی کا حاصل ہے تو بلبل میں تم سے زیادہ زندگی ہے۔ اگر دوسروں کا پیٹ کاٹ کر کے، دوسروں کا خون پی کر کے زندگی گزارنا آدمیت اور مقصد زندگی ہے تو یہ تو شیروں کی زندگی ہے، اور تیندوے تم سے زیادہ زندگی اور راز آدمیت سے واقف ہیں۔

میرے دوستو! اگر ایک شخص ہتھیلی پر سر رکھ کر میدان جنگ میں کودتا ہے تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ زندہ سلامت بچ کر آ جاتا ہے، حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑھ کر کس نے اپنے آپ کو جان جوکھوں میں ڈالا ہوگا۔ خالد سیف اللہ سے بڑھ کر کون موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑا ہوگا۔ اور ہمیشہ موت کو ہنسی کھیل سمجھا ہوگا، بتائیے! اسلام کی تاریخ میں، جانبازی کی تاریخ میں، سرفروشی کی تاریخ میں خالدؓ کا جب انتقال ہونے لگا اور بستر پر طبعی موت آنے لگی تو کہنے لگے کہ میری زندگی میں کوئی ایسا موقع نہیں آیا کہ جہاں موت کا امکان ہو، اور میں نے وہاں اپنے آپ کو پیش نہ کیا ہو، لیکن خدا کی شان کہ آج میں بستر پر مر رہا ہوں۔

فلانا ھت اعین الجبنا، فلانا ھت اعین الجبنا، فلا ناھت اعین الجبنا۔

خدا کرے بزدلوں کی آنکھ چھوئے نہیں، بزدلوں کی نیند نصیب نہ ہو اس لئے کہ مجھ سے بڑھ کر اپنی جان ہلاکت میں ڈالنے والا اور شہادت کی تلاش میں نکلنے والا اور کون ہوگا؟ لیکن خدا آج دکھا رہا ہے کہ میں بیماری کے بستر پر مر رہا ہوں، اور جو لوگ موت سے بھاگتے تھے کتنے دنیا سے رخصت ہو گئے؟ اور وہ اپنے تمام اندازوں کے خلاف اور تمام تیاریوں کے خلاف موت کا نشانہ بنگئے۔

دوستو! خودکشی یہ نہیں ہے کہ آدمی کسی وقت اپنی جان پر کھیل کر کسی وقت اپنے کاروبار کو خطرے میں ڈال دے، کسی وقت دوراندیشوں اور ہوشیار لوگوں کے مشورے کی خلاف ورزی کرے جب لوگ اس کو اس طرح کے مشورے دیں کہ بھائی یہ وقت کاروبار ملتوی کرنے کا نہیں ہے، یہ وقت دکان چھوڑ کر جانے کا نہیں ہے، اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے تو وہ ان لوگوں کے مشورے کے خلاف چل پڑے۔ جو لوگ کسی وقت آنکھوں پر پٹی باندھ لیتے ہیں۔ یا دیکھی ان دیکھی کر دیتے ہیں، وہ خودکشی نہیں کرتے ہیں۔ خودکشی وہ کرتا ہے جو اپنا مقصد زندگی فراموش کر کے اپنے نفس کی پرستش میں لگ جاتا ہے۔ ایک مسلمان فرد، ایک مسلمان جماعت کے لئے خودکشی یہ ہے کہ اپنا حقیقی مقصد بھول کر، اور جو کام اللہ نے اس کو سپرد کیا ہے، ان کو فراموش کر دے، اور یہ بھول جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس دنیا میں ایک اہم فرض کی دائیگی کے لئے مبعوث کیا ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف تنھون عن المنکر

وتومنون باللہ .

یعنی تم اس کام کے لئے محض اسی مقصد کے لئے دنیا میں بھیجے گئے ہو، لہذا اگر تم اس کام کو بالائے طارق رکھ دو اور کاروبار میں سر سے پاؤں تک ڈوب جاؤ، اور خالص کاروباری انسان بن جاؤ، بزنس مین بن جاؤ، اور تمہاری سب سے بری تعریف یہ ہو کہ تمہارے بارے میں یہ کہا جائے کہ فلاں تو بڑا کاروباری ہے کوئی مسلمان فرد، کوئی مسلمان گروہ اگر خالص کاروباری حیثیت اختیار کر لے کہ میں کاروباری ہوں، میرا کاروبار مقدم ہے، پیٹ مقدم ہے، دنیا کے تقاضے مقدم ہیں، گھر والوں کے مطالبے مقدم ہیں، گھر والوں کی ضرورتیں مقدم ہیں، اسی کو قرآن مجید ''خودکشی'' کہتا ہے قرآن اس کو ''خودکشی'' نہیں کہتا جس میں موت موہوم ہو اس کو خودکشی کہتا ہے جس میں حقیقی موت ہو، یقینی خودکشی وہ نہیں جس میں موت کا امکان ہے۔ خودکسی وہ ہے جس میں موت یقینی ہے۔ حقیقی خودکشی وہ نہیں جس میں یہ عارضی جسم ہلاک ہو جائے، بیمار ہو جائے، تکلیف اٹھائے جس کو ایک دن مرنا ہے، جس کی حیات عارضی ہے خودکشی وہ ہے، جس میں اس روح کو تکلیف ہو جائے جس کو موت نہیں۔ خودکشی وہ ہے جس میں وہ مقصد فوت ہو جائے جو سرمایہ تھا، جو اثاثہ تھا، جو پونجی لے کر نکلے تھے وہ ڈوب جائے، یہ ہے کاروباری ذہنیت کے خلاف اور پونجی سلامت رہے اور آج کا نفع نہ ملے یہ کاروباری ذنیت کے خلاف اور پونجی سلامت رہی اور آج کا نفع نہ ملے یہ کاروباری ذہنت کے خلاف نہیں، حقیقی کاروبار وہ ہے جو اپنی پونجی سلامت رکھ کر نئے نئے تجربے کرے۔ خودکشی یہ ہے کہ آدمی دعوت کا کام نہ کرے آدمی اسلامی زندگی اختیار کرنے کے لئے نہ نکلے۔ اور دین کے لئے ہجرت نہ کرے جب نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی اس کے بعد بہت سے لوگ بلکہ بہت سے صحابیؓ بیٹھے رہ گئے، کمزور تھے، اور بہت سے کمزور نہیں تھے، مگر انہوں نے وقت کی نزاکت کو محسوس نہیں کیا اور ہجرت نہیں کی، اور بہت سے وہ تھے جنہوں نے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ یا بعد میں مدینہ طیبہ کی ہجرت کی انہوں نے کیا فتوحات حاصل کیں، اور مراتب حاصل کئے، وہ ان سے کہیں زیادہ تھیں جنہوں نے ہجرت نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

والسبقون الا ولون من المهجرين والانصار والذين اتبعوهم باحسان رضى الله عنهم ورضوا عنه.

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئک اعظم درجة من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا۔

وہ جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے خرچ کیا، اور اللہ کی راہ میں جان کی بازیاں لگائیں، اور جنہوں نے بعد میں جان کی بازی لگائی، برابر نہیں ہو سکتے۔

خودکشی کیا ہے:

غرض یہ ہے کہ حقیقی خودکشی یہ ہے کہ انسان اپنے حقیقی فائدے سے اپنی آنکھیں بند کر لے، اور اپنے حقیقی فائدے کو خطرے میں ڈالے۔ فائدے کو یقینی طور پر خطرے میں ڈال دینا، اور ہمیشہ کے لئے تلف کر دینا، اور ہمیشہ کے لئے اس سے محروم ہو جانا یقینی خودکشی ہے اور اپنے کو واقعی نقصان پہنچانا ہے۔

حکمت روح:

اب میں آپ حضرات سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آیئے۔ ہم اور آپ موجودہ حالات کا جائزہ لیں۔ جہاں اس وقت ہم بیٹھے ہوئے ہیں، یہ یورپ کی سرزمین ہے، جہاں اللہ تعالیٰ نے محض اتفاقیہ طور پر نہیں بلکہ اپنی حکمت بالغہ کے تحت ہم کو پہنچا دیا ہے، حالات کچھ بھی ہوں، اسباب کچھ بھی ہوں وہ اسباب سیاسی ہوں یا اقتصادی، اس کا تعلق ہندوستان کے ملک سے نکل جانے سے ہو یا یورپ کے عام حالات سے ہو، بہر حال اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی اور بہت بڑی رحمت بھی تھی کہ اس کے کلمہ گو انسانوں کو، محمد رسول اللہ ﷺ کے دامن سے وابستہ انسانوں کو اگر چہ ہزار خرابیاں ان کے اندر تھیں، ہزار نقائص تھے، میں نے مانا کہ وہ صفائی میں کم، سلیقے میں کم، وہ مستعدی میں کم، وہ حسن و جمال میں کم، وہ ذہانت میں کم، اور اس سے بھی زیادہ جو بھی نقائص اور کمی ہو سکتی ہے وہ میں ماننے کے لئے تیار ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک امتیاز، ایک جوہر ان کو ایسا عطا فرمایا جس سے یورپ کی یہ گوری قومیں، جنہوں نے دنیا میں ڈیڑھ سو، دو سو برس تک اپنی حکومتوں کا ڈنکا بجایا ہے، اور جس کا مشرق و مغرب میں طوطی بولا ہے، اور جنہوں نے فضاؤں میں اڑ کر اور پانی پر چل کر دکھایا ہے اور جو چاند پر قدم جمانا چاہتے ہیں، لیکن ان کا دامن

جس گوہر نایاب سے خالی ہے وہ کیا ہے؟ وہ ایمان کا جوہر ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کی نسبت کا جوہر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ حضرات کو اس سرزمین پر پہنچایا ہے۔ اب میں آپ کو صاف کہتا ہوں کہ آپ کے لئے خودکشی کیا ہے؟ اور آپ کا اپنے اوپر احسان کیا ہے؟ ان دونوں باتوں کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ بس آج کی بات یہی ہے اور سارے فیصلے کا انحصار بھی اسی پر ہے۔ آپ کے لئے تباہی کا راستہ کیا ہے، اور آپ کے لئے سرسبزی اور فروغ کا راستہ کیا ہے؟ آپ کے لئے تنزل کا راستہ کیا ہے، آپ کے لئے ہلاکت اور خطرے کا راستہ کیا ہے، اور آپ کی حفاظت وضمانت کا راستہ کیا ہے؟ یہ مجھ سے سنیئے۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس ملک میں بھیجا ہے۔ اگر آپ یہاں صرف کاروبار میں مصروف رہے، آپ کی ساری ذہانت اور محبت اور ساری تگ ودو اسی پر صرف ہوتی رہی کہ ہم نے یہاں آکر کیا کمایا، ہم وہاں سے لے کر کیا آئے تھے اور اب یہاں ہم کس حیثیت کے آدمی ہو گئے، ہماری پوزیشن کیسی ہوگئی ہم نے بینک میں کیا جمع کیا۔ ہم نے اپنے ملک میں کیا بھیجا، وہاں دیہات میں کچا مکان چھوڑ کر آئے تھے وہ پکی حویلی بن گئی یا نہیں، ہم نے اپنے بچوں کو یہاں تعلیم یافتہ بنایا، ان کو کسی کاروبار میں لگایا یا نہیں؟ ہم نے اگر اپنے آپ کو اس پیمانہ پر تولا تو یاد رکھئے، یہ ایک اجتماعی اور عمومی خودکشی ہوگی، ایک فرد کی خودکشی ہوتی ہے اور ایک قوم کی خودکشی، فرد کی خودکشی فرد کے لئے ہوتی ہے اور قوم کی خودکشی، فرد کی خودکشی سے خطرناک ہوتی ہے۔ اور قوم کی خودکشی پوری باعث ہلاکت ہوتی ہے، جس کے لئے اس کائنات میں کوئی جگہ نہیں۔ یوں تو لوگ غلطیاں کرتے ہیں، اپنی موت بھی مرجاتے ہیں، زہر بھی پی لیتے ہیں، سمندر میں چھلانگ بھی لگا دیتے ہیں چھتوں پر سے کود بھی جاتے ہیں اس لئے دنیا کے لیل ونہار میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن جب کوئی قوم خودکشی پر آمادہ ہوجاتی ہے، اور فیصلہ کر لیتی ہے کہ ہمیں صحیح راستہ چھوڑنا ہے۔ ہمیں ظلم وزیادتی کا، گناہوں اور سرکشی کا راستہ اختیار کرنا ہے، ہمیں اپنے لئے کانٹے بونے ہیں، تو پھر اس پر رحم کھانے والا کوئی نہیں ہوتا اور اس کی کوئی جگہ نہیں ہوتی، نہ اس پر آسمان روتا ہے اور نہ زمین آنسو بہاتی ہے۔

میرے دوستو! آپ کے لئے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ تو یہ ہے کہ آپ خالص

کاروباری رہیں۔ اور صبح سے شام تک اسی فکر میں رہیں۔ کل میں مسجد میں عصر و مغرب کے درمیان بیٹھا ہوا تھا، میرے کانوں مسلمان آوازیں آرہی تھیں۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ ہم اس حالت میں آئے تھے۔ وہ پورا اپنے کاروبار کی داستان سناتے رہے۔ یہ چھوٹا سا نمونہ تھا جو میرے سامنے ایک مسجد میں جمعہ کے دن عصر و مغرب کے درمیان میں پیش آیا۔ تو جب ہمارا زیادہ سے زیادہ وقت جو دعا کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے، جو انوار الٰہی کے برسنے اور ملاء اعلیٰ کے متوجہ ہونے کا وقت ہوتا ہے، اس میں جب ہمارا موضوع یہ ہو تو مسجد سے باہر کیا ہوتا ہوگا؟ اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں، اگر انگریز پانچ منٹ محنت کرتا ہے تو ہم ساتھ دن محنت کر لیں گے۔ اگر انگریز انسان کی طرح محنت کرتا ہے تو ہم گھوڑے کی طرح محنت کریں گے۔ اگر انگریز کھاتا پیتا اور تفریح کرتا ہے ہم تفریح کو اپنے ملک میں چھوڑ آئے ہیں، اکٹھا تفریح کر لیں گے۔ اگر انگریز صحت کا خیال رکھتا ہے تو ہمیں صحت سے کیا غرض؟ پیسہ اصل چیز ہے۔ اگر انگریز سلیقے سے کماتا ہے تو کمانے کا مزہ بھی اٹھاتا ہے، تو ہمیں اس سے مطلب نہیں، ہمیں تو بس پیسہ چاہئے۔ ہمیں تو یہ ہے کہ کتنے دن میں کتنی دولت کمائی۔

میرے دوستو! اگر یہ آپ کی ذہنیت ہے تو آپ اس ملک پر دھبہ ہیں، اور اس سے بڑھ کر آپ اسلام پر دھبہ ہیں اس لئے کہ آپ اسلام کے لئے دروازہ ہیں فرض کیجئے میں چھوٹی سی مثال آپ کو دیتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ خدانخواستہ یہاں مسلمان نہ آتے، اور خالص کاروباری اور پیٹ پالنے والی زندگی کا نمونہ پیش کرتے اور مسلمانوں کے مکانات کے بارے میں ان کے جو تاثرات ہیں وہ نہ ہوتے، اور یہاں اسلام کی عمدہ عمدہ کتابیں پہنچتیں، اور اسلام کی تبلیغ ہوتی، اور کوئی اللہ کا بندہ موثر طریقے پہ انگریزی زبان میں قرآن شریف اور سیرت نبوی ﷺ کو پیش کرتا تو ہوسکتا ہے کہ انگریز کہتا کہ جس پاک نبی ﷺ کی یہ سیرت ہے، معلوم نہیں ان کی امت کا کیا حال ہوگا؟ کیسے اس کے اخلاق ہوں گے؟ کیا اس کی زندگی ہوگی؟ وہ تو بس مقدس انسان ہوں گے؟ اور وہ تو دنیا سے بالاتر انسان ہوں گے، اور وہ ہر چیز میں نمونہ ہوں گے۔ آئیڈیل اور معیاری ہوں گے، اور ان کی ہر چیز سیرت نبوی ﷺ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نکلتی ہوگی۔ کیسے صاف ستھرے لوگ ہوں گے۔ کیسے فرض شناس لوگ ہوں گے۔ کیسے صادق الوعدہ اور صادق القول ہوں گے، ان کی زندگی میں کتنا اعتدال ہوگا؟ کتنا حقوق اللہ اور حقوق

العباد کا خیال ہوگا؟ غرض بہت اونچا تصور ہوتا۔ ہوسکتا ہے یہاں سے انگریز جاتے اور مسلمانوں کی زندگی کا مطالعہ کرتے، کسی اچھے ماحول میں پہنچ جاتے، یا نہ پہنچتے، خود قرآن سے متاثر ہوکر اسلام قبول کرتے۔ لیکن اب بتائیے! ہم نے اگر اسلامی زندگی کا اچھا نمونہ پیش نہ کیا اور ہم نے اسلام کو صحیح رنگ میں پیش نہ کیا، اور اسلام کا کام نہ کیا، اور ہم نے اس میں یہ نمونہ اور نظیر نہ قائم کی، کہ مسلمان کے لئے ہدایت کی کوشش اور اللہ کو پالینے کی کوشش مقدم ہے۔ اس کے بعد ان کی دوسری کوششیں ہیں۔ پہلے ہدایت پانا اور دنیا کو ہدایت دینا، ہدایت سے آشنا کرنا، اس کے بعد کھانا، بیوی بچے اور گھر بار اور وطن ہے۔ اگر ہم نے یہ نمونہ پیش نہ کیا، تو بتائیے کہ ہم نے اپنی ذات پر اور انسانیت پر ظلم کیا یا نہیں؟

اب آپ حضرات یہاں ہیں۔ آپ کے لئے میں اس کو خودکشی کہوں گا۔ اس کے بعد آپ مجھے معاف کریں، میں ایسا بھیانک لفظ بول رہا ہوں کہ جس کے تصور سے بھی مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں ''حرام موت''؟ کون حرام موت کے لئے تیار ہوتا ہے؟ ہزار ہا پھانسی کے تختے پر چڑھ جانا، ہزار بار تکلیف میں ایڑیاں رگڑ کر مرنا خودکشی سے بہتر ہے۔ میں بار بار خودکشی کہہ رہا ہوں، کیا میرا ذوق اس کو قبول کرتا ہے؟ کیا یہ اچھا معلوم ہوتا ہے؟ مگر کیا کروں قرآن شریف کا خود ارشاد ہے۔ **ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکة** اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔ اسی کا نام خودکشی ہے۔ خودکشی کے معنی خود اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خود موت کا سامان اختیار کرنا یہی قرآن شریف کہہ رہا ہے۔

لہٰذا اگر آپ یہاں سے اس طرح رہے جیسے غیر مسلم رہتے یا جیتے رہتے ہیں، سمیٹنے اور عیش کی فکر رہتی ہے اور اس طرح رہے کہ اصل تو کاروبار اور دولت ہے، ۲۴ گھنٹے فرصت نہیں، ہر لمحہ اسی کا استغراق یعنی نفع اندوزی کا استغراق، تجارت کا استغراق، اس میں آپ مدہوش رہے، آپ کو اپنی زندگی بنانے کی فرصت نہیں، آپ کو اللہ کے اور شریعت کے احکام معلوم کرنے کی فرصت نہیں، حلال وحرام کا فرق معلوم کرنے کی فرصت نہیں، اللہ کے اچھے بندوں کے پاس بیٹھنے کی فرصت نہیں، اس طرف رخ کرنے کی فکر نہیں، جہاں دین کا بازار لگا ہوا ہے۔ جیسے ہندوستان، پاکستان اور ممالک اسلامیہ کے دینی مراکز وہاں جانے کی اور وہاں سے اپنی اصلاح کراکے آنے کی، اور دین کے سبق سیکھنے کی فرصت نہیں۔ بھائیو! یہ خودکشی ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ

کی طرف سے کوئی ضمانت نہیں، اس ملک میں کل کیا ہوگا۔ کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا؟ میں بہت ڈرتا ہوں کہ کوئی بدفالی، بدشگونی کی بات کروں۔ میری دلی تمنا ہے کہ اس ملک میں جتنے مسلمان ہیں وہ عزت وحفاظت کے ساتھ رہیں اور مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ برابر جاری رہے۔ یہاں تک کہ یہاں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی آبادی قائم ہو جائے۔ میں اس کی دل سے دعا کرتا ہوں اور یہاں آکر بہت خوش ہو رہا ہوں کہ دیکھئے ان گھروں میں پہلے کیا ہوتا تھا۔ اس عمارت میں پہلے کس کا نام لیا جاتا تھا۔ آج اس میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔

میں ابھی خطبہ مسنونہ پڑھ رہا تھا۔ اور دل باغ باغ ہو رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت مجھے بھی دی ہے مگر آج سے بیس سال پہلے کوئی میرا نام لے کر کہتا ہے کہ ایک وقت آئے گا تو انگلستان جا کر گرجے میں محمد رسول اللہ ﷺ کا نام لے گا اور کہے گا "اشہدان محمداً عبدہ ورسولہ" ۔رسولہ سے بھی چوٹ پڑتی ہے مسیحیت پر، وہ بھی کہیں میدان میں نہیں، کسی اسٹیج پر نہیں بی بی سی ریڈیو پر نہیں، بلکہ خاص گرجے میں جاکر اشہدان محمداً عبدہ ورسولہ کی صدا بلند کرو گے تو بھائی مجھے یقین نہ آتا، اب دیکھئے یہ جماعت کی برکت ہے، یہ تھوڑے سے دینی کام ہونے کی برکت ہے کہ آج گرجے اللہ کی عبادت کے مرکز بن رہے ہیں۔ توحید کا یہ چوتھا گرجا ہوگا جس میں خطبہ مسنونہ پڑھنے اور اللہ کا پیغام پہنچانے کی توفیق ہو رہی ہے۔

دوستو! آپ کی حفاظت کا راستہ صرف یہ ہے کہ آپ یہاں اللہ کا نام بلند کریں، اللہ کا نام بلند کرنے کے لئے ہندوستان وپاکستان میں مسلمانوں کو جتنی کوشش کرنی پڑ رہی ہے، اس سے زیادہ آپ کو کوشش کرنی پڑے گی، جب آپ محفوظ رہ سکیں گے، اس لئے کہ وہاں تو اسلام خدا کے فضل وکرم سے ایک ہزار برس گزار چکا ہے، وہاں پر اسلام کا ستون نصب ہے، وہاں تو اسلام کی جڑیں پاتال تک پہنچ چکی ہیں، وہاں تو مسجدوں کے مینارے اور مدرسوں کے گنبد آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ وہاں تو قال اللہ اور قال الرسول ﷺ سے فضائیں گونج رہی ہیں وہاں تو انشاء اللہ اسلام محفوظ ہے۔ لیکن آج یہاں اسلام تازہ تازہ آیا ہی اور آپ کے ذریعہ سے آرہا ہے۔ یہاں کی فضا آپ کی ذریعہ سے کلمہ توحید اور کلمہ شہادت سے آشنا ہو رہی ہے۔ اگر تم سے چوک ہوئی اور تم نے کاروبار میں زیادہ وقت لگایا اور تم نے اصل مقصد کو فوت کر دیا تو اس کی سزا تمہیں بھگتنی پڑے گی اور ضمنی طور پر اس ملک کو بھی اٹھانی پڑے گی اور پھر سارے

مسلمان، بلکہ ساری دنیا کا یہ نقصان ہوگا کہ اسلام کی ہدایت کا دروازہ یہاں کھلتے کھلتے بند ہوگیا اور آپ کے کاروبار کی حفاظت اس میں ہے کہ آپ یہاں اپنی صلاحیت ثابت کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنی اہلیت ثابت کریں۔

اس موقع پر آپ کو خاص واقعہ یاد دلاتا ہوں۔ میدان بدر میں جب رسول للہ ﷺ نے دیکھ لیا کہ جہاں تک ہتھیاروں کا تعلق ہے، قوت بازو کا تعلق ہے، مسلمانوں کی فتح کا کوئی امکان نہیں بلکہ مسلمانوں کی شکست یقینی اور کفار کی فتح یقینی ہے حضور ﷺ کی نگاہ تو کیا، معمولی جرنیل، اور فوجی افسر بھی فوجی طاقت کا اندازہ کرلیتا ہے پھر رسول اللہ ﷺ کہ جن کا سینہ اللہ نے کھول دیا تھا۔ الم نشرح لک صدر ک۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ سلیم الفطرت اور سلیم الذہن پیدا کیا تھا آپ کو کیسے اس بات میں شبہ ہوسکتا ہے۔ فوراً آپ کی بصیرت نے دیکھ لیا، اور نگاہ نبوت نے سمجھ لیا کہ ظاہری آثار کیا ہیں پھر آپ نے کیا کیا؟ آپ ﷺ زمین پر سر رکھ کر سجدے میں پڑ گئے اور فرمانے لگے: اے اللہ! میں اس چھوٹی سی مٹھی بھر جماعت کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا، یہ کیا کرے گی، اس کے پاس ہے ہی کیا، یہ نہتھی، بے دست و پا جماعت، یہ کنگال جماعت جو گھر میں بھی اپنے بچوں اور گھر والوں کے لئے خالی چولھے چھوڑ کر آئی ہے، جس کے پاس تلوار نہیں، تلوار ہے تو نیام نہیں۔ جس کے پاس دو گھوڑے ہیں اور چند اونٹ، میں کس منہ سے کہوں کہ یہ فتح کی مستحق ہے؟ لیکن ایک بات کہتا ہوں، انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے جب تک رہیں گے توحید کی منادی کرتے رہیں گے، اب تجھے اختیار ہے کہ ان کو ختم کر کے اس کا دروازہ بند کردے اس کا امکان ختم کردے، یا اس کو باقی رکھ کر اس کا سلسلہ باقی رکھ۔

اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لم تعبد فی الارض قط

اے اللہ! اگر تو اس مٹھی بھر جماعت کو ہلاکت کردے گا تو تیری پرستش نہیں ہوگی یہ معمولی آدمی کے کہنے کی بات تھوڑی تھی، اس کے لئے تو حضور ﷺ کا کا اعتماد چاہئے تھا اور اس قوم کی صلاحیت بھی چاہئے تھی کہ اس کے اخلاص کے متعلق پورا اطمینان تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یہ اس کی پوری تصدیق کریں گے اے اللہ! اگر تو اس مٹھی بھر جماعت کی ہلاکت کا فیصلہ کرتا ہے کہ ان بھیڑیوں کے دانتوں میں ان کے سر اور منہ ہوں تو میں کچھ نہیں کہتا، صرف ایک بات کہتا

ہوں کہ پھر تیری حقیقی عبادت دنیا میں نہیں ہوگی اس لئے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو اس کا فیصلہ کر کے آئے ہیں۔

قیامت تک کی ضمانت:

پھر کیا ہوا؟ میدان بدر میں ہر قسم کے قرائن، آثار اور توقعات، اندازے اور حسابات کے خلاف مسلمانوں کو فتح ہوئی، اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے ضمانت لی، قیامت تک قائم رہنے والی ضمانت، کہ اگر یہ رہتے ہیں تو تیرا ہی کام کرتے رہیں گے اور جب اللہ نے فتح دی تو گویا یہ بات مان لی گئی کہ یہ جب تک رہیں گے اللہ ہی کا کام کریں گے۔

ہدایت ونور نبوت سے محروم سرزمین:

دوستو! یہاں یورپ میں بھی تم یہ فیصلہ کرتے ہو کہ زندگی کا اچھا نمونہ پیش کرو گے، یہاں تبلیغ کے لئے وقت نکالو گے اس قسم کی ہدایت کے لئے اور اپنی سرگرمی سے، اپنی فکر اور دھن سے، تو انشاءاللہ اس ملک میں اسلام کو مضبوط کرو گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاروبار کی حفاظت کرے گا، تمہارا مستقبل محفوظ اور یقینی ہے اور اگر یہ نہیں ہے تو بھائیو! ایسے کاروبار میں تو ہندوستان کے مارواڑی اور پاکستان کی بہت سی برادریاں تم سے بڑھی ہوئی ہیں پھر تمہاری کیا خصوصیت ہے؟ یہاں تم نے کون سا ایسا تیر مار دیا ہے اور ایسے چار چاند لگا دیئے ہیں، یہاں تو تمہارے جو کچھ خصوصیت ہے، قابلیت ہے وہ یہ کہ تم اس ملک میں جس کی زمین ہدایت کے لئے پیاسی ہے جس کے آسمان ہدایت کے لئے پیاسے ہیں، جس کی فضائیں اذانوں کے لئے پیاسی ہے جس کے آسمان ہدایت کے لئے پیاسے ہیں، جس کی فضائیں اذانوں کے لئے پیاسی ہیں وہاں پر تم یہ عہد کرو کہ ہم انشاءاللہ یہاں اسلام کو پھیلائیں گے، چمکائیں گے، اپنی زندگی سے بھی، اپنی تبلیغی سرگرمیوں سے بھی اور انشاءاللہ یہاں سچے پکے مسلمان بن کر اسلام کا جھنڈا بلند کریں گے۔

فرصت کو غنیمت جانئے:

دوستو! مجھے یہ کہنا ہے کہ اللہ کے لئے وقت نکالنے میں پس وپیش نہ کیجئے اس لئے کہ اسی

میں تمہاری اور تمہارے مال اور مستقبل کی حفاظت ہے ۔ ورنہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے **فلا یا من مکر اللہ الا القوم الخاسرون**، خدا کی مخفی تدبیروں کو کوئی نہیں جانتا اور جن کی قسمت میں نقصان اٹھانا لکھا ہے وہی اللہ کی مخفی تدبیروں سے کالے لوگوں کو نکالیں، خدا جانے کون سا مسئلہ کھڑا ہو جائے اس وقت تم دیکھتے رہ جاؤ گے اور جہاز بھر بھر کر تم کو بھیج دیا جائے گا۔

آثار سے مآل کا اندازہ کیجئے:

آج دل تمہاری طرف ہیں تمہارا خیر مقدم کر رہے ہیں تمہاری ضرورت محسوس کر رہے ہیں، کل تمہارے خلاف باغی ہو جائیں گے اور اس کے آثار شروع ہو گئے ہیں، جب اللہ تعالیٰ تنبیہ کرنا چاہتے ہیں تو ایسے موقع پر ایسے آدمیوں کو کھڑا کر دیتے ہیں جو تمہاری دشمنی کا نعرہ لگاتے ہیں تا کہ تمہاری آنکھیں کھل جائیں کہ افق پر دیکھ لو کہ کیا ہونے والا ہے؟ بادل اٹھ رہے ہیں، بجلی چمک رہی ہے، پانی برسنے والا ہے اپنی چھتوں کو ٹھیک کر لو، برسات کا موسم آ گیا ہے۔

بار نہیں ابر باراں بنو:

میرے یورپ کی دوستو! برسات کا موسم آ گیا ہے، اپنی چھتوں کے سوراخوں کو بند کر لو، برسات میں تمہیں موقع نہیں ملے گا، ہر ملک کی ایک برسات ہوتی ہے، برما کی برسات آ گئی، یورپ کی برسات آنے سے پہلے پہلے تیاری کر لو اور یہاں اپنا استحقاق اور اللہ کے یہاں اپنی صلاحیت ثابت کر دو کہ تم رہو گے تو اسلام رہے گا انشاء اللہ اللہ تعالیٰ تمہیں محفوظ رکھے گا، اور رخ ایسا نکلے گا کہ یہ بھی دیکھتے رہ جائیں گے اور یہی تمہاری خوشامد کریں گے کہ تم رہو" القلب بین اصبعی الرحمٰن" انسان کا دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہے اس لئے دل کو بدلتے دیر نہیں لگتی دل کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا سامان کرو اور وہ سامان یہ ہے کہ اپنی افادیت ثابت کرو۔ اپنی افادیت سے تم مفید ہو، اس سرزمین پر بار نہیں ہو، تم اس سرزمین پر اللہ کی رحمت ہو، پھر ان شاء اللہ کوئی خطرے کی بات نہیں۔

یہ میں نے بہت دنوں تک کی بات کہہ دی، عمل کرنا تمہارا کام ہی، میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں بھی اور مجھے بھی ان لمحات سے نفع پہنچائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نیا ایمان

۲۶ نومبر ۱۹۵۱ء کو بمقام لکھنؤ مفکر اسلام مولانا علی میاں نے ایک تبلیغی جلسہ میں یہ اہم تقریر کی تھی جس میں عوام وخواص کی ایک جم غفیر موجود تھی

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذبا لله من شرور انفسنا ومن سيّئات اعمالنا من يهد الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا الله ونشهد ان محمد اعبده ورسوله الذى ارسله الله تعالى بالحق بشيرا ونذيرا وداعيا الى الله باذنه وسراجامنيرا .

بھائیو اور بزرگو! آپ حضرات کو اس تعداد میں دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا جی چاہتا ہے، کہ دین کی آواز پر اپنے کاموں کو چھوڑ کر آپ یہاں تشریف لائے، اور سب سے بڑا احساس یہ ہوتا ہے کہ ایمانی دعوت میں اب بھی یہ طاقت ہے کہ دور دراز کے بھائیوں کو ایک جگہ جمع کر سکتی ہے، جی چاہتا ہے کہ ایمان کی قوت اس سے زیادہ بڑھے اور ہمارے اندر از سر نو ایمانی زندگی پیدا ہو۔

دین اور ایمان میں فرق:

دوستو! ایک چیز ہے دین، اور ایک ہے ایمان، ان دونوں میں ایک فرق ہے دین تو وہ نظام ہے جس کو لے کر تمام انبیاء آتے رہے، اور جس کا آخری پیغام رسول اللہ (ﷺ) لے کر تشریف لائے، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ اس دین کو مکمل فرمایا:۔

اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتى ورضيت لكم الا سلام ديناً.

دین تو یقیناً مکمل ہو چکا، اب اس میں جو کوئی ترمیم اور اضافہ کرنا چاہے وہ دجال، کاذب اور مفتری ہے لیکن دوسری چیز ہے اس دین پر یقین کرنا اور اس دین کی حقیقتوں پر ایمان لانا،

دین پر تو بے شک مہر لگ چکی ہے، اس میں کسی اضافہ کی دعوت نہیں دی جاسکتی، اس میں سے جس طرح کچھ گھٹایا نہیں جاسکتا، بڑھایا بھی نہیں جاسکتا، لیکن ایمان کا معاملہ یہ نہیں ہے، اس میں زیادہ سے زیادہ ترقی کی گنجائش ہے، اس لئے ایمان میں تازگی اور زیادتی کی دعوت قیامت تک جاری رہے گی، بلکہ ضروری ہے کہ دین پر اپنے ایمان ویقین کو مضبوط کرنے، اس کو اپنی زندگی بنائے، اور ہر چیز کو اس پر قربان کرنے اور اس کو کسی چیز کے عوض ہاتھ سے نہ دینے کی کوشش برابر جاری رہے۔ اس امت کی ہر نسل، ہر حصے، اور ہر دور کو اس دین پر نیا ایمان لانا اور از سر نو دین کو سمجھنا ضروری ہے۔

مشاہدے اور تجربے سے زیادہ نبی کی خبر پر یقین:

دوستو! اور بزرگو! آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت بھی دین کی بعض حصے موجود تھے، نماز وحج وغیرہ کسی نہ کسی جگہ اور کسی نہ کسی حالت میں پائے جاتے تھے، دین کا وجود بالکل ختم نہیں ہو چکا تھا، قدیم مذاہب وادیان کی بہت سی شکلیں اور صورتیں موجود تھیں، لیکن جو چیز کھو گئی تھی وہ یہ تھی کہ دین میں کوئی طاقت باقی نہیں رہی تھی۔ ان لوگوں کا ان حقیقتوں پر تو ایمان ویقین تھا کہ سانپ کا زہر قاتل ہے، ہوا زندگی کے لئے ضروری ہے، کھانے سے پیٹ بھرتا ہے، اسی طرح زندگی کے بہت سے تجرباتی حقائق پر وہ دل سے یقین رکھتے لیکن اس پر ایمان نہیں تھا کہ دوزخ کی آگ کیسی خطرناک ہے، اور جنت کا آرام اور اس کی راحتیں کیسی قابل رشک ہیں۔ ان کا ایمان نہیں تھا کہ اللہ کو ناراض کر کے وہ دنیا کی فلاح نہیں پا سکتے۔ دراں حالانکہ ان کا نوکر ان کی نافرمانی کر کے ان کے گھر میں نہیں رہ سکتا تھا، ان کا ایمان نہیں کہ گناہ وظلم سے بستیاں اور ملک تباہ ہو سکتے ہیں، وہ جتنا ایک طبیب کی باتوں پر اعتماد رکھتے تھے رسول کی باتوں پر اتنا بھی اعتماد نہیں تھا، اس کا سبب یہ تھا کہ ان کا تعلق دین اور دوسری زندگی سے مردہ ہو چکا تھا، اور انہیں اس سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی، صرف دنیا کی زندگی اور اس کی دیکھ بھال اور آزمائی ہوئی حقیقتیں ان پر چھائی ہوئی تھیں۔

دوستو! کچھ ایسا ہی حال اب ہمارا ہو گیا ہے، اگر اسی وقت کوئی آ کر یہاں کہہ دے کہ عجائب گھر سے شیر چھوٹ گیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ پورا مجمع اسی خبر کی طرف متوجہ ہو جائے گا، اور سب کو اپنی اپنی فکر پیدا ہو جائے گی، اجتماع کا سارا سکون انتشار سے بدل جائے

گا، کیونکہ ہماری زندگی ہمارے اوپر حاوی ہے، جب کوئی خطرہ زندگی کو چیلنج کرتا ہے تو ہماری قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور زندگی کے لئے محافظ بن جاتی ہیں لیکن اگر کوئی شخص اس زندگی کے خطرات سے آگاہ کرے جو ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ہے، اور جس میں تکلیف ہے تو دوامی اور غیر فانی اور آرام ہے تو دوامی اور غیر فانی، تو ہم نہایت بے توجہی اور بے فکری سے سن لیں گے، اس کا سبب بے دینی نہیں، بلکہ دین پر ایمان کی کمی اور کمزوری، اور ایک طرح کی بے یقینی ہے، اور ظاہر ہے کہ ایمان کی اس درجہ کمزوری کے ساتھ ایک ایسی زندگی سے کیسے دلچسپی ہو سکتی ہے اور کیسے اس کے خطرات سے فکر پیدا ہو سکتی ہے جو بالکل آڑ اور اوٹ میں ہے۔

کوہ صفا پر آغاز دعوت:

آنحضرت ﷺ کو جب اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بنایا، اس زمانے میں عرب میں ایک دستور یہ تھا کہ اگر کوئی قبیلہ کسی دوسرے قبیلے پر حملہ آور ہوتا، اور اس قبیلہ کا کوئی شخص حملہ آور لشکر کو اس وقت دیکھ لیتا جب وہ بالکل سر پر پہنچ چکا ہوتا، تو وہ شخص دوڑ کر پہاڑ پر چڑھ جاتا اور بالکل برہنہ ہو جاتا، اور دہائی دیتا، اس شخص کو "النذیر العریان" کہا جاتا تھا، اس کا یہ فعل اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ دشمن بالکل سر پر آپہنچا ہے، اور جس حال میں بھی ہو اسی حال میں مقابلے کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔

اسی دستور کے مطابق آنحضرت (ﷺ) ایک دن ایک پہاڑ پر چڑھ گئے، مگر آپ کپڑے پہنے رہے، اور پکارا ''انا النذیر العریان'' مکہ والے آپ کی صداقت اور شرم و حیا کے معترف تھے اس لئے سارا شہر آنا فانا کام کاج چھوڑ کر پہاڑ کے دامن میں جمع ہوا، انہوں نے اتنی توجہ اور فکر سے اس لئے کام کیا تھا کہ حضور ﷺ کے اس فعل کو انہوں نے اپنی زندگی کے لئے ایک خطرے کی علامت سمجھا تھا، وہ سمجھتے تھے کہ کوئی دشمن حملہ آور ہو رہا ہے جس کی اطلاع یہ ہمیں دیں گے چنانچہ جب حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں تم سے کہوں کہ پہاڑ کے پیچھے دشمن کا لشکر چھپا ہوا ہے، جو تمہاری گھات میں ہے تو کیا تم مجھے سچا سمجھو گے؟ حالانکہ تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو، مگر میں چونکہ اوپر کھڑا ہوں اس لئے میری نظر کے اور اس کے درمیان کوئی آڑ نہیں سب نے کہا بے شک ہم آپ کی بات کی تصدیق کریں گے کہ مگر جب آپ نے فرمایا کہ وہ لشکر عذاب الٰہی کا لشکر ہے جو بالکل سر پر کھڑا ہوا ہے، میری بات مانو تو اس کے حملہ سے بچ سکتے

ہو۔ بس یہ سن کران کی ساری توجہ اور ساری فکر ختم ہوگئی، اور وہ آ کر پچھتائے، اور کہنے لگے کہ کیا آپ نے یہی بات سنانے کے لئے ہمیں یہاں بلایا تھا؟ کیا بات تھی؟ ان پر بس اپنی دنیا کی زندگی چھائی ہوئی تھی، اس کے ہر خطرہ پران کے کان کھڑے ہوجاتے تھے مگر دوسری زندگی کا انہیں خیال نہ تھا، اس لئے اس کے خطرات کی مطلق فکر نہ ہوتی تھی۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں مختلف مذاہب موجود تھے وہ ایمان کے مدعی تھے، مگر ان کے ماننے والوں پر ایمان اتنا بے جان اور بوسیدہ ہوگیا تھا جو محض فرضی اور خیالی تکالیف کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا، ان کی مرغوب معصیتیں اور بداخلاقیاں نہیں چھڑا سکتا تھا، ان کے پاس دین تو موجود تھا، مگر ایمان کی طاقت اور تازگی کھوجانے کی وجہ سے وہ دین چھوٹے چھوٹے حوادث سے مقابلہ کرنے کے لئے بھی انہیں آمادہ نہیں کرسکتا تھا۔

لیکن رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین پر سچے دل سے ایمان لانے والوں کا حال ان لوگوں سے بالکل مختلف تھا، انہیں اس زندگی سے زیادہ دوسری زندگی سے دلچسپی تھی۔ اس کی فکر تھی اور ان کا دین ان سے بڑی سے بڑی قربانی باآسانی کرادیتا تھا، اس لئے کہ دین اور دینی حقیقتوں پر ان کا ایمان تازہ اور نہایت جاندار تھا۔ دوسرے مذاہب کے ٹھیکہ داروں اور سچے دینداروں میں ایسا فرق تھا جیسا کاغذ کی تصویر اور ایک زندہ انسان میں، آگ کی تصویر اور خود آگ میں جیسا فرق ہوتا ہے، صحابہ کرامؓ کے نئے ایمان نے ان کی رگ رگ میں وہ آگ بھردی تھی کہ مقابلہ میں آنے والے جو اس ایمان سے محروم تھے، مومی تصویروں کی طرح پگھل جاتے تھے یا اپنی خیر مناتے ہوئے سامنے سے ہٹ جاتے تھے، ان کی تلواروں میں لوہے کی گرمی نہ تھی، بلکہ ان کے ایمانوں کی گرمی تھی، وہ فاقہ کش اور خرقہ پوش مجاہد دراصل ہتھیار کی طاقت پر نہیں بلکہ ایمان کی طاقت پر لڑتے تھے اور دشمنوں کے چھکے چھڑا دیتے تھے۔ ان کا یقین تو یہ تھا کہ اگر ساری دنیا کی تلواریں ہماری گردنوں پر پڑیں، مگر اللہ کا حکم نہ ہو تو ہمیں کوئی نہیں مار سکتا، جبکہ ان کے مقابل یہ یقین رکھتے تھے کہ تلوار کا ایک ہی وار ہمارا خاتمہ کردے گا۔ اس نئے ایمان کی طاقت نے ان غریب عربوں کے دل سے ان کی کمزوری کا احساس بالکل نکال دیا تھا۔ ایران کے دربار میں جب ان کے سفیر گئے تو ان کی تلواروں پر چیتھڑے لپٹے ہوئے تھے اور گھوڑے پست قامت تھے۔ مگر ان کا ایمان شعلہ زن تھا، اور اسی کی طاقت ساری طاقتوں پر

غالب تھی، جس سے سپہ سالار ایران رستم بھی لرزاں تھا۔ ایران کے سارے درباری بھی اپنی اپنی فکر میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کی اسی قوت نے انہیں اس قدر جری اور نڈر بنا دیا تھا کہ ان درباروں میں قالینوں پر گھوڑوں کو لئے ہوئے چلے جاتے، اور تخت پر نیزہ گاڑ دیتے تھے۔

حقیقی ایمان کیا ہے؟

اسی ایمان کا فرق تھا کہ حضور ﷺ کی بعثت کے وقت اگر نمازیں تھیں بھی تو خشوع و خضوع نہ تھا، اور اگر حج تھا تو اس کی روح نہ تھی، لیکن جو لوگ حضور ﷺ کی دعوت پر ایمان لے آئے، ان میں آپ نے ایسا ایمان پیدا فرما دیا کہ حج و نماز کے وقت کے علاوہ بھی وہ ان پر چھایا رہتا تھا اور گویا ہر دم خدا اور آخرت کو اپنی آنکھوں کے سامنے پاتے تھے، اسی دنیا میں جنت کی خوشبوئیں تک محسوس کر لیتے تھے۔

ایک صحابی کا واقعہ:

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ میدان جنگ میں اپنے ایک صحابی کے متعلق ایک دوسرے صحابی سے حضور ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ، ذرا فلاں کا پتہ چلاؤ۔ کس حال میں ہیں؟ (یعنی صحیح سلامت ہیں یا خدانخواستہ زخمی پڑے ہیں یا جاں بحق ہو گئے) انہوں نے ایک جگہ دیکھا زخمی پڑے ہوئے ہیں اور تقریباً وقت آخر ہو رہا ہے، کہا حضور ﷺ نے حال دریافت فرمایا ہے۔ جواب دیا، جاؤ میرا سلام عرض کرنا اور عرض کر دینا کہ حضور جنت کی خوشبوئیں آ رہی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا واقعہ:

حضرت ابو ہریرہؓ کا واقعہ ہے کہ وہ مرض الوفات کی سخت تکلیف میں مبتلا تھے، بیوی قریب بیٹھی تھی، تکلیف کی شدت دیکھ کر ان کے منہ سے نکلا ''واکرباہ!'' حضرت ابو ہریرہؓ کی جب ذرا طبیعت سنبھلی، فوراً بولے کیا کہتی ہو واکرباہ؟ نہیں! واطرباہ واطرباہ! غداً القیٰ الاحبہ محمدًا و حزبہ (واہ کیا خوشی کا موقع ہے، کیا نشاط کا عالم ہے کل ہم دوستوں سے ملیں گے، محمد ﷺ اور اپ کی جماعت سے ملیں گے)۔

غرض صحابہ کرامؓ کو دین کی حقیقتوں پر ایسا یقین تھا کہ ہمیں محسوسات و مشاہدات پر بھی

ویسا یقین نہیں ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا ایمان نیا اور تازہ تھا اور ہر نئی اور تازہ چیز میں ایک قوت اور شادابی ہوتی ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کا واقعہ:

حضرت ابوذر غفاریؓ جب حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے تو اس کا جوش پیدا ہوا کہ حق کا اعلان اور اظہار کروں۔ (حالانکہ دشمنان اسلام کی نظر میں وہ ایک جرم کا اظہار تھا) آپ نے بیچ میں جا کر بلند آواز سے کلمہ پڑھا، کفار چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور خوب زدوکوب کیا، مگر ان کو وہ لذت ملی کہ دوسرے دن پھر جا کر یہی پٹنے کا کام کیا اور پھر پیٹے گئے۔ یہ دراصل ان کے ایمان کی تازگی تھی، ان کا نیا اور تازہ ایمان دین کی راہ میں دنیا کی ہر تکلیف کو حلاوت ولذت سے بدل دیتا تھا۔

حضرت عبداللہ ذوالبجادین کا واقعہ:

حضرت عبداللہ ذوالبجادین اسلام لانے سے قبل اپنے والد کے فوت ہو جانے کی وجہ سے اپنے چچا کے پاس رہا کرتے تھے، اور انہیں کا کام کاج کیا کرتے تھے، ان کی بکریاں وغیرہ چرانے جاتے تھے، کانوں میں اسلام کی آواز پہنچ چکی تھی، ایک دن تہیہ کرلیا کہ آج محمد ﷺ کی خدمت میں جا کر اسلام لے آنا ہے۔ چچا کے پاس آئے، بکریوں کا ریوڑ چچا کے حوالے کیا، اور کہا، میں اب اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں، اسلام قبول کرنے جارہا ہوں، چچا نے کہا بدن پر جو کپڑے ہیں اتارتے جاؤ، ظالم نے بالکل برہنہ کرکے چلتا کردیا، کیسے نہ کیسے والدہ کے پاس پہنچے اور پہننے کے لئے کپڑا مانگا، انہوں نے ایک کمبل دیا، جس کے دو ٹکڑے کرکے ایک اوڑھا اور ایک باندھا اور حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور پھر بقیہ زندگی آپ کے قدموں میں گزار دی، ذوالبجادین کا لقب آپ نے ان کی دو کملیوں کی وجہ سے دیا تھا۔

تازہ ایمان کی کشش:

بزرگو اور دوستو! نیا اور تازہ ایمان اس زندگی کو بالکل بے وقعت بنا دیتا ہے، اور اس کو قبول کرنے والا فوراً داعی ومجاہدین بن جاتا ہے۔ ایک جنگ کے موقع پر رومیوں کی صف سے ایک

بہادر نکلا اور اس نے حضرت خالدؓ کو پکارا، آپ گئے، اس نے بجائے لڑنے کے اسلام کے متعلق کچھ سوالات شروع کر دیئے اور آخر میں دریافت کیا کہ تمہارے دین میں داخل ہونے کا طریقہ کیا ہے؟ آپ نے سب سوالات کے جواب دیئے، اور اپنے خیمے میں لے آئے، وہاں اسے غسل کرایا، کلمہ پڑھایا، اس نے دو رکعت نماز پڑھی اور پھر میدان جنگ میں واپس آیا، اور اللہ کی راہ میں بڑی بہادری اور بے جگری سے لڑ کر شہید ہوگیا۔ دیکھا آپ نے نئے اور تازہ ایمان میں کتنی کشش ہے کہ حضرت خالدؓ بیچ جنگ میں سے ایک دشمن کو اسلام کا خادم بنا کے لے آئے اور اس نے اسلام قبول کرتے ہی اپنی زندگی اس پر نثار کر دی۔

ہماری دعوت:

دوستو! ہماری دعوت دراصل ایمان کی اسی اصل طاقت کو حاصل کرنے کی دعوت ہے اور ایسا ایمان پیدا کرنے کی دعوت ہے جس سے ہمارے متعلقین اور ہمارے احباب بھی ایک خوشبو محسوس کریں۔ پھول میں اگر خوشبو ہوتی ہے تو ضرور محسوس ہوتی ہے، آگ میں جب گرمی ہوتی ہے تو ضرور محسوس ہوتی ہے، اسی طرح اگر ہمارے ایمان میں خوشبو ہو، گرمی ہو، تو اس سے دوسرے ضرور متاثر ہوں گے، ورنہ دوسروں کی شکایت اور غیروں کے شکوے بیکار ہیں۔

حمص میں مسلمانوں کا غلبہ ہوا اور وہاں جزیہ وصول کیا گیا، مگر تھوڑے ہی دن بعد خلیفہ وقت کے حکم سے اس جگہ کو چھوڑ کر جانا پڑا، تو جزیہ کی ایک ایک پائی کا حساب کر کے واپس کیا گیا، یہ ان کے ایمان کا اثر تھا۔ حمص کے یہودیوں اور عیسائیوں نے اس سے ان کے ایمان کی خوشبو محسوس کی۔ چنانچہ جب مسلمان رخصت ہو رہے تھے تو وہ لوگ روتے تھے اور دعائیں کرتے تھے کہ اللہ تم کو پھر واپس لائے۔ اسی طرح اگر ہمارے اندر کوئی ایمانی طاقت، کوئی اندرونی قوت، اور اخلاقی برتری ہو تو ناممکن ہے کہ دوسرے انسان اس کو محسوس نہ کریں۔

مسلمانوں کے پاس سرمایہ اور علم، تمدن اور دوسری دولتوں کی کمی نہیں، اصل میں جو کمی ہے اور جس سے لوگوں کی نگاہیں بدل گئیں اور مسلمان دنیا کی نظروں میں گر گئے وہ ایمان کی تر و تازگی اور شادابی کی کمی ہے۔ اس کمی کا اثر آج ہی نہیں اسی وقت ظاہر ہو گیا جب مسلمان صاحب اقتدار و حکومت بھی تھے۔ بنی امیہ کے عہد میں حکومت کی طرف سے ایک غیر مسلم باجگزار ریاست میں جزیہ کی رقم وصول کرنے کے لئے محصل گئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب اسلامی حکومت کے محصل

حکومتی کروفر کے ساتھ وہاں گئے، تو والی ریاست نے کہا وہ اللہ کے بندے کہاں ہیں جو پہلے آیا کرتے تھے، جو گھانس کے چپل پہنے ہوئے تھے، جن کے چہروں سے فاقہ کشی اور کپڑوں سے غربت ٹپکتی تھی؟ ان کو بتلایا گیا کہ وہ تو اگلے زمانہ کے مسلمان تھے، اب وہ کہاں ہیں۔ تو اس نے کہا کہ اب ہم ایک پیسہ خراج کا نہیں دیں گے، کیونکہ ہم نے اب تک ان سے مرعوب ہو کر خراج دیا تھا، وہ جس وقت کہتے تھے کہ اللہ کے بندے اللہ کا مطالبہ دے، تو ہم ان کی بات کو رد نہیں کر سکتے تھے، لیکن تم سے مرعوب ہونے کی وجہ نہیں ہے، تمہارا جو جی چاہے کرلو!

آج تروتازہ ایمان کی شدید ضرورت:

دنیا کو آج اس تروتازہ ایمان کی شدید ضرورت ہے جو آدمی کی پوری زندگی کو اپنے تابع کرے، مگر یہی ضروری چیز ہے جو دنیا سے ناپید ہوگئی۔ آج یورپ کے کارخانوں نے دنیا کی ہر ضروری بلکہ غیر ضروری بھی چیز بنا ڈالی ہے، اور ہر ضرورت مند بازار سے خرید سکتا ہے، مگر وہ چیز جس کو پیدا کرنے سے یورپ کے کارخانے بھی عاجز ہیں یہی خالدؓ وابوذرؓ کا ایمان ہے، اور اسی بناء پر یورپ کو اس بات کا پورا پورا اعتراف ہے کہ وہ دنیا کی برائیوں اور جرائم سے پاک کر دینے سے قاصر ہے۔ بڑے بڑے ماہرین اخلاقیات ونفسیات اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یورپ کا ایک ماہر نفسیات واخلاقیات جو ہر سال اپنی خدمت قبول کرانے کے لئے حکومت کے سامنے سفارش پیش کیا کرتا تھا، ایک بار ایک عورت کے گلے سے ہار چراتے ہوئے پکڑا گیا۔ یہ چرچل وٹرومین دنیا کے امن کے چوکیدار بنے بیٹھے ہیں، اگر موقع ملے تو شخصی یا قومی اقتدار حاصل کرنے یا قائم رکھنے کے لئے ایٹم بم گرا کر دنیا کو تباہ برباد کر دیں، جیسا کہ گزشتہ جنگ میں جاپان کے دو معصوم صنعتی شہروں کے ساتھ کیا۔

دوستو! ہم کسی نئے دین کے داعی نہیں، لیکن ایک نئے ایمان کے ضرور داعی ہیں۔ ہم ضرور کہتے ہیں کہ اپنے ایمان کو تازہ کرو، خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یاایھا الذین آمنوا آمنوا

اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو، ایمان لاؤ۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں: جددوا ایمانکم (اپنے ایمانوں کو نیا کرتے رہو) اور یہی ہماری دعوت ہے!

ہم کھل کر کہتے ہیں کہ ہم اور ہمارے بزرگ، بڑے اور چھوٹے، ہمارے ساتھی، اس کے محتاج ہیں کہ ہمارا ایمان تازہ ہو اور وہی ایمان پیدا ہو جو ہمارے اسلاف کا تھا۔ اس ہندوستان میں جو بزرگ اپنے اپنے وقت میں ایمان کے داعی اور مجدد گزرے ہیں، انہوں نے بھی اس وقت باوجودیکہ دین اور ایمان موجود تھا اور عالم دین موجود تھے، ایمان کی تجدید کی دعوت دی، اور امت کے اندر ایک نئی ایمانی زندگی پیدا کر دی۔ پھر ان قدیم الاسلام نومسلموں سے وہ باتیں ظہور میں آئیں جنہوں نے قرن اول کی یاد تازہ کر دی اور ثابت کر دیا کہ ایمان میں بڑی طاقت ہے اور اس طاقت کو ہر زمانہ میں زندہ کیا جا سکتا ہے۔ آج بھی اسی طاقت کی دنیا میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے اسلاف کی روایات تازہ ہو جاتی ہے۔ "اخوان المسلمین" کے نوجوانوں نے جب اپنے اندر نیا ایمان پیدا کیا تو انہوں نے دین کے لئے ایسی قربانیاں پیش کیں، جن کی اس زمانہ میں مثال نہیں ملتی۔

اس وقت ساری اسلامی دنیا میں ایمان کی طرف ایک بازگشت ہو رہی ہے۔ ترکی، مصر اور حجاز میں اپنے اپنے طرز پر ایمان کو بڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہر ملک کی طرح اور شاید اور ملکوں سے زیادہ ہمارے اس ملک میں ضرورت ہے کہ نیا ایمان حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، اور اس کی دعوت عام کی جائے۔

ہمارا افسردہ اور بوسیدہ ایمان مشکلات کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ معمولی حالات کا مقابلہ معمولی اور کمزور ایمان کر سکتا ہے، لیکن غیر معمولی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے غیر معمولی طاقت کا ایمان درکار ہے۔ آج دنیا میں مسلمانوں کو غیر معمولی حالات کا سامنا ہے، اس لئے ہمیں اپنے ایمان میں غیر معمولی تازگی اور اپنی زندگی میں غیر معمولی تغیر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے ان اجتماعات کی دعوت اور ہماری حقیر کوششوں کا مقصد یہی ہے کہ ہم میں از سر نو حقیقی ایمان اور ابتداء اسلام کے نومسلموں کا سا جوش اور ذوق پیدا ہو! حالات کے بدلنے میں صرف اتنی ہی بات کی دیر ہے۔

مسلم خواتین کی علمی ودینی خدمات

> اپریل ۱۹۹۸ء کے پہلے ہفتہ میں جامعۃ المومنات الاسلامیہ دوبگا میں ثقافتی ہفتہ منایا گیا، جس میں حفظ وقرآن اور تقاریر و اسلامک کوئز کے انعامی مقابلے ہوئے، طالبات نے بڑی محنت وکاوش کے ساتھ ان مقابلوں میں حصہ لیا اور انعامات حاصل کئے، جامعۃ المومنات کے اس ثقافتی ہفتہ کا اختتام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے خطاب سے ہوا، جس میں حضرت مولانا نے تاریخ اسلامی کے مختلف ادوار میں عورتوں کے کردار کا ذکر کیا، اور معاشرہ کے سدھار اور اس کی اصلاح میں ان کی خدمات کو بیان کیا، مولانا نے اس ثقافتی ہفتہ کے پروگراموں میں حصہ لینے والی طالبات کو مبارکباد پیش کی اور ان کے روشن مستقبل کیلئے دعائیں کیں۔

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين محمد وآله واصحابه اجمعين ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين . امابعد:

علم مرد وعورت دونوں کے لئے

میرعزیز بہنواور بیٹیو: مجھے بہت مسرت ہے کہ میں یہاں آکر اس تعلیمی سرگرمی کے کے نتیجہ کو دیکھ رہا ہوں جو خاص طور پر ہماری بچیوں کے لئے امت کی بیٹیوں کے لئے اس کا انتظام کیا گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جیسے ایک گھرانہ بغیر بیبیوں کے ناقص ہے اور اس کو گھرانہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے ایسے ہی امت کا بھی حال ہے کہ اگر اس میں صرف تعلیم اور ترقی، فہم اور سمجھ، اخلاق اور تہذیب یہ صرف مردوں میں محدود رہی تو پھر اس امت کو بیدار امت اور زندہ امت کہنا مشکل ہے، اس کا اہتمام ہمیشہ کیا گیا ہے ابتدائے اسلام سے بچیوں لڑکیوں اور خواتین کو بھی تعلیم میں اور اسلام کی تربیت میں شریک کیا گیا ہے، حدیث میں فرمایا گیا ہے "طلب العلم فريضة على كل مسلم"، علم کی طلب اور علم پر محنت کرنا اور علم کو حاصل کرنا یہ ہر مسلمان مرد اور عورت

پر فرض ہے۔

عورت کی تعلیم کے بغیر نظام حیات کا حال

تو اسلام کا پورا نظام، اس کا نظام دینی اور اس کا نظام ذہنی اور اس کا نظام اخلاقی اور اس کا نظام پرورش کا صحیح مفہوم وجود میں نہیں آ سکتا، جب تک کہ خود ہماری امت کی مسلمان بیٹیاں اس میں شریک نہ ہوں اور وہ ضروری حد تک علم حاصل نہ کریں اللہ تعالیٰ کی تعلیمات سے جو مرد وعورت کے درمیان مشترک ہیں، ان سے واقف نہ ہوں یہ ایک یکطرفہ کوشش ہوگی اور یکطرفہ روش ہوگی، جس سے کوئی امت تو امت ملت تو ملت ایک شہر بھی اس پر گذارا نہیں کر سکتا، اس کی ضرورت ہے اسی لئے آتا ہے کہ علم کی طلب ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت پر فرض ہے، ہمارا پورا نظام معاشرت بلکہ نظام زندگی و نظام مذہبی بھی اس کے بغیر نہیں چل سکتا کہ بیبیاں اور بچیاں بھی اسلام سے واقف ہوں اور گھر میں جو کچھ ماحول ہوتا ہے وہ تو بیویوں اور بیٹیوں ہی کا ساختہ پرداختہ ہوتا ہے اگر گھر کے اندر اسلامی فضا نہیں ہے، دینی تعلیمات نہیں ہیں، اسلامی اخلاق نہیں ہیں، تو پھر اس نسل کی اسلامی پرورش ہو ہی نہیں سکتی اس لئے ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ اس کا ہمیشہ اہتمام رکھا گیا۔

تاریخ اسلام میں طبقہ نسواں کے کارنامے

اور امت کا طبقہ نسواں بھی ہمیشہ نہ صرف یہ کہ علم سے واقف بلکہ علم پھیلانے والا بھی رہا اور تذکرہ کی کتابوں میں ایسی بیویوں کے نام ملتے ہیں جو بڑی فاضلہ عالمہ تھیں اور جن کی وجہ سے خاندان کے خاندان بلکہ اس زمانہ میں ملت کا پورا حصہ دین سے واقف تھا اور دین پر کاربند تھا، ان کے کارنامے آپ دیکھیں، بلکہ بعض خاندانوں کا ایمان بچایا ہے مستورات نے کہ انھوں نے شروع سے بچیوں کی ایسی تربیت کی اور اسلامی اور دینی غیرت کا اظہار کیا اور نقش کر دیا اور سچ پوچھئے تو دل کی بھٹی میں دل کی خاک میں اور دل کی کشت زار میں تخم مائیں ڈال سکتی ہیں، گھر کی مستورات ہی ڈال سکتی ہیں اور یہ تخم جب پک جاتا ہے تو پھر اس کو حکومتیں بھی نہیں اکھاڑ سکتی ہیں اور اس کی ہزار ہا مثالیں ہیں کہ ماں اور بہنوں سے پڑھایا ہوا سبق ان سے سیکھا ہوا دین، ان کا بیدار کیا ہوا جذبہ بڑے بڑے مجاہدین کی استقامت اور ان کی ثابت قدمی کا

ذریعہ بنا اور اگر آپ ان کی تحقیق کریں اور ذرا ریسرچ سے اور سراغ رسانی سے کام لیں تو معلوم ہوگا کہ اصل جو اس میں اثبات واستقامت اور جذبہ پیدا ہوا ہے وہ ماں کا پیدا کیا ہوا ہے اور اس کی کثرت سے مثالیں ہیں کہ بڑے بڑے چوٹی کے علماء اسلام میں ایسے گذرے ہیں، جن پر سب سے زیادہ ان کی ماؤں کا اثر پڑا ہے، اور ان کی ماؤں نے ان کی اخیر تک اسلام پر قائم رہنے کی ہمت اور حوصلہ دیا ہے اور اس کے لئے مستقبل کتابیں ہیں اور ہماری تاریخ میں مستورات کے طبقہ کی مستقل کتابیں ہیں کہ بعض اوقات انھوں نے اللہ کے راستے میں جان دینے پر آمادہ کیا اور اپنے لخت ہائے جگر کو انھوں نے خطرے میں ڈالا ان کی ہمت بڑھائی بلکہ ان میں غیرت پیدا کی کہ دین کے لئے کیوں کام نہیں کرتے ہو؟ دین کے لئے قربان ہو جانا چاہئے اور سب کچھ قربان کر دینا چاہئے، اس کی مثالیں ہماری تاریخ میں ملتی ہیں، بعض بڑے بڑے اکابر اور بڑے بڑے مجاہد پیدا ہوئے ہیں کہ اول اول ان کے اندر جو جہاد کا جذبہ پیدا ہوا، اسلام کے لئے قربانی دینے کا جذبہ پیدا ہوا اور اسلام پر نثار اور قربان ہو جانے کا جو حوصلہ پیدا ہوا وہ ان کی ماؤں کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ اکثر اہل اللہ کے حالات میں اور مجاہدین کے حالات میں اور فاتحین کے حالات میں ان کی ماؤں کا بنیادی حصہ ملے گا اور انھوں نے خود اعتراف کیا کہ ہمیں سب سے پہلے ہمارے کان میں یہ بات ہماری ماں کے ذریعہ پڑی، انھوں نے ہمارے اندر دینی غیرت پیدا کی اور بعض موقعوں پر تو دینی حمیت پیدا کرنے میں ہماری خواتین کا حصہ زیادہ ہے، اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس مدرسہ میں الحمدللہ دین کی تعلیم ہو رہی ہے، اور زمانے کے مطابق اور ضرورت کے مطابق اس کا کام کیا جا رہا ہے، الحمدللہ اس کا ایک بڑا مرکز بن گیا ہے، ہمارے شہر میں جو ہمارے شہر اور اہل شہر کے لئے خاص طور سے ہمارا جس ادارہ سے اور جس حلقہ سے تعلق ہے اس کے لئے قابل فخر اور موجب شکر ہے کہ اس ادارہ کے قائم کرنے والوں اور چلانے والوں کا تعلق دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ہے اور اس مکتب خیال سے ہے جس کے ہمارے اساتذہ ہمارے رفقاء داعی رہے اور ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ قبول فرمائے اور جزائے خیر دے اور اب جو خطرہ پیدا ہو رہا ہے نئی نسل کے لئے ذہنی ارتداد کا اور ہم آگے نہیں کہتے اور اس سے باز رہنے میں سب سے بڑا ہاتھ ماؤں کا ہوگا اور اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ کسی کی مادر مشفقہ، کسی ماں کے فقرے نے ایک روح

پیدا کردی اور قربانی دینے اور ایثار اور اپنے کو خطرے میں ڈالنے پر آمادہ کرلیا، اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

خواتین اسلام کی ذمہ داریاں

اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اپنے عزیزوں کا اور رفقاء کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے یہ نمونہ دکھایا اور امید پیدا کرائی کہ انشاء اللہ ہمارے اس اودھ میں خاص طور پر ہمارے اس لکھنؤ میں جو تہذیبی مرکز ہے اور اس طرح صوبہ کا دارالحکومت بھی ہے اس میں انشاء اللہ ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگا جو مسلمانوں کی آئندہ نسل کے ایمانی، دینی اور اخلاقی حفاظت کا کردار ادا کرے گا اور وہ طبقہ صرف مستورات کا ہوسکتا ہے، خواتین کا طبقہ ہوسکتا ہے اور ہماری بہنوں کا طبقہ ہوسکتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو ترقی دے اور اس کو زیادہ مفید اور نافع اور فیض رساں بنائے اور ان کی محنتوں اور خوشی کی جفاکشی اور ان کی قربانیوں کو قبول فرمائے، ان کی فیاضیوں اور ان کی لڑکیوں کو جنھوں نے اس میں حصہ لیا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ قیام اور دوام بخشے اور اس سے زیادہ نفع پہونچائے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ایک اعلان وشہادت بالحق

الحمدللہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی. اما بعد۔

حضرات! یہ ایک حقیقت اور مشاہدہ ہے کہ تبلیغی جماعت (جس کا مرکز نظام الدین دہلی ہے) اس زمانہ کی ایک سرگرم، متحرک اور محرک، متعلم اور معلم، داعی دینی جماعت ہے، جس کے ایک وقت میں مجموعی طور پر ہزاروں افراد ایک بستی سے دوسری بستی، ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں، (جس میں کسی تعداد میں بھی مسلمان پائے جاتے ہیں) تبلیغی ودعوتی نقل وحرکت اور تبلیغی سفروں اور دوروں میں مصروف اور سرگرم نظر آتے ہیں، یہ اپنے دعوت واصولوں اور ضابطوں کے دائرے میں رہ کر (جو بانی جماعت اور داعی اول) حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کاندھلوی ۱۳۶۳ھ۔۱۹۴۴ء) نے توفیق الٰہی کی مدد سے اور اپنے علم وتجربہ کی روشنی میں بنایا تھا، دین کے مبادی کی تعلیم، ایمان کی تجدید اور استحکام، فرائض شرعیہ کی پابندی، مسلمان کے اکرام واحترام، ذکر الٰہی ویاد خداوندی اور ترک مالایعنی (فضول اور زائد کاموں سے احتراز) کی تلقین کرتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس فی سبیل اللہ نقل وحرکت، قربانی وجفاکشی اور اخلاص وتوکل کی برکت سے خود انھوں نے دینی ترقی کی اور دین سے ضروری واقفیت پیدا کی، اور ان کی دعوت وتبلیغ اور عزیمت ونقل وحرکت سے ہزاروں کی زندگی میں ایک دینی انقلاب آگیا، مسجدیں آباد ہوئیں، تعلیم کے حلقے قائم ہوئے، اخلاق ومعاشرہ کی بھی اصلاح ہوئی، دین کی تعلیم اور دین میں مزید ترقی کا جذبہ پیدا ہوا، جماعت کے قابل قدر اثرات ونتائج کا اعتراف کرتے ہوئے اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زمانہ کی تبدیلی، نئے خطرات اور چیلنجوں اور نئی سازشوں اور منصوبوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو تاریخ کے ہر دور میں اسلام اور مسلمانوں کو کم وبیش پیش آئے ہیں اور اس زمانہ میں وہ کہیں زیادہ سنگین، مہیب اور عمیق ودور رس ہیں، جماعت

کے اصولوں اور بنیادی ہدایت کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے اور اس دعوت سے جو قوت ایمانی اور جذبہ دینی پیدا ہوتا ہے، وہ ان کے دوررس اثرات اور خطرناک نتائج سے ملت کو محفوظ رکھنے میں معین ومددگار ہوسکتا ہے۔

جہاں تک اس دعوت وجماعت کے بنیادی عقیدہ اور مسلک کا تعلق ہے، وہ توحید خالص شرک وبدعت سے احتراز، پابندی شریعت اور اتباع سنت ہے اس کی حقیقت اور وجہ جاننے کے لئے اس دعوت کے داعی اول اور جماعت کے بانی حضرت محمد الیاس صاحبؒ کے خاندانی وروحانی اور ذاتی تعلیم وتربیت اور نشو ونما کے ماحول سے (اجمالی سہی) واقفیت کی ضرورت ہے کہ جس طرح ایک نسبی اور نسلی تعلق اور نسبت، عقائد واخلاق پر اثر انداز ہوتی ہے، بلکہ ان کا سرچشمہ قرار دی جاسکتی ہے، اسی طرح (بلکہ اس سے زیادہ) روحانی تعلیمی وتربیتی نشو ونما اور سلسلۂ طریقت، اثر انداز بلکہ ذہن وفکر ساز ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی تاریخی کڑی یہ ہے کہ مولانا کے مادری جدامجد اور خاندان کاندھلہ کے مورث اعلیٰ حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی (م ۱۲۴۵ھ) حضرت شاہ عبد العزیز صاحب علیہ الرحمۃ اللہ کی ممتاز ترین تلامذہ میں تھے، وہ شیخ وقت ہونے کے باوجود ۶۰، ۶۵ برس کی عمر میں اپنے شیخ کے جواں سال خلیفہ حضرت سید احمد شہید (ش ۱۲۴۶ھ) سے بیعت ہوئے اور اپنے علمی ودینی کمالات اور سلوک وتصوف کے منازل طے کرنے کے باوجود حضرت سید صاحب کی محبت آپ کے فضل وکمال کے اعتراف اور آپ کی تعلیمات اور دعوت کے اثر میں (جس کا سب سے بڑا اصول اور جزو اعظم توحید خالص کی دعوت وتعلیم اور شرک وبدعت سے نفور واحتراز تھا) ڈوب گئے اور خود اس کے داعی بن گئے۔

پھر اس خاندان کا روحانی تعلق حضرت حاجی امداد اللہ صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور ان کے خلیفۂ اعظم حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ سے رہا، یہ سب حضرات توحید اور اتباع سنت میں حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ کی شہرۂ آفاق کتاب ''تقویۃ الایمان'' کے (جو توحید اور رد شرک کے باب میں ایک بے نظیر کتاب ہے) حامی ومؤید اور انتہائی مداح اور معترف تھے، اس کا نتیجہ ہے کہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے حقیقی برادرزادہ خویش اور محبوب فرد خاندان، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ

کاندھلوی نے بندہ کو اس کو عربی میں منتقل کرنے کی دعوت دی اور ایماء فرمایا، اور ان کی طرف سے اس کے لئے بار بار یاددہانی اور اصرار ہوا، اس عاجز نے مدینہ طیبہ (علی ماجھا الصلاۃ والسلام) میں اس کام کی ابتدا کی، اور ہندوستان آکر اس کو پورا کیا، اور اس پر مفید حواشی اور مسلم اور بلند پایہ مشائخ وعلماء کی تائیدی اقوال حاشیہ میں درج کیے، یہ کتاب جب طبع ہوگئی تو اس کا ایک نسخہ بندہ نے جامعہ اسلامیہ مدینہ طیبہ کے ایک سلفی العقیدہ عرب فاضل اور استاذ جامعہ کو پیش کیا، انھوں نے پڑھنے کے بعد اپنے گہرے تاثر کا اظہار کیا اور فرمایا کہ ''یہ تو توحید کا منجنیق (مشین گن) ہے''۔

یہ عقیدہ ومسلک آخر وقت تک اس جماعت کا ذمہ داروں، مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے خاندان کے ارکان وافراد اور مرکز نظام الدین میں رہا اور ہے، ایک مرتبہ مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے بندہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ مولوی ابوالحسن، ہم لوگ ابھی تک حضرت سید صاحب کی تجدید کے سایہ میں ہیں بندہ کی کتاب سیرت سید احمد شہیدؒ پڑھ کر فرمایا کہ میری معلومات میں اس سے کچھ اضافہ نہیں ہوا، ہم نے اپنی دادیوں اور نانیوں سے یہ سن رکھا ہے۔

اس تاریخی پس منظر میں اس نسبی ونسبتی توارث اور تسلسل کے بیان کرنے کا مقصد یہی ہے کہ اس دعوت کے فکر ومزاج اور اس دعوت کے بانی اور ذمہ داروں کے عقیدہ ومسلک میں توحید خالص اتباع سنت ورد بدعت، اور دین خالص کی تعلیم ودعوت ضمیر وخمیر میں شامل ہے اور اس کی طرف کسی ایسے عقیدہ ومسلک اور کسی ایسے قول وعمل کی نسبت نہیں کی جاسکتی جو اس کے منافی اور اس کے متعارض ہو اور ان لوگوں کو جو اس جماعت ودعوت کو ان چیزوں سے متہم کر کے صحیح العقیدہ اہل علم ودین کی نظر میں مشکوک بنانا چاہتے ہیں، خدا سے جو عالم الغیب والشہادۃ ہے، ڈرنا اور یوم الحساب کا خیال رکھنا چاہیے۔

وما علینا الا البلاغ

دنیا بعثت سے پہلے اور بعثت کے بعد

الحمدللہ و کفیٰ وسلام علیٰ عباہ الذین اصطفیٰ. اما بعد

حضرات! اچودہ برس پہلے کی دنیا پر نظر ڈالئے، اونچی اونچی عمارتوں، سونے چاندی کے ڈھیروں اور زرق برق لباسوں کو چھوڑ دیجئے، یہ تو آپ کو پرانی تصویروں کے مرقع اور مردہ عجائب خانہ میں بھی نظر آ جائیں گے، یہ دیکھئے کہ انسانیت بھی کبھی جیتی جاگتی تھی، مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پھر کر دیکھ لیجئے اور سانس روک لیجئے کہیں اس کی نبض چلتی ہوئی اور اس کا دل دھڑکتا معلوم ہوتا ہے؟

زندگی کے سمندر میں بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھائے جا رہی تھی، انسانی کے جنگل میں شیر اور چیتے، سور اور بھیڑیئے، بکریوں اور بھیڑوں کو کھا رہے تھے، بدی نیکی پر، رذالت شرافت پر، خواہشات عقل پر، پیٹ کے تقاضے روح کے تقاضوں پر، غالب آ چکے تھے، لیکن اس صورت حال کے خلاف اتنی لمبی چوڑی زمین پر کہیں احتجاج نہ تھا، انسانیت کی چوڑی پیشانی پر غصہ کی کوئی شکن نظر نہیں آتی تھی، ساری دنیا اسلام کی ایک منڈی بن چکی تھی، بادشاہ، وزیر، امیر و غریب، اس منڈی میں سب کے دام لگ رہے تھے اور سب کوڑیوں میں بک رہے تھے، کوئی ایسا نہ تھا، جس کا جوہر انسانی خریداروں کے حوصلہ سے بلند ہو اور جو پکار کر کہے کہ یہ ساری فضا میری ایک اڑان کے لئے کافی نہیں، یہ ساری دنیا اور یہ پوری زندگی میرے حوصلہ سے کم تھی، اس لئے ایک دوسری ابدی زندگی میرے لئے پیدا کی گئی، میں اس فانی زندگی اور اس محدود دنیا کی ایک چھوٹی سی کسر پر اپنی روح کو کس طرح فروخت کرسکتا ہوں؟

قوموں اور ملکوں کے اوران سے گزر کر قبیلوں اور برادریوں کے اوران سے آگے بڑھ کر کنبوں اور گھرانوں کے، چھوٹے چھوٹے گھروندے بن گئے تھے، اور بڑے بڑے بلند ہمت، انسان جن کو اپنی سرفرازی اور سربلندی کے بڑے اونچے دعوے تھے، بالشیوں کی طرح ان

گھروندوں میں رہنے کے عادی بن چکے تھے، کسی کو ان میں تنگی اور گھٹن محسوس نہیں ہوتی تھی، اور کسی کو اس سے زیادہ وسیع تر انسانیت کا تصور باقی نہیں رہا تھا، زندگی ساری سود وسودا اور مکروفن میں گھر کر رہ گئی تھی۔

انسانیت ایک سرد لاشہ تھا، جس میں کہیں روح کی تپش، دل کا سوز اور عشق کی حرارت باقی نہیں رہی تھی، انسانیت کی سطح پر خودرو جنگل اگ آیا تھا، ہر طرف جھاڑیاں تھیں، جن میں خونخوار درندے اور زہریلے کیڑے تھے، یا دلدلیں تھیں، جن میں جسم سے لپٹ جانے والی اور خون چوسنے والی جونکیں تھیں، اس جنگل میں ہر طرح کا خوفناک جانور، ہر طرح کا شکاری پرندہ، اور ان دلدلوں میں ہر قسم کی جونک پائی جاتی تھی، لیکن آدم زادوں کی اس بستی میں کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا، جو آدمی تھے وہ غاروں کے اندر، پہاڑوں کے اوپر اور خانقاہوں اور عبادت گاہوں کے خلوتوں میں چھپے ہوئے تھے اور اپنی خیر منارہے تھے یا زندگی میں رہتے ہوئے زندگی کی آنکھیں بند کر کے فلسفہ سے اپنا دل بہلا رہے تھے یا شاعری سے اپنا غم غلط کر رہے تھے اور زندگی کے میدان میں کوئی مردِ میدان نہ تھا۔

دفعتاً انسانیت کے اس سرد جسم میں گرم خون کی ایک رو دوڑی، نبض میں حرکت اور جسم میں جنبش پیدا ہوئی، جن پر پرندوں نے اس کو مردہ کو سمجھ کر اس بے حس جسم کی ساکن سطح پر بسیرا کر رکھا تھا، ان کو اپنے گھر ہلتے ہوئے اور اپنے جسم لرزتے ہوئے محسوس ہوئے، قدیم سیرت نگار اس کو اپنی زبان خاص میں یوں بیان کرتے ہیں کہ کسریٰ شاہ ایران کے محل کے کنگرے گرے اور آتش پارس ایک دم بجھ گئی، زمانۂ حال کا مورخ اس کو اس طرح بیان کرے گا، کہ انسانیت کی اس اندرونی حرکت سے اس کی بیرونی سطح میں اضطراب پیدا ہوا، اس کی اس ساکن و بے حرکت سطح پر جتنے کمزور اور بودے قلعے بنے ہوئے تھے، ان میں زلزلہ آیا، مکڑی کا ہر جالا ٹوٹتا اور تنکوں کا ہر گھونسلہ بکھرتا نظر آیا، زمین کی اندرونی حرکت سے اگر سنگین عمارتیں اور آہنی برج خزاں کے پتوں کی طرح جھڑ سکتے ہیں تو پیغمبر کی آمد آمد سے کسریٰ و قیصر کے خود ساختہ نظاموں میں تزلزل کیوں نہ ہوگا؟ زندگی کا یہ گرم خون جو انسانیت کے سرد جسم میں دوڑا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا واقعہ ہے جو متمدن دنیا کے قلب مکہ معظمہ میں پیش آیا۔

آپ نے دنیا کو جو پیغام دیا اس کے مختصر لفظ زندگی کی تمام وسعتوں پر حاوی ہیں، تاریخ

گواہ ہے، کہ انسانی زندگی کی جڑیں اور اس کے چھوٹے قصر زندگی کی بنیادیں کبھی اس زور سے نہیں ہلائی گئیں جیسی اس پیغام لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اعلان سے ہلائی گئیں اور دنیا کے کند ذہن پر کبھی ایسی چوٹ نہیں پڑی تھی، جیسے ان لفظوں سے پڑی، وہ غصہ سے تلملا گیا اور اس نے جھنجھلا کر کہا ''**اجعل الآلهة الهاً واحداً ان هذا لشيي عجاب** (کیا ان سب کو جن کی ہم پرستش کرتے تھے اور جن کے ہم بندے بنے ہوئے تھے، اڑا کر ایک ہی معبود مقصود رکھا ہے؟ یہ تو بڑے اچنبھے کی بات ہے) اس ذہن کے نمائندوں نے فیصلہ کیا یہ ہمارے نظام زندگی کے خلاف ایک گہری اور منظم سازش ہے اور ہم کو اس کا مقابلہ کرنا ہے،'' **وانطلق الملأ منهم ان امشوا واصبروا على آلهتكم ان هذا لشيئ يراد**'' (ان کے سردار اور ذمہ دار ایک دوسرے کے پاس گئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو، یہ تو کوئی طے کی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے۔

یہ نعرہ زندگی اور انسانیت کے تصور پر ایک کاری ضرب تھی، جو ذہن کے پورے سانچہ اور زندگی کے پورے ڈھانچہ کو متاثر کرتی تھی، اس کا مطلب تھا کہ جیسا کہ آج تک سمجھا جاتا رہا، یہ دنیا کوئی خودرو جنگل نہیں بلکہ یہ مالی کا لگایا ہوا آراستہ باغ ہے اور انسان اس باغ کا سب سے اعلیٰ پھول ہے، یہ پھول جو ہزاروں بہاروں کا سرمایہ ہے، بے مقصد نہیں کہ مل دل کر رہ جائے، انسان کے جوہر انسانیت کی اس خالق کے سوا کوئی قیمت نہیں لگا سکتا، اس کے اندر وہ لامحدود طلب، وہ بلند ہمت وہ بلند پرواز روح اور وہ مضطرب دل ہے کہ ساری دنیا مل کر اس کی تسکین نہیں کر سکتی اور یہ سست عناصر دنیا اس کے ساتھ نہیں چل سکتی اس لئے غیر فانی زندگی اور ایک لامحدود دنیا درکار ہے، جس کے سامنے یہ زندگی ایک قطرہ اور یہ دنیا بازیچہ اطفال ہے، وہاں کی راحت کے سامنے یہاں کی کوئی تکلیف حقیقت نہیں رکھتی، اس لئے انسان کا فطری تقاضا خدائے واحد کی عبادت، اس کی خوشنا سی رضائے الٰہی کی طلب اور اس کی زندگی اس کے لئے جدوجہد ہے، انسان کو کسی روح، کسی مخفی وفرضی طاقت کسی درخت اور پتھر، کسی قسم کی دھات اور جمادات کسی مال ودولت، کسی جاہ وعزت، کسی طاقت وقوت اور کسی روحانیت وعظمت کے سامنے بندوں کی طرح جھکنے اور سبزہ کی طرح پامال ہونے کی ضرورت نہیں، وہ صرف ایک بلندی کے سامنے سب سے زیادہ پست اور سب پستیوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ بلند ہے

،وہ سارے عالم کا مخدوم اور ایک ذات کا خادم ہے،اس کے سامنے فرشتوں کو سجدہ کرا کر اس کو اللہ کے سوا ہر ایک کے سجدے سے منع کر کے ثابت کر دیا کہ کائنات کی طاقتیں جن کے فرشتے امین ہیں اس کے سامنے سرنگوں اور سربسجود ہیں اور اس کا سر اس کے جواب میں اللہ کے سامنے جھکا ہوا ہے۔

دنیا کا ذہن اتنا شل ہو چکا تھا کہ وہ مادیت ومحسوسات اور جسم اور پیٹ کے حدود سے باہر آسانی سے کام نہیں کر سکتا تھا، انھوں نے کچھ پیمانے بنا رکھے تھے ہر نئے شخص کو اس پیمانے سے ناپتے تھے، زندگی کی جو چھوٹی چھوٹی بلندیاں بن چکی تھیں، ہر بلند انسان کو انھیں کے سامنے لا کر دیکھتے تھے،انھوں نے بڑے غور وفکر اور ذہانت سے کام لیا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس کے آگے نہ سوچ سکے کہ یا تو وہ مال ودولت کے یا سرمایہ داری و بادشاہی کے یا عیش وعشرت کے طالب ہیں، انصاف کیجئے تو اس وقت تک دنیا کا تجربہ اس سے زیادہ اور کیا تھا اور اس نے اپنے زمانہ کے حوصلہ مندوں اور شہبازوں کی اس بلند پرواز کب دیکھی تھی؟ انھوں نے آپ کی خدمت میں ایک وفد بھیجا، یہ اصل اس عصر کے ذہن ودماغ اور نفسیات کی سچی نمائندگی اور اس نے جو کچھ کہا وہ زمانہ کے احساسات کی صحیح ترجمانی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس کا جواب دیا وہ نبوت کی صحیح نمائندگی اور امت مسلمہ کی حقیقت کا اصلی اظہار تھا، آپ نے ثابت کر دیا، کہ آپ ان میں سے کسی چیز کے طالب نہیں، آپ جس چیز کے داعی ہیں وہ ان کی ان بلند چیزوں سے اس سے بھی زیادہ اونچی ہے، جتنا آسمان اس سے: آپ اپنی ذات راحت اور ترقی کے لئے فکر مند نہیں بلکہ نوع انسانی کی نجات اور راحت کے لئے بے چین ہیں، آپ اس دنیا میں اپنے لئے کوئی مصنوعی جنت بنانے کے خواہش مند نہیں بلکہ جنت سے نکالے ہوئے انسان کو حقیقی جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل کرنا چاہتے ہیں، آپ اپنی سرداری کے لئے کوشاں نہیں بلکہ تمام انسانوں کو انسان کی غلامی سے نکال کر بادشاہ حقیقی کی غلامی داخل کرنا چاہتے ہیں، اسی بنیاد پر امت نبی اور یہی پیغام لے کر دنیا میں پھیل گئی، اس کے سفیروں نے جو اپنے اندر دعوت کی سچی روح اور اسلام کی صحیح زندگی رکھتے تھے، کسریٰ اور قیصر کے بھرے دربار میں صاف کہہ دیا کہ ہم کو اللہ نے اس کام کے لئے مقرر کیا ہے کہ ہم اس کے بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں، دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی

وسعت میں اور مذاہب کی ناانصافی سے نکال کر اسلام کے انصاف میں داخل کریں، ان کو جب اپنے اصولوں پر حکومت قائم کرنے اور چلانے کا موقع ملا تو وہ جو کچھ کہتے تھے اور جس کی دوسروں کو دعوت دیتے تھے، اس کو جاری کر کے دکھا دیا، ان کی معیاری حکومت کے زمانہ میں کسی انسان کی بندگی نہیں ہوتی تھی، بلکہ اللہ کی بندگی ہوتی تھی، کسی انسان یا جماعت کا حکم نہیں چلتا تھا، بلکہ اللہ کا حکم چلتا تھا، ان کا حاکم جس کو وہ خلیفہ کہتے تھے، معمولی سی انسانی تحقیر پر کہہ اٹھتا تھا کہ لوگ ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے تھے،، تم نے ان کو کب سے غلام بنالیا؟ ان کا بڑے سے بڑا حاکم بڑی بڑی بادشاہتوں کے دارالسلطنت میں اس شان سے رہتا تھا کہ لوگ اس کو مزدور سمجھ کر اس کے سر پر بوجھ رکھ دیتے تھے اور وہ اس کو ان کے گھر پہونچا آتا تھا، ان کا دولت مند انسان اس طرح زندگی گزارتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس زندگی اور اس کی راحت کو راحت ہی نہیں سمجھتا اس کی نظر کسی اور زندگی پر ہے اور اس کو طلب کسی اور راحت کی ہے۔

اس امت کا وجود دنیا کے ہر گوشہ میں مادی حقیقتوں اور جسمانی لذتوں کے علاوہ ایک بالکل دوسری حقیقت کے وجود کا اعلان ہے، اس کا ہر فرد پیدا ہو کر بھی اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ دنیا کی طاقتوں سے بڑی ایک دوسری طاقت ہے، اور اس زندگی سے زیادہ حقیقی دوسری زندگی ہے، وہ دنیا میں آتا ہے، تو اس کے کان میں اسی حق کی آواز دی جاتی ہے، مرتا ہے تو اسی شہادت ومظاہرہ کے ساتھ اس کو رخصت کیا جاتا ہے، جب اس دنیا پر بے حسی اور موت کا سکوت طاری ہو جاتا ہے اور شہر کی ساری آبادی معاش کی جدوجہد میں سرتاپا غرق ہو جاتی ہے اور دنیا میں مادی ضرورتوں کے علاوہ کوئی اور ضرورت اور محسوس حقیقتوں کے علاوہ کوئی اور حقیقت جیتی جاگتی نظر نہیں آتی، اس کی وہی اذان اس طلسم کو توڑ دیتی اور اس کا اعلان کرتی ہے کہ نہیں جسم اور پیٹ سے زیادہ ایک دوسری روشن حقیقت ہے اور وہی کامیابی کی راہ ہے ''حی علی الصلوٰۃ حی علی الفلاح'' بازار کا شور اس نعرۂ حق کے سامنے دب جاتا ہے، اور سب حقیقتیں اس حقیقت کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں اور اللہ کے بندے اس آواز پر دیوانہ وار دوڑ پڑتے ہیں، جب رات کو پورا شہر میٹھی نیند سوتا ہے اور یہ جیتی جاگتی دنیا ایک وسیع قبرستان ہوتی ہے، دفعتاً موت کی اس بستی میں زندگی کا چشمہ اس طرح ابلتا ہے، جس طرح رات کی سیاہی میں صبح سپید کی نمود ار ہو'' الصلوٰۃ خیر من النوم'' سے اونگھتی سوتی انسانیت کو تازگی اور زندگی کا نیا پیغام ملتا ہے، جب کسی

طاقت وسلطنت کا کوئی فریب خوردہ ''انا ربکم الاعلیٰ'' (میں تمہارا سب سے اونچا پروردگار ہوں) اور ''مالکم من الٰہ غیری'' (میرے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں) کا نعرہ لگاتا ہے تو ایک غریب مؤذن اسی کی مملکت کی بلندیوں سے ''اللہ اکبر'' کہہ کر اس کے دعوائے خدائی کا تمسخر اڑاتا ہے اور ''اشھد ان لا الٰہ الا اللہ'' کہہ کر حقیقی بادشاہت کا اعلان کرتا ہے اس طرح دنیا کا مزاج بے اعتدالی سے اور اس کا دماغ بہکنے سے محفوظ رہتا ہے۔

اس عرفان، ایمان اور اعلان کا چشمہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کی تعلیم ودعوت ہے، اور اب یہی عرفان، ایمان اور اعلان دنیا کی حیات نو کا سرچشمہ اور ہر صحیح وصالح انقلاب کا واحد ذریعہ ہے)

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

آگ سے خوف......

اسبابِ آگ سے بے خوف

ذیل کا مضمون حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ کی وہ اہم اور دو دو چار کی طرح سمجھ میں آنے والی تقریر ہے جو مولانا نے 18 اکتوبر 1991ء کو مدرسۃ الفلاح اندرو کی مسجد میں جمعہ کے دن فرمائی تھی۔

الحمد للہ و کفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ۔اما بعد. فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم . یاایھا الذین آمنوا قوا انفسکم واھیکم ناراً وقودھا الناس والحجارۃ .

(مومنو اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آتش جہنم سے بچاؤ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں) کی تشریح فرماتے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے فرمایا' لوگ نتائج سے تو ڈرتے ہیں لیکن نتائج پیدا کرنے والے اسباب سے نہیں ڈرتے ہیں۔ یعنی آگ سے تو ڈرتے ہیں لیکن آگ میں لے جانے والے اسباب سے نہیں ڈرتے۔ مرض سے ڈرتے ہیں لیکن مرض پیدا کرنے والے اسباب' غیر صحت بخش آب وہوا' متعفن فضا اور جراثیم سے نہیں ڈرتے۔ اس کھلی ہوئی حقیقت اور روز روشن کی طرح عیاں غلطی میں بڑے بڑے فلاسفہ' علماء اور حکماء سب مبتلا ہیں کوئی اپنی اولاد کو آگ میں نہیں ڈالنا چاہتا لیکن نادانی اور غفلت سے اسباب وہی اپناتا ہے جو آگ میں لے جانے والے ہیں۔

ایک خاتون شادی میں شرکت کے لئے گئیں شادی شادی ہوتی ہے ہر ایک خوش وخرم نظر آتا ہے اپنی خوشی اور بشاشت کا اظہار کرتا ہے مگر ان خاتون کے چہرے پر اداسی بلکہ گھبراہٹ سی طاری تھی عورتوں نے پوچھا بہن! کیا بات ہے آپ نہیں ہنس بول رہی ہیں کیوں خاموش خاموش چپ سادھے بیٹھی ہیں۔ ان خاتون نے جواب دیا بہن میں جب گھر سے نکلی تو میرا بچہ سور ہا تھا میں اسے سوتا چھوڑ کر چلی آئی ہوں فکر لگی ہوئی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جاگے اور وہیں

طاق پر ماچس رکھی ہوئی ہے لے کر کھیلنے لگے جلائے اور اس کے کپڑوں میں آگ لگ جائے۔ عورتوں نے بہت سمجھانا اور مطمئن کرنا چاہا کہ بہن آپ اطمینان رکھیں بچہ جاگے گا تو طاق پر رکھی ہوئی ماچس جو اد پر ہے کیونکر لے گا کیسے اس پر چڑھے گا آپ خواہ مخواہ وہم سے پریشان ہیں ان کو بہت کچھ اطمینان دلایا لیکن اس دور دراز قیاس امکان پر بھی ان کے دل میں جو کھٹک پیدا ہو گئی تھی وہ دور نہ ہو سکی اس لئے کہ ماچس کی تیلی جلانے کا نتیجہ فوراً سامنے آ جاتا ہے۔

مگر ہمارا ہی بچہ جب ایسے طور وطریق اپناتا ہے یا ایسے ماحول میں جاتا ہے ایسی تعلیم وتربیت حاصل کرتا ہے جو اس کو اسلام اور شعائرِ اسلام سے دور لے جاتی ہیں۔ اخلاقی بے راہ روی اور مشرکانہ عقائد کی طرف لے جاتی ہیں۔ خدا فراموشی کی راہ پر ڈالتی ہیں جو سراسر جہنم میں لے جانے والی ہیں تو اس ماں کو ذرا بھی فکر وتشویش نہیں ہوتی اس لئے کہ وہ اس حقیقت پر زیادہ دھیان نہیں دیتی سامنے جو کچھ ہے اس پر اس کی نظر ہے نتائج سے غافل ہے اس لئے بے فکر و مطمئن ہے بلکہ بعض وقت فکر مند ماؤں کو ایسے ہی مطمئن کرنا چاہتی ہے جس طرح گھر میں بچے کو چھوڑ کر شادی میں جانے والی خاتون کو عورتیں مطمئن کر رہی تھیں۔ آپ کیسی ناممکن بات کر رہی ہیں کہیں بچہ دیا سلائی کو پا بھی سکتا ہے۔

آگ سے بچانے کے لئے دینی عقائد کی حفاظت ضروری ہے' یہ ایمان و یقین کہ اس پوری کائنات کا خالق و مالک تنہا ایک خدا کی ذات ہے اور پورے نظام کو وہی چلا رہا ہے اس کے چلانے میں اس کو کسی کی نہ مدد وسہارے کی ضرورت ہے اور نہ وہ انسانوں کی طرح کبھی تھکتا اکتاتا ہے اور نہ اس پر نیند وغفلت طاری ہوتی ہے۔ لاتاخذہ سنوۃ ولا نوم۔

یہ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب کی سچی اور پکی بات ہے اس میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ صد فیصد صحیح ہے۔ (ذلک الکتاب لاریب فیہ یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں (کہ یہ کلام خدا ہے) حوالہ دیں

اس کے بھیجے ہوئے نبی آخر الزماں سچے نبی ہیں اور جو کچھ انہوں نے بتایا اور انسان کو راہ ہدایت دکھائی ہے وہ سب حق ہے۔ قیامت کا آنا یعنی اس دنیا کا جس کی زیب وزینت عیش و آرام میں پڑ کر انسان غفلت کی زندگی گزارتا ہے۔ ایک دن فنا ہو جانا یقینی ہے۔

كل من عليها فان ويبقى وجه ربك ذو الجلال والكرام۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کا وعدہ پورا ہو کے رہے گا۔

الا ان وعد الله حق

(اور یہ بھی سن رکھو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے)

قیامت میں قرآن وحدیث میں دی گئی تعلیمات ہی کے مطابق حساب ہوگا جو اپنے ایمان وعمل میں کھرا نکلے گا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت میں داخل ہو جائے گا اور اس کو ابدی راحت وآرام نصیب ہوگا۔ اور جو ان عقائد میں کچا ہوگا یا اس سے دور جا پڑے گا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈالا جائے گا۔

اب ذرا سوچئے کہ اپنے بچے کو آپ شعوری یا غیر شعوری طور پر کس راہ پر لگا رہے ہیں اس کے لئے کون سے اسباب اپنا رہے ہیں آگ میں لے جانے والے یا اس سے بچانے والے؟

اس روشنی میں اپنے بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت کا انتظام کیجئے ان کے ایمان وعقیدہ کی فکر کیجئے اور اس کے لئے اس ماں کی طرح بے کل وبے چین ہو جایئے جو ایک موہوم خیال اور دور از قیاس بات کے خیال سے خوشی وشادی کے موقع پر بھی اداس بیٹھی تھی کہ کہیں بچہ جاگ کر دیا سلائی اتار کر جلائے نہیں کہ اس کے کپڑوں میں آگ لگ جائے اور وہ جل جائے۔

میرے دوستو اور بھائیو! اس حقیقت پر ذرا سنجیدگی کے ساتھ فکر کے ساتھ حقیقت پسندی کے ساتھ غور فرمایئے کہ اس وقت اپنے بچے کو آپ دین وعقیدہ کی طرف سے غافل ہو کر جو تعلیم دے رہے ہیں وہ آپ کے بچے کو غیر شعوری طور پر کس راہ پر لے جا رہی ہے آگ کے راستہ پر یا اس سے بچانے والے راستہ پر۔

آپ علماء کی تقریریں سنتے ہیں لیکن فائدہ نہیں اٹھاتے۔ آپ اگر آگ میں لے جانے والے اسباب سے ڈرنے لگیں اور فکر ودور اندیشی سے کام لیں اور آخرت میں جو انجام سامنے آنے والا ہے اس پر غور کریں تو اس سے آپ کو وہ فائدہ ہوگا جو مضامین وتقریروں سے بھی نہیں حاصل ہو سکتا۔ اس کا سارا انحصار اس پر ہے کہ فوری اور نقد فائدے پر نہیں بلکہ انجام پر غور فرمائیں۔

آپ اس کو اس مثال سے سمجھئے کہ آپ کا بچہ سائیکل چلا رہا ہے۔ سائیکل میں بریک نہیں

ہے اور بچہ جس راستہ پر سائیکل لے کر جارہا ہے اس راستہ میں بڑے بڑے غار اور کھائیاں ہیں اگر آپ نے اپنے بچے کو اس راستہ پر جانے دیا تو خود سوچئے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ ابھی جب تک بچہ سطح زمین پر سائیکل چلا رہا ہے آپ دیکھ رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں لیکن چند گھنٹوں کے بعد وہ جن کھائیوں میں گر کر ہلاک ہو جائے گا اس پر آپ کی نظر نہیں جارہی ہے۔

ہم نے شروع میں آپ سے کہا تھا کہ لوگ نتائج سے تو ڈرتے ہیں لیکن نتائج پیدا کرنے والے اسباب سے نہیں ڈرتے یعنی آگ سے ڈرتے ہیں لیکن آگ میں لے جانے والے اسباب سے نہیں ڈرتے۔

ابھی ہم مانڈو ہو کر آئے ہیں وہاں کیسے کیسے غار اور کھائیاں ہیں اگر کوئی آنکھ بند کر کے انجام سے بے خبر ہو کر ان کھائیوں کی طرف سائیکل چلائے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟

ہم اس وقت زندگی کے جس راستہ پر چل رہے ہیں اس میں بڑی بڑی کھائیاں ہیں بڑے بڑے غار ہیں۔ اس کی بہت زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ کیسے کیسے ایمان سوز' دین سوز' آخرت کے حساب کتاب اور اس کے برے انجام سے غافل کر دینے والے خوش رنگ و خوش آہنگ حالات ہیں جو ہمارے بچوں کو آگ کے الاؤ میں جھونک دینے کے لئے منہ کھولے ہوئے ہیں مگر ہم اس پر غور نہیں کرتے۔ اس کی فکر نہیں کرتے نقد اور فوری نفع کی تلاش میں بالکل ہی غافل ہیں کہ ہمارا بچہ ہلاکت خیز غاروں اور کھائیوں کی طرف جارہا ہے۔

بچوں کی تعلیم و تربیت کی فکر نہیں کرتے' ان کو صحیح راستہ نہیں بتاتے' بچے کے دل و دماغ میں سب سے پہلی بات یہ بٹھانی چاہیے پہلی نصیحت یہ کرنی چاہیے کہ سب سے بڑا جرم شرک و بدعت ہے یعنی اللہ کے علاوہ کسی اور کو نفع یا نقصان پہنچانے والا سمجھنا خدا کے نزدیک شرک و بدعت نہایت گندی اور گھناؤنی چیز سے بھی گندی ہے مزاروں پر جا کر مانگنا اور اپنی عرضیاں پیش کرنا۔ یہ سب شرکیہ کام ہیں۔ ان سے بچنے کی بچوں کو تربیت دیجئے ان کو ایسی تعلیم دیجئے جو ان خطرناک چیزوں سے ان کو بچا سکے۔ یہ تو صرف خدا کی قدرت میں ہے کہ جو چاہے اور جب چاہے اور جس کے لئے چاہے فیصلہ فرمادے۔

انما امره اذا اراد شيئاً ان يقول له كن فيكون

(اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرمادیتا ہے ہوجا تو وہ ہو جاتی ہے) کسی اور کو یہ قوت وطاقت حاصل نہیں۔

بس! بھائیو آخر میں یہی کہوں گا کہ اپنے بچوں کو متعلقین کو آگ سے بچایئے ان چیزوں سے بچایئے جو آگ میں لے جانے والی ہیں۔ بچوں کو بری صحبت سے بچایئے بری کتابوں سے بچایئے۔ اخلاق بگاڑنے والے رسالوں اور میگزینوں سے بچایئے۔ کالج کی تعلیم کو اسباب زندگی کے طور پر ضرور لایئے لیکن دین اور عقیدہ سے غافل اور اندھے بہرے ہو کر نہ تعلیم دلایئے کہ آپ کے بچوں میں الحاد و دہریت کے جراثیم پیدا ہو جائیں اور وہ آگ کے راستہ پر چل پڑیں۔

اسی کے ساتھ اپنے گھروں اور بیویوں کے حالات کی بھی خبر لیجئے۔ شادی بیاہ میں بے حجابی و بے پردگی سے بچایئے فلموں اور ٹیلیویژن کی حیا سوزیوں سے بچایئے، مجھے تجربہ ہے اور اپنی آنکھوں سے برابر دیکھتا ہوں کہ مجھ کو شادی میں بلایا گیا۔ اور عورتیں بے پردہ بیٹھی ہوئی ہیں، میں نے کہا یہ کیا ہے؟ اور پھر فوراً چلا آیا۔ آپ ان رسوم سے بچئے۔ ان بزرگوں، اللہ کے نیک بندوں اور صالحین کے قصے سنایئے، ان کو قرآن وحدیث کی باتیں بتایئے اور دین کی سیدھی راہ پر چلانے کی فکر کیجئے۔

یہ کیسی ستم ظریفی اور مضحکہ خیز بات ہے کہ آگ سے بچنے کی نصیحت تو کی جائے لیکن اسباب وہ اپنائے جائیں جو آگ میں لے جانے والے ہیں۔ بس بھائیو! آپ غور و فکر سے کام لیں اور اپنی اولاد کو اپنے اہل وعیال اور متعلقین کو ان اسباب سے اور ان فتنوں سے بچانے کی فکر کریں جو آگ میں لے جانے والے ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

سو فیصدی اسلام مطلوب ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم o الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین و خاتم النبیین محمد و آلہ وصحبہ اجمعین اما بعد! اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃً ولا تتبعوا خطوات الشیطان انہ لکم عدو مبین۔

حضرات! ابھی آپ کے سامنے جو خطبہ استقبالیہ پڑھا گیا ہے اس میں میرے خاندان کا اور میرے بزرگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ غازی پور سے ان بزرگوں کا جو تعلق رہا ہے وہ قابل قدر ہے اور میرے لئے بھی فخر کی بات ہے۔ آپ حضرات نے جس محبت واحترام اور برادرنوازی کا ثبوت دیا ہے اس کا تقاضا ہے کہ میں بھی آپ کی خدمت میں وہ چیز پیش کروں جو بہتر سے بہتر تحفہ ہو۔ آپ نے میری خاطر داری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی' محبت سے پیش آئے اس لئے احسان شناسی کا' تشکر اور شرافت کا' یہ تقاضا ہے کہ اپنے میزبانوں کے لئے جو قیمتی سے قیمتی چیز ہو وہ پیش کردوں جو عمر بھر کے لئے' اجتماعی زندگی کے لئے' ذاتی زندگی کے لئے' دعوتی زندگی اور نمونہ والی زندگی کے لئے کافی ہو۔

آپ کے سامنے میں نے ابھی قرآن حکیم کی ایک آیت پڑھی ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ اسلام کا مطالبہ ہے کہ سو فیصدی مسلمان سو فیصدی اسلام میں داخل ہو جائیں۔ ان الفاظ پر آپ غور کریں۔ مطالبہ ان سے ہے جو ایمان والے ہیں۔ کلمہ پڑھنے والے ہیں' اسلام کو اپنا مذہب بنانے والے ہیں۔ مطالبہ دس بیس یا پچاس فیصدی سے نہیں ہے بلکہ سو فیصدی سے ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ سو فیصدی مسلمان جنہوں نے کلمہ پڑھ لیا اور اعلان کر دیا کہ ہم مسلمان ہیں بس ان پر اسلام کا قانون لاگو ہو گیا۔ کوئی استثنا نہیں' کسی قسم کا ریزرویشن یا کوٹہ نہیں۔ اسلام کے قوانین پر ان ضوابط پر عمل کرنا ہو گا' مسلمان بھی سو فیصدی اور اسلام بھی سو

فیصد ملی۔ کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اسلام بحیثیت عقیدے کے مقبول ہے۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ہمارا ایمان ہے لیکن فرائض کے مقابلہ میں ذرا استثناء چاہیے کیونکہ ہم بہت مشغول ہیں۔ بڑی محنت سے کمانا پڑتا ہے' بڑی محنت سے اپنی اور اپنے گھر والوں کی گذر اوقات کا سامان کرنا پڑتا ہے۔ یہ پانچ وقت کی نمازیں ہمارے اوپر بڑی بھاری ہیں' اس میں تھوڑی سی رعایت کر دیجئے۔ ہم مغرب اور عشاء کی نماز دفتر سے آ کر پڑھ لیا کریں گے۔ فجر کی نماز سب سے زیادہ مشکل ہے۔ رات میں بہت دیر سے سونا ہوتا ہے اور دوسری تین گھنٹوں کے بعد فجر کا وقت ہو جاتا ہے۔ ظہر کی نماز کا وقت خاص کاروبار کا وقت ہوتا ہے۔ اگر ہم طالب علم ہیں تو اسکول کالج میں ہیں۔ لیکچرار یا پروفیسر ہیں تو یونیورسٹی میں ہیں۔ اگر ہم دفتر کے ملازمین ہیں یا تاجر ہیں تو یہی وقت بڑی مصروفیت کا ہوتا ہے' لیکن دین کا خرید و فروخت کا ہے۔ ظہر و عصر کا وقت بازاروں کی رونق کا وقت ہے۔ سانس لینے کا بھی موقع نہیں ملتا لہٰذا ہمیں اس سے مستثنیٰ کر دیں۔ ہمارے لئے یہ پانچوں وقت کی پابندی بہت مشکل ہے۔ بیشک ہم مسلمان ہیں لیکن ہمیں اس میں کچھ رعایت چاہیے۔ سن لیجئے کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن میں صاف لکھا ہوا ہے کہ نماز سب پر فرض ہے' وقت کی پابندی کے ساتھ' فجر کی نماز سورج نکلنے سے پہلے' ظہر کی زوال کے بعد عصر کی غروب سے پہلے اور مغرب کی سورج غروب ہونے کے بعد عشاء کی نماز جب عشاء کا وقت داخل ہو جائے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ٹھیک ہے نمازیں بہت ضروری ہیں اور اس میں استثناء بھی نہیں ہے مگر یہ روزے تو بہت مشکل ہیں اس کے رکھنے سے آدمی کمزور ہو جاتا ہے۔ صحت خراب ہو جاتی ہے اور ہماری تو صحت یوں ہی اکثر خراب رہتی ہے اور پھر یہ زمانہ ہے مشغولیت کا' یہ موسم ہے گرمی کا۔ اس میں تو روزوں کی پابندی کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

ابھی مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ ہم ایک بار مسلم پرسنل لاء کے سلسلہ میں راجیو جی سے ملنے گئے ہم نے ان سے کہا کہ بات کو کسی نتیجہ تک پہنچا دیجئے کیونکہ روزہ آنے والا ہے۔ رمضان میں میرا آنا بہت مشکل ہوگا۔ ہم رائے بریلی کے رہنے والے ہیں وہاں سے اتنا لمبا سفر کر کے آنا میرے لئے ممکن نہ ہوگا۔ راجیو جی نے بڑے بھولے پن سے کہا۔ مولانا صاحب! آپ روزہ جاڑوں میں کیوں نہیں رکھتے؟ میں نے فوراً ان سے کہا' یہ بات اب کسی سے نہ کہیے گا ورنہ

پرسنل لاء سے بڑھ کر دوسرا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ واویلا مچ جائے گا' ہو سکتا ہے بات پریس میں آ جائے کہ راجیو جی نے مولانا علی میاں سے کہا ہے کہ مسلمان اپنے روزے جاڑوں کے موسم میں ہی رکھا کریں۔ روزہ تو اپنے وقت ہی سے ہو گا چاہے گرمی میں ہو یا جاڑے میں یا برسات میں۔ سب کو رکھنا ہو گا اور اس کے وقت پر رکھنا ہو گا۔ کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ زکوٰۃ کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ سال کے آخر میں سارے مال پر دولت پر ایک ایک پائی جوڑ کر زکوٰۃ نکالی جائے۔ یہ تو بہت مشکل ہے ہمیں تو اس سے معاف ہی رکھیے۔ ہم یہ عرض کریں گے کہ اسلام کے ارکان میں سے زکوٰۃ بھی ایک رکن ہے۔ اسلام کی عمارت اس پر ٹکی ہوئی ہے اس عمارت کو آپ کمزور کیوں کرتے ہیں۔ اس کے بعد حج کا معاملہ آتا ہے اتنا لمبا سفر اور اتنے کثیر اخراجات۔ جان کا خطرہ الگ' فی زمانہ کوئی زیادہ خطرہ نہیں ہے لیکن ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے سمندری سفر کے خطرات کی وجہ سے حج ترک کر دیا تھا اور بعض علماء نے یہ فیصلہ دیدیا تھا کہ حج ہندوستان کے مسلمانوں پر فرض نہیں ہے۔ ابھی خطبہ استقبالیہ میں بھی تذکرہ کیا گیا کہ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے مقدس حج کے فریضہ کو دوبارہ شروع کیا' زندہ کیا۔ اس زمانہ میں بادبانی جہاز تھے' اس میں چادریں لگا دی جاتی تھیں۔ ہوا کے رخ پر وہ جہاز چلتے تھے۔ اتنا وقت لگتا تھا کہ بعض مرتبہ حج کا وقت نکل جاتا تھا۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ ہوا ان بادبانی جہازوں کہیں اور پہنچا دیتی تھی۔ حضرت سید احمد شہید نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ کہیں حج کی عبادت ہی ہندوستان کے مسلمانوں میں ختم نہ ہو جائے اس لئے آپ نے حج کے سفر کا ارادہ کیا۔ فیصلہ اور اعلان کر دیا کہ جس کا دل چاہے ہمارے ساتھ حج کے لئے چلے۔ جیسے بھی ہو گا' محنت مزدوری کرنی پڑے گی تو کریں گے مگر حج ضرور کریں گے جو لوگ جائیں گے ان کا کھانا پینا ہمارے ذمہ ہو گا۔ رائے بریلی سے سید صاحب ڈلمو آئے' کشتی سے ہوتے ہوئے غازی پور آئے اور پھر واپسی میں غازی پور سے گزرنا ہوا۔ انہوں نے حج کے فریضہ کو زندہ کرنے کے لئے اتنا بڑا اقدام کیا جس کی کوئی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں' بادشاہوں کی زندگیوں میں' بزرگوں کے حالات میں نہیں ملتی۔ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں نے حج کا سفر کیا ہو' اس کی کوئی تاریخ ہمیں نہیں ملتی۔

میں تاریخ کا طالب علم ہوں اور تاریخ نگار بھی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی تاریخ

میں کہیں نہیں ملا کہ اتنی بڑی جماعت کے ساتھ کسی نے حج کیا ہو۔ جب سید صاحب کلکتہ پہنچے تو یہ حالت تھی کہ انگریز تک تماشہ دیکھنے آئے۔ مکانات کی چھتوں پر چڑھ کر دیکھ رہے تھے کہ آخر کیا بات ہے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ سات سو آٹھ سو آدمیوں کا کھانا سید صاحب کے ذمہ تھا۔ لوگ توبہ کر رہے ہیں، لوگ اسلام لا رہے ہیں، عجیب منظر تھا۔ گویا ایک زلزلہ سا آ گیا تھا۔ دینی زلزلہ روحانی زلزلہ۔

ہماری گفتگو اور ہمارے دلائل سے مطمئن ہو کر اگر کوئی صاحب یہ فرمانے لگیں کہ مولانا صاحب! آپ کی باتیں ٹھیک ہیں، ہم سے نمازوں یا روزوں کی ادائیگی و پابندی میں کوتاہی ہو جائے سستی ہو جائے لیکن ہم بہرحال مانتے ہیں کہ یہ اسلام کے فرائض ہیں لیکن یہ بھی خیال کیجئے کہ یہ ہماری شہری زندگی ہے، کچھ معاشرتی طریقے ہیں۔ برادرانہ زندگی ہے، پڑوس کے معاملات ہیں، برادران وطن سے ہمارے کچھ تعلقات ہیں۔ ہمارے خاندان کے کچھ مخصوص رسم و رواج ہیں۔ ہماری برادری کے مقرر کردہ کچھ ضوابط ہیں۔ ہماری حیثیت عرفی کے کچھ تقاضے ہیں۔ ہم ایک Social Class سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ہمیں کم از کم شادی بیان اپنے ڈھنگ سے اور اپنی پسند سے کرنے دیجئے۔ اگر آپ بڑے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں تو ظاہر ہے شاندار شادی کریں گے۔ ہزاروں لوگوں کو شادی میں بلائیں گے۔ لڑکی کو اتنا جہیز دیں گے اور اپنی دولت وثروت کا ایسا مظاہرہ کریں گے کہ لوگ حیران رہ جائیں گے۔ ولیمہ کی دعوت میں آدھا شہر اُمڈ پڑے گا۔ آپ یہ کہیں گے کہ ایسے موقعوں پر ہمارے اوپر کوئی پابندی نہ لگائی جائے، ہم جو چاہیں کریں۔ جیسے چاہیں کریں۔ جائیداد گروی رکھنی پڑے، کھیت بیچنا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کوئی ہمارے آڑے نہ آئے تو میں آپ کو بتاتا ہوں اسلام اس کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔ اسلام نے زندہ رہنے کا ایک طریقہ بتایا ہے۔ عبادات کا ایک ضابطہ مقرر کیا ہے، کچھ اصول دیئے ہیں حدود مقرر کئے ہیں۔ آپ اس سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اگر میری بات آج ذرا سخت معلوم ہو تو آپ معاف کریں گے۔ کہیں آپ یہ نہ سوچنے لگیں کہ ہم تو آئے تھے کچھ اور سننے کے لئے۔ صحابہؓ کے واقعات، بزرگوں کی کرامات، علمی نکتے سننے کے لئے آئے تھے، تو خدا کا شکر ہے یہ چیزیں ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں ہیں۔ ایک علمی مرکز سے ہمارا تعلق ہے، دوسرے ملکوں میں جانا ہوتا ہے۔ یونیورسٹیوں کی سطح کے مطابق ان کی اکیڈمی کی سطح

کے مطابق تقریریں کرنی ہوتی ہیں مگر میں اس وقت آپ سے صاف صاف اور کھری کھری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ بہت ایمانداری اور دیانتداری کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس میں استثناء ہے ہی نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ عبادات میں تو آپ مسلمان رہیں مگر معاملات میں کچھ اور بن جائیں۔ آپ کو یہ حق نہیں ہے کہ عائلی قانون میں' پرسنل لاء میں Social Life میں آزادی کا مظاہرہ کریں' جس طریقہ سے چاہیں رہیں اسی طرح آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ماں باپ بھائی بہن کے حقوق ادا کرنا' بیوی کے حقوق ادا کرنا' پڑوسیوں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم رکھنا اور اتنے بڑے قانون و دستور اور ضابطہ حیات کی پابندی کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا۔

ادخلوا فی السلم کافۃ

اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ لفظ اسلام کی جگہ سلم کا استعمال کیا۔ یہ س ل م کے اصلی حروف ہیں سلم کا مطلب ہے Surrender کرنا یعنی سپردگی۔ اسلام حوالگی کا نام ہے۔ یعنی ہماری مصلحت' ہماری خواہش' ہمارا مفاد' ہماری روایات' ہمارا طرز زندگی' ہماری تاریخ یہ چیزیں کوئی سند نہیں ہیں۔ ہم خدا کے ماننے والے ہیں' رسول ﷺ کے ماننے والے ہیں۔ اسلامی قوانین کو' اسلامی طریقہ زندگی کو قبول کرنے والے ہیں اور اس کے تمام شعبوں کے ساتھ قبول کریں گے۔ وعظوں اور جلسوں میں یہ باتیں کم کہی جاتی ہیں۔ وہ باتیں جو دل کو خوش کرنے والی ہیں معلومات میں اضافہ کرنے والی ہیں' خطیب کی دھاک بٹھانے والی ہیں' ان کا رعب جمانے والی ہیں وہ کہی جاتی ہیں مگر روزمرہ کی باتیں' عملی باتیں کم کہی جاتی ہیں۔

میں نے اپنی تقریر کے آغاز میں جو آیت پڑھی تھی اسی کی تشریح آپ کے سامنے کر رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ قرآن کا پیغام آپ کے دل میں اتر جائے۔ آپ کی زندگی میں انقلاب آ جائے۔ آپ کی فکر اور سوچ بدل جائے۔ اسی لئے میں بار بار یہ فقرہ دہرا رہا ہوں کہ مسلمان سو فیصدی مسلمان بن جائیں' وقتی مسلمان نہیں دائمی مسلمان ہر جگہ مسلمان۔ مسلمانوں میں ایک طبقہ ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے' اس نے اپنا الگ معاشرہ بنا رکھا ہے۔ اپنی مرضی کے مطابق' اپنی

علمی سطح کے مطابق وہ قدم قدم پر رعایت اور ریزرویشن چاہتا ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ غریب طبقہ یا متوسط طبقہ کے مسلمانوں کے ساتھ اسلام کا جو معاملہ یا مطالبہ ہے وہ خوش حال طبقہ کے مسلمانوں کے ساتھ نہ ہو۔ اعلیٰ سطح کے جو لوگ ہیں ان کے لئے اسلام کا کوئی دوسرا ایڈیشن تیار کیا جائے۔ ان پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ جس طرح چاہیں رہیں سہیں۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ پاؤں مسجد کے اندر رکھ دیا اور سارا دھڑ باہر کر دیا۔ مسجد کے کنارے کھڑے ہیں اور نہ وضو سے مطلب نہ نماز سے مطلب اور کہتے یہ ہیں کہ دیکھئے ہم مسجد میں داخل ہو گئے یہ مسجد میں داخل ہونا نہیں ہے۔ مسجد میں پورے جسم کے ساتھ داخل ہوں۔ مسجد میں داخل ہونے کا جو حق ہے' جو فریضہ ہے۔ مسجد جس چیز کا مطالبہ کرتی ہے جس مقصد کے لئے بنائی گئی ہے اس کو پورا کیجئے۔

میرے بھائیو! اسلام ایک مکمل دین اور مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہ دین اللہ کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ اس کو عقل پر مصلحتوں پر اور کسی ملک کے ماحول پر نہیں چھوڑا گیا ورنہ پھر یہ ہوتا کہ ہندوستان کا اسلام کچھ اور ہوتا مصر کا کچھ اور ہوتا' سعودی عرب کا اور ہوتا انگلینڈ اور امریکہ کا دوسرا ہوتا۔ اسلام کے ماڈل دنیا میں الگ الگ ہوتے۔ آپ آنکھ بند کر کے دنیا کے آخری کونے تک چلے جائیے جہاں مسلمان ہیں' نماز کا وقت آئے' یہی نہیں کہ آپ وہاں نماز پڑھ سکتے ہیں بلکہ بے تکلف پڑھا بھی سکتے ہیں۔ کتنے ہندوستانی ہیں جو عرب ممالک میں امام ہیں۔ ہمارے کتنے مدرس عرب گئے' فضلاء گئے ہیں' خطبہ دیتے ہیں' حج کرتے ہیں' وہاں حج کے طریقے بتاتے ہیں۔ یہ اسلام ہی کی خصوصیت ہے ہم مراکش گئے' دمشق گئے تو وہاں یونیورسٹی کی مسجد میں جمعہ کے دن ہم سے نماز پڑھانے کے لئے کہا گیا۔ ہم نے وہاں نماز پڑھائی خطبہ دیا۔ ہمیں نہیں سوچنا پڑا کہ یہاں کس طرح نماز پڑھی جاتی ہے اور کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں نہیں پوچھنا پڑا کہ یہاں خطبہ نماز سے پہلے دیا جاتا ہے یا بعد میں' یہی ایک دین ہے جس کو گائیڈ بک کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام ایک آفاقی اور عالمی دین ہے۔ اسلام ایک Universal Law ہے جو چیز اچھی ہے ہر جگہ اچھی ہے۔ جو چیز بری ہے ہر جگہ بری ہے' جو حرام ہے ہر جگہ حرام ہے۔

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ جو چیز ایک جگہ حرام ہے دوسری جگہ حلال اور جائز قرار دی جائے۔

آج کل مسلمانوں نے لاٹری خریدنا شروع کر دیا ہے۔ جوا کھیلنا' نشہ آور چیزیں استعمال

کرنا‘ سینما اور ٹی وی وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا۔ یہ سب برائی ہیں۔ خرابی کی جڑ ہیں۔

ایک بات اور سمجھانا چاہتا ہوں۔ اسلام جغرافیائی تغیر کا قائل ہے نہ تاریخی تغیر کا‘ یہ بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اسلام میں ایسی کوئی تفریق نہیں ہے کہ ایک طبقہ کا دین کچھ ہے اور دوسرے طبقہ کا دین کچھ اور ہے۔ قدیم مسلم گھرانوں کا دین کچھ اور ہے اور نئے نئے اسلام میں داخل ہونے والوں کا کچھ اور ہے۔ دین اسلام ہی ایک دین ہے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔ یہ دین عالمی ہے۔ دائمی ہے۔ ابدی ہے اور روحانی ومکانی وطبقاتی ہے۔ اس دین میں کسی کے لئے کسی قسم کی چھوٹ نہیں ہے۔ خلفاء راشدین تھے‘ سلاطین تھے‘ ہارون رشید ہوں‘ عالمگیر ہوں‘ شاہ جہاں ہوں اور کوئی اور بڑے سے بڑا بادشاہ رہا ہو سب کے لئے ایک دین تھا۔ وہی فرائض‘ وہی ارکان وہی اسلامی تہذیب۔ سلام سب کا ایک یعنی السلام علیکم وعلیکم السلام۔ یہ نہیں کہ آداب عرض کہہ دیا یا ہاتھ اٹھا دیا۔ اسلام نے پوری دنیا کے لئے ایک نقشہ بنا دیا ہے۔ قرآن موجود ہے حدیث موجود ہے‘ سیرت موجود ہے‘ تاریخ موجود ہے۔ مسلمان چودہ سو سال سے اسی پر چل رہے ہیں۔ یہی دنیا کا تنہا دین ہے جس کی شکل اب تک نہیں بدلی ہے۔ دوسرے مذہب وہ مذہب نہیں ہے جو ہمارے پیغمبر لائے تھے۔ ابھی ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ Islam or the true cristianity جس کا تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت سے ہے۔ یہ ایک عیسائی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کے مصنف نے بھی اعتراف کیا ہے کہ موجودہ Christianity سینٹ پال کی بنائی ہوئی ہے۔ رومن میتھالوجی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر لٹکایا جانا یا اسی طرح کی دوسری چیزیں سینٹ پال کی گڑھی ہوئی ہیں۔ اصلی مسیحیت اسلام کے مطابق تھی۔ اس کو تبدیل کیا گیا ہے۔ اسلام واحد مذہب ہے جس میں کوئی رد و بدل نہیں کیا گیا۔ اپنے Original Form میں آج بھی موجود ہے۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مجھے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ ہندوستان اکالۃ الامم یعنی قوموں کو کھا جانا والا ہے۔ یہاں جو چیزیں پہنچتی ہیں وہ تحلیل ہو جاتی ہیں۔ اپنی اصلی شکل کھو دیتی ہیں۔ یہاں کتنے ہی ایسے مذاہب ہیں جنھوں نے یہاں گھل مل کر اپنی شکل کو کھو دیا۔ ان کو پہچاننا مشکل ہے۔ ہندوستان میں آ کر کچھ سے کچھ ہو گئے۔ اسلام الحمدللہ اپنی پوری شکل میں موجود ہے۔ ہم یہاں سے مصمم ارادہ کر کے اٹھیں کہ ہم سو فیصدی مسلمان سو فیصدی اسلام میں داخل ہوں۔

یہ نہیں کہ آدھا اسلام ہو اور آدھا اپنے زمانے کا رسم و رواج ہو مصلحتیں ہوں زمانے کے تقاضے ہوں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم یہاں رہیں تو یہاں کی قوموں کی تقلید بھی کریں۔ ان کا بھی رنگ قبول کریں ان کے ہم رنگ ہو جائیں۔ جس طرح دوسرے لوگ بیاہ شادی کرتے ہیں ہم بھی کرنے لگیں۔ فرق و امتیاز باقی رکھنا پڑے گا۔ گھریلو زندگی ہو یا تجارت کا میدان زراعت ہو یا صنعت و حرفت قانون ہو یا معاشرتی زندگی شادی بیاہ کی تقریبات ہوں یا غمی کی۔ ہر موقع پر ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ اسلام کیا چاہتا ہے۔ ہمیں کسی وقت بھی من مانی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

ان صلوٰۃ ونسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین.

ہماری نمازیں ہماری عبادتیں اور ہمارا جینا مرنا سب اللہ ہی کے لئے ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ بعض برادریوں نے شادی بیان میں فضول خرچی دکھاوے اور جہیز کی لعنت سے بچنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور سادگی کہ ہم چار پانچ آدمی لڑکی کے گھر جاتے ہیں اور نکاح پڑھا کر دلہن لاتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ سارے عالم اسلام میں اس کی تقلید کی جائے۔

آج اسلامی قوانین میں مداخلت ہو رہی ہے۔ ہمارے پرسنل لاء پر حملے ہو رہے ہیں۔ یہ ایک طرح کی سزا ہے جو ہمیں مل رہی ہے کیونکہ ہم نے خود اسلام کے قوانین کو پس پشت ڈال کر من مانی حرکتیں شروع کردی ہیں۔ ہم خود اس میں ترمیم کرتے ہیں ہم خود عمل نہیں کرتے۔ دوسروں سے کیا کہیں۔

ہم مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ایک خادم اور ترجمان کی حیثیت سے صاف صاف کہتے ہیں کہ ہم نہ حکومت کو اس کا حق دیتے ہیں نہ عدالت کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ ہمارے قانون جو فی الاصل خدا کا قانون ہے جس پر ہم ایمان لائے ہیں اس میں کسی قسم کی ترمیم یا ردو بدل کرے۔

وادی کشمیر میں توحید خالص کا پہلا پیغام اور اس کے علمبردار

حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمہ اللہ کی یہ تقریر یکم محرم الحرام ۱۴۰۲ھ (۳۰ اکتوبر ۱۹۸۱ء) بروز جمعہ مسجد سری نگر میں نماز جمعہ سے پیشتر ایک مجمع عظیم کے سامنے ہوئی جس میں ہزاروں کی تعداد میں سری نگر اور اطراف کے مسلمان شریک تھے۔

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره،ونومن به ونتوكل عليه و نعود بالله من شرور انفسنا و من سيات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلاهادى له و نشهد ان لااله الا الله وحده لاشريك له ونشهد ان سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله صلى الله عليه وعلى اله واصحابه أجمعين ومن تبعهم باحسان و دعا بدعوتهم الى يوم الدين.

اعوذ بالله من الشيطان الرجيم

ماكان لبشر ان يؤتيه الله الكتٰب والحكم والنبوة ثم يقول للناس كونو عباداً لى من دون الله ولكن كونو ربانيين بما كنتم تعلّمون الكتٰب وبما كنتم تدرسون ، ولايامركم ان تتخذو الملائكة والنبيّين ارباباً ايأمركم بالكفر بعد اذانتم مسلمون (آل عمران 79-80)

ترجمہ: کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں اللہ تو اسے کتاب، حکمت اور نبوت سے سرفراز فرمائے اور اس کا شیوہ بن جائے کہ لوگوں سے کہتا پھرے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ اللہ والے بن جاؤ یہ اس لئے اور بھی کہ تم کتاب آسمانی کے پڑھانے پڑھنے میں مشغول رہتے ہو تو وہ تم کو اس کا حکم دے گا کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو اپنا

پروردگار بنالو کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ وہ تمہیں کفر کا حکم دے بعد اس کے کہ تم اسلام (دین توحید خالص) میں داخل ہو چکے ہو؟

بھائیو اور دوستو! جیسا کہ ابھی محترم میر واعظ مولانا محمد فاروق صاحب نے فرمایا کہ میں یہاں 36 سال کے بعد آیا ہوں عمر وصحت کا قافلہ جس رفتار جارہا ہے اس لحاظ سے مستقبل کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ سب ارادہ الٰہی پر موقوف ہے۔ میں جب 36 برس قبل یہاں آیا تھا تو اس وقت میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بقید حیات تھے میں ان کا مہمان تھا ان سے میرا تعارف ہندوستان میں نئی دہلی نظام الدین کے تبلیغی اور ندوۃ العلما کے تعلیمی مرکز میں ہوا تھا جب میں نے یہاں قدم رکھا تو بے اختیار وہ دور یاد آ گیا، وہ منظر یاد آیا جب وہ اسی منبر جامع مسجد سے قرآن وحدیث کے ارشادات کے موتی کی طرح بکھیرتے تھے آج ان کی صورت (تخلیل کی آنکھوں سے) سامنے ہے۔ میں اس بار جب آیا ہوں تو وہ اپنے مالک وخالق کے پاس پہنچ چکے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ہمارے موجودہ میر واعظ مولانا محمد فاروق صاحب کی زندگی اور علم وعمل میں ترقی عطا فرمائے (آمین)

میرے بھائیو! جو مسافر اتنے دنوں کے بعد آیا ہو، اور اسے آئندہ آنے کی یقینی وقطعی طور پر امید نہ ہو، اس کو آپ کی خدمت میں کیا تحفہ پیش کرنا چاہئے؟ ایسے موقعہ پر آدمی اپنا دل اور کلیجہ نکال کر رکھ دیتا ہے۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ فقیر کے پاس جو قیمتی سے قیمتی تحفہ ہے وہ آپ کے سامنے رکھ دے۔ اور وہ فقیر کی ملکیت نہیں اس کے گھر کی چیز نہیں وہ اسے اللہ کی طرف سے کلام الٰہی کے ذریعہ ملی ہے۔ یہ دولت سب کو وہیں سے ملی ہے اور جس کو ملے گی قیامت تک وہیں سے ملے گی۔ ہدایت کا سرچشمہ اور منبع ایک ہی ہے اس لئے میں آپ کے سامنے سب سے ضروری پیام اور سب سے ضروری سبق دہرانا چاہتا ہوں۔

ابھی میر واعظ صاحب نے چند مبارک نام لئے ان میں ایک مبارک نام حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کا ہے۔

بان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

میرا ان کے سلسلہ اور ان کی ذات سے ایک طرح کا خاندانی تعلق ہے وہ اس طرح کہ وہ

اور میرے جد امجد امیر کبیر سید قطب الدین محمد مدنیؒ ایک ہی سلسلہ کے تھے (۱) اور مجھے ان سے ایک قلبی ربط محسوس ہوتا ہے، میں آپ سے پوچھتا ہوں حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کو ختلان (۲) سے کونسی چیز کھینچ کر یہاں لائی، کیا اس حسین وادی کا حُسن کھینچ کر لایا؟ کیا سلسلۂ ہمالیہ کی چوٹیوں کی بلندی اور وادیوں کی شادابی کھینچ کر لائی؟ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ جس خطہ سے آئے تھے، وہ بھی حسین خطہ تھا، پھلوں اور پھولوں سے بھرا ہوا تھا، پھر کیا چیز ہے، جو ان کو یہاں لائی؟ آپ ہر وقت ان کا نام لیتے ہیں، اللہ کا شکر ہے، آج صدیاں گذرنے کے بعد بھی آپ کا ان سے تعلق قائم ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی کوششوں اور اخلاص وروحانیت کی برکت سے ابھی یہاں اسلام محفوظ ہے۔

حضرت میر سید علی ہمدانی کی تڑپ

میں آپ کو بتاؤں کہ وہ کون سی چیز تھی جو ان کو کھینچ کر لائی؟ وہ ایک غیرت تھی جس کو اپنے محبوب سے زیادہ محبت ہوتی ہے، اس کی ذات وصفات کی زیادہ معرفت ہوتی ہے، اور اس کے محاسب وکمالات پر زیادہ یقین ہوتا ہے، اس میں اتنی ہی اپنے محبوب کے بارے میں غیرت ہوتی ہے، ایک ناواقف آدمی لعل وجواہر کو اینٹ پتھر کی طرح ڈال دیتا ہے، قیمتی ہیرے کو ناواقفی سے توڑ دیتا ہے لیکن جوہری کو دیکھئے کہ وہ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے اور اس کی کس طرح حفاظت کرتا ہے ایسے ہی باغبان کو دیکھئے وہ کس طرح ایک ایک پھول پر قربان ہوتا ہے اور اس کو پسند نہیں کرتا کہ اس پر کوئی شکن آئے، بلبل سے پوچھئے گل کے متعلق، پروانوں سے پوچھئے شمع کے متعلق، عاشق سے پوچھئے معشوق کے متعلق، اور خدا کے پیغمبروں اور اس کے عارفوں سے پوچھئے توحید کے متعلق۔

---

(۱) امیر کبیر سید قطب الدین محمد مدنی (متوفی ۶۷۷ھ) ابوالجناب حضرت نجم الدین کبریٰ (م ۶۱۰ھ) کے خلفاء میں سے تھے جن کے سلسلہ میں امیر علاء الدولہ سمنانی کی شاخ پر ثمر سے امیر کبیر سید علی ہمدانی (م ۷۸۶ھ) منسلک اور وابستہ تھے یہ سلسلہ سہروردیہ تھا جو کشمیر میں کبروی، بہار میں فردوسی اور دکن میں جنیدی کہلاتا ہے حضرت شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری (مخدوم بہاری) (م ۷۸۶ھ) اسی سلسلہ کے مشائخ بہار میں تھے جن کے مکتوبات صدی مشہور ہیں (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ سوم)

(۲) ختلان ماوراء النہر کے علاقہ میں سمرقند کے قریب شہروں کا ایک مجموعہ ہے، جو دریائے جیحون کے بالائی حصہ پر واقع ہے، اس ضلع کے ایک شہر یا مقام کو ختل بھی کہتے ہیں جمع کے موقع پر ختلان بولتے ہیں (مراصد الاطلاع، دائرہ معارف اسلامیہ وغیرہ)

آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم توحید کے سب سے بڑے امین اور اس کے سب سے بڑے مبلغ وداعی اور اس کے عارف وحقیقت شناس تھے، صدیوں سے انہی کی پائی ہوئی دولت ہے، جواب تک بٹ رہی ہے اور قیامت تک بٹتی رہے گی ہمارے اور آپ کے دامن میں بھی خدا کے فضل سے وہی دولت موجود ہے۔ آنحضرت ((روحی فداہ) سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والے سب سے زیادہ اللہ کو پہنچاننے والے سب سے زیادہ اللہ کو چاہنے والے سب سے زیادہ اللہ پر قربان ہونے والے تھے۔ اس لئے آپ کی غیرت کا بھی یہ حال تھا کہ ایک شخص نے صرف یہ کہہ دیا کہ۔

من يطع الله ورسوله فقد رشد و من يعصهما فقد غوى.

جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ ہدایت پائے گا اور جو نافرمانی کرے گا وہ گمراہ ہوگا۔

آپ اس کو برداشت نہیں کرسکے اور آپ سے سنا نہ گیا فرمایا ''**بئس الخطيب انت قل ومن يعص الله ورسوله**''(۱) (تمہیں بات کرنیکا سلیقہ نہیں (الگ الگ) یوں کہو کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ گمراہ ہوگا۔) ایسے ہی ایک شخص نے کہا'' **ماشاء الله و شئت**'' (اگر اللہ اور آپ چاہیں تو یہ کام ہو جائے) آپ نے فرمایا'' **جعلتني والله عدلاً قل ماشا الله وحده**''(۲) (تم نے مجھے خدا کا ہمسر بنا دیا؟) نہیں'' ماشاء اللہ وحدہ'' (جو تنہا خدا چاہے)

محبت وغیرت لازم وملزوم

یہ ہے غیرت کا عالم، ایک عاشق صادق کو جتنی محبت ہوتی ہے اتنی ہی غیرت ہوتی ہے غیرت تابع ہے محبت کے، غیرت تابع ہے علم کے، غیرت تابع ہے خلوص ہے، اگرچہ سوءادبی ہے لیکن اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی دیکھئے میاں بیوی کا تعلق کیسا نازک ہوتا ہے، کتنا قریبی، کتنا دائمی، اور کتنا مخلصانہ ہوتا ہے تو شوہر کی غیرت بیوی کے بارے میں اور بیوی کی غیرت شوہر کے بارے میں کتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے شوہر یہ برداشت نہیں کرسکتا۔

---

(۱) صحیح مسلم ج ا ص ۲۸۶ (کتاب الجمعہ)

(۲) مسند احمد ج ا ص ۲۸۳

(اگر وہ شریف مرد ہے اور صحیح معنیٰ میں غیرت دار ہے) کہ اس کی بیوی پر غیر کا سایہ پڑے، کسی سے تھوڑا سا بھی علاقہ ہو، کسی کی طرف اس کا میلان ظاہر ہو جائے، چونکہ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی قدس سرّہ عارف باللہ تھے، ولی کامل تھے، عاشق خدا تھے، عاشق رسول تھے، خداشناس، دین کے مزاج آشنا اور نباض تھے اس لئے آپ کو دین کے بارے میں غیرت بھی ایسی تھی کہ لاکھوں کروڑوں آدمیوں میں نہیں ہوتی۔ انہوں نے سنا کہ کشمیر ایک طویل وعریض وادی ہے وہاں کے لوگ خدا سے ناآشنا ہیں۔ وہاں خدا کی ذات کے سوا خالق کائنات کے سوا، وحدہ لاشریک کے سوا بہت سی چیزیں پوجی جارہی ہیں۔ اصنام کی پرستش ہوتی ہے کچھ چیزیں زمین کے اندر ہیں کچھ زمین کے اوپر ہیں کچھ کھڑی ہیں کچھ لیٹی ہیں لوگوں نے جس میں ذرا سی طاقت دیکھی، نفع ونقصان پہنچانے کی صلاحیت دیکھی کوئی خصوصی امتیاز دیکھا ذرا سا حسن و جمال دیکھا۔ اسی کے سامنے جھک گئے۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ یہاں نہ آتے تو شاید خدا اور اس کا رسول ان کا دامن گیر نہ ہوتا اس لئے وہ جہاں رہتے تھے وہاں سے لے کر اس وادیٔ کشمیر تک بڑے بڑے دین کے روحانی مراکز تھے۔ ہمالیہ کے دامن میں پورا ہندوستان پڑا ہوا تھا۔ جہاں ہزاروں عالم، سینکڑوں مدرسے اور خانقاہیں تھیں لیکن عالی ہمت یہ نہیں دیکھتے کہ تنہا ہم پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے یا نہیں وہ اس فریضہ کو اپنا ذاتی فریضہ سمجھ لیتے ہیں۔ ہزار کوئی ان کو روکے، ان کے راستہ پر ہزار کوئی رکاوٹیں کھڑی کردے، پہاڑ ان کے راستے میں حائل ہوں، دریا سدِ راہ ہوں، وہ کسی کی بھی پرواہ نہیں کرتے، گویا کوئی آسمانی آواز تھی جو انہوں نے سنی کہ سید کشمیر جاؤ اور وہاں توحید پھیلاؤ۔

سید علی ہمدانی نے صاف محسوس کیا کہ میں عنداللہ جواب دہ ہوں میدان حشر سامنے ہے عرش خداوندی موجود ہے۔ اس کے سایہ رحمت میں انبیاء اولیاء کھڑے ہیں اور وہاں سے سوال ہوتا ہے کہ سید علی! تم کو علم تھا کہ میری پیدا کی ہوئی زمین کے ایک خطہ میں غیر اللہ کی پرستش ہورہی ہے غیر اللہ کے سامنے دست سوال دراز کئے جارہے ہیں، دامن مراد پھیلائے جارہے ہیں، تم نے اس کو کیسے برداشت کیا؟ میر سید علی ہمدانی کے سامنے تو یہ منظر تھا اگر ساری دنیا کے علماء وحکماء جمع ہو کر سمجھاتے کہ حضرت! آپ سے سوال نہیں ہوگا لیکن وہ کہتے کہ نہیں مجھ ہی سے یہ سوال ہوگا میری غیرت یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ اللہ کی لمبی چوڑی زمین کے ایک چھوٹے سے

حصے میں بھی غیر اللہ کی پرستش ہو، غیر اللہ سے خوف ورجا کا معاملہ ہو، انسانوں کو (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) قسمت بنانے اور بگاڑنے والا سمجھا جاتا ہو، اولاد اور رزق دینے والا باور کیا جاتا ہو ان کو ہر وقت ہر جگہ حاضر وناظر جانتے ہوں، اگر مجھے معلوم ہوگیا کہ قطب شمالی میں یا قطب جنوبی میں یا ہمالیہ کی بلند وسبز چوٹی پر ایک متنفس بھی ایسا ہے جو غیر اللہ کی پرستش کر رہا ہے، غیر اللہ کو نافع وضار سمجھتا ہے غیر اللہ کو اس کائنات پر حکومت کرنے والا سمجھتا ہے تو میرا فرض ہے کہ میں وہاں پہنچوں اور اس کو پیغام پہنچاؤں۔ یادرکھو اللہ فرماتا ہے:۔

الاله الخلق و الامر (الاعراف ۵۴)

اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور اسی کا کام ہے حکم چلانا۔

ایسا نہیں کہ پیدا تو اس نے کیا مگر حکم کسی اور کا چل رہا ہے اس نے اپنی سلطنت کسی اور کے حوالہ کر رکھی ہے کہ ہم نے پیدا کر دیا تم حکومت کرو، خالق بھی وہی ہے حاکم اور منتظم (ایڈمنسٹریٹر) بھی وہی ہے، ایسا نہیں کہ جیسے تاج محل کو شاہ جہاں بادشاہ نے بنوایا۔ ترکستان وغیرہ سے معمار بلائے، صناعوں نے کاریگری دکھائی وہ آئے اور چلے گئے اب تاج محل پر جس کا جی چاہے راج کرے، حکومت کرے، تخت بچھائے، توڑے، بنائے۔

یہ دنیا تاج محل نہیں ہے، یہ دنیا قطب مینار نہیں ہے، یہ دنیا کوئی آثار قدیمہ کا عجائب خانہ نہیں، یہ خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا ہے، سارا نظام اسکی مٹھی میں ہے، اس کے دست قدرت میں ہے ایک چھوٹا سا کارخانہ بھی یہاں کا اس نے دوسروں کے حوالہ نہیں کیا۔

''وسع کرسیه السموٰت والارض''

ترجمہ: (اس کی بادشاہی اور علم آسمان وزمین سب پر حاوی ہے)

اس کا تحت سلطنت پوری کائنات پر حاوی ہے۔ اس پورے کرہ ارض پر حاوی ہے، یہ (زمین کا) ایک سیارہ کیا ہے سارے سیارے، ساری کہکشاں، سارا نظام شمسی، سارا نظام فلکی، یہ سب کے سب اسی کے قبضہ میں ہے۔[1]

---

(۱) خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم نے اپنی مشہور نظم ''مسدس حالی'' میں خوب کہا ہے۔

خرد اور ادراک رنجور ہیں واں ۔ مہ و مہر ادنیٰ سے مزدور ہیں واں

جہاندار مغلوب ومقہور ہیں واں ۔ نبی اور صدیق مجبور ہیں واں

نہ پرستش ہے رہبان واحبار کی واں

نہ پروا ہے ابرار و احرار کی واں

حضرت مولانا سید علی ہمدانی کو جو چیز کھینچ کر یہاں لائی وہ غیر توحید تھی، یہ بھی آپ یاد رکھئے کہ سید علی ہمدانی نے اس سرزمین کو بزور شمشیر فتح نہیں کیا، محبت سے فتح کیا ہے، روحانیت سے فتح کیا ہے، خلوص سے فتح کیا ہے، درد سے فتح کیا، میں نے عربوں کے ایک جلسہ میں بھی یہ بات کہی میں نے کہا کہ کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس شخص کی روحانیت کا، اس شخص کی تاثیر کا؟ جس نے تین دورے کئے اور پورے کے پورے خطہ کو مسلمان بنالیا، مورخوں نے کہا کہ انہوں نے تین دورے کئے ایک دورہ اجمالی کیا، دوسرا قدرے تفصیلی اور تیسرے دورہ میں گھر گھر گئے اور اللہ کا پیغام پہنچایا، خدا کا ایک بندہ چند ساتھیوں کے ساتھ آتا ہے، اور پورا کا پورا خطہ مسلمان ہوجاتا ہے اور اللہ تعالی کے فضل سے آج بھی وہ مسلمان ہے آج بھی دلوں میں ایمانی حرارت موجود ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس توحید کی امانت کو ان سے چھین نہیں سکتی، اور وہ رشتہ توڑ نہیں سکتی، جو عبد اور معبود کے درمیان ہے۔

میرے بھائیو! یاد رکھو اگر اس خطہ میں کہیں بھی غیر اللہ کی پرستش ہوتی ہے، ان سے حاجت روائی کا سوال کیا جاتا ہے، کوئی مشرکانہ فعل ہوتا ہے، تو میر سید علی ہمدانی کی روح کو قبر میں اذیت ہوتی ہے۔

ایک تاریخی حقیقت

اس غیرت کا ایک نمونہ یہ ہے کہ جب حضرت یعقوب کا وقت آخر قریب آیا تو آپ نے خاندان کے سب افراد، بیٹوں، پوتوں، نواسوں کو جمع کیا اور کہا کہ عزیزو! میرے جگر گوشو! میری پیٹھ قبر سے نہیں لگے گی جب تک تم مجھے یہ اطمینان نہ دلا دو کہ میرے دنیا سے چلے جانے کے بعد کس کی عبادت اور پرستش کروگے؟ ان لوگوں نے خم ٹھونک کر کہا کہ آپ اندیشہ نہ فرمائیں، آپ ہی کے معبود برحق اور آپ کے باپ دادا، ابراہیم واسماعیل واسحاق علیہم السلام کے معبود وحدہ لاشریک کی عبادت کریں گے۔

قالو نعبد الهک و اله ابآئک ابراهم و اسماعیل و اسحاق الها واحداً و نحن له مسلمون (البقرہ۔۱۳۳)

انہوں نے کہا کہ آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیم واسمعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے اور ہم اسی کے حکم بردار ہیں۔

ابا جان، دادا جان، نانا جان آپ کیوں ہم سے یہ سوال کر رہے ہیں آپ کو کس بات کا کھٹکا ہے؟ آپ اطمینان رکھئے آپ نے بچپن سے جس طرح ہماری تربیت فرمائی ہے اور دل کی نرم سرزمین میں توحید پاک کا بیج بویا ہے اس سے ہم ہٹ نہیں سکتے، ہم آپ کے معبود برحق خدائے واحد ہی کی پرستش کریں گے جس کی ابراہیم واسماعیل واسحاق پرستش کرتے تھے اس وقت ان کو اطمینان ہوا اور دنیا سے خوش خوش رخصت ہوئے۔ یہ اولیائے عظام، داعیان اسلام، بزرگان کرام، ان ہی پیغمبروں کے وارث اور جانشین ہیں یعقوب علیہ السلام کو کھٹکا اسی بات کا تھا کہ میری اولاد شرک کے جنجال میں اسی طرح نہ پھنس جائے جیسے ہزاروں خاندان اور سینکڑوں قومیں (اپنے بانیوں اور داعیوں کے بعد) پھنس گئیں۔

میرے بھائیو! جو کچھ عرض کیا گیا اسے گوش دل سے سنئے اور اس پر عمل کیجئے۔ اس وادی کے لئے میر سید علی ہمدانی اور ان کے رفقاء جو تحفہ اور پیغام لے کر آئے تھے وہ اصلاً توحید کی دولت تھی اس کو سینے سے لگائے رکھئے اللہ تعالیٰ ہی کو اس دنیا کا مالک، افراد اور قوموں کے عروج وزوال کا مالک، دنیا کے سیاہ وسپید کا مالک سمجھئے، اس کے آستانہ پر سر جھکائیے یہی پیغام ہے جو خدا کا ہر پیغمبر لے کر آیا ہے خدا کے ولیوں نے دنیا کو سنایا اور مصلحین ومجددین نے ہر دور کے لوگوں تک پہنچایا، فتح وکامیابی کی شرط یہی ہے، عزت وطاقت کی شرط یہی ہے، اسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں اسی سے دل لگائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

ان الذین اتخذ والعجل سینا لھم عضب من ربھم وذلتہ فی الحیوۃ الدنیا، وکذلک نجری المفترین (الاعراف۔۱۵۲)

جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنالیا تھا ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) اور ہم افتر پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

ممکن ہے لوگ یہ کہتے کہ ہم نے گوسالہ پرستی کب کی؟ اس سے ہزار بار توبہ، ایسی احمقانہ اور شنیع حرکت ہم کب کر سکتے تھے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اپنی اس آخری کتاب میں اس کا جواب دیا اور یہ کہہ کر ہم اسی طرح بہتان باندھنے والوں کو سزا دیتے ہیں تمام مشرکانہ عقائد واعمال کو شامل کرلیا کہ شرک کی بنیاد ہمیشہ من گھڑت قصے کہانیوں اور بے اصل وبے تحقیق باتوں پر ہوتی ہے۔ یہ دونوں توام (جڑواں بچوں کی طرح) ہوتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ شرک کا ذکر کرتے

ہوئے فرماتا ہے۔

فاجتنبو الرجس من الاوثان واجتنبو ا قول الزور (الحج ۳۰)

بتوں کی پلیدی سے بچو اور جھوٹی بات سے اجتناب کرو۔

شرک کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں صاف صاف ''افترائے عظیم'' کا لقب دیا ہے فرماتا ہے۔

و من یشرک باللہ فقد افتریٰ اثماً عظیما (النساء۔۴۸)

اور جس نے خدا کا شریک مقرر کیا اس نے بڑا بہتان باندھا۔

میں آپ کو اس وقت اس منبر سے خطاب کر رہا ہوں جو منبر رسول کا جانشین ہے مسجد نبوی کے منبر کی نشانی ہے، اس کا پایہ بہت بلند ہے اس پر بیٹھ کر کہہ رہا ہوں کہ آپ کے سارے مسائل حل ہیں، آپ کی ساری مشکلات کہر کی طرح چھنٹ جائیں گی، اور سب مصائب کافور ہو جائیں گے، اگر آپ نے توحید کا دامن مضبوط پکڑ لیا، اور جب تک اس سرزمین میں توحید خالص نہیں آتی، اور ہر قسم کے مشرکانہ خیالات وتوہمات دور نہیں ہوتے، مجھے اس میں بڑا تردد اور شبہ ہے کہ ہزاروں تدبیروں سے بھی مسائل حل ہوں، اللہ تعالیٰ کی مدد نہ ہو تو کوئی تدبیر بھی کارگر نہیں، اور مدد ہو تو پھر کسی کا کھٹکا نہیں۔

ان ینصر کم اللہ فلا غالب لکم و ان یخذلکم فمن ذالذی ینصر کم من بعدہ و علی اللہ فلیتو کل المومنون.

ترجمہ: اگر خدا تمہارا مددگار ہے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا، اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو پھر کون ہے کہ تمہاری مدد کرے اور مومنوں کو چاہئے کہ خدا ہی پر بھروسہ رکھیں۔

وآخر ودعونا ان الحمد للہ رب العالمین۔

تبلیغی جماعت

مولانا الیاس صاحب کی دینی فکر

حضرت مولانا محمد الیاس رحمتہ اللہ علیہ۱۹۴۴ بمطابق ۱۳۶۴ء نے جب مسلمانوں میں دینی شعور کو کم، بے دینی کے رجحان کو عام اور مغربی تہذیب، عصری تعلیم اور انگریزی حکومت کے مہلک اثرات کو بڑھتے دیکھا اور بہت سے علماء کو مادیت کا شکار عیش و تنعم کا دل دادہ اور دعوت دین کے فریضہ سے غافل دیکھا، جب انہوں نے مدارس کو اس حال میں پایا کہ وہ سمندر میں ایک جزیرہ کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں، ان میں اثر انگیزی کی طاقت کم اور اثر پذیری کی صلاحیت زیادہ ہوگئی ہے، عوام سے انکا ربط کمزور اور زندگی سے ان کا تعلق ٹوٹ چکا ہے، تو انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ان نازک حالات میں گوشہ نشینی اختیار کرنا، عافیت پسندی کو ترجیح دینا اور محدود مدرسی تعلیم و تدریس پر اکتفا کرنا، کسی طرح بھی کافی نہیں، بلکہ اس صورت حال کو بدلنے کے لئے عوام سے رابطہ ضروری ہے اور اس میں اب ذرا بھی تاخیر مہلک ثابت ہوسکتی ہے، کیونکہ بیماروں کو اپنی بیماری کی سنگینی اور اپنے مرض کی ہلاکت خیزی کا اندازہ نہیں ہے۔

چنانچہ مولانا محمد الیاس رحمتہ اللہ علیہ نے سب سے زیادہ اس بات پر زور دیا کہ عوام سے رابطہ قائم کر کے ان کے دلوں میں ایمان کی آبیاری کی جائے اور عقیدہ توحید اور دین کے بنیادی و ضروری مسائل کو ان کے دل و دماغ میں پیوست کیا جائے، پھر ارکان اسلام، علم دین اور اوراد و افکار کی طرف توجہ کی جائے اور اس میں کا ان آداب کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے جو اس دعوتی عمل کو مؤثر بنانے اور اس کو فتنوں اور آزمائشوں سے محفوظ رکھنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور جن میں اکرام مسلم، لایعنی باتوں پر پرہیز اور غیر متعلق امور سے اجتناب بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

تحریک کا آغاز و عروج

مولانا محمد الیاس رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی دعوت و تحریک کا آغاز ہندوستان کے اخلاقی لحاظ سے سب سے زیادہ پسماندہ علاقہ سے کیا، جو جہالت و گمراہی اور دین سے ناواقفیت میں سب سے

بڑھا ہوا تھا، یہ علاقہ میوات کے نام سے مشہور ہے، اور دہلی کے جنوب میں واقع ہے۔

مولانا محمد الیاس رحمتہ اللہ علیہ نے وہاں کے لوگوں کو اپنا کاروبار اور علاقہ چھوڑنے اور کچھ مدت کے لئے دوسرے علاقوں میں جا کر دعوت وتبلیغ کا کام کرنے کی دعوت دی، کیونکہ مولانا کا یہ خیال تھا کہ جب تک یہ لوگ اس بگڑے ہوئے ماحول سے جس میں وہ زندگی گزار رہے ہیں، نکلیں گے نہیں اس وقت تک ان کے لئے دین کو سیکھنا اور سمجھنا، اخلاق کو بنانا اور سنوارنا اور ایک پاکیزہ اور شریعت کے مطابق زندگی گزارنا ممکن نہیں۔

اس علاقہ کے سینکڑوں نہیں ہزاروں باشندوں نے مولانا محمد الیاس رحمتہ اللہ علیہ کی دعوت پر لبیک کہا، اور دنوں ہفتوں کے لئے نہیں مہینوں اور سالوں کے لئے راہ خدا میں اپنا گھر بار چھوڑ کر دور دراز علاقوں کا سوار پر اور پیادہ پا سفر کیا، دین سیکھا، اخلاق کی اصلاح کی اور دینی جذبہ اپنے اندر پیدا کیا۔

مولانا محمد الیاس رحمتہ اللہ علیہ کی یہ دعوت دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک میں پھیل گئی، اس کے اس تیزی کے ساتھ پھیلنے اور دلوں پر اثر انداز ہونے کے پیچھے نہ تو پروپیگنڈہ کی طاقت تھی، نہ اخباری اشتہار کی، نہ سرکاری خزانہ کی کارفرمائی تھی، اور نہ عوامی چندہ کی، اس کی پس پشت اگر کوئی طاقت تھی تو وہ صرف یہ کہ اس کا طریق کار اسلام کے ابتدائی کے دعوتی واصلاحی طریقہ کار سے مشابہ اور قریب تر تھا اور اس جماعت سے منسلک لوگوں میں اخلاص اور رضائے الٰہی کا جذبہ موجزن تھا، جو ان مخلص بندوں کو یاد دلاتا تھا، جنھوں نے دعوت وجہاد کی راہ میں پیش آنے والی ہر تکلیف ہنسی خوشی برداشت کی اور اس کام میں خوشنودی رب کے علاوہ کبھی کسی چیز کی خواہش نہ تھی۔

آہستہ آہستہ اس تحریک کے اثر دوسرے براعظموں اور دوسرے ملکوں میں پھیلنے لگے، امریکہ، یورپ، آفریقہ اور آسٹریلیا، میں جماعتوں کی نقل وحرکت شروع ہوگئی، جس سے کام کرنے والوں کی زندگی میں تبدیلی آئی، اپنی اور دوسروں کی اصلاح کے فکر دامن گیر ہوئی اور اس کے لئے قربانی دینے کا جذبہ پیدا ہوا۔

مخالفین کے خلاف جماعت کا استحکام

بنگلہ دیش، پاکستان اور ہندوستان کے طول وعرض میں تبلیغی جماعت کی شہرت ایک ''وہابی

جماعت'' کی حیثیت سے ہے، جو مشرکانہ رسم ورواج کے خلاف آواز اٹھاتی اور جاہلی عادات واطوار کے خلاف برسرپیکار نظر آتی ہے، اس جماعت کی مخالفت میں سب سے آگے وہ بدعتی حلقہ تھا جو مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرتا تھا، اس حلقہ نے تبلیغی جماعت کی مخالفت کو اپنا شعار بنایا، اور اس کی وہابی تحریک کا ایجنٹ قرار دیا، مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی معرکۃ آلاراء تصنیف '' تقویۃ الایمان'' کی کھل کر مخالفت کی اور تبلیغی جماعت کے اثرات محدود کرنے کے لئے وہی حربے استعمال کئے جو جاہلی عہد کے کفار ومشرکین استعمال کیا کرتے تھے، جو کہتے تھے،

'' **لا تسمعوا لهذا القرآن والغوا فيه لعلكم تغلبون** ''

اس قرآن کو سنو (اور اس کی تلاوت کے وقت) اتنا شور مچاؤ کہ تمہارے اس شور وہنگامہ سے وہ دب جائے۔

لیکن خدا گواہ ہے کہ ان غلط اتہامات، بے بنیاد الزامات اور ایذا رسانی کے ان واقعات سے ان حضرت کے پائے استقامت میں لغزش تو درکنار ان کے صبر وضبط اور عزم وثبات میں اور اضافہ ہو گیا، اور ان کی بردباری، نرم گفتاری اور سخت سے سخت بات پر خاموشی کا یہ اثر پڑا کہ ان کے بہت سے مخالفین ان کے ہم نوا ب گئے، اور ایک بڑی تعداد جو شرک وبدعت میں مبتلا تھی، اس نے شرک وبدعت سے توبہ کی اور توحید خالص کی دعوت قبول کی گمراہی سے نکل کر ہدایت کی راہ پائی اور اس کی گواہی ہر وہ شخص دے سکتا ہے جس نے ان علاقوں کو دیکھا ہو جہاں تبلیغی جماعتوں کی آمد ورفت ہوئی ہو۔

فردی کوتاہی وتقصیر کا الزام جماعت پر عائد نہ کیجئے

اب اگر ان دعوتی واصلاحی کوششوں، اس راہ میں دی جانے والی عظیم قربانیوں اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی اہم اور نمایاں کامیابیوں کے ساتھ اس جماعت سے وابستہ بعض افراد سے اعتقادی نہیں عملی، دانستہ نہیں نادانستہ کوئی قابل مواخذہ عمل سرزد ہوتا تو یہ چند افراد کو اپنی کوتاہی اور جماعت کے اصول ومنہج کو سمجھنے میں ان کی اپنی تقصیر ہے اور اس کا الزام جماعت پر عائد کیا جانا کسی بھی صورت میں درست نہیں ہو سکتا۔

تبلیغی جماعت کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی رائے

آخر میں اس تقریر تبصرہ کو علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس مقدمہ کی آخری سطروں پر ختم کیا جاتا ہے، جو انھوں نے بندہ کی کتاب ''حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت'' پر تحریر فرمایا تھا:

اوپر کی سطروں میں تبلیغ ودعوت کے اصول پر جو کچھ آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام کے تبلیغی اصول اور دعوت کے طریقہ کیا ہیں، اور جہاں تک ہم سمجھ سکتے ہیں آئندہ اوراق میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جس دعوت وتبلیغ کے علمی وعملی اصول وآئین کا تذکرہ ہے وہ موجودہ ہندوستان کی تمام دینی تحریکوں میں اصل اول سے زیادہ تقریب ہے۔ حکیمانہ تبلیغ ودعوت، امر وبالمعروف، نہی عن المنکر اسلام کے جسم کی ریڑھ کی ہڈی ہے، اس پر اسلام کے بنیادی، اسلام کی قوت، اسلام کی وسعت اور اسلام کی کامیابی منحصر ہے اور آج سب زمانوں سے بڑھ کر اس کی ضرورت ہے اور غیر مسلمانوں کو مسلمان بنانے سے زیادہ اہم کام مسلمانوں کو مسلمان، نام کے مسلمانوں کو کام کا مسلمان اور قومی مسلمانوں کو دینی مسلمان بنانا ہے، حق ہے کہ آج مسلمانوں کی حالت دیکھ کر قرآن وپاک کی یہ ندا:

''یا ایھالذین آمنوا آمنوا''

اے مسلمانو: مسلمان بنو۔

کو پورے زور وشور سے بلند کیا جائے، شہر شہر، گاؤں گاؤں اور در در پھر کر مسلمانوں کو مسلمان بنانے کا کام کیا جائے اور اس راہ میں وہ جفاکشی اور محنت کوشی اور وہ ہمت اور وہ قوت مجاہدہ صرف کیا جائے جو دنیادار لوگ دنیا کے عز وجاہ اور حصول طاقت میں صرف کر رہے ہیں، جس میں حصول مقصد کی خاطر ہر متاع عزیز کو قربان کرنے اور ہر مانع کو بیچ سے ہٹانے کے لئے ناقابل تسخیر طاقت پیدا ہوتی ہے، کشش سے، کوشش سے، جان ومال سے، ہر راہ سے اس میں قدم آگے بڑھایا جائے، اور حصول مقصد کی خاطر وہ جنون کی کیفیت اپنے اندر پیدا کی جائے جس کے بغیر دین ودنیا کا کوئی کام ہوا ہے اور نہ ہوگا۔

خدارا ذرا سوچئے

اس وقت مسلمان جن خطرات میں گھرے، جن مسائل میں الجھے جن چیلنجوں سے نبرد

آزما اور تاریخ کے جس نازک ترین موڑ سے گزر رہے ہیں وہ ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ اپنی طاقت وتوانائی ان فروعی مسائل میں صرف کریں جو بحث وتحقیق کے مراحل سے گزر چکے ہیں، اور صدیوں سے ان پر عمل ہوتا چلا آرہا ہے یا کسی فقہی مسلک کی کسی ایسے مسئلہ کی وجہ سے مخالفت کریں، جو کوئی بنیادی اہمیت نہیں رکھتا، اس سے امت کی کوئی خدمت نہیں ہوتی، اس لئے ضرورت ہے کہ اپنی توانائی صرف تعمیری کاموں میں صرف کی جائے اور اپنی کوششوں کا محور، اخلاقی بگاڑ، مشرکانہ عقائد، جاہلی رسم ورواج، اور غیر اسلامی بود و باش کی اصلاح کو بنایا جائے۔

توحید اور شریعت اسلامی پر عمل کرنے والوں اور محرمات سے بچنے والوں کو صرف فقہی اختلافات کی بنیاد پر جو ہمیشہ قائم رہا ہے، ہدف تنقید بنانا ایسا ہی ہے، جیسا بندہ نے اپنے ایک عربی رسالہ میں لکھا ہے ''بے مقصد جہاد بغیر دشمن کے جنگ کے مرادف ہے''۔

اکثریتی فرقہ کے ارادوں اور عزائم سے جو شخص بھی واقف ہے وہ بخوبی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ ہندوستان کو جس پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکمرانی کی اور تہذیبی، ثقافتی، انتظامی اور اقتصادی حیثیت سے اس کو بام عروج پر پہونچایا، ایک دوسرا اندلس (اسپین) بنانے کی پوری تیاری کی جا چکی ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی فکری، ثقافتی، اجتماعی، تہذیبی اور لسانی اور اس کے بعد دینی واقتصادی نسل کشی کی کوشش کا سلسلہ جاری ہے ور اس کی علامتیں نصاب تعلیم میں تبدیلی، ہندی کی جبری تعلیم پرسنل لاء میں مداخلت، یکساں سول کوڈ کے نفاذ پر اصرار، اردو زبان کی بیخ کنی، انگریزی وہندی اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین، فرقہ وارانہ جماعتوں کے قائدین حتیٰ کہ بعض وزراء کے بیانات واعلانات اور ان کی پیش کردہ تجاویز اور ان کی تیار کی ہوئی اسکیموں کی شکل میں ظاہر ہونی لگی ہیں، تو ایسے نازک وقت میں آپس میں دست وگریبان ہونا ایک بڑی ناعاقبت اندیشی اور کوتاہ نظری ہے۔

وما علینا الا البلاغ المبین

عزم مصمم اور قوت فیصلہ

ملت اسلامیہ کی ایک اہم ضرورت

ذیل کا مضمون مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ کا وہ خطبہ صدارت ہے، جس کو مولانا نے انجمن تعلیمات دین علی گڑھ کے زیر انتظام ۲۶/۲۷ اپریل ۱۹۹۸ء کو آل انڈیا دینی تعلیمی کونسل کے اجلاس میں علماء، ادباء، دانشوروں اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کی موجودگی میں پڑھا یہ خطبہ علی گڑھ کے وسیع کینیڈی ہال میں پڑھا گیا جو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

الحمد لله وحده والصلوٰة والسلام علىٰ من لانبي بعده

حضرات: میں اپنے خطبے کا آغاز قرآن شریف کی ایک چونکا دینے والی آیت سے کروں گا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ام كنتم شهدآء اذ حضر يعقوب الموت اذقال لبنيه ماتعبدون من بعدی ، قالو انعبد الهک واله ابآئک ابراهيم واسمعيل واسحاق الهاً وحداً ونحن له مسلمون.

بھلا جس وقت یعقوب علیہ السلام وفات پانے لگے تو تم اس وقت موجود تھے، جب انھوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ تو انھوں نے کہا کہ آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کے معبود کی عبادت کریں گے، جو معبود یکتا ہے اور ہم اسی کے حکم بردار ہیں۔

باوجود اس کے کہ یہ پیغمبر زادوں کا گھرانہ تھا، جس میں توحید اور اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کے سوا نہ کوئی تعلیم تھی نہ عمل، نہ ماحول اور فضاء، پھر بھی عقیدہ اور عمل اور توحید خالص کی اہمیت اور فکر واور اپنی نسل کے اس عقیدہ و عمل سے دائمی وابستگی کے خیال سے کہ

عشق است وہزار بدگمانی

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں، پوتوں اور نواسوں کو جمع کر کے دریافت کیا کہ عزیزو! میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ ان فرزندوں اور نبی زادوں نے اس کے جواب میں یقیناً یہ کہا ہوگا کہ ابا جان، دادا جان، نانا جان آپ نے ابھی تک ہم کو تعلیم ہی کیا دی؟ اور کس چیز کا پابند بنایا؟ یہی توحید خالص اور عبادت الہ واحد، پھر آپ کو ہمارے مستقبل کے بارے میں کیوں شک ہے؟ کہ ہم آپ کی آنکھ بند ہوتے ہی دوسرے راستہ پر پڑ جائیں گے؟ حضرت یعقوب علیہ السلام نے زبان حال سے یہی کہا ہوگا کہ فرزندو میری پیٹھ قبر سے نہیں لگے گی جب تک دنیا سے یہ اطمینان لے کر نہ جاؤں گا کہ میرے بعد تم سب خدائے واحد کے پرستار اور دین ابراہیمی کے علمبردار ہو گئے۔

دنیا میں رہنا ہے تو صرف مسلمان بن کر

حضرات! آپ سلسلۂ ابراہیمی سے تعلق رکھتے ہیں، اس خاندان کا شیوہ اور شعار یہ رہا ہے کہ دنیا سے جانے سے پہلے اپنی نسل کے بقائے ایمان اور تعلق باللہ کا اطمینان اور ضمانت کر لی جائے اور دنیا سے جانے سے پہلے اولاد سے یہی عہد و پیمان لے کر جائے کہ دنیا میں جب تک رہنا ہے مسلمان بن کر رہنا ہے اور جب جانا ہے تو مسلمان کی حیثیت سے جانا ہے۔

ووصّٰی بها ابراهيم بنيه ويعقوب، يٰبنيّ ان الله اصطفىٰ لكم الدين فلا تموتن الا وانتم مسلمون.

اور یہی وصیت کر گئے ابراہیم اپنے بیٹوں کو اور یعقوب، اے بیٹو! اللہ نے چن کر دیا ہے تم کو دین پس نہ مرنا مگر مسلمان۔

نہ صرف یہ عہد و پیمان ضروری ہے بلکہ اس کے لئے وسائل کا مہیا کرنا، اس کو ممکن اور آسان بنانے کی تدبیریں اختیار کرنا اور اس کا اطمینان حاصل کر لینا بھی ضروری ہے، اسی لئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کا امتحان لیا، اور اپنا پڑھایا ہوا سبق سنایا۔

حضرات: بحیثیت اس مذہب کے متبع اور داعی کے ہم پر اور ہر مسلمان پر یہ فرض ہے کہ ملک کی تعلیمی تبدیلیوں کا بغور جائزہ لیتے رہیں اور ہر وقت ان پر نظر رکھیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ ان کا اثر ہمارے مذہب، ہماری نسلوں کے دل و دماغ اور ان کی دینی و اخلاقی مستقبل پر کیا پڑے گا،

میں یہ صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہمارا مذہب بہت سے دوسرے مذاہب کے برخلاف بہت جلد متاثر ہوتا ہے اور بہتر زیادہ متاثر کرتا ہے، اور یہ اس کا نتیجہ ہے کہ وہ ایک زندہ اور ذی شعور مذہب ہے، زندہ ہستی متاثرہ بھی ہوتی ہے اور مؤثر بھی، جو وجود زندگی کھو چکا ہوتا ہے، یا زندگی کے میدان سے کنارہ کش ہو جاتا ہے، وہ نہ متاثر ہوتا ہے، اور نہ مؤثر، ہم اپنے مذہب کے لئے یہ پوزیشن قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ دنیا چاہے جتنی ہی بدل جائے، زندگی کے چاہے کیسے ہی نقشے بنیں، نئی نسلوں کو ڈھالنے کے لئے کیسے ہی سانچے تیار ہوں، ہمارے مذہب پر کوئی اثر نہیں پڑتا، ہم بدستور مذہبی فرائض ادا کرتے رہیں گے، اور انسان اور خدا کا رشتہ اسی طرح قائم رہے گا، ہمارا مذہب ایک پورا نظام حیات ہے، وہ زندگی کے ہر شعبہ کے لئے متعین ہدایات اور احکام دیتا ہے، اس لئے ہمیں ہر ملک اور ہر دور میں چوکنا رہنا چاہئے، اور یہ دیکھتے رہنا چاہئے کہ کیا ہمیں اپنے ذہنی، اخلاقی اور روحانی نشو ونما کے لئے مناسب فضا اور سازگار ماحول میسر ہے یا نہیں، اور ہماری آئندہ نسلیں صحیح معنوں میں مسلمان رہ سکیں گی یا نہیں؟۔

اسلام چند رسومات وتقریبات کا نام نہیں

پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ اسلام صرف چند رسول اور تقریبات کا نام نہیں، چند عبادات تک بھی مخصوص نہیں بلکہ یہ مکمل زندگی گذارنے کا طریقہ اور کامل دین ہے، ایک مختصر جملہ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مستقل تہذیب ہے، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کا کوئی مخصوص طرز زندگی اور اس کی کوئی مستقل تہذیب نہیں، لہٰذا دوسری قومیں اور دوسرے ممالک کے لوگ اسلام قبول کریں تو اسلامی عقائد کو لے لینا ہی کافی ہے، تہذیبی اقدار کو لینے اور اختیار کرنے کی ضرورت میں بڑی صراحت کے ساتھ یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ غیر اسلامی طرز فکر ہے، اسلام کو اصرار ہے کہ عقائد واعمال کے ساتھ اس کا مخصوص طرز زندگی بھی اپنایا جائے، قرآن وسنت سے منصوص طریقہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک خاص طرح کی زندگی اور خاص طرح کی معاشرت چاہتا ہے، اسلام میں سونے جاگنے، کھانے پینے سے لے کر عائلی قانون، نکاح وطلاق اور وراثت تک کے متعین ضوابط واحکام، اور اسلام کا مطالبہ ہے، کہ انھیں کے مطابق زندگی گذاری جائے، اس کی خلاف ورزی نہ ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی باتوں سے لے کر انتہائی معمولی اور چھوٹی چھوٹی باتوں تک کی تعلیم دی اور صحابہ کرامؓ نے انھیں سیکھا

اور برتا۔

پورے نصاب تعلیم کیا ابتدائی اور نئی تاریخ کی وضع وتدوین تو بڑے وسیع اور انقلاب انگیز منصوبے ہیں، رسم الخط (SCRIPT) کی تبدیلی ہی قدیم تہذیبی، علمی اور مذہبی سرمایہ سے رشتہ ختم کر دینے اور ان سے بیگانہ بنا دینے کے لئے کافی ہے، آرنلڈ ٹو آئن بی (TOYNBEEARNOLD) نے جو اس زمانہ کا بڑا فلسفی اور مورخ ہے، لکھا ہے کہ ''اب کسی کتب خانہ کو آگ لگانے کی ضرورت نہیں، رسم الخط (SCRIPT) بدل دینا کافی ہے،'' رسم الخط کی تبدیلی سے قوم کا رشتہ اپنے ماضی سے بالکل ٹوٹ جائے گا، اور اس کی پوری تہذیب اس کے لئے بے معنی ہوکر رہ جائے گی، پھر جس طرف چاہو اس کو لے جاؤ، جو چیز کسی ملت کو اس کے ماضی سے، اس کے مذہب سے، اس کی تہذیب سے، اس کے کلچر سے ملاتی ہے، وہ رسم الخط ہے، رسم الخط بدلا، نسل بدل گئی، آج ہندوستان میں یہی ہو رہا ہے، فرقہ وارانہ فسادات محض ملک کو بدنام کرتے ہیں، فائدہ ان کا کچھ نہیں ہے، تعلیم کا نظام بدلنا کافی ہے، آج سے ۶۰۔۷۰ سال پہلے لسان العصر اکبرالٰہ آبادی مرحوم نے کہا تھا۔

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

اور اس سے زیادہ لطیف انداز میں انھوں نے اس حقیقت کو اپنے مشہور شعر میں بیان کیا ہے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ان کے ذہن میں کالج کا وہ تصور رہا ہوگا جس میں صرف قبطی زبان پڑھائی جاتی ہو اور ایسی تاریخ جس میں فراعنہ کی الوہیت، ان کے غیر محدود و غیر مشروط اختیارات اور مصر کی دوسری نسلوں اور قوموں (بنی اسرائیل اور بیرون مصر سے آئی ہوئی قوموں) کی تحقیر آمیز تصویر اور نفرت انگیز تاریخ پیش کی گئی ہو۔

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

زبان اور رسم الخط بدل جانے اور ثقافتی وتعلیمی انقلاب سے کسی ملک میں جو عظیم وعمیق

انقلاب آ سکتا ہے اور وہ ملک اگر اپنے عقائد، تہذیب تمدن، علمی اشتغال وکمال، مساجد ومدارس کی کثرت وشان وشوکت کے لحاظ سے کسی خالص قدیم الاسلام (اسلامی تمدن اور عربی زبان کے حامل) کی حیثیت سے کسی قدیم اور خالص اسلامی ملک سے کم نہیں تھا، لیکن وہاں زبان اور رسم الخط کے بدل جانے اور دینی تعلیم موقوف کئے جانے کی وجہ سے وہ عقیدہ، عمل، زبان اور تمدن وثقافت کے لحاظ سے بالکل خالص غیر اسلامی ملک بن گیا، تو وہ اندلس (اسپین) ہے، جس کے انقلاب حال کے لئے علامہ اقبالؒ کا یہ مصرعہ کافی ہے۔

اس کی فضا بے اذان، اس کی زمین بے سجود

اسپین میں ایسے روحانی پیشوا، علوم اسلامیہ اور عربی زبان میں کمال رکھنے والے اور علوم اسلامیہ میں ایسی مجتہدانہ تصنیفات، مستند ومعیاری کتب حدیث کی شرحات لکھنے والے پیدا ہوئے، جن کی نظیر ہر عربی اللسان اور پیرو اسلام ملک میں بھی نہیں مل سکتی۔[1]

مذہب مالکی جو اندلس کا عمومی اور اکثریتی طبقہ کا فقہی مذہب تھا، اس کی پیروی اس ملک میں ایسی تھی کہ اس دور میں مذہب مالکی کا یہ فتویٰ اور فیصلہ تھا "عمل اهل قرطبة حجته" (اہل مدینہ کا عمل ایک شرعی دلیل اور معیار ہے) صدیوں سے یہ سرزمین اور پورا ملک جو دین کا نہ صرف پیرو بلکہ علمبردار، علوم اسلامیہ کا نہ صرف حامل بلکہ اس میں مجتہدانہ درجہ رکھنے والا تھا، اور جس کی سرکاری اور عوام زبانی عربی تھی، اس کی فضا یکسر بے اذان ہے اور اس کی مساجد تک (جن کی نظیر بڑے سے بڑے اسلامی ممالک میں بھی مشکل سے ملے گی) رکوع وسجود سے محروم ہیں۔

حضرات! اب اس داستان کو جس میں شکوہ وشکایت کا حصہ زیادہ ہے، مختصر کرتے ہوئے کہوں گا کہ ایک آزاد جمہوری حکومت کا جس کی بنیاد خالص حب الوطنی، رضا کارانہ، جذبۂ خدمت اور اس مشترکہ جنگ آزادی پر پڑی ہو، جس میں ملک کے تمام شہری اور اکثریت واقلیت کے افراد دوش بدوش شریک رہے ہوں، سب سے عظیم ومقدس فرض یہ ہے کہ اس کی

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو علامہ کرد علی کی کتاب عربی میں "غابر الاندلس وحاضرها" اردو میں "عبرت نامہ اندلس" جلد اول ودوم، مصنفہ پروفیسر رائن ہارٹ، ڈوزی، ترجمہ مولوی عنایت اللہ دہلوی، ناظم دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی، مطبوعہ بستان ادب لاہور، پاکستان نیز اخبار الاندلس از مولانا خلیل الرحمن صاحب۔

آبادی کے تمام عنصر اور اس کے مختلف فرقوں اور اقلیتوں کو اس ملک میں اپنے اور اپنی نسل کے تحفظ کا پورا احساس اور مکمل اطمینان ہو، کسی حکومت کی ناکامی اور دستور کی خامی کی اس سے بڑھ کر مثال نہیں ہوسکتی کہ اس ملک کا کوئی شہری تحفظ کے احساس سے محروم ہو اور واضح رہے کہ اس حقیقت پسند انسان کی حیثیت اس میں جب تحفظ کا لفظ بولتا ہوں تو اس سے مراد جسمانی ومعنوی، نسلی واعتقادی ہر طرح کا تحفظ ہوتا ہے، کہ محض جسمانی تحفظ، جسم وجان کی سلامتی اور قتل وغارت گری سے حفاظت پر کوئی باشعور، باضمیر صاحب عقیدہ اور صاحب تہذیب، جماعت قانع اور مطمئن نہیں ہوسکتی، ایسا تحفظ تو جنگل کے بعض جانوروں اور پرندوں کے لئے بھی کیا جاتا ہے، اور وقتاً فوقتاً ان کی نسل ونوع کی حفاظت کے لئے سخت قوانین بنائے جاتے ہیں، مجھے معاف کیا جائے، مسلمانوں کا معیار اس بارے میں اور زیادہ بلند اور ان کی حس اس سلسلہ میں اور زیادہ تیز ہے، اس کا تعلق ان کے مذہبی معتقدات، ان کے حصول زندگی اور ان کے اس فہم وفکر اور نقطۂ نظر سے ہے، جو دین ودنیا، فوز وفلاح، فرد وجماعت کی کامیابی، وسعادت کے بارے میں وہ رکھتے ہیں، ان کا تقاضا ہے کہ ایک طرف اس ملک کے مسلمان آئینی جد وجہد کے تمام طریقوں سے کام کر کے اور اجتماعی عزم وفیصلہ کی پوری طاقت سے اس ملک میں اپنے لئے حقیقی اور کامل تحفظ کی فضا پیدا کریں، جس کے بغیر (مجھے کہنے کی اجازت دی جائے، وطن وطن نہیں غربت ومسافرت ہے، آزادی آزادی نہیں غلامی ہے، اور گھر چمن نہیں قید خانہ اور قفس ہے، اس سلسلہ میں ایثار وقربانی اور خطر پسندی کی بھی ضرورت ہے، کہ حکومت کی امداد سے جو ان مطالبات اور تغیرات کے ساتھ مشروط ہے، پورے استغناء اور توکل اور اعتماد علی اللہ کے ساتھ معذرت کردی جائے اور اس کو قبول نہ کیا جائے۔

دوسری طرف حکومت کو بھی اپنے رویہ اور اس رجحان پر نظر ثانی کرنی چاہئے، جو نجی تعلیمی اداروں کو ختم کرنے اور مختلف فرقوں اور اقلیتوں کو ان کی آزادی اور بنیادی شہری حقوق سے محروم کرنے کی شکل میں جو دستور ہند نے ان کو دیئے ہیں، نمایاں ہو رہا ہے بلکہ اس سے ایک قدم آگے دستور ہند میں تبدیلیوں کا خطرناک قدم بھی اٹھایا جاچکا ہے، اور اس طرح اقلیتوں کیلئے وہ آخری پناہ گاہ بھی ختم ہو رہی ہے، جو کسی دستوری اور جمہوری ملک میں پائی جاتی ہے، یہاں تک کہ ملک کے آزاد واقلیتی اداروں بلکہ مذہبی تعلیم گاہوں کو بھی سرکاری تعلیمی پالیسی اور اکثریت

کے اعتقادات وروایات اور مذہبی نشانات کا پابند بنانے کے عزم واعلانات اور مذہبی نشانات کا پابند بنانے کے عزائم واعلانات کا اظہار ہو چکا ہے، سرکاری اداروں، کالجوں اور اسکولوں میں ہندو دیو مالا (HINDUMYIHOLOGY) پرمبنی کتابیں بھی نصاب میں داخل کی جارہی ہیں، اس سے بڑھ کر کہ یہ تعلیم گاہوں میں جن میں مسلمان بچے بڑی تعداد میں تعلیم پاتے ہیں، وندے ماترم کا گیت پڑھانا ضروری قرار دیا جارہا ہے جو اسلامی نقطۂ نظر بلکہ اعتقاد کے لحاظ سے واضح اور طاقتور مشرکانہ گیت ہے، سامعین کی معلومات کے لئے اس کا ترجمہ اردو میں پیش کیا جا رہا ہے۔

تو ہی مرا علم ہے، تو ہی میرا دھرم ہے، تو ہی میرا باطن ہے، تو ہی میرا مقصد ہے، تو ہی جسم کے اندر کی جان ہے، تو ہی بازوؤں کی قوت، دلوں کے اندر تیری ہی حقیقت ہے، تیری ہی محبوب مورتی ہے، ایک ایک مندر میں، تو ہی درگا دس مسلح ہاتھوں والی تو ہی کملا ہے، کمل کے پھول کی بہار، تو ہی پانی ہے، علم سے بہرہ ور کرنے والی، میں تیرا غلام ہوں، غلام کا غلام ہوں، غلام کے غلام کا غلام ہوں، اچھے پانی، اچھے پھلوں والی، مری ماں، میں تیرا بندہ ہو، میں بھارت ماتا کی وندنا کرتا ہوں''۔

پھر ہندوستان کے تصور کے سامنے سر جھکانے اور پھول چڑھانے کا ضابطہ بھی نافذ کیا جارہا ہے، یہ ملک کو ایسی خطرناک منزل کی طرف لے جانے کا اقدام ہے جس کے تصور ہی سے ایک محب وطن کے رونگٹے کھڑے ہوئے جاتے ہیں، اور ان کی راتوں کی نیند حرام ہوجاتی ہے، انھیں خطرات کی نشاندہی انھیں حقائق کو واضح اور دلنشین کرنے اور انھیں مقاصد کے حصول کے لئے آخری جدوجہد کرنے کی خاطر یہ دینی تعلیمی کونسل وجود میں آئی، اس خطرہ کا واضح طور پر احساس سب سے پہلے قاضی محمد عدیل عباسی صاحبؒ (علیگ) کو ہوا، جو ایک ممتاز نیشنلسٹ اور کانگریسی مسلمان تھے، یو پی اسمبلی کے ممبر بھی رہے، اور ڈسٹرکٹ بورڈ بستی کے اہم رکن وعہدیدار بھی ڈسٹرکٹ بورڈ کے اندر رہتے ہیں اور خاص طور پر ایجوکیشن کمیٹی کے عرصہ تک چیئرمین رہنے کی وجہ سے اور پھر اپنی واقفیت، حقیقت پسندانہ ذہن اور اسلامی ضمیر واحساس کی وجہ سے انھوں نے اس خطرہ کو نہ صرف یہ کہ جلد ہی بھانپ لیا، بلکہ یہ ان کے ذہن واعصاب پر ایسا مستول ہوگیا کہ انھوں نے اپنی پوری توانائی اور اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں اس پر مرکوز کردیں، وہ عرصہ تک اپنے ضلع کے خود ہی خطرہ کا مقابلہ اور مکاتیب ومدارس قائم کرنے کا کام خاموشی

سے کرتے رہے، ان کو ایک ایسا چٹکلا ہاتھ آ گیا، جس سے وہ عام چندہ سے بڑی حد تک مستغنی ہو گئے، یہ چٹکلا چٹکی فنڈ تھا، انھوں نے یہ تحریک چلائی کہ ہر گھر میں کھانا پکاتے وقت ایک مٹھی آٹا ایک ہانڈی میں جو اس کے لئے مخصوص کر دی جائے، ڈال دیا جایا کرے، اس کو فروخت کر کے مقامی مکتب کا خرچ چلایا جائے، وہ اسی دائرہ کے اندر عرصہ تک محدود ہو کر کام کرنا چاہتے تھے، لیکن جب مولانا منظور صاحب نعمانی مرحوم، بندہ سطور اور بعض دوسرے دوستوں کے سامنے وضاحت کے ساتھ یہ مسئلہ آیا تو ہم نے ان سے اصرار کیا کہ وہ اس دائرہ سے باہر قدم نکالیں اور اس سے باہر کم سے کم صوبائی پیمانہ پر انجام دینے کی کوشش کریں۔

ہماری گفتگوؤں کے بعد وہ اس پر آمادہ ہو گئے، اور انھوں نے ۳۰/۳۱ دسمبر ۱۹۰۹۱ کی تاریخوں میں بستی میں ایک صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس بلائی جس میں انھوں نے صرف صوبہ ہی نہیں بلکہ صوبہ کے باہر سے بھی ممتاز مسلمان دانشوروں، تعلیمی مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والوں، قومی، ملی کارکنوں اور تنظیموں کے سربراہوں کو بلایا، اس کے بعد مختلف و متعدد اہم مقامات میں اس کے سالانہ اجلاس (کانفرنسیں) ہوتے رہے، جس میں اب علی گڑھ کا یہ شہرۂ آفاق تعلیمی و ثقافتی شہر شامل ہے، جس نے ایک تاریخ ساز رول ادا کیا ہے۔

نشان یہی ہے زندہ قوم کا

حضرات: جو قوم خود فیصلہ نہیں کر سکتی، دنیا کی ساری تدبیری، حکمت و سائنس، بلکہ طاقت ور سلطنتیں بھی اس قوم کی مدد نہیں کر سکتیں، جن قوموں نے اپنے ضمیر کے ساتھ اپنے عقیدے، اور اپنے ایمان کے ساتھ، ان اصولوں کے ساتھ جو ان کو جان سے زیادہ عزیز تھے، باقی رہنے کا فیصلہ نہیں کیا ان کا نام حرف غلط کی طرح لوح جہاں سے مٹا دیا گیا، دنیا جو تاریخ کہتی ہے، یہ سلطنتوں کی تاریخ نہیں ہے، تہذیبوں کی تاریخ نہیں ہے، علم و دانش کی ترقی و فروغ کی تاریخ نہیں ہے، ذہانتوں کی تاریخ نہیں ہے، ایک جملہ میں یہ انسانی فیصلوں کی تاریخ ہے، فیصلوں نے سلطنتیں قائم کی ہیں اور مٹا دی ہیں، فیصلوں نے تہذیبیں پیدا کی ہیں اور تہذیبوں کا گلا گھونٹ دیا ہے، فیصلوں نے قوم کو دنیا کے ایک سرے سے اٹھا کر دنیا کے دوسرے سرے پر پہنچا دیا ہے، اور عزم و فیصلہ کی غیر موجودگی نے جیتی جاگتی، دوڑتی بھاگتی، زندگی اور توانا قوم کو بے جان مجسموں کی طرح باقی رکھا اور مردوں کی طرح دفن کر دیا۔

نشان یہی ہے زندہ قوموں کا
کہ صبح وشام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمال صدق ومروت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
خودی کے مرد خود آگاہ کا جمال وجلال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں
حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں

اصلاح واستفادہ سے کوئی مستغنی نہیں

> حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ نے یہ تقریر مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ الٰہ آباد میں ان کی وفات کے بعد فرمائی، جو نومبر ۱۹۷۶ء میں ''معرفت حق نما'' میں شائع ہوئی تھی، تقریر کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر ہم اس کو ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔

• الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین محمد بن عبداللہ الامین ومن تبعھم باحسان الیٰ یوم الدین۔

حضرات! جن لوگوں کو کسی مدرسہ میں پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے یا وہ کسی بزرگ کی خدمت میں استفادہ اور تربیت کے لئے حاضر ہوئے ہیں، ان کو اس کا بخوبی اندازہ ہوگا، کہ زمانہ خواہ کتنا ہی گذر جائے اس طالب علم کیلئے اپنے مدرسہ میں کھڑے ہوئے کچھ بیان کرنا یا اس جگہ جہاں وہ استفادہ کے لئے حاضر ہوا کرتا تھا، کچھ عرض کرنا کتنا مشکل کام ہے۔

میری مثال بالکل ایسی ہی ہے، اس لئے کہ میں ہمیشہ اپنے بزرگوں کی خدمت میں اور خصوصاً اس آخری دور میں حضرت مولانا (شاہ وصی اللہ صاحبؒ) کی خدمت میں اس لئے آتا تھا کہ کوئی ایسی بات سننے میں آئے جس سے دل کی کچھ کیفیت پیدا ہو، یقین میں اضافہ ہو اور ایمانی حلاوت نصیب ہو، اور رسم وصورت میں حقیقت پیدا ہو۔

اصلاح واستفادہ سے کوئی مستغنی نہیں ہوتا!

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ کچھ لکھ پڑھ جاتے ہیں یا ان کو کچھ تصنیف وتالیف کا اتفاق ہوتا ہے اور ان کی طرف کچھ نگاہیں اٹھنے لگتی ہیں کہ ہم بھی کچھ جانتے بوجھتے ہیں تو پھر اب ان کو کچھ سننے کی اور کہیں جانے کی اور کسی سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت نہیں تو ان کا یہ خیال بالکل صحیح نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی دور میں بھی اور کسی عمر میں بھی، گمنامی اور شہرت کی حالت میں بھی استفادہ سے بلکہ اصلاح سے مستغنی نہیں ہوتا، ہمہ شمسار کا تو خیر ذکر کیا ہے، جن

کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسی صحبت حاصل تھی، جس کو کیمیا اثر کہنا بھی حقیقت میں اس کی کچھ تعریف نہ ہوگی، بس یوں سمجھئے کہ ایسی پاک صحبت جس کے بعد کسی صحبت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، اور کوئی صحبت اس سے بڑھ کر مؤثر نہیں ہو سکتی، مگر پھر بھی صحابہ کرامؓ کو آپ کے بعد ہمیشہ اس بات کی فکر وطلب رہتی تھی کہ اپنے ایمان میں اضافہ کریں، اور ہمارے قلوب میں وہی سوز وگداز اور وہی کیفیات پیدا ہو، جو صحبت نبویؐ میں حاصل ہوا کرتی تھیں یا کم از کم اس کا اثر یا عکس ہی نصیب ہو جائے، چنانچہ بخاری شریف میں ایک جلیل القدر صحابی کا قول، امام بخاری نے نقل کیا ہے، "اجلس بنا نومن ساعة" آؤ بھائی تھوڑی دیر بیٹھ کر ذرا ایمان کی باتیں کر لیں، اور ایمان کا مزہ اٹھالیں، ایمان کے جھونکے آئیں اور ہم اس سے لطف اندوز ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی تو بعد والے کیونکر اس سے مستغنی ہو سکتے ہیں؟ بلکہ واقعہ یہ ہے اور جن لوگوں کا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ کہنے سننے سے آدمی کے قلب میں ضرور ایک بے کیفی سی پیدا ہو جاتی ہے، اور اس میں کہنا سننے سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے، سننے سے اتنی بے کیفی قلب میں نہیں پیدا ہوتی ہے، جتنی کہنے سے ہوتی ہے، اس لئے ایسے لوگوں کو اس کی زیادہ ضرورت ہے کہ وہ کبھی سامع ہوں قائل نہ ہوں، اور کبھی صرف مستفید ہوں، مفید نہ ہوں اور کبھی مخاطب ہوں، مخاطب نہ ہوں اور ہمہ تن گوش ہو کر کسی اللہ والے کی باتیں سنیں، تاکہ قلب میں ایسا کیف پیدا ہو، جس سے قلب کی زندگی ہے۔

ایمان کو تازہ کرنے کی ضرورت ہے:

غرض جن لوگوں کو ذرا بھی تجربہ ہے اور ان کے قلوب مردہ نہیں ہو چکے ہیں وہ خود جانتے ہیں کہ ان کو دوسروں سے ہزار درجہ زیادہ اپنے ایمان کو تازہ کرنے کی ضرورت ہے اور اللہ والوں کی بات ادب وتعظیم کے ساتھ سننے کی ضرورت ہے اگر وہ سمجھیں کہ ہم مستغنی ہیں یا ہم بھرے ہوئے ہیں، تو ان سے زیادہ محروم وبد قسمت کوئی نہیں بزرگان دین نے اس کی ایسی مثال بیان فرمائی ہے کہ اگر کوئی فقیر اس طرح صدا لگائے کہ یوں تو میرے پاس سب کچھ ہے ہمارا کشکول بھی بھرا ہوا ہے، پھر بھی صدا لگاتا ہوں تو بڑے سے بڑے سخی کے اندر بھی سخاوت کا جذبہ نہیں پیدا ہوگا، اس کے لئے تو اسباب کی ضرورت ہے کہ اپنے کو محتاج ظاہر کیا جائے، یہی حال اب

یہاں بھی ہونا چاہیے (یعنی اللہ والوں کے یہاں) ان حضرات کے یہاں اس طرح سے حاضر ہونا چاہئے کہ ہم بالکل خالی ہیں، مفلس محتاج بن کر آپ کی خدمت میں کچھ لینے کے لئے آئے ہیں۔

مفسانیم آمدہ در کوئے تو
شیئا للہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما
آفریں بردست وبر بازوئے تو

واقعہ یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ میں ایسے حضرات کی خدمت میں حاضری دوں، اور پھر ایسے دور میں اور ہمارے جوار میں حضرت مولانا وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ زیادہ شفقت کرنے والا میری نظر میں ت کوئی نہیں تھا، اور مناسبت کی بات تو بالکل غیر اختیاری ہے، اس کے لئے کوئی معلوم اور متعین اصول نہیں ہیں کیوں ہوتی ہے؟ کب ہوتی ہے؟ کیسے ہوتی ہے؟ اس کے اصول تو کسی بڑے سے بڑے حکیم نے بھی نہیں بتائے تو مناسبت منجانب اللہ ایک چیز ہے، بہر حال حضرت کی صحبت سے مجھے فائدہ ہوتا تھا، حضرت کی شفقتوں سے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، وہ تو ہمارے دوستوں کو اور یہاں کے حاضر باش بزرگوں کو یاد ہوں گی، باقی سب سے بڑا فائدہ یہاں کی حاضری میں مجھے یہ ہوتا تھا۔ (جس کی شاید آپ حضرات توقع نہ کرینگے) وہ یہ کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم یہاں بالکل عامی ہیں، اور گنوار ہیں ہمیں ان چیزوں کی ہوا بھی نہیں لگی اور یہ کہ دین کی حقیقت ان ہی حضرات کے یہاں آ کر معلوم ہوتی ہے، اگر کوئی اور فائدہ نہ ہوتا سوائے اس اصولی اور کلی فائدے کے تو سب سے بڑا فائدہ یہی تھا کہ کہیں تو آدمی کو یہ معلوم وہ کچھ نہیں جانتا، کہیں تو آدمی کو معلوم ہو کہ وہ محتاج ہے، تو سب سے بڑی چوٹ جو یہاں آ کر دماغ پر لگتی، وہ یہ کہ ہم تو بالکل عامی اور جاہل ہیں ہمیں تو صرف نقوش آتے ہیں باقی دین کی حقیقت سے ہم بہت دور نظر آتے ہیں، اسی کو علامہ اقبال نے کسی کے متعلق کہا ہے۔

سر دیں مارا خبر اُو را نظر
او درون خانہ ما بیرون در

یعنی ہمارے لئے دین کی حقیقت سنی سنائی چیز ہے اور ان کے لئے جانچی پرکھی دیکھی بھالی اور چکھی ہوئی چیز ہے، وہ گھر کے اندر ہیں اور ہم گھر سے باہر، غرض بزرگان دین کے یہاں جا کر آدمی کی سمجھ میں یہ بات آ جاتی ہے خاص کر پڑھے لکھے لوگوں کی سمجھ میں کہ ہمیں اپنی صورت حقیقت پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اپنے قالب میں روح پیدا کرنے کی حاجت ہے، یہ سب سے بڑا فائدہ ہے۔

حضرت سیّد صاحب کا واقعہ

مجھے یاد ہے کہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جب حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع کیا تو ان کے بہت سے عالی معتقدین کو ناگوار ہوا، اور سید صاحبؒ سے احتجاج کیا کہ ہماری جماعت کی ایک طرح کی سبکی ہوئی کہ ہم نے تو آپ کو بڑا بنایا تھا، گویا آپ شیخ الکل تھے، اور ہر چیز میں آپ امام کا درجہ رکھتے تھے، اور ہر چیز میں آپ امام کا درجہ رکھتے تھے اور آپ نے دوسرے کا دامن پکڑ لیا، تو اس سے ہماری خفت ہوئی اس پر ایک دن سید صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ عجیب لوگ ہیں ایک طرف تو میرے معتقد بنتے ہیں، دوسری طرف مجھ ہی پر اعتماد نہیں کرتے، یعنی میں اپنا فائدہ سمجھ کر وہاں گیا تو ان کو اس سے اختلاف ہے، گویا میرے استاد بن کر مجھے مشورہ دیتے ہیں کہ آپ کہاں چلے گئے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں ان سے پوچھ کر وہاں جاتا، میں تو اپنا فائدہ اس میں دیکھتا ہوں اور آپ کی خاطر وہاں نہ جاؤں، گویا اس دولت سے میں محروم رہوں۔

اللہ والوں کے یہاں کی باتیں ذھانت کا نتیجہ ہیں

ان حضرات کے یہاں جو باتیں ملتی ہیں وہ صرف نکتے اور موشگافیاں نہیں ہیں وہ تو ذہانت کا نتیجہ ہیں، درحقیقت ذہانت کے چار درجے ہیں اور جو ذہانت کا آخری درجہ ہے وہ روح کی ذہانت ہے، یہ روح کی ذہانت ایسی لطیف ہے کہ اس کا بیان الفاظ میں مشکل ہے، جہاں سرحدیں ختم ہوتی ہیں، دماغ کی ذہانت کی (جس سے پہلے زبان کی ذہانت کا درجہ تھا) وہاں سے قلب کی ذہانت شروع ہوتی ہے، اور جہاں قلب کی ذہانت کی سرحد ختم ہوتی ہے وہاں سے روح کی ذہانت کی سرحد شروع ہوتی ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کے ان مخلص اور مقبول بندوں کو

حاصل ہوتی ہے، جن سے اللہ تعالیٰ تربیت کا کام لیتے ہیں، اس میں سامنے ہونا نہ ہونا، مسافت کا قرب و بعد، معرفت وعدم معرفت سب برابر ہے، کوئی چیز اس کے لئے شرط نہیں، ان حضرات کی روح اتنی براق، اتنی سریع الادراک ہوتی ہے کہ بلا کسی شرط کے خیر و شر کی تمیز ان کو حاصل ہو جاتی ہے، خصوصی طور پر ان حضرات کے یہاں جو چیز مجھے محسوس ہوتی ہے، وہ یہی ہے اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بہت بڑا فضل ہے کہ بغیر کسی وجہ کے جس کی وجہ مجھے خود نہیں معلوم، اللہ تعالیٰ نے ایسے بندوں کے پاس مجھے پہونچا دیا۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ہم نے روح کی ذہانت کے کھلے نمونے دیکھے اور پھر حضرت (شاہ وصی اللہ صاحبؒ) رحمۃ اللہ علیہ میں، میں نے ان دونوں بزرگوں میں زیادہ مشابہت دیکھی، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں بزرگوں سے الگ الگ کام لیا، ذوق بھی دونوں کا الگ الگ تھا، لیکن بہت سی چیزوں میں مشارکت تھی، خصوصاً قلب کی ذہانت اور روح کی ذہانت میں۔

بہر کیف میں ان حضرات کے یہاں اس لئے آیا کرتا تھا کہ کبھی تو اس پُر عونت اور فریب خوردہ کو یہ محسوس ہو کہ وہ کچھ نہیں ہے کیونکہ اس سے بڑھ کر آدمی کیلئے کوئی چیز خطرناک نہیں ہے کہ اس کو کبھی یہ محسوس نہ ہو کہ کوئی کوچہ ایسا بھی ہے کہ جس سے وہ واقف نہیں اور خاص طور سے دین کے متعلق اگر یہ ذہن میں آجائے کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے اور اب مجھے کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں، تو اس سے زیادہ خطرناک کوئی چیز نہیں ہے، ایسا آدمی جو بھی دعویٰ کر دے بعید نہیں ہے اور اسی طرح کے لوگوں نے دعویٰ کیا بھی ہے، ان لوگوں نے دعویٰ نہیں کیا جو پہاڑ کے نیچے کھڑے تھے، کہ جب سر اٹھاتے تھے تو دیکھتے کہ آسمان بھی بہت اونچا ہے بلکہ جو لوگ سمجھے کہ ہم پہاڑ کی چوٹی پر پہونچ گئے ہیں، انھوں نے دعویٰ کیا ہے، انسان کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی چیز محافظ نہیں اور اس پر یہ بڑا فضل ہے کہ اس کو یہ معلوم ہو کہ دین کی ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں جا کر دین کی وہ باتیں سننے یا دیکھنے میں آسکتی ہیں، جس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ ہمارا میدان نہیں اور یہاں ہمارا گذر نہیں۔

ہمارے اکابرین کا رتبہ

کوئی شخص اگر ایسا ہو کہ بولنے پر آئے تو بولتا جائے اور لکھنے پر آ جائے تو لکھتا جائے اور دنیا بھر کے لوگ مل کر اس کی تعریف کرنے لگیں تو اس سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ ''سر دین'' جس کو علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ اس کو کرنے کی ضرورت ہے، اور وہ اللہ کے ان خاص بندوں ہی کے پاس ہوتا ہے، یہی چیز تھی جس کی وجہ سے حضرت ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ نے سید عبدالرزاق بانسویؒ کا دامن پکڑا جو بالکل ہمارے بارہ بنکی اور لکھنو کے دیہات کی بولی بولتے تھے، جیسے آوت ہے جاوت ہے۔ (یعنی آتا ہے جاتا ہے) یہ تو ان کی زبان تھی مگر ملا نظام الدینؒ کا حال یہ ہے کہ مناقب رزاقیہ میں دیکھتے چلے جائیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنے آپ ہر دور میں اس کی مثالیں دیکھیں گے تیرھویں صدی میں مولانا عبدالحی صاحبؒ جن کو شاہ عبد العزیز صاحبؒ خود شیخ الاسلام کا لقب دیتے ہیں اور مولانا اسماعیل شہیدؒ جن کو (شاہ صاحبؒ) حجۃ الاسلام کے لقب سے یاد کرتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں کہ شیخ الاسلام مولانا عبدالحی اور حجۃ الاسلام مولانا اسماعیل شہیدؒ اگر چہ یہ دونوں میرے عزیز ہیں اور مجھ سے چھوٹے ہیں، مگر اظہار حق واجب ہے، اس لئے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو وہ مقام عنایت فرمایا ہے کہ جو کمتر کسی کو حاصل ہے، نیز فرماتے ہیں کہ ان کو مجھ سے کم نہ سمجھو، تو ان لوگوں کو دیکھئے کہ سید احمد شہیدؒ سے رجوع ہوئے جو کہ امی تو نہیں تھے مگر محض فارسی داں تھے اور ان کا یہ حال تھا کہ شکوۃ کا مطالعہ کرتے تھے اور جو کوئی پاس سے گذرتا اس سے پوچھتے، ارے بھائی، اس لفظ کے کیا معنی ہیں ذرا بتاتے جائیے، ان کا یہ علم تھا اور مولانا عبدالحیؒ سے تو انھوں نے پڑھا بھی تھا کہ باوجود ان دونوں حضرات نے سید صاحب کی رکاب جو تھامی ہے تو مرتے دم تک نہیں چھوڑی، جب کوئی پوچھتا کہ آپ لوگوں نے سید صاحبؒ میں کیا بات دیکھی جس کی وجہ سے ان کی طرف رجوع کیا؟ حالانکہ وہ علم میں بھی آپ کے مقابل میں کوئی مقام نہیں رکھتے، تو فرماتے، بھائی ہم کو نماز پڑھنی بھی نہ آتی تھی، انھوں نے نماز پڑھنا سکھایا، نیز فرمایا کہ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جیسی اور بہت سی چیزیں ہیں، یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی جگہ اور بہت سی چیزیں ہیں یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی جگہ ایسی ہو جہاں پڑھے لکھوں کو بھی جا کر معلوم ہو کہ میں کچھ نہیں ہوں، اگر

خدانخواستہ ایسی جگہیں ختم ہوگئیں اور ایسے اللہ کے بندے نہ رہے اگر صرف مدعیان علم رہ گئے اور ہم جیسے لوگ رہ گئے جن کے متعلق لوگ معلوم نہیں کیا کیا سمجھتے ہیں تو یہ بڑے خطرے کی بات ہے''

عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

اللہ کا بہت بڑا فضل ہے کہ کچھ ایسے حضرات موجود ہیں جہاں نہ کسی خوش بیانی کی ضرورت ہے، اور نہ کسی بڑے وسیع مطالعہ کی حاجت، یہ سب چیزیں تو ہر جگہ موجود ہیں۔

میں تو کہا بھی کرتا ہوں اور اس میں تنہا نہیں ہوں کہ آجکل کے علماء کے وعظ میں میرا جی نہیں لگتا، جلسے کی تحقیر اور علماء کی تنقیص نہیں کرتا اور اس کے فائدہ کا بھی انکار نہیں، لیکن خدا جانے کیا بات ہے، اس کو بیماری ہی سمجھ لیجئے کہ میرا جی نہیں لگتا، ہمارا جی تو بس ایسے وعظ میں لگتا ہے، جس میں خالص اللہ اور اس کے رسول کی بات پرانے انداز سے کہی جائے اور جنت اور دوزخ کا تذکرہ کیا جائے، چنانچہ جب یہ حضرات تقریر کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ نہ یہ کتابی علم ہے، نہ کتابوں کی باتیں ہیں، بلکہ یہ علمی باتیں ہیں، سیدھی سادی دین کی باتیں اور ایسے انداز سے کہی جاتی ہیں کہ ہم کو بھی اس سے فائدہ ہوتا ہے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھی ہم جب آتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ فرما رہے ہیں، وہ حقیقت ہے اور ان کے یہاں لب لباب ہے، یہ نہیں کہ ایک چیز کو خوب پھیلا کر بیان کیا جا رہا ہے، یہ چیز تو ہم کو دوسری جگہ نہیں ملتی، ہمارے یہاں کتب خانے ہیں اور دوسرے ذرائع ہیں، جن سے ہم کسی بھی مضمون کو پھیلا سکتے ہیں، لیکن ان حضرات کے یہاں جو حقائق ہیں ان کی مدعیت ہی کچھ اور ہے۔

مولانا جامی صاحب نے ایک عالم کا جو مکالمہ سنایا کہ میں اور جگہوں پر گیا وہاں یہ چیز محسوس نہ ہوئی جو حضرتؒ کی خدمت میں آ کر محسوس ہوئی، اس کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ بزرگوں کے یہاں کوئی بنیادیں، کوئی نیا علم کوئی نئی تحقیق، کوئی نیا انکشاف نہیں ہے، اس بارے میں بھی لوگ بہت غلط فہمی میں ہیں، معلوم نہیں کیا سمجھتے ہیں کہ بزرگان دین کے یہاں جا کر کیسے کیسے دین کے اسرار ونکات اور عجیب عجیب تحقیقات سننے میں آئیں گی، تو یہ بھی ہوتا ہے، چنانچہ محی الدین ابن عربیؒ کے یہاں مجدد الف ثانی اور شیخ مخدوم یحییٰ بہاریؒ کے

یہاں تو ایسے ایسے نکات ہیں کہ بڑے بڑے فلسفی ان کے سننے کے بعد کان پکڑ لیں اور سمجھیں کہ ہمیں تو علم کی ہوا بھی نہیں لگی، لیکن ان حضرات کے یہاں سے جو چیز لینے کی ہے، وہ یہ کہ صورت اور رسم میں حقیقت پیدا کی جائے اور میں تو سمجھتا ہوں کہ یہی خلاصہ بھی ہے تصوف کا، جس کا مطلب گویا بس اس کے سوا کچھ نہیں کہ نماز تو پڑھتے ہیں، صحیح نماز پڑھنے لگیں اور دین کے سارے شعبوں میں حقیقت نہیں تھی، نیت صحیح نہیں تھی، اخلاق صحیح نہیں تھا، رخ صحیح نہیں تھا، حقیقت پیدا ہو جائے اور نیت درست ہو جائے اور اللہ کی رضا کے لئے ہم اس کو کرنے لگیں اور شریعت کے احکام کی تلاش اور ان کا اہتمام پیدا ہو جائے، نیز ان کا ادب واحترام پیدا ہو جائے احکام شرعیہ کا اہتمام اور انتظام یہ دونوں ہی چیزیں ضروری ہیں، بس یہ ہے کہ تل اوٹ پہاڑ جس کے بارے میں لوگ سمجھتے ہیں کہ تصوف پتہ نہیں کیا چیز ہے اور تصوف کی حقیقت جو بیان کر رہا ہوں اس کا بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

حضرت مولانا کی تصنیف ''نسبت صوفیہ'' اس سلسلہ کی بہترین چیز ہے، میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا پھر کہہ رہا ہوں کہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ دوسری زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ کیا جائے اور علماء خاص طور اس کو پڑھیں، کیونکہ تصوف کی اصلاح نے ہی اس پر پردہ ڈال دیا ہے۔ لہٰذا بجائے تصوف کے جیسا کہ حضرت مولانا کا معمول تھا، اس کو ''نسبت احسان'' یا حقیقت سے تعبیر کیا جائے، اگر سب حضرات مل کر اس بات کو قبول کر لیں اور گو یہ کام مشکل ہے لیکن اگر ہو جائے تو کیا خوب ہے کہ منکرین تصوف سے ہمارا آدھا اختلاف تو اسی سے ختم ہو جائے گا۔

نیز فرمایا کہ تصوف کا لب لباب اور خلاصہ یہی ہے کہ جو کچھ ہم صبح سے شام تک کرتے رہتے ہیں بغیر کسی نیت کے اور بغیر کسی احتساب کے وہ ہم احتساب اور نیت کے ساتھ کرنے لگیں، ہمارے اندر اصلیت پیدا ہو جائے، نیز اس کی اہمیت پیدا ہو جائے، گویا نمک ہے، مگر اس میں نمکینی نہیں ہے، شکر ہے مگر اس میں مٹھاس نہیں ہے، مٹھاس پیدا ہو جائے، پانی ہے مگر اس میں برودت اور تسلی دینے اور پیاس بجھانے کی صلاحیت نہیں، وہ ایسا ہو جائے کہ اس سے ہمارا حلق تر ہو رہا ہو، ہمارے جسم کا ایک ایک عضو تر ہو رہا ہو، اور ہماری زبان سے اللہ کا شکر ادا ہو، ہمارے اور پانی کے درمیان جو رشتہ ہے حقیقت میں وہ ٹوٹ گیا ہے، پانی بھی موجود ہے اور ہم بھی ہیں لیکن پانی سے جو فائدہ ہم کو پہونچنا چاہئے، وہ نہیں پہنچ رہا ہے، اس میں پانی کا نقص

کم اور ہمارا نقص زیادہ ہے، بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہمارے اور اس کے درمیان پل ٹوٹ گیا ہے، پل تعمیر کر لیجئے تاکہ پانی اپنا کام کرنے لگے، اللہ کی نعمتیں بٹ رہی ہیں، اللہ کی دنیا بالکل اسی طریقے سے ہے، جیسی تھی، لیکن اس سے استفادہ کے جو وسائل تھے وہ کمزور ہو گئے ہیں، بقول اکبر مرحوم۔ ؎

اللہ کی راہ اب تک ہے کھلی آثر ونشاں سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا

یہی حال دین کی نعمتوں کا ہے، قرآن وہی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات وہی، احکام شرعیہ سب وہی اور ان پر اللہ کے جو وعدے ہیں سب برحق، لیکن ہمارے اور ان کے درمیان جو رشتہ ہونا چاہئے تھا، اعتقاد کا، یقین کا، بھروسے کا اور شوق کا وہ ٹوٹ چکا ہے اسی کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے، بس یہی چیز ان حضرات سے لینے کی ضرورت ہے اور اسی کے وہ امام تھے، ان کی تحریریں اور ان کے ملفوظات اور ارشادات اب بھی موجود ہیں اور ان میں وہی تاثیر ہے، مجھے خوب یاد ہے کہ حضرتؒ نے جو گرامی نامہ میرے نام تحریر فرمایا تھا، اس میں خواجہ محمد معصومؒ کی ایک عبارت بھی نقل فرمائی تھی، جس میں ففروا الی اللہ تحریر تھا، میں نے جب حضرتؒ کا وہ خط پڑھا تو مجھ پر کئی دن تک اس کا اثر رہا، خواجہ محمد معصومؒ کا مضمون بالکل ایسا معلوم ہوا کہ ایک زندہ چیز ہے اور ابھی کسی اللہ کے بندے نے لکھا ہے ایک تو حضرت خواجہ محمد معصوم کی تحریر پھر حضرتؒ کا اسکو نقل کرنا ان دونوں باتوں کا امتزاج سے اس میں اثر ہی دوسرا تھا۔

خدا کا شکر ہے" جائے بزرگاں بجائے بزرگان" آج تو نہیں ہیں مگر حضرت کے جو معمولات تھے اور ان کی اصلاح وتربیت کا جو طریقہ تھا وہ آپ حضرات نے اللہ کے فضل اور اس کی توفیق سے جاری رکھا اور حضرت کی یہ مقبولیت اور خصوصیت ہے ورنہ بہت سی جگہ دیکھا کہ جب وہ بزرگ اٹھ گئے تو سب چیزیں ختم ہو گئیں اور وہ جگہ خالی ہو گئی، سوا اس کے کہ جا کر زیارت کر لیجئے، کوئی پیغام وہاں سے نہیں ملتا اور دل کی دوا وہاں نہیں ملتی بزرگوں نے اس موقع کے لئے یہ مصرعہ پڑھا ہے۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

چنانچہ جہاں جایئے یہی نظر آتا ہے کہ جن کی دکان تھی وہ واقعی بڑھا گئے لیکن خدا کا شکر

ہے کہ یہاں کے لوگوں نے حضرتؒ کے کام کو جاری رکھا رسالے کے ذریعہ، مجلسوں کے ذریعہ، خطوط کے ذریعہ اور حضرت کے جو جو افادے کے طریقے تھے اس کے ذریعہ ان چیزوں کو باقی رکھا، بیشک دین زندہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیشہ اس کا انتظام رہے گا، کہ حقیقی دین باقی رہے اور وہ زندہ انسانوں کے ذریعہ سے زندہ رہے گا۔

لہٰذا اب اس کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تحقیقات اور ملفوظات کے ساتھ ساتھ ان کے سلسلے اور ان کے خاندان اور ان کے دوستوں کو اس کی توفیق دیتا رہے کہ وہ اس کام کو جاری رکھیں اور خود ان سے بھی دوسروں کو وہی پیغام ملتا رہے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے اور یہ فیض جاری رہے۔

یہ شہر تو ہمیشہ سے مرکز رہا ہے، اور یہاں کیسے کیسے اللہ کے بندے پیدا ہوئے ہیں اور آخر میں حضرتؒ نے بھی اسی جگہ کا انتخاب فرمایا اور وہ چیز زندہ ہوگئی۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں است
خم وخمخانہ بہ مہر و نشان است

الحمدللہ کہ ابھی خم وخمخانہ مہر ونشاں کے ساتھ باقی ہے، خدا کا شکر ہے کہ حضرتؒ کے بعد اتنے دن گذر جانے کے باوجود بھی الحمدللہ جگہ خالی نہیں ہے اور یہاں سے وہی پیغام ملتا ہے اور وہی بات کہی جاتی ہے۔

اللہ رکھے آباد آں ساقی ترا میخانہ

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

منتخب و ماموراُمت

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نؤمن به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضلل الله فلا هادي له و نشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له و نشهد ان سيدنا و مولانا محمداً عبده و رسوله صلى الله تعالىٰ عليه و علىٰ آله و اصحابه اجمعين اما بعد فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم.

ایک مثالی رہنما امت کی ضرورت

جن باتوں کی طویل انسانی تاریخ اور علم النفس اور علم الاخلاق پوری تائید کرتے ہیں، ان میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ بلند ترین مقاصد، شریفانہ تعلیمات اور عمل کے اعلیٰ ترین نمونے اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتے اور اگر قائم ہو بھی جائیں تو دائم و باقی نہیں رہ سکتے، جب تک کہ ان کی پشت پر ایک انسانی جماعت (بلکہ صحیح الفاظ میں ایک ایسی امت) نہ ہو جو اس دعوت و تحریک کی علمبردار اس کے راستہ میں جدو جہاد کرنے والی اور اس کا عملی نمونہ ہو۔

اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض انبیاء علیہم السلام (چہ جائیکہ مصلحین اخلاق اور حکمائے کبار) کی تعلیمات بھی اس وجہ سے زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہیں کہ ان کے پیچھے کوئی امت نہ تھی، جو ان کے پیغام کی ذمہ داری سنبھالتی، اس راستہ میں جاں نثار کرتی اور اپنی زندگی، اپنے تمدن اور حکومت و معاشرہ کے ذریعہ ان کا عملی نمونہ پیش کرتی، نتیجہ یہ ہوا کہ جن علاقوں میں وہ بھیجے گئے تھے، وہاں کی زندگی ایک ایسے آب رواں کی طرح بن کر رہ گئی، جس کی سطح ایک ہوتی ہے اور وہ اقوام وقبائل جانوروں کے ایک ریوڑ کی طرح ہو گئے، جن کا کوئی نگراں و نگہبان نہ ہو۔

جب اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری رسول اور خاتم النبیین ہوں، اور آپ کے بعد نہ کوئی اور نبی آئے اور نہ کوئی اور کتاب نازل ہو، تو اس طرح اللہ تعالیٰ

نے انسانیت کو اس خطرہ سے محفوظ کر دیا، اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک پوری امت کو بھی مبعوث کیا، گویا بعثت محمد یہ دہری بعثت تھی جس میں نبی کی بعثت امت کی بعثت کے ساتھ شامل تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کی ایسی تعریف کی ہے (جو نبوت کے بغیر) کسی مبعوث اور مامور من اللہ ہی کی ہو سکتی ہے۔

کنتم خیر امتہ اخر جت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکرو تومنون باللہ
تم لوگ بہترین جماعت ہو جو لوگوں کیلئے پیدا کی گئی ہے، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

وکذلک جعلنکم امۃً وسطاً لتکونو شھدآء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھداً

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک امت عادل بنا دیا تا کہ تم گواہ رہو لوگوں پر اور رسول گواہ رہیں تم پر۔

حدیث نبویؐ میں بھی اسی طرح کے الفاظ آئے ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت سے فرمایا۔

انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین
تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو نہ کہ تنگی پیدا کرنے والے۔

بعثت ودعوت کی ذمہ داری اور اپنی ماموریت ومسولیت کا یہ شعور واحساس صحابہ کرامؓ وتابعین عظام کے دلوں میں اس وقت بھی موجزن تھا جب ایرانی قائد جنگ رستم نے سید نا ربعی بن عامرؓ (آپ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے، ملاحظہ ہو الاصابۃ ۱/۵۰۳) سے (جنھیں سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ نے رستم کی طلب پر اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا) یہ پوچھا کہ تمھارے یہاں آنے کا محرک ومقصد کیا ہے؟ تو انھوں نے یہ مومنانہ اور داعیانہ جواب دیا کہ:

اللہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد الی عبادۃ اللہ وحدہ ومن ضیق الدنیا الی سعتھا ، ومن جور الادیان الی عدل الاسلام

(البدایۃ والنھایۃ ۳۹/۷)

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس لئے بھیجا ہے کہ ہم جس کو وہ چاہے بندوں کی بندگی سے نکال کر ایک خدا کی بندگی پر آمادہ کریں اور دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف اور مذاہب کے ظلم سے بچا کر سایہ عدل میں لائیں۔

عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے

> آج سے چار سال قبل ۲۰ تا ۲۵ اگست ۹۸ء مطابق ۲۸ ربیع الثانی تا ۳ جمادی الاولی ۱۴۱۹ھ کو رابطہ عالم اسلامی کا دسواں اجلاس اردن کے دارالسلطنت عمان میں منعقد ہوا اس موقع پر عالم عربی کے چوٹی کے علماء، ادباء اور دعاۃ موجود تھے ذیل کی اہم اور چشم کشا تقریر حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ نے اس جلسہ میں فرمائی جس کا انتظام اردنی وزارت اوقاف نے کیا تھا۔ وزیر اوقاف نے آغاز جلسہ میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ کا تعارف کرتے ہوئے مولانا کے فکر اور ان کی شہرۂ آفاق کتاب ''ماذا خسر العالم'' اپنے غیر معمولی تاثر کا اظہار کیا۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی عربی تقریر کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے!

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين، خاتم النبيين محمد وعلى آله وصحبه اجمعين، ومن تبعهم باحسان ودعا بدعوتهم الى يوم الدين. اعوذ بالله من الشيطان الرجيم، والذين كفرو بعضهم أولياء بعض الا تفعلوه تكن فتنه في الارض و فساد كبير.

میرے بھائیو! اور بہنو جب بھی میں قرآن کریم کی یہ آیت پڑھتا یا سنتا ہوں اس کے اعجاز بیانی اور جہان معانی کے سامنے حیران و ششدر ہو جاتا ہوں۔ اس بنا پر بھی کہ الحمد اللہ پورے قرآن پر اور اس کے ایک ایک حرف اور اس کے ایک ایک شوشہ پر میرا ایمان ہے چاہے اس کا تعلق عقائد سے ہو یا احکام سے، پیشن گوئیوں سے ہو یا خبروں اور واقعات سے اور تاریخ کے ایک طالب علم بلکہ ایک محقق کی حیثیت سے بھی۔ خصوصاً چھٹی صدی عیسوی کی تاریخ کے تعلق سے کہ اس مبارک صدی میں رحمت عالم، خاتم الانبیاء محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور سیرت نبوی سے شغف اور خصوصی اشتغال رکھنے اور اس موضوع پر مختلف عالمی زبانی میں لکھی کتابوں پر نظر رکھنے اور اسمیں حسب توفیق و استطاعت حصہ لینے والے کی حیثیت سے بھی جس حیثیت سے بھی اور جس قدر اس میں غور و فکر کرتا ہوں حیرت و استعجاب بڑھتا جاتا ہے،

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی پوری دنیا میں جہالت مضبوطی کے ساتھ اپنے پنجے گاڑھے ہوئے تھی، روم وایران، مشرق ومغرب، شمال وجنوب، یورپ وایشیا، چین وافریقہ غرض دنیا کے تمام علاقے متمدن اور غیر متمدن سب کے سب اس کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ دشت وجبل پر اس کی حکمرانی تھی، جاہلیت ایسا بت تھا جس کی سبھی پرستش کررہے تھے، جس کے سامنے سبھی کی جبین نیاز جھک رہی تھی۔

اس وقت کی متمدن، مہذب اور ترقی یافتہ دنیا دو حصوں میں منقسم تھی، ایک تھا مشرقی اور دوسرا مغربی شمالی، یہ دونوں حصے دو جاہلی شہنشاہیت کے ماتحت اور زیر اثر تھے، میں بہت سوچ سمجھ کر بت پرست شہنشاہیت کے بجائے جاہلی شہنشاہیت کی تعبیر استعمال کررہا ہوں۔ متمدن دنیا کا بڑا حصہ یعنی مغربی شمالی حصہ روم امپائر (جو کہ ایک مسیحی شہنشاہیت تھی) کے زیر اثر تھا۔ جبکہ مشرقی حصہ مجوسی، ساسانی اور ایرانی شہنشاہیت کے ماتحت تھا۔ اور دنیا کے تمام باقی حصے اور علاقے کھلی ننگی اور عریاں بت پرستی میں زندگی گزار رہے تھے۔ اس میں ہمارا ملک ہندوستان بھی شامل ہے جو اپنی تمام ذہانتوں، عمیق فلسفوں قدیم تہذیبوں اور تاریخ کے بعض ادوار میں فکری اسکولوں کا گہوارہ ہونے کے باوجود وثنیت اور بت پرستی میں گلے گلے ڈوبا ہوا تھا۔ دہلی یونیورسٹی کے ایک وسیع النظر اور قدیم ہندوستان کی تاریخ پر سند سمجھے جانے والے مورخ کا کہنا ہے کہ ہندوستان پوجے جانے والے دیوی دیوتاؤں کی تعداد بعض اوقات 3 کروڑ تک پہنچ گئی ہے۔

اس صورتحال کو بدلنے اور انسانوں کو اپنے سے کم تر، جامد اور بے جان چیزوں کی غلامی سے نجات دلانے میں بدھ مذہب بھی ناکام رہا، کم وبیش یہی حال ایران کی مجوسی حکومت کا تھا۔ یہی حال فارس کا تھا، اور یہی حال دنیا کے تمام ملکوں، تمام سلطنتوں اور قوموں کا تھا۔ سب کے سب اوہام وخرافات کے اسیر وگرفتار اور لاکھوں کروڑوں خداؤں کے بندے اور پرستار تھے، اور یہی لوگ پوری دنیا پر چھائے ہوئے تھے ان لوگوں کی صحیح تعداد بتانا تو مشکل ہے مگر میرے علم میں کسی بھی مورخ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت یا اس سے پہلے کی آبادی کی تعداد نہیں بتائی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہی لوگ حکومتوں کے بھی مالک تھے، اور جنگی ساز وسامان کے بھی، یہی لوگ علمی لائبریریوں کے بھی مالک تھے۔

اور اقدار و روایات کے بھی، ان لوگوں نے اپنے تمام اسباب و وسائل کے ساتھ ایک محاذ بنا رکھا تھا اور وہ تھا بت پرستی کا محاذ، بت پرستی کی ترغیب کا محاذ، ظلم و استبداد اور جبر کا محاذ، اور ظالم و جابر اور مطلق العنان حکمرانوں کی سامنے جھکنے کا محاذ، چھوت چھات کا محاذ اور وطن پرستی کا محاذ۔

اور اس کے بالمقابل مٹھی بھر لوگ، اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ایک طرف پوری متمدن دنیا تمام وسائل و ذرائع ابلاغ پر قابض دنیا، اس وقت کے تمام علوم و فنون کی ماہر دنیا، تمام انسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے والی دنیا تھی۔ اور دوسری طرف صحیح معنوں میں مٹھی بھر لوگ تھے صحیح بخاری میں آیا ہے تین مرتبہ مسلم شمار (مردم شماری نہیں) کروائے جانے کا ذکر ملتا ہے آخری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی سے غزوۂ احد یا غزوہ خندق کے موقع پر مسلم شماری ہوئی اس وقت مسلمانوں کی کل تعداد جو سامنے آئی وہ پندرہ سو کی ہے ''الا تفعلوه تكن فتنه فی الارض فساد کبیر'' میں انہیں مسلمانوں سے کہا جارہا ہے۔ کہ اگر تم نے کفر و شرک اور عالمگیر بت پرستی اور عالمی جاہلیت کے محاذ کے مقابلہ میں محاذ نہیں بنایا، کوئی چھاؤنی قائم نہیں کی، توحید خالص، دین حق، احترام انسانیت، انسانی اخوت و ہمدردی اور سماجی عدل و انصاف کا کوئی محاذ نہیں بنایا تو پوری دنیا میں بڑا فتنہ و فساد برپا ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی کتاب الٰہی اور منزل من اللہ ہونے پر کسی شخص کا ایمان نہ ہو اور تاریخ پر نظر ہو، دنیا کی صورتحال سے واقف ہو، بت پرست محاذ کی طاقت و قوت کا اندازہ ہو وہ اس بات کو آسانی سے کبھی نہیں سمجھ سکتا۔

ایک جانب کروڑ ہا کروڑ انسان جن میں دانشوروں کا طبقہ بھی ہے اور جاہلوں کا بھی ہر قسم کے ہتھیار سے لیس اور تمام وسائل و ذرائع سے مالا مال ہیں دوسری جانب مٹھی بھر کمزور لوگوں سے جن کی تعداد پندرہ سو سے آگے نہیں بڑھتی، فقر و فاقہ اور غربت کی وجہ سے ان کی بڑی تعداد اپنے تن چھپانے اور پیٹ بھرنے کی بھی استطاعت نہیں رکھتی، ان سے کہا جارہا ہے کہ تم جہالت اور ظلم و استبداد کے سیلاب بلاخیز کو روکنے کیلئے اٹھ کھڑے نہیں ہوئے تو دنیا میں فساد برپا ہو جائے گا اگر تم نے بند نہیں باندھا تو یہ سیلاب ہر چیز کو بہا لے جائے گا۔

اس طرح اس وقت پوری دنیا دو کیمپوں میں بٹی ہوئی تھی، ایک کیمپ بت پرستوں کا اور جاہلیت کے علمبرداروں اور پرستاروں کا تھا اور دوسرا مٹھی بھر مسلمانوں کا، دونوں کی عددی و

نفری طاقت وقوت مادی اسباب وسائل میں وہی تناسب تھا، جو تناسب سمندر اور قطرہ میں ہوتا ہے جو تناسب آفتاب اور ذرہ میں ہوتا ہے، خدائے وحدہ لاشریک کے سوا کوئی اور یہ کہہ سکتا ہے کہ اے مٹھی بھر مسلمانو! اگر تم نے دنیا کے اس شرک و بت پرستی اور اوہام وخرافات کے محاذ کے خلاف توحید خالص اور دین حق کا محاذ نہیں کھولا تو دنیا میں زبردست تباہی مچ جائے گی۔ فتنہ برپا ہوجائے گا۔ کیا ظاہری اسباب وسائل کو دیکھتے ہوئے اور مادی پیمانوں کے لحاظ سے یہ ایک قابل فہم اور بعید از مکان بات نہیں ہے۔ چند ذرات یا ریت کے ایک معمولی تودہ سے کہا جارہا ہے کہ بھیانک، غضبناک اور سرکش بحر مواج کے سامنے پشتہ بن کر کھڑے ہوجاؤ، اس طوفان بدتمیزی کو روکو ورنہ دنیا تباہ ہوجائے گی یہ بات خدائے وحدہ لاشریک اور عالم الغیب والشہادۃ کے سوا کوئی دوسرا نہیں کہہ سکتا تھا۔ خدا قیمت کو دیکھتا ہے قامت کو نہیں، اس کے یہاں اعتبار اوصاف کا ہوتا ہے ذات کا نہیں، وہ کوالٹی (معیار) کو دیکھتا ہے، کوانٹیٹی (تعداد) کو نہیں، اگر چہ مسلمان قدو قامت میں چھوٹے تھے، لیکن قیمت میں بڑھے ہوئے تھے، اور میزان الٰہی میں اعتبار قیمت کا ہوتا ہے، قامت کا نہیں، تاریخ اس پر گواہ ہے، ہر دور میں قیمت قامت پر غالب آئی ہے اور شکست دیتی رہی ہے، اگر قیمت کا اعتبار ختم ہوجائے، اگر یہ جوہر کم عیار ہو جائے تو دنیا باقی نہ رہے، کائنات کا وجود مٹ جائے، اگر قیمت کی قیمت باقی نہ رہے، اگر قیمت بے قیمت ہوجائے تو نہ عقیدہ صحیحہ کا تحفظ ممکن ہوگا اور نہ دین صحیح باقی رہے گا، نہ دعوت صحیحہ کو کامیابی مل سکتی ہے۔

میرے بھائیو: ہم لوگوں کو چاہئے کہ اس آیت کو اپنے فکر وتدبر کا محور بنائیں اس پر غور کریں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ پوری انسانیت کو انسانوں کی غلامی اور دنیا کی تنگی سے نکالنے کی ذمہ داری مٹھی بھر والوں پر ڈال رہا ہے۔

اور چشم فلک نے دیکھا کہ اس مٹھی بھر بے سروساماں جماعت نے اس ذمہ داری کو جب قبول کرلیا، اور اسے لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تو اسباب وسائل سے بھرپور زبردست اکثریت پر غالب آگئی، یہ تودۂ خاک نہ صرف یہ کہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے لئے پشتہ اور بند ثابت ہوا بلکہ اس نے اس کا دھارا موڑ دیا، اسے پیچھے ڈھکیل دیا، اس مٹھی بھر جماعت نے اپنے اوصاف وخصوصیات سے اپنی بے سروسامانی کے باوجود بڑی بڑی سلطنتوں کو ان کے تمام سازو

سامان اور کروفر اور جاہ وجلال کے ساتھ شکست دیدی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کریمہ پر غور کرنے سے دل و دماغ میں بجلیاں کوندنے لگتی ہیں، احساسات وجذبات میں تموج پیدا ہو جاتا ہے، ایمان وعقیدہ میں صلابت، عزائم میں بلندی اور ارادوں میں قوت واستحکام پیدا ہوتا ہے، یہ آیت ہمیں آواز دے رہی ہے، کہ جاہلیت کے مقابلہ کے لئے ہم اپنے ایمان وعقیدہ کے سہارے اٹھ کھڑے ہوں، صدق واخلاص کے ہتھیار سے مسلح ہو کر اسباب ووسائل کا مقابلہ کریں، ہمیں ہرگز اپنے ذرائع و وسائل اور عددی طاقت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے، یہ آیت ہمیں پیغام دیتی ہے کہ کبھی ہمارا سر باطل اور طاغوتی طاقتوں کے سامنے نہ جھکے ہم ساز وسامان اور آلات حرب وضرب سے کبھی مرغوب ومتاثر نہ ہوں، اللہ کی تائید ومدد قیمت والوں کے ساتھ ہوتی ہے، اس نے مسلمانوں اور حق کے علمبرداروں سے فتح ونصرت کا وعدہ فرمایا ہے، ہر زمانہ میں اس نے اہل حق کی مدد کی ہے، آج بھی اس کی مدد ہو سکتی ہے، شرط یہ ہے کہ ہم ایمان ویقین، انسانی ہمدردی اور ایثار وقربانی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں، ہم اپنے ان اسلحوں سے پوری دنیا کو فتح کر سکتے ہیں، سیاسی مصلحتوں او رپوری دنیا کو فتح کر سکتے ہیں، سیاسی مصلحتوں اور مال ودولت کے پجاریوں کو زیر کر سکتے ہیں، انسانی تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے، اسلامی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے، کہ تھوڑی فوج نے تھوڑے سے ہتھیار اور معمولی ساز وسامان سے بڑی بڑی فوجوں کو شکست دی ہے، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اس وقت دنیا کو ایک ایسے خلا کا سامنا ہے، جس سے بڑا کوئی خلاء نہیں، یہ خلاء انسانیت کے خلاف ہے، یہ خلاء اللہ کی رحمت کے خلاف ہے، یہ خلاء مشیت الٰہی کے خلاف ہے، یہ خلاء انبیاء کرام کی تعلیمات کے خلاف ہے، یہ خلاء عالمی دعوت کا خلاء ہے، یہ اللہ پر اعتماد وتوکل کا خلاء ہے، ایمانی قوت وطاقت پر بھروسہ کا خلا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت وتائید پر اعتماد کا خلاء ہے، تاریخ انسانی اور تاریخ اسلامی بھی بارہا اس کا تجربہ کر چکی ہے، کہ مادی ساز وسامان اور تعداد کے لحاظ سے معمولی جماعت بڑی بڑی فوجوں پر غالب آئی ہے،

''کم من فئۃٍ قلیلۃ غلبت فِئۃً کثیرۃً باذن اللہ۔

میرے بھائیو: آج اس موقع کو میں غنیمت جانتا ہوں، گوناگوں مصروفیات، متنوع ذمہ داریوں کی وجہ سے ایسے مواقع اب کم ملتے ہیں، میرے بھائیو، میرے ، نی اور ا سلامی

بھائیو: میرے عرب بھائیو! ''الاتفعلوه تکن فتنة فی الارض وفساد کبیر'' کو لوحِ دل پر لکھ لیجئے، اسے اپنے ذہن و دماغ میں بسا لیجئے کہ اگر آپ جاہلیت کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے نہیں ہوئے، اگر آپ نے دعوت کا جھنڈا بلند نہیں کیا، تو دنیا میں فتنہ برپا ہو جائے گا، فساد پھیل جائے گا، اگر آپ نے حق کی دعوت کو عام نہیں کیا، اگر آپ نے انسانیت پر ترس نہیں کھایا، تو دنیا اپنی تمام مادی ترقیوں، عیش و آرام کے تمام اسباب اور سائنس کی تمام ایجادات کے باوجود خطرہ میں ہے، ضرورت ہے کہ حق کا غلغلہ اس طرح بلند ہو کہ ہر کان سن لے، اس قوت سے اسے پھیلایا جائے کہ ہر فرد تک وہ پہونچ جائے، اس انداز سے اسے پیش کیا جائے کہ ہر دل کو چوٹ لگے، ہر آنکھ بھر آئے، اگر ایسا نہیں ہوتا ہے اور اس خلاء کو پر نہیں کیا جاتا ہے، تو دنیا خطرے میں ہے، اس کی ذمہ داری اللہ نے آپ پر ڈالی ہے، پوری امت مسلمہ پر ڈالی ہے، لیکن میرے عرب بھائیو، آپ پر اس کی زیادہ ذمہ داری ہے، آخر یہ، دین اسلام دنیا کو آپ کے ذریعہ ملا، وہ آپ ہی کے اسلاف تھے جنھوں نے اس نعمت خداوندی اور عطیہ ربانی کو پوری دنیا کے لئے وقف عام کیا، وہ آپ ہی کے آباؤ اجداد تھے، جنھوں نے دنیا کو خودکشی سے بچایا تھا، انسانیت کی بھنور میں گھری کشتی کو ساحل تک پہونچایا تھا، آپ کو ان کا صحیح وارث اور جانشین ہونا چاہئے اور اس کی دعوت دین کی امانت کا امین ہونا چاہئے، آپ اس دعوت کو لے کر مشرق و مغرب میں پھیل جایئے، جاپان اور چین جایئے، روس اور امریکا جایئے، دنیا کے گوشہ گوشہ میں جایئے اور سسکتی، ہوئی دنیا کو اسلام کا مرہم پیش کیجئے، انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکالئے، اس مقصد کے لئے وہ تمام وسائل اختیار کیجئے، جن کا زمانہ تقاضا کر رہا ہے، وہ اسلوب اپنائے، جس اسلوب کو زمانہ سمجھتا ہے، وہ زبان بولئے جس زبان کو آج دنیا سمجھتی ہے، یہ تمام مسلمانوں پر فرض ہے، لیکن میرے عرب بھائیو، آپ پر دوسری ذمہ داری ہے کیونکہ جن کے ہاتھوں یہ دین پھیلا، جن کی کوششوں اور قربانیوں نے انسانیت کو ہلاکت سے بچایا، وہ عرب تھے، صحابہ کرام تھے، انصار و مہاجرین تھے یا ان کے شاگرد اور پروردہ تھے، وہ لوگ تھے جنھوں نے عربوں ہی سے کسب فیض کیا تھا، صحابہ کرامؓ ہی سے علم صحیح، انسانیت کے لئے ہمدردی کا جذبہ اور اس کے دکھ درد میں سلگنا اور کڑھنا سیکھا تھا، ہم پر واجب ہے کہ ہم دین کی دعوت کی ذمہ داری ادا کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں، اس مقصد کی تکمیل کے لئے کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کریں،

یہ ایک خلاء ہے، جس کا جلد از جلد پر ہونا ضروری ہے، کیونکہ کوئی خلاء انانیت کے لئے اس سے زیادہ خطرناک اور تشویشناک نہیں، اس کا پر ہونا صرف مسلمانوں ہی کے مفاد میں نہیں ہے، مثلاً اس کام کو اس لئے کیا جائے تا کہ مسلمانوں کے اثر ورسوخ کا دائرہ وسیع ہو، انھیں اقتصادی اور سیاسی فائدہ پہونچے نہیں، ہرگز نہیں، اس کا پر ہونا پوری انسانیت کے مفاد میں ہے، اگر یہ خلاء پر نہیں ہوتا ہے تو پوری انسانیت خطرہ میں ہے پوری دنیا خطرہ میں ہے، چاہے وہ تمدن، ترقی یافتہ اور دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی کوشش کرنے والے ممالک ہی کیوں نہ ہوں، اگر یہ خلاء، پر نہیں ہوتا ہے، تو زیادہ دنوں تک انسانیت کی بقاء، وتحفظ کی ضمانت نہیں دی جاسکتی، اس خلاء کا پر ہونا انسانیت کے مفاد میں بھی ہے اور مسلمانوں کے بھی، ہماری ذمہ داری ہے کہ دنیا کو ہم یہ بات سمجھائیں اور دنیا کو چاہئے کہ وہ یہ بات سمجھے، اس میں اس کی بھلائی ہے، عالمی طاقتوں کو چاہئے کہ وہ یہ بات سمجھیں، جس دن وہ اس کو سمجھ لیں گے اور دین اسلام کا کھلے ذہن ودماغ سے مطالعہ شروع کردیں، وہ دن بڑا مبارک ہوگا، تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوگا اور اللہ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں۔

آخر میں آیت کریمہ کہ آپ کے سامنے ایک بار پھر میں تلاوت کرتا ہوں، تا کہ آپ غور کریں، اس کے پیغام کو سمجھیں اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں اور اس کی ادائیگی کا عزم کریں،

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، والذین کفرو بعضھم ائولیاء بعض الاتفعلوہ تکن فتنة فی الارض وفساد کبیر"۔

مسلمانو: اگر تم نے دین حق کی نشر واشاعت اور دعوت وتبلیغ کا کام نہیں کیا تو زمین پر فساد برپا ہوجائے گا، فتنہ پھیل جائے گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

امت مسلمہ کا وجود غزوۂ بدر کا صدقہ ہے

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو میں تبلیغی اجتماع کے موقع پر ۱۴؍ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو بعد نماز مغرب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوئی نے ایک پر اثر دینی، دعوتی، علمی، فکری، اور اصلاحی تقریر فرمائی

الحمد لله و كفى و سلام على عباده الذين اصطفى اما بعد! فاعوذ بالله الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم ولقد نصر كم الله ببدرٍ روانتم اذلة ، فاتقو الله لعلكم تشكرون.

غزوہ بدر بقائے دین کا ضامن ہے

ترجمہ: اور یہ بات محقق ہے کہ حق اللہ تعالیٰ نے تم کو بدر میں منصور فرمایا حالانکہ تم بے سرو سامان تھے، سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو، تا کہ تم شکر گذار ہو۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اے مسلمانو: اللہ تعالیٰ نے تم کو بدر میں فتح عطا فرمائی اس حالت میں کہ تم بہت بے یارو مددگار تھے اور بہت خطرے میں تھے تو اللہ سے ڈرو تا کہ تم شکر گذار بندے بنو، ہمارے بہت سے ذی علم حضرات کو اور اس مسند نشینوں کو بھی، اہل علم کو بھی اور جو قرآن مجید کی آیات کا ترجمہ سمجھتے ہیں ان کو تعجب ہوگا کہ اس عظیم الشان تبلیغی اجتماع میں جس کا موضوع تبلیغ ودعوت ہے، یہ آیت کس مناسبت سے پڑھی گئی؟ کیا کچھ غزوات کا تذکرہ ہونا والا ہے، کچھ غزوۂ بدر پر روشنی ڈالی جانے والی ہے کیا، تاریخ کا کوئی ورق کھولا جانے والا ہے، کوئی باب کھولا جانے والا ہے، لیکن اس آیت کی تبلیغ ودعوت سے بھی اور ہم مسلمانوں کی زندگی سے بھی اور ہم مسلمانوں کی کامیابیوں سے اور اسلام کے آج دنیا میں موجود رہنے سے بھی بڑا گہرا تعلق ہے، اگر میں یہ کہوں کہ آپ کے سامنے ایک تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے، ایک نظر رکھنے والے انسان کی حیثیت سے کہ اس وقت دنیا میں جو مشرقی ممالک ہیں ان میں مسلمانوں کی آبادی بھی ہے، مسلمانوں کی سلطنت اور شان وشوکت بھی ہے اور دولت وثروت

بھی یہ اور پھر دعوت وعزیمت کا کام بھی ہے اور مدارس بھی ہیں، کتب خانے بھی ہیں، یہاں تک کہ میں بلا تکلف بغیر کسی تواضع کے کہتا ہوں کہ یہ ندوۃ العلماء ایک عالمی درسگاہ ہے، جس کی شہرت تمام دنیا میں ہے، اس کا وجود اور یہاں کا جو کتب خانہ ہے، جس میں ہزاروں سے متجاوزہ کتابیں ہیں اور مشرق سے لے کر مغرب تک جتنے کتب خانے ہیں اور پوری تاریخ اور انسانی تاریخ میں پوری تاریخ عالم میں مسلمانوں نے جو کچھ کارنامہ انجام دیا ہے اور انھوں نے علم کے دریا بہائے اور انھوں نے کتابوں کے انبار لگائے، تحقیقات کی اور پوری دنیا میں جو خدا کی عبادت ہو رہی ہے اور عقیدۂ توحید موجود ہے اور یہ مساجد جو آپ کو نظر آ رہی ہیں، یہ سب غزوہ بدر کی فتح کا نتیجہ ہیں اور خالص غزوہ بدر کی فتح کا نتیجہ ہے، میں آپ سے اگر یہ کہوں کہ ابھی آپ نے جو مغرب کی نماز پڑھی ہے یہ بھی غزوہ بدر کی برکتوں میں سے ایک برکت ہے اور آپ جو آزادی سے نماز پڑھ لیتے ہیں روزہ رکھتے ہیں، حج کرنے کیلئے بیت اللہ شریف کو بھی جاتے ہیں اور پھر تعلیم کا سلسلہ بھی جاری ہے، اور تبلیغ کا یہ عالمی نظام اور یہ عظیم الشان مظاہرہ اور یہ اس کا منظر جو آپ کے سامنے ہے، یہ سب غزوہ بدر کی فتح کا نتیجہ ہے کیا صورت تھی، کہ کل تین سو تیرہ مسلمان تھے جو مدینہ طیبہ سے نکلے تھے، اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کیلئے اور مدینہ طیبہ کی حفاظت کے لئے اور دین کی حفاظت وبقاء کے لئے اور ادھر ایک ہزار مسلح کفار قریش آئے تھے جو دانت پیس رہے تھے اور وہ اس کے لئے تڑپ رہے تھے، بیقرار تھے کہ اس خطرہ کا سد باب کر دیا جائے اور اسلام کے وجود کو فنا کر دیا جائے اور وہ بہترین طریقے سے مسلح تھے ایک طرف قریش کا جنگجو قبیلہ تھا اور اس کے پاس تمام اسلحہ اور سامان جنگ تھا اور دھر مسلمان جن کے گھروں میں فاقے ہوتے تھے اور ان میں کئی بچے بھی شامل ہو گئے تھے، وہ سب جہاد کے شوق میں تھے تو جہاں تک تعلق ہے اسباب ونتائج کا اور ذرائع کا اور بصیرت کا اور حالات کا جائزہ لینے کا اور عقل سلیم کا اور گذشتہ واقعات سے نتیجہ نکالنے اور ریاضی کا بھی وہ جو سب سے عام فن ہے۔ اور ہر ایک کو ان سے کچھ نہ کچھ دخل ہے کہ وہ ایک ہزار اور تین سو تیرہ کا فرق سمجھتا ہے کہ جاہل سے بھی کہہ دیجئے تو وہ سمجھ جائے گا کہ کہاں ایک ہزار اور کہاں تین سو تیرہ تو اگر یہ جو اللہ تعالیٰ نے اسباب میں خاصیت رکھی ہے اور اسباب کو بھی آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنا عمل کرتے ہیں جب تک خدا کا ارادہ ہوتا ہے، خدا کی مشیت ہوتی ہے تو اگر اسباب پر اسباب و

نتائج پر ہر بات کا انحصار ہوتا تو اس کا فیصلہ ہوتا تو انجام بالکل معلوم ہے کہ وہ ایک ہزار تین سو تیرہ پر غالب آ جاتے اور یہ تین سو تیرہ ختم ہو جاتے اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور اللہ تعالیٰ ان الفاظ کے کہنے پر کوئی مواخذہ نہ فرمائے خدانخواستہ تین سو تیرہ ختم ہو جاتے تو پھر اس کے باقی رہنے بڑھنے اور فتح حاصل کرنے کا کیا ذکر اسلام باقی رہنے کا بھی کوئی سوال نہیں تھا اب جو بات میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ بات صرف اتنی ہی نہیں کہ تین سو تیرہ نے ایک ہزار پر فتح پائی تھی ایک تاریخی واقعہ ہے اور سنایا گیا ہے ایک ایسے مجمع میں کیوں تین سو تیرہ کو خلاف قیاس، خلاف عقل، خلاف تجربہ خلاف اندازہ اور عقل سلیم کے خلاف تین سو تیرہ کو ایک ہزار پر فتح حاصل ہوئی یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اور یہ ایک سبق ہے یہاں سے اپنے ساتھ لے جانے کا کہ کیسے تین سو تیرہ کو ایک ہزار پر فتح ہوئی کیا تین سو تیرہ کو اس لئے فتح ہوئی کہ وہ زیادہ مضبوط تھے زیادہ مسلح تھے یا زیادہ ان کے اندر جوش تھا اگر یہ بات ہوتی تو اس کا سب سے زیادہ اندازہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تھا پھر آپ پر اضطراری کیفیت طاری ہوئی ایک الحاح کی، تضرع کی اور دعا و انابت کہ ابوبکر صدیق ؓ سے بھی نہ دیکھا جا سکے آپ نے نماز پڑھنی شروع کی اور اس طرح گریہ وزاری کے ساتھ دعا کرنی شروع کی اور آپ پر اتنی الحاح کی کیفیت طاری ہوئی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ علیہ سمجھ رہے تھے کہ میں کس سے بات کر رہا ہوں نبی المرسل سے اللہ تعالیٰ تبارک وتعالیٰ سے براہ راست اس کے پیغام آتے ہیں جن کو سب سے زیادہ اللہ تعبارک وتعالیٰ کی نصرت پر یقین ہے۔ اور جو اللہ تبارک وتعالیٰ کو ہر چیز پر قادر مانتا ہے وہ تابع نہیں ہے اسباب ونتائج کا قلت وکثرت کا، تعداد کا اسلحہ کی کمی وزیادتی کا، بالکل پابند نہیں ہے لیکن ان سے دیکھا نہیں گیا، اضطراری کیفیت ان پر بھی طاری ہوئی انہوں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ فضل فرمائے گا۔ اس پر آپ پریشان نہ ہوں اور تسلی کے الفاظ فرمائے اس کے بعد اب جو بات آپ کو سنانا ہے وہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنے ساتھ لے کر جائیں وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اس وقت ایک جملہ نکلا، سیرت کو پڑھنے والا، کتابوں کے دیکھنے والے اکثر گزر جاتے ہیں ان چیزوں سے اور وہاں غور نہیں کرتے، ایسا نہیں کہ چونک کر کھڑے ہوئے او رہم پر ایک استغراقی کیفیت طاری ہو جائے اور ہم ڈوب جائیں غور وفکر میں ابھی آپ سے پوچھا جائے جو لوگ راستوں سے گزرتے ہیں بھائی آپ

جب وہاں سے آتے ہیں تو دائیں طرف ایک سائن بورڈ پڑتا ہے کیا لکھا ہے تو آپ کہیے گا کہ بھئی ہم تو نے خیال ہی نہیں کیا کیونکہ روز گزرنا ہوتا ہے، دن میں کئی کئی بار ہم غور سے دیکھتے بھی نہیں، اور کام بھی نہیں اس لئے بہت سے لوگ جو سیرت کی کتابیں پڑھتے ہیں اس سے گزر جاتے ہیں بہت کم لوگوں نے اس پر غور کیا ہوگا کہ یہ کسی ایک چونکا دینے والی اور بیدار کر دینے والی اور عبرت لینے والی اور عبر حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی چیزیں ہیں، وہ ایسی چیز ہے کہ آدمی سب بھول جائے اور اس پر ہر ایک بالکل ششدر اور حیران رہ کر کھڑا ہو جائے کہ کیا کہا جا رہا ہے، کیا فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا جائزہ لیا، کیا تناسب ہے، طاقت میں، کیا تناسب ہے اسلحہ میں، کیا تناسب تعداد میں اور قریش کی حالت غضبنا کی کی اور ایک جذبہ انتقام کی اور مسلمانوں کی، جو اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں جو اللہ ہی کی مدد کو سمجھتے ہیں کہ اس کی مدد کام آنے والی ہے دونوں میں کیا فرق ہے مادی طور پر اور میدان جنگ میں جو چیزیں اہمیت رکھتی ہیں ان کے لحاظ سے آپ کی زبان سے یہ جملہ نکلا جو قیامت تک غور کرنے کے قابل اور غور کرنے کا مستحق ہے اور عبرت لینے کا مستحق اور اصول عمل بنا لینے کا مستحق ہے، **اللھم ان تھلک ھذہ العصابتہ لا تعبد**، آپ فرماتے ہیں کہ اے اللہ اگر تو نے اس مٹھی بھر جماعت کو ہلاک کر دیا ان ایک ہزار کے مقابلے میں کہ وہ ایک ہزار ہیں اور زیادہ مسلح ہیں اور یہ مٹھی بھر جماعت جو پوری طرح مسلح بھی نہیں ہیں تو اور کچھ ہو نہ ہو آپ کی عبادت اس دنیا میں نہیں ہوگی۔ تو ایہ ایک نبی ہی کہہ سکتا ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کا محبوب بھی ہے اور مقرب ترین انسان بھی اور ملھم من اللہ ہے بڑی بات یہ ہے کہ "**ومابنطق عن الھویٰ ان ھو الا وحیی یوحیٰ**" اور نہیں بولتے اپنے نفس کی خواہش سے یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا، **ملھم من اللہ** ہے اور دنیا میں کوئی آدمی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اولیاء اللہ میں سے نہ قائدین جنگ میں سے اور نہ بڑے بڑے مفسروں اور فراست رکھنے والوں میں سے کوئی یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا اور پھر کس سے یہ بات کہی جا رہی ہے **خدائے غنی خدائے لم یزل و لا یزال** سے جو کسی چیز کا محتاج نہیں ہے اس کو کسی چیز سے ڈرایا نہیں جا سکتا لیکن یہ آپ کی ہی شان تھی کہ آپ نے یہ فرمایا، اور آپ نے فرمایا کیا بلکہ اللہ نے کہلوایا سچ بات یہ ہے کہ **وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحیی یوحیٰ**، اور اس لئے آپ کی زبان سے کہلوایا تا کہ قیامت تک مسلمانوں کو یاد رہے کہ کیا بات

کہی گئی تھی اور کس بناء پر یہ بالکل خاق العادت طریقہ پر، معجزانہ طریقہ پر، محیر العقول طریقہ پر، ششدر و حیران بنا دینے والے طریقہ پر آدمی دانتوں میں انگلی رکھ کر سوچتا ہی رہے اور سر جھکا کر کے اور سسکیاں لے کر کے اس پر ایک استغراق کی کیفیت طاری ہو جائے بلکہ بعض لوگ اگر اس میں بے ہوش ہو جائیں سوچنے میں تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن ہم لوگ غور کرنے کے عادی نہیں گزر جاتے ہیں ان چیزوں سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اللہ اگر تو نے اس مٹھی بھر جماعت کو ہلاک کر دیا تو پھر سب کچھ ہوگا، دنیا کا کارخانہ ویسا ہی رہے گا وہی دنیا میں رونق ہوگی، فتوحات ہوں گی، سلطنتیں ہوں گی، دولت کے دریا بہیں گے اور علم کے بھی دریا بہیں گے، لیکن ایک کام نہیں ہوگا وہ یہ کہ تیری یعنی ایک خدائے واحد کی عبادت نہ ہوگی اب اس کے بعد کیا ہو، سوچنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بالکل خارق العادت طریقہ پر میر العقول اور بالکل معجزانہ طریقہ پر یعنی صرف اس میں خدا کی طاقت ہی نظر آتی ہے، ارادۂ الٰہی معلوم ہوتا ہے اور کچھ نہیں اور قدرت الٰہی کا ایک جلوہ ہے اور قدرت الٰہی کی ایک شان ہے اور کچھ بھی نہیں اللہ تعالیٰ نے اس فقرہ کے بعد ان تین سو تیرہ کو ان ایک ہزار پر فتح مبین عطا فرمائی ''**ولقد نصر کم اللہ ببدر و انتم اذلہ فاتقو اللہ لعلکم تشکرون**'' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور اللہ نے تم کو فتح دی بدر کے میدان میں اس حالت میں کہ تم بے بس تھے اور بالکل اس وقت مغلوب تھے تو اللہ سے ڈرو تا کہ شکر گزار بندے بنو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس امت کے اسباب کے خلاف، نتائج کے خلاف تجربوں کے خلاف اور حقائق کے خلاف اور ہر طرح کی پیشنگوئیوں اور اندازوں کے خلاف جو فتح دی ہے ان تین سو تیرہ کو ایک ہزار پر، وہ اس بنا پر کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ بات قبول کر لی اور اس کی تصدیق فرمائی کہ یہ تین سو تیرہ کی جو تعداد ہے ان کی وجہ سے دنیا میں عبادت کا سلسلہ چلے گا اور ان تین سو تیرہ کی فتح سے امت کو جو امن وامان حاصل ہوگا اطمینان حاصل ہوگا، اور ان جانشینوں کے ذریعہ یہ سلسلہ قیامت تک چلے گا اس کی وجہ سے عبادت الٰہی دنیا میں قائم رہے گی تو آپ جانتے ہیں کہ جب کسی چیز پر، کسی شرط پر، کسی صفت پر، کسی امتیاز کے بیان کرنے پر بڑا نتیجہ نکلے اور اس پر بالکل خارق العادات طریقہ پر کوئی اس کا انجام ہو اور اس میں اللہ تعالیٰ فتح دے خلاف قیاس پھر تو اس شرط کو قائم رکھنا ضروری ہو جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس امت کے دنیا میں باقی رہنے کا،

عبادت کی دعوت دینے کا اور دنیا میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا قانون پھیلانے اور اس کو غالب کرنے کا اور پھر اس دنیا میں اس کو فتوحات حاصل کرنے کا اور سلطنتیں قائم کرنے اور اس دنیا میں اس کو علم کے دریا بہادینے کا اور معرفت الٰہی کے دروازے کھول دینے کا اور اس دنیا میں اس امت کو بہت طویل عرصہ تک اور کثیر حصہ میں دنیا کے اس امت کو آزادی کے ساتھ عزت کے ساتھ اور وقار کے ساتھ عظمت کے ساتھ رہنے کا موقع ملے گا ان سب کی شرط یہ ہے کہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی خود عبادت کریں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام پر عمل کریں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے قانون پر، اللہ تبارک وتعالیٰ کی شریعت پر اور دوسروں کو بھی حکم دیں، اور یہ آپ سمجھ لیں کہ عبادت کے معنی صرف نماز روزہ کے نہیں، عبادت میں عقائد بھی داخل ہیں معاملات بھی داخل ہیں اخلاق بھی داخل ہیں، آئین وقانون بھی داخل ہیں ازدواجی زندگی کے جو طریقے خدا نے بتائے ہیں اور اس کے رسول نے بتائے ہیں اوقرآن حدیث میں وہ بھی داخل ہے او رلوگوں کے ساتھ معاملہ کرنا بھی داخل ہے اور اس میں تجارت بھی داخل ہے اس میں جتنے معیشت کے اسباب ہیں سب معاش کے جتنے اسباب ہیں سب داخل ہیں ان سب پر یہ امت عمل کرے گی، اللہ تعالیٰ کی شریعت پر، پوری نازل کی ہوئی شریعت پر، اور اللہ کے رسول کی عطا کی ہوئی سکھائی ہوئی شریعت پر یہ امت عمل کرے گی اس میں اس بات کو قبول کرنے پر اس کی تصدیق کرنے پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان تین سو تیرہ کو ایک ہزار پر فتح دی تو اب اگر یہ سب کچھ کرنے لگے میں اب صاف کہتا ہوں کہ مسلمان اگر تارے توڑے آسمان کے اور فضاؤں پرا کا قبضہ ہو جائے جیسے یورپ کا قبضہ ہے اور آپ مشرق سے مغرب تک جائیں اور منٹوں او رسیکنڈوں میں بھی پہنچ جائیں اور آپ سائنسی تحقیقات میں ایک ریکارڈ قائم کردیں اور آپ علم کے دریا بہائیں اور کتب خانوں سے شہر کے شہر بھردیں، اور آپ کے اندر اعلیٰ درجہ کی ذہانت اور اعلیٰ درجہ کی نکتہ آفرینی ہو اعلیٰ درجہ کی ادبی صلاحیت ہو، جسمانی حسن وجمال اور قوت کمال ہر چیز میں آپ فائق ہوں ان میں سے کوئی چیز امت کی بقاء کی ضمانت نہیں اس امت کے بقاء کی ضمانت صرف یہ ہے کہ امت وہ ہے جس کی وجہ سے عبادت کا رواج ہے یہ امت خود تیری عبادت کرے گی اور تیرے احکام پر چلے گی اور دنیا کو ان احکام کی طرف بلائے گی دعوت دے گی تو آپ سمجھ لیجئے جب کسی شرط پر کسی بات پر کسی پیشن گوئی پر کوئی نتیجہ ظاہر ہوتا ہے پھر کیسا

نتیجہ اور اس نتیجہ کا ذریعہ کون ہے اللہ تبارک وتعالیٰ فتح دینے والے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی فتح چاہنے والے، نصرت چاہنے والے اور اس کے درمیان ایک شرط، ایک صفت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کی جس سے بڑھ کر خدا کے جلال اور کمال سے کوئی خائف نہیں اور کوئی اس پر ایمان رکھنے والا نہیں ہوسکتا، آپ سے بڑھ کر ادب شناس نہیں ہوسکتا آپ سے بڑھ کر کوئی اللہ کے جلال سے اور اللہ کے شان استغناء سے کوئی واقف نہیں ہوسکتا لیکن ان سب کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ یہ کلمہ آپ کی زبان سے نہیں نکلا بلکہ یہ کلمہ بھی الہامی تھا، اللہ نے آپ کی زبان سے کہلوایا اور اس پر فتح دی تا کہ قیامت تک کے لئے یہ باب بالکل طے شدہ اصول بن جائے کہ مسلمانوں کی بقاء مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں کی عزت، مسلمانوں کا آزادی کے ساتھ اپنے اصول پر عمل کرسکنا اور عمل کو دعوت دینا اور دعوت وتبلیغ کا سلسلہ یہاں تک کہ میں صاف کہتا ہوں کہ خلافت راشدہ سے لے کر خلاف نبی امیہ تک خلاف نبی امیہ سے لے کر خلافت عباس تک اور اس کے بعد کی سلطنتوں تک اور اس کے بعد پھر یہ پوری ساسانی سلطنت ایران، اس کا فتح ہونا اور ادھر رومی سلطنت بازنطینی سلطنت کا فتح ہونا یہ بالکل ناقابل قیاس بات تھی، کہ کوئی اتنی بڑی رومی سلطنت کو شکست دے سکتا ہے، ادھر ایران کی سلطنت کا یہ حال تھا کہ ہندوستان کی سرحدوں تک پہنچی ہوئی تھی سارا ایران، سارا عراق اس کے ماتحت تھا یہ ساری ناقابل قیاس باتیں اور ناممکن عمل باتیں اور ناقابل تصدیق باتیں صرف اس وجہ سے ظہور میں آئیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ تسلیم کرلیا اور اس بات کی تصدیق فرمائی اور قبول فرمالیا کہ اس امت کے ذریعہ دنیا میں عبادت کا سلسلہ جاری رہے گا اور امت خود عبادت کرے گی اور دوسروں کو عبادت کی دعوت دے گی تو جو کچھ مسلمانوں کو ملا آج صاف میں کہتا ہوں کہ ابھی آپ نے جو مغرب کی نماز پڑھی یہ فتح بدر کا نتیجہ اور برکت ہے یہ ابھی اتنے مسلمان جمع ہوگئے ایک دعوت پر اور ایک تبلیغ کے اجلاس پر، تبلیغی دعوت پر، یہ سب اس سے بڑھ کر کیا، یہاں سے لے کر ہر سال جو حج ہوتا ہے لاکھوں مسلمان جمع ہوتے ہیں منیٰ وعرفات میں اور یہ طواف اور پھر صفا ومروہ کی سعی یہ ساری کی ساری چیزیں، جو کچھ ہے، جو مسلمان جہاں بھی ہے بلکہ جو مسلمان اطمینان سے کھانا کھالیتا ہے، آج آپ سے میں صفائی سے کہتا ہوں کہ میں نے اور آپ نے جو آج کھانا کھایا ہے دوپہر کا اور انشاء اللہ جو آج کھائیں گے اور جو اس وقت چاروں

وقت کی نماز پڑھی ہے اور انشاء اللہ پانچویں نماز پڑھیں گے، سب فتح بدر کا نتیجہ ہے اور سب فتح بدر کی برکت سے آپ کو ملا ہے، ورنہ کوئی صورت نہیں تھی اور کتنے ادیان ہیں جن کو آپ دیکھئے اگر آپ تاریخ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کوئی مذہب سو برس رہا، کوئی پچاس برس رہا اور کوئی اس سے بھی کم رہا یا محرف ہوگیا۔ دین جو آج تک باقی ہے صرف یہ نہیں کہ باقی ہے۔ اور کوئی ردو بدل نہیں ہوا اور اپنی اصل شکل میں باقی ہے، اپنی خصوصیات کے ساتھ باقی ہے اپنے عقائد کے ساتھ باقی ہے اپنے فرائض وعبادات کے ساتھ باقی ہے ذکر اللہ کے ساتھ باقی ہے او رصلوٰۃ النبی کے ساتھ باقی ہے اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری اور اس کے ساتھ محبت اور رشتہ رسولؐ کے ساتھ باقی ہے اور یہ حق کی حمایت کے جذبہ کے ساتھ باقی ہے اور باطل کا مقابلہ کرنے کے جوش کے ساتھ باقی ہے اور یہ امت معروف کو معروف سمجھتی ہے منکر کو منکر سمجھتی ہے اور نفس وشیطان اور الٰہی فرمان کے فرق کو سمجھتی ہے۔ اور اس دنیا میں کہیں اس کا وجود نہیں ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتاب قرآن مجید کا یہ معجزہ ہے سورہ فاتحہ جو سب سے زیادہ پڑھی جانے والی سورت ہے اس صورت کے آخر میں آتا ہے۔

"اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم والا الضالين"

اب مسلمانوں کے بعد جو مذاہب رہ جاتے ہیں جہاں تک آسمانی مذاہب کا تعلق ہے تو دو سب سے بڑے مذہب ہیں جو اس وقت تک دنیا میں باقی ہیں ایک یہودیت اور ایک عیسائیت، اور ایک کے بارے میں فرمایا المغضوب علیھم اور دوسرے کے بارے میں فرمایا الضالین صرف اس امت کو سیدھی راہ حاصل ہے کہ بدر کی فتح ہوئی بدر میں یہ سب حضرات فتح یاب ہوکر اور ان میں سے اکثر صحیح وسالم مدینہ تک پہنچ سکے اور وہاں جا کر انہوں نے یہ الفاظ دہرائے۔

"الا تفعلوه تكن فتنة فى الارض فساد كبير"

اس چھوٹی (اقلیت سے جو بقامت کہتر بقیمت بہتر تھی آپ خیال تو کیجئے کس سے کہا جارہا ہے "الا تفعلو تكن فتنه الارض فساد كبير" اے مسلمانوں اور مٹھی بھر مسلمانو! اے مکہ معظمہ سے آئے ہوئے مہاجرو اور جنہوں نے اسلام قبول کیا ہے فتح خیبر کے انصاریو!

اگر تم لوگ دنیا میں کفر وشرک کا مقابلہ کرنے کیلئے اور دنیا سے ضلالت مٹانے کیلئے، دنیا میں ہدایت پھیلانے کیلئے، دنیا والوں کا سر اللہ کے سامنے جھکانے کیلئے دنیا کو سچائی اور اخلاق حسنہ پر عمل کرنے کے لئے اور نفس پرستی اور شہوانیت اور شیطانیت ان سب سے بچانے کیلئے اگر تم نہ کھڑے ہوئے اور اگر اس کیلئے تم نے کمر نہ باندھی ''تکن فتنة فی الارض و فساد کبیر'' تو دنیا میں ایک فساد عظیم برپا ہوگا میں نے مکہ معظمہ میں عربوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا آپ بقامت کہتر بقیمت بہتر ہیں آپ ہی کے اسلاف تھے جو مٹھی بھر تھے اس کی تعداد تھی بخاری شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ تین مرتبہ مسلمانوں کی مردم شماری ہوئی تو کسی میں چند سو نکلے اور پھر اخیر دو ڈھائی ہزار یا اس سے کم وبیش اتنی چھوٹی تعداد نکلی لیکن یہ بقامت کہتر بقیمت بہتر تھے یعنی قد وقامت کے لحاظ سے، اپنی تعداد کے لحاظ سے مٹھی بھر تھے لیکن اپنے مقصد کے لحاظ سے، اپنی افادیت کے لحاظ سے، اپنے اعمال کے لحاظ سے وہ بقیمت بہتر تھے تو آپ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ آج بھی دنیا میں بقامت کہتر بقیمت بہتر ہیں لیکن بقیمت بہتر کہاں سے یہ صفت پیدا ہوگئی اسلام پر عمل کرنے سے، عبادت وسیع معنیٰ میں جس کو عربی میں اور قرآن وحدیث کی اصلاح میں عبادت کہتے ہیں ہمارے یہاں کس کو کہتے ہیں ذرا سی دعا تک لی اور نماز پڑھی لی ایک دو رکعت، بھی ہم نے عبادت کی، عرب میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اس میں سارے احکام الٰہی آجاتے ہیں، اور جیسے میں کہا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اعوذ باللہ من الشیطان الرحیم بسم اللہ الرحمن الرحیم، یاایھا الذین آمنو الدخلو فی السلم کآفته ولا تتبعو خطوات الشیطان ''اے ایمان والو! اللہ کے ساتھ صلح اور اطاعت پر پورے کے پورے داخل ہوجاؤ یعنی سو فیصد مسلمان ہوجاؤ سو فیصدی اسلام میں داخل ہوجاؤ، اس میں پچاس فیصدی، ساٹھ فیصدی کوئی تقسیم نہیں نہ مسلمانوں میں اس کی گنجائش ہے اور نہ اس کی اجازت، نہ اسکا کوئی جواز ہے مسلمان ساٹھ فیصدی یا پچاس فیصدی دین پر چل رہے ہیں نہیں یہ بالکل کافی نہیں ادخلو فی السلم کآفة پورے کے پورے سو فیصدی داخل ہوجاؤ اور پھر یہی نہیں کہ داخل ہونے والے سو فیصدی نہیں جس پر داخل ہو رہے ہیں اور جس نظام کی اطاعت کو قبول کر رہے ہیں اور جس آئین خداوندی کو قبول کر رہے ہیں اور جس دین میں داخل ہو رہے ہیں اس کے سو فیصدی حصہ میں داخل ہوں یہ نہیں مسجد میں پاؤں تو رکھ دیئے اور جسم

باہر، تو آج میں آپ یہ کہوں گا اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور اس درس سے کہ کہیں خدا کے یہاں باز پرس نہ ہو کہ تمہیں ایک ایسا موقع ملا اپنے اتنے بھائیوں سے بات کرنے کا، اور وہ توجہ سے سن رہے تھے ان مخلصین کی برکت سے جنھوں نے اس پر پہلے تقریریں کیں اور جنھوں نے اس جلسہ کو بلوایا ان سے کہ دین کو پورے عقائد کے ساتھ، فرائض وعبادت کے ساتھ اور اس کیساتھ اپنے معاشرے کے ساتھ پورے اسلامی معاشرے کے ساتھ اس کے اصول کیساتھ، اس کی سادگی کے ساتھ، اور اس کی پابندیوں کے ساتھ، اور اس پر جو حقوق ہیں جنہیں ان حقوق کے ساتھ قبول کرنا ضروری ہے یہ نہیں کہ فرائض پنجگانہ کے تو آپ بھی قائل ہیں اور عامل بھی ہیں اور پانچ وقت کی نماز بھی پڑھتے ہیں لیکن شادی میں نہ بولئے یہ شادی جو ہے شادی کا معالہ ایک ذاتی معاملہ ہے، خاندانی معاملہ ہے، اس میں تو پہلے حیثیت عرفی دیکھی جاتی ہے کہ کیا اس کی (Soial position) ساجی پوزیشن ہے فرض کیجئے کہ کسی نے لاکھ روپیہ خرچ کر دیا تو اس اس کا دین سے کیا تعلق یہ تو عرف کی چیز ہے عرف کے معنیٰ فقہ کی اصلاح اور اصول فقہ کی اصلاح میں لغت بھی بہت وسیع معنی ہیں تو یہ عرف چیز ہے یہ تو جس ملک میں ہم رہتے ہیں اور جس آب وہوا میں رہتے ہیں اور جس ماحول میں رہتے ہیں یہ اس کا خیال کرتے ہوئے اور اس کا احترام کرتے ہوئے اور اس کو ضرورت سمجھتے ہوئے ہم کرتے ہیں ان چیزوں میں آپ دین اجراء کرنے لگتے ہیں دینی نقطہ نظر سے اور دین کا حکم بیان کرنے لگتے ہیں یہ شادی ہے بھی اس میں آدمی کو آزاد چھوڑ دیجئے۔

ہر جگہ مانگا جاتا ہے اور مطالبہ کیا جاتا ہے جہیز کا، مسلمان بھی اگر مانگے تو اس میں کیا حرج ہے یہ تو ایک بالکل خاندانی چیز ہے اور عرفی چیز ہے اور ماحول کی چیز ہے نہیں اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی عقائد سے لے کر اخلاق ومعاملات اور معاشرت اور باہمی تعلقات تک اور تجارت وزراعت تک سب میں اللہ کے احکام کی پیروی کرنا ضروری ہے اور یہ امت جو چھوڑی گئی ہے کہ جب اللہ کے رسول نے فرمایا ''اللھم ان تھلک ھذا العصابة لا تعبد'' میں نے سیرت کی بعض کتابوں میں دیکھا ''لاتعبد ابداً'' تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر اللہ کے جلال سے اللہ تبارک وتعالی کی شان استغناء سے، اللہ کی عظمت سے، آپ سے زائدہ کون واقف ہوسکتا ہے؟، لیکن آپ کی زبان سے یہ [illegible] آپ [illegible] کہے کہ یہ الفاظ جو انسان

کو ششدر بنادینے والے اس کے قیاس وقوت قیاسیات کو بالکل ماؤف کردینے والے الفاظ ہیں اگر یہ صحیح سیرت کی کتابوں میں نہ آتے اور حدیث کی کتابوں میں نہ آتے تو کوئی ہمت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کو اس طرح بیان کرسکتا بس میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس امت کو اس بنا پر وقت دیا گیا ہے اور اس کی زندگی کی مہلت دی گئی ہے اس کو سب سہولتیں دی گئی ہیں اور اس کیلئے نصرت الٰہی آسمان سے بار بار آئی ہے اور آج بھی اللہ تعالیٰ حفاظت فرمارہا ہے اس امت کی، باوجود اس کے کہ آپ کو معلوم نہیں کہ اسرائیل امریکہ کے اتحاد سے ایسا منصوبہ تیار ہے جو بالکل نسل کشی کیا، ہر ملک کو اسپین بنا دینا اور مسلمانوں کے دلوں سے اسلام کی حمیت کیا حمیت تو بڑی چیز ہے دین کی محبت کو نکال دینا اور دین پر فخر کرنے کے جذبہ کو نکال دینا چاہتا ہے جس کے لئے سب پلان بنا ہوا ہے، آبادی کو کنٹرول کرنے اور خواتین کے فلاح و بہبود کے مسائل کو بہانہ بنا کر پوری انسانیت کے خلاف سازش کی جارہی ہے اس وقت بھی یہ امت موجود ہے اور ان شاء اللہ موجود رہے گی، قیامت تک موجود رہے گی یہ اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو تسلیم کرلیا اپنے رسول کی زبان سے جو لفظ نکلا تھا لا تعبد، کہ اس امت کو آپ نے فنا کردیا، اس دنیا سے اس کا نام و نشان مٹ گیا اور ان ایک ہزار کو ان تین سو تیرہ پر جو اس دنیا میں ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور عقل بھی، تجربہ اور قیاس بھی اور ریاضی بھی اور فن جنگ سب کا تقاضا یہی ہے کہ یہی نتیجہ نکلے لیکن اس کے بالکل برخلاف اگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان تین سو تیرہ کو ایک ہزار پر فتح ہوئی تو یہ اس بناء پر کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تصدیق کی اور اس کو مان لیا کہ عبادت کا رشتہ اس امت کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اس امت کے ساتھ عبادت کا رشتہ باندھ دیا گیا ہے یہ خود عبادت کریں اور دنیا کو عبادت کی دعوت دیں، میں زیادہ وقت نہیں لوں گا کہ بیمار و کمزور ہوں۔

تو میرے بھائیو! میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے اور آپ کی بقا کیلئے ہمارے اور آپ اس وقت جو ہم بیٹھے ہیں اس کو بھی میں کہتا ہوں اس مجمع کو بھی شامل کرتا ہوں، پرسوں جمعہ آئے گا جہاں جہاں جمعہ کی نمازیں ہوں گی پھر حج کا زمانہ بھی انشاء اللہ آئے گا، انشاء اللہ مسلمان حج کریں گے، آج آپ دنیا میں جو سفر کرتے ہیں اور مسافتیں طے کرتے ہیں اور عہد لیتے ہیں بہرحال آپ کو زندگی کی آزادی حاصل ہے یہ سب صدقہ ہے، سب طفیل ہے اس کا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات تسلیم کرلی اور اس کو قبول کرلیا

کہ عبادت الٰہی اس امت کے ساتھ وابستہ ہے آپ میں سے ہر ایک بادشاہ ہو جائے، ہر ایک قارون ہو جائے اپنے وقت کا ہر ایک ہامان وفرعون ہو جائے، معاذ اللہ اور آپ کچھ بن جائیں آپ میں سے ہر ایک اسکالر بنیں، بڑے اسکالر بنیں، بڑے انجینئر ہیں، بڑے سائنس دان بنیں، بڑے ملکینک بنیں، یہاں تک کہ آپ جمہوریتوں کے صدر ہو جائیں اور کہیں کے وزیراعظم ہو جائیں یہ آپ کے باقی رہنے زندہ رہنے کیلئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں بالکل کافی نہیں اور یہ کوئی استحقاق نہیں اور اس لئے کوئی استحقاق پیدا نہیں ہوتا آپ کے زندہ رہنے کا عزت سے رہنے کا اور اپنی نسل کو آگے بڑھانے اور اپنے دین وفرائض کو ادا کرنے کا ان سب کا آپ کو وقت ملا ہے یہ سب صدقہ ہے نتیجہ ہے اس کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ بات تسلیم کرلی اور قبول فرمالیا اپنے نبی محبوب کو کہ سب کچھ ہوگا اے اللہ تیرے تمام کارخانے ویسے ہی رہیں گے مگر ایک عبادت کا کام صرف یہی امت کرنیوالی ہے اب اس امت کی ذمہ داری کتنی بڑھ جاتی ہے۔ تبلیغ ودعوت اصل میں اسی کی یاد دہانی ہے اور اس کی تشریح ہے اور اسی متن کی تشریح ہے کہ اس امت کا سب سے پہلا فریضہ جس سے اس کو زندگی کا استحقاق پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کا استحقاق ہی اس پر منحصر ہے کہ آپ اللہ کی عبادت خود کریں اور دوسروں کو دعوت دیں یہ میں کہتا ہوں آج یورپ امریکہ سب محتاج ہیں آپ ان کو اللہ کی عبادت کی دعوت دیں یہ لوگ دنیا کی تنگی میں ہیں ان کے فیشن، ان کے معبود بن گئے ہیں ان کی روایات (Eitsion Kitesion) اٹیٹیشن ان کے معیار اسٹینڈرڈ یہ ساری چیزیں ان کے معبود بن گئے ہیں کہ بغیر اس کے یہ زندگی گزار ہی نہیں سکتے ان کو آپ بتائیں کہ آزادی کیا ہوتی ہے۔ حقیقی آزادی کیا ہوتی ہے زندگی کا لطف کس چیز میں ہے۔ یہ یورپ امریکہ چاہے کتنے بڑے سرمایہ دار ہوں کتنی بڑی یہ فوجی طاقت رکھتے ہوں اور کتنی ترقی کی ہو علم وفن میں، تہذیب میں اور سائنس میں یہ سب کے سب اپنے نفس کے غلام ہیں، اپنے آلات کے غلام ہیں اور اپنے ہی قانون اور اپنے ہی خود ساختہ قوانین کے یہ فیشن کیا فیشن تو اپنا بنایا ہوا ہے کہ اچھا صاحب کل سے یہ فیشن ہوگا۔ اور جو معمولات ہیں دن رات کے ان کے ایسے غلام ہیں کہ جیسے کوئی آزاد مرد کسی کا غلام کا، کسی آزاد کا غلام ہو جائے، آپ کا اور ہمارا فریضہ ہے کہ دینی اسلامی، اور ایمانی فرض ہے، انسانی فرض ہے، اخلاقی فرض ہے، کہ ہم ان کو بھی دنیا کی تنگی اور دنیا کی کال کوٹھری سے تعبیر کرتا ہوں

صاف کہتا ہوں کہ آپ کی دنیا کال کوٹھری ہے ایسے غلام کو نکال کر دنیا کی وسعتوں میں لائیں اور دنیا کی کھلی فضاء میں ہوا کھلائیں اور ان کو بتائیں کہ آزادی کیا ہوتی ہے۔اس امت کے باقی رہنے کے آج جو ہم اور آپ باقی ہیں گویا ہر ایک کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک پیشہ سا ہے کہ وہ اس امت کا فرد ہیں جس کی وجہ سے دنیا میں عبادت ہو رہی ہے۔اور دنیا میں عبادت کی دعوت بھی دی جارہی ہے،عبادت کی دعوت قیامت تک دی جاتی رہے گی بس اگر ہم زندگی چاہتے ہیں اور عزت چاہتے ہیں اور آخرت میں سرخروئی چاہتے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتیں چاہتے ہیں اور اپنے نبی کی خوشنودی اور مسرت چاہتے ہیں تو عبادت کو اپنے ساتھ اتنا مربوط کرلیں کہ ہم جہاں ہوں اللہ کے دین کے داعی ہوں خود عمل کرنے والے ہوں اور دوسروں کو عمل کرنے کے دعوت دینے والے۔ہوں اللہ تبارک وتعالیٰ ہم کو آپ کو اور سب کو اس کی توفیق دے(آمین)

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

قرآن کریم میں عورتوں کا مقام

صحیح معاشرہ کی تشکیل میں عورتیں کیا اہم رول ادا کرسکتی ہیں...!

ذیل کا مضمون حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی وہ اہم تقریر ہے جو ۱۹ دسمبر ۹۶ء کو مدرسہ خدیجۃ الکبریٰ کے جلسے میں جس میں طالبات کے علاوہ خواتین کی بہت بڑی تعداد موجود تھی فرمائی، حضرت مولانا نے قرآن کریم میں عورتوں کو جو درجہ دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مردوں کے ساتھ عورتوں کو جو مرتبہ عطا کیا ہے اس پر تفصیل سے گفتگو فرماتے ہوئے خواتین اسلام کے علمی کارناموں اور دینی خدمات پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ خواتین خدمت اور اصلاح معاشرہ میں اہم رول ادا کرسکتی ہیں، یہ تقریر ایسی ہے کہ پمفلٹ کی شکل میں زیادہ سے زیادہ خواتین تک پہونچائی جائے، اور ہماری مائیں، بہنیں اس کو پڑھیں اور اپنی قسمت پر ناز کریں خصوصاً اس ماحول میں جبکہ یہ کہا جارہا ہے کہ اسلام میں عورتوں کو بہت کم درجہ دیا گیا ہے۔

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نومن به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرر انفسنا و من سيأت اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضلل الله فلا هادي له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له و نشهد ان سيدنا ومولانا محمداً عبده و رسوله صلى الله تعالىٰ عليه و على آله واصحابه اجمعين اما بعد فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم.

" من عمل صالحاً من ذكر أو انثىٰ وهومومن فلنحيينه حيوةً طيبةً ولنجزينهم اجرهم باحسن ماكانو يعملون"

حضرات: قاری صاحب نے جو آیت تلاوت کی ہے وہ ذہن کو بہت متوجہ کرنے والی ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے عمل صالح کے تذکرہ میں مرد اور عورت کا الگ الگ تذکرہ کرتے ہوئے توجہ دلائی ہے، اس طرح عورت کو بھی اسی توجہ کا مستحق دکھایا ہے، جس کا مرد کو، عمل صالح کا جو فائدہ بتایا ہے، وہ بہت عظیم ہے، عمل صالح کا فائدہ یوں تو سب کو معلوم ہے اور اس کا ذکر بھی

سب کرتے ہیں، لیکن اس آیت میں جو فائدہ بتایا گیا وہ اپنی خاص نوعیت واہمیت رکھتا ہے جو بہت اہم ہے لیکن اس کی طرف اس آیت کے پڑھنے والوں کا ذہن عموماً کم گیا ہے، گذشتہ زمانے سے لے کر اس وقت تک کتنے حفاظ گزرے ہیں، اور حافظوں کو قرآن حفظ یاد ہے اور ہوگا اور عالموں نے اس کی تفسیر بیان کی ہے لیکن بہت کم اس پر غور کرنے کی نوبت آئی کہ اس میں کتنی بڑی بشارت سنائی گئی ہے وہ یہ کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو بھی نیک کام کرے گا۔ (من یعمل من الصالحات) مرد ہو یا عورت (من ذکر أو انثی) فلنحیینه حیوۃً طیبۃً ہم اس کی ضرور اچھی زندگی گزروائیں گے۔

یہ سب ساری دوڑ دھوپ دنیا میں جو ہو رہی ہے، امریکہ سے لے کر انڈونیشیا تک ہماری اسلامی دنیا میں مراکش سے لے کر شمالی افریقہ پھر، یمن، انڈونیشیا اور ملیشیا تک سب کا حاصل یہ ہے کہ اچھی زندگی کیسے حاصل ہو، اس کے لئے کیا کوشش کی جائے، اور اس کے کیا اسباب اور کیا ذرائع ہیں اور کس طرح یہ دولت حاصل کی جائے، آپ دیکھیں گے کہ پرائمری اسکولوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک، یونیورسٹیوں کے بعد خاص مضمون کی بڑی جو یونیورسٹیاں، جامعات اور بڑی اکیڈمیاں ہیں جو غور و فکر کرنے کے لئے ہی بنائی اور قائم کی گئی ہیں اور بڑے بڑے مصنفین ہیں ان سب کا جو مشترک موضوع ہے وہ یہ کہ ایسی زندگی کیسے حاصل ہو، یہاں تک کہ سیاست اور انتخابات اور جمہوریت اور صحافت، یہ ساری چیزیں بھی اس کی معاون ہیں، کم سے کم یہ کہ وہ اس کا اعلان کرتی ہیں کہ ہم اس کا راستہ دکھائیں گے، رہنمائی کریں گے۔

اچھی زندگی کی ضمانت

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ایک بہت بڑی بشارت سنائی ہے، ''من یعمل من الصالحات'' جو اچھے کام کرے گا، اور اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق ہوں کام اللہ کی منشاء کے مطابق ہوں اس کے رسول کی منشاء و فرمان کے مطابق ہوں اور دینی احکام کے مطابق ہوں، پھر آخری آسمانی صحیفہ قرآن مجید کے مطابق تو ہم اس کی اچھی زندگی گزروائیں گے، اس میں دنیا کی زندگی بھی آجاتی ہے، یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس میں صرف آخرت ہی کی بشارت دی گئی۔ ''حیوۃ طیبۃ'' جو لوگ عربی جانتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں نکرہ

کا لفظ ہے ''الحیوۃ طیبۃ'' بھی نہیں کہا گیا ہے'' فلنحیینه حیواۃ طیبةً ''ہم ہر طرح کی اچھی زندگی اس کی گزروائیں گے، یہ ساری کوشش اس بات کی ہورہی ہے، یہ دوڑ دھوپ، یہ محنتیں اور یہ راتوں کا جاگنا، اور یہ کتابوں پر محنت کرنا، پرائمری سے لے کر یونیورسٹیوں تک پڑھنا پڑھانا اور پھر اس کے بعد ڈگریاں حاصل کرنا، کوئی انجینئرنگ کا راستہ اختیار کرتا ہے اور کوئی ادب اور لٹریچر کا راستہ اختیار کرتا ہے، سب کا مشترک مقصد اور ہدف ونشانہ یہ ہے کہ اچھی زندگی حاصل ہو۔

اور کیا آدمی چاہتا ہے کہ بڑی تنخواہ ہو، رہنے کیلئے اچھی بڑی کوٹھی اور سواری کے لئے اعلیٰ درجہ کی موٹر اور ہوائی جہازوں پر سفر کرنا اور پھر اس کے بعد سیاست میں آئے تو وزیر اعظم بن جانا اور پھر پارلیمنٹ کا ممبر بن جانا، سب اس لئے کیا جاتا ہے کہ ہم آرام اور سکھ کی زندگی گذار سکیں، اس کو سکھ کہتے ہیں، یہ ایک عام لفظ ہے اور بہت وسیع کہ ہم سکھی ہوں دکھی نہ ہوں، ہم سکھ کی زندگی گذار سکیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی ضمانت لے لی ہے، اور فرمایا ہے کہ اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ نیک عمل کرے، ہمارے احکام کے مطابق اگر عمل ہوگا'' فلنحيينه ''لام کے ساتھ کہا، جب کہنا ہوتا ہے، عربی میں ایسا ضرور ہوگا، ایسا ضرور کریں گے تو اس کو لنفعلن، لنذھبن لنعلمن کے وزن پر استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے حالانکہ اللہ کا قول، فرمان خداوندی ہے، اس میں شک کیا ہو سکتا تھا، لیکن ہمیں اطمینان دلانے کے لئے مردوں اور عورتوں کو اطمینان دلانے کے لئے کہا کہ ہم ضرور، اس کی اچھی زندگی گزروائیں گے، اور کیا چاہئے، دنیا میں یہ کس لئے دوڑ دھوپ ہورہی ہے، کس لئے اپنی صحتیں خطرے میں ڈالی جارہی ہیں، کس لئے مقابلے ہیں، کس لئے یہ دوڑ دھوپ ہے، سب اسی لئے کہ اچھی زندگی گزرے۔

اب اچھی زندگی کسی نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اچھی تنخواہ ہو، حالانکہ اچھی تنخواہ بھی اچھی زندگی گزرنا ہرگز یقینی نہیں، لاکھوں مثالیں دی جاسکتی ہیں، کہ اچھی بڑی تنخواہ ہے، لیکن زندگی اچھی نہیں، یا صحت خراب ہے، یا آپس میں نااتفاقی ہے، یا اطمینان قلبی نہیں ہے، کوئی ڈر لگا ہوا ہے، یا کوئی خطرہ رہا ہے، یا کوئی ایسا مرض ہوگیا ہے، کوئی عارضہ ہوگیا ہے، کچھ ہوگیا ہے، وہم ہونے لگا ہے، یا صحت میں بھی خرابی آگئی ہے کہ بڑی تنخواہ، بڑی کوٹھی، شاندار موٹر سب ہے، اولاد ہے، لیکن مزہ نہیں آرہا ہے، زندگی میں۔

نعمت، جس کو زندگی کی نعمت کہتے ہیں وہ حاصل نہیں ہو رہی ہے، تو یہ بات بہت سوچنے کی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو ہمارے احکام پر عمل کرے گا، ہماری شریعت پر عمل کرے گا، ہمارے رسولؐ کے فرمانوں پر عمل کرے گا، نہ وہ دیکھے گا کہ رسموں میں کیا ہوتا ہے، نہ یہ دیکھے گا کہ کون سی چیز بڑے فخر کی سمجھی جاتی ہے، کس بات پر تعریفیں ہوتی ہیں، کس بات میں عزت ملتی ہے، کس بات میں دولت ملتی ہے، کوئی اس کا خیال نہیں کرے گا، کوئی اس کا خیال نہ کرے صرف یہ کہے کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے کہ شادی بیاہ کس طرح ہونا چاہئے، بچوں کی پرورش کیسے کرنی چاہئے، گھر میں کس طرح کی زندگی رائج کرنی چاہئے، نمازوں کی پابندی ہو، پردہ ہو، حیاء وشرم ہو، ایک دوسرے کا احترام ہو، بڑے کو بڑا سمجھا جائے، چھوٹے پر شفقت کی جائے، غرور نہ ہو، تعلّی نہ ہو، اسراف وفضول خرچی نہ ہو، ناجائز رسمیں نہ ہوں، اور یہ دوسروں کو خوش کرنے کے لئے اللہ کو ناراض کرنا بالکل آسان سمجھا جائے یہ نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر یہ باتیں نہ ہوں گی تو ہم اس کو ضرور اچھی طرح گزروائیں گے، یعنی میں بھی اور اس کی ہزاروں نہیں لاکھوں مثالیں ہیں، اگر آپ حدیث پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ جن گھروں میں اور جن خاندانوں میں شریعت کی پابندی کی گئی اور اسلامی زندگی کا جو نمونہ اور سانچہ ہے، اسلامی زندگی کا جو ماڈل ہے، وہ اختیار کیا گیا، رسموں کو نہیں دیکھا گیا، رواج کو نہیں دیکھا گیا، بلکہ یہ دیکھا گیا کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم کیا ہے؟ جن لوگوں، خاندانوں، برادریوں اور جن ملکوں اور جن معاشروں نے اور جس سوسائٹی نے اس پر عمل کیا ان کو اللہ نے دنیا میں جنت کی زندگی کا مزہ چکھا دیا، اس میں شبہ نہیں، ہم مبالغہ سے نہیں کہہ رہے ہیں، دنیا ہی میں اس کو جنت کی زندگی کا مزہ آگیا کہ بس معلوم ہوتا ہے کہ ہم جنت میں ہیں، محبت کا دور دورہ ہے، ایک دوسرے کا حق ادا کیا جاتا ہے، یہاں کسی کا حق مارا نہیں جاتا، کسی کو حقارت کی نظر سے دیکھا نہیں جاتا، کوئی فضول بات نہیں کہی جاتی، کوئی ناجائز آمدنی باہر سے نہیں بس اللہ توکل اور اللہ کا نام لینا، پابندی کے ساتھ نماز پڑھنا، حلال روزی کھانا، حرام کا پیسہ کیا حرام کی پائی بھی گھر میں نہ آنے پائے، جن گھروں میں اس کی پابندی کی گئی ان کے گھر جنت کا نقشہ ہیں، ان گھروں پر بادشاہوں کے محلات اور شاہوں کی کوٹھیاں قربان، ان کے سامنے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی جیل خانہ ہے، دیکھنے میں باہر سے کتنی شاندار کوٹھی ہے، بڑی بڑی

دیواریں ہیں، یہ سب ہے لیکن اندر جہنم کی زندگی ہے، بیوی اور شوہر میں محبت نہیں، ماں بیٹے میں محبت نہیں ہے، نہ ماں میں وہ شفقت ہے، نہ بیٹے میں وہ احترام ہے، نہ کسی کمزور پر ترس آتا ہے، نہ کسی غریب کی مدد کی جاتی ہے اور سوائے کھانے پینے اور سوائے فخر وغرور کے اور دکھاوے کے لئے مظاہرہ کرنے کے کوئی اور یہاں کام ہی نہیں ہے۔

تو بھائیو اور بہنو: آپ اس بات کا خیال رکھیں اور یہ اللہ نے موقع دیا ہے کہ مرد عورت دونوں کوشش کر کے اور شریعت کے مطابق زندگی گزار کر اور اللہ کی فرمانبرداری کر کے اور اس کے رسولؐ کی شریعت پر چل کر وہ بڑی سے بڑی ترقیاں حاصل کر سکتے ہیں، اور ترقیاں بھی کیسی روحانی ترقی، یہ ہم خوب سوچ سمجھ کر کہہ رہے ہیں، اس پر بحث ہوتی ہے اس کو پکڑا جاتا ہے، اس پر سوال کیا جاتا ہے کہ یہ کیسے لکھ دیا، اس لئے ہم ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔

علمی دنیا میں عورتوں کی خدمات

ہم آپ کو خدا کی قسم کھا کر بتاتے ہیں کہ دین کے احکام پر عمل کرنے سے اور دین کا ضروری علم حاصل کرنے سے اسی پر عمل کرنے سے مستورات نے اسلامی تاریخ میں، اسلامی دنیا میں وہ وہ ترقیاں حاصل کی ہیں، روحانیت کے اس درجہ تک پہونچی ہیں، جس درجہ تک اس زمانے میں ہزاروں نہیں لاکھوں مرد نہیں پہونچنے پائے، آج ہم آپ سے پوچھتے ہیں کیا رابعہ بصریہ کا نام، آپ نے نہیں سنا کہ رابعہ بصریہ کون تھیں، ان کا نام آج لکھنو میں یہاں اس محلے میں لیا جارہا ہے کہ ان کے زمانے کے ہزاروں نہیں لاکھوں آدمی بھی ان کے درجے کو نہیں پہونچے ہوں گے، اور اس کے علاوہ تاریخ پڑھیں اور خود مستورات کی اور مسلمان فاضلات کی اور مسلمان ادیبات کی تاریخیں الگ الگ لکھی گئی ہیں، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ علمی حیثیت سے بھی ہماری بہنیں پرانے زمانے میں ایسے درجہ تک پہونچی ہیں کہ تاریخ میں نام آتے ہیں، کہ بڑے بڑے اس زمانے کے علامہ ان سے رجوع کرتے تھے، اس وقت ہم ان کے نام لے نہیں سکتے وہ بہت ہیں اور مجھے سب یاد بھی نہیں۔

اندلس، بغداد اور قاہرہ میں اور حرمین شریفین میں ایسی عورتیں تھیں کہ ان سے لوگ مسئلے پوچھنے جاتے تھے اور عربی لغت کی تحقیق کرنے جاتے تھے، ان سے علمی استفادہ کے لئے جاتے تھے

ان کے نام ہیں، تاریخ کے اندر، ان کے شاگردوں کے نام ہیں، کتنے بڑے بڑے شاگرد ہوئے، تو یہ دولت علم کی دولت مردوں کے ساتھ مخصوص نہیں، مرد وعورت دونوں قرآن کے لئے ہے۔

قرآن کریم میں مردوں کے ساتھ عورتوں کے ذکر کا اہتمام

ہم آپ سے ایک طالب علم اور عربی جاننے والے کی حیثیت سے کہتے ہیں کہ یہ صرف کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ مرد وعورت سب درجے حاصل کر سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جب ذکر کرتا ہے ایسے مراتب کا، تو مردوں کے لئے صیغہ الگ اور عورتوں کے لئے الگ ذکر کرتا ہے، ''ان المسلمین والمسلمٰت والمومنین و المومنت و القانتین و القانتات'' اور ہر لفظ کے ساتھ ایک مرد کے لئے صیغہ ہے، ایک عورت کے لئے، کوئی پوچھے کہ بھئی اتنا کہہ دیا ہوتا کہ ''ومن یعمل من الصالحات من ذکر او انثیٰ و مؤمن'' نہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ عبادت کی یہ قسم صرف مردوں کے ساتھ مخصوص ہے، عورت اس میں کوئی درجہ نہیں حاصل کر سکتی، روزہ رکھنے میں ان کا ذکر ہے، عبادت کرنے میں ان کا ذکر ہے، اور اللہ کی یاد کرنے میں ان کا ذکر ہے، ''واللہ والذکرین اللہ کثیراً والذکرات '' اللہ کا ذکر کرنے میں الذاکرین مذکر کا صیغہ بھی استعمال کیا گیا ہے اور مؤنث کا بھی، اس لئے کہ دوسرے مذاہب کی تاریخ ان کی کتابیں بتاتی ہیں کہ وہاں بہت سے کمالات اور بہت سی صفات صرف مردوں کے لئے مخصوص کر دی گئی ہیں اور یہ بات دماغ میں بیٹھی ہوئی تھی اور ایک بالکل بدیہی بات سمجھی جاتی تھی کہ یہ صرف مردوں کا کام ہے عورت اس میں ہاتھ نہ لگائے، وہ ترقی نہیں کر سکتی ہے، اس کو اس سے کوئی بڑا امتیاز نہیں حاصل ہو سکتا ہے، لیکن قرآن میں ایک ایک عبادت کے ساتھ، عبادت کی ایک ایک قسم کے ساتھ مردوں کے لئے الگ لفظ اور الگ صیغہ ہے اور عورتوں کیلئے الگ صیغہ ہے۔

قرآن مجید میں عورتیں کے نام سے مستقل ایک سورۃ

اور پھر دیکھئے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ قرآن مجید کی بڑی سورتوں میں سے ایک سورۃ کا نام ہی عورتوں کے نام پر رکھا گیا ہے ''سورۃ النساء'' کیا ہندو مذہب کا کوئی جاننے والا بتائے گا کہ اس کے مذہب میں اور اس کی کسی مقدس کتاب میں عورتوں کے نام سے کوئی لیکھ ہو یا اس کے عنوان سے ذکر ہو۔ لیکن جہاں پر ایک سورۃ سورۂ بقرہ ہے سورۂ آل عمران

اور پھر ساری سورتیں قران مجید کی ہیں وہیں ایک سورۃ النساء بھی ہے۔ اور پہلے دن سے اس وقت تک اس کا نام چلا آ رہا ہے اور یہ عورتوں کیلئے ہے ترقی اور علم دین حاصل کرنے اور دین میں ترقی اور اس میں امتیاز پیدا کرنے اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے اور اس کے یہاں اونچا مقام حاصل کرنے اور اللہ کا مقبول بندہ اور بندی بننے کی پوری پوری صلاحیت اور پورے امکانات اور پہلی صدی سے لے کر اس وقت تک موجود ہیں اور آج بھی ایسا ہو سکتا ہے۔

ہندو مذہب میں عورتوں کی دینی خدمات

اور آپ حضرات ہندوستان ہی کی تاریخ پڑھئیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہاں کتنی بیویوں نے قرآن کی تعلیم اور دینیات کی ترویج اور بدعات کی تردید اور سنتوں کی اشاعت کا کام کیا ہے ایک شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان کو دیکھ لیجئے کہ وہاں ایسی بیبیاں گزری ہیں کہ جنہوں نے دہلی میں اور بعض مرتبہ دہلی کے باہر بھی ان کا فیض پہنچا اور کم سے کم یہ کیا کم بات تھی کہ ان کی آغوش تربیت میں ان کی گود میں شاہ عبدالقادر پیدا ہوئے، شاہ رفیع الدین پیدا ہوئے شاہ عبدالعزیز پیدا ہوئے یہ کن کی گودوں میں پیدا ہوئے تھے اور پھر ہمارے یہاں اودھ میں دیکھئے کیسی کیسی بیبیاں پیدا ہوئیں میں ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں کہ حضرت سید احمد شہیدؒ رائے بریلی میں پیدا ہوئے وہاں کے خاندان میں ہی نہیں بلکہ ان کا فیض سارے ہندوستان میں پہنچا۔ ان کے ہاتھ پر ۲۵، ۳۰ ہزار آدمی مسلمان ہوئے اور ۳۰ لاکھ کے قریب لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت اور توبہ کی ان کے حالات میں لکھا ہے کہ دیکھنے اور سننے میں تو بہت معمولی بات معلوم ہوگی لیکن دیکھئے کس درجہ کی کتنی اونچی بات ہے کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ان کی والدہ صاحبہ نماز پڑھ رہی تھیں اور ان کی دائی بیٹھی ہوئی تھی کہ ایک دم سے کوئی آدمی گھر میں آ گیا گھر میں اس آدمی نے کہا کہ دو فرقوں میں فساد ہو گیا اور لڑائی ہو رہی ہے اور آپ کو جہاد کیلئے دعوت دی آپ تیار ہوئے ماشاء اللہ آپ جوان تھے اور بہت ورزشیں کئے ہوئے اور بہت پھر تیلے تھے دائی نے کہا نہیں نہیں یہ نہیں جا سکتے عمر بھی اس وقت شاید ۱۲، ۱۴ برس کی رہی ہوگی والدہ خوب سمجھتی اور جانتی تھیں کہ وہاں جا کر شہادت کی خبر آ سکتی ہے ہم یہیں بیٹھیں ہیں کہ معلوم ہوا کہ شہید ہو گئے یا زخمی ہو کر واپس لائے جا سکتے ہیں تو دائی نے روک دیا اور والدہ صاحب نے

جب سلام پھیرا حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے کہا بی بی تم نے کیوں روکا تم نے اس سعادت سے کیوں محروم رکھا ہمارے بیٹے کو جانے دینا چاہئے تھا یہ جہاد کا معاملہ تھا اب آپ بتایئے کہ کس درجہ کا کیسا یقین وایمان ہوگا اس خاتون کے اندر اور وہ علم دین سے کتنی واقف ہوں گی اور پھر کتنا اس کے اندر ایثار وقربانی کا جذبہ ہوگا کہ اپنے بیٹے کو خطرے میں ڈالنے کیلئے تیار اور دائی جس کا ایک عارضی خادمانہ رشتہ ہوتا ہے وہ روکے مگر دودھ پلانے والی اور اس کو وجود میں لانے والی شفیق ماں یہ کہے کہ نہیں ان کو جانا چاہئے تھا ایسی سیکڑوں ہزاروں مثالیں آپ کو ملیں گی۔ یہ سب کے بیان کرنے کا موقع نہیں۔ آپ کو بہت سے ایسے انشاء اللہ ملیں گے علماء فضلاء اور دین کے داعی وخدمت کرنیوالے کہ ان سے آپ اگر یہ پوچھیں کہ آپ کی یہ حالت کیسے ہوئی آپ اس درجہ تک کیسے پہنچے، آپ کی یہ سیرت کیسے بنی تو ان میں سے بہت سے کہیں گے کہ ہماری ماں نے ہماری ایسی ہی تربیت کی تھی، اور مید ہے کہ مجمع میں بھی ایسے لوگ بیٹھے ہوں گے جو اپنی ماں کے ممنون واحسان مند ہوں گے۔ اور ہم شہادت دے سکتے ہیں کہ ہمیں ہماری ماں نے جھوٹ بولنے سے روکا، ہماری ماں نے ہم کو حق تلف کرنے سے کسی پر زیادتی کرنے سے کسی پر ہاتھ بڑھانے سے روکا ہم اپنی ماں کو دیکھتے تھے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے اور ہمیں یاد ہے کہ ہم نے اپنی والدہ صاحبہ کو تہجد پڑھتے ہوئے دیکھا ہے معلوم ہوا کہ نماز تہجد نہیں چھوٹتی ہے اور ہم فخر یہ نہیں کہتے لیکن عرض کرتے ہیں کہ ہمارے بچپن میں ہمارے چھوٹے سے خاندان میں چار گھر رہے ہوں گے تکیہ پر یہ سوال کیا گیا کہ کیا عورتیں تراویح پڑھ سکتی ہیں اور کیا عورتوں کی تراویح با جماعت ہوسکتی ہے۔ تو علماء فرنگی محل نے یہ فتویٰ دیا کہ اگر عورت امام ہو اور عورتیں ہی مقتدی ہوں تو جماعت کرنے میں کوئی حرج نہیں، چنانچہ ہماری والدہ صاحبہ مرحومہ اور ہماری خالہ زاد بہن اور ہماری پھوپھی یہ سب قرآن مجید پڑھتی تھیں اور تراویح میں ایک قرآن ہمارے گھر میں ختم ہو جاتا۔

اس کے علاوہ عورتوں میں مصنفاف گزری ہیں اور ایسی بڑی بڑی بعض مصنفات ہیں کہ ان کی کتابیں عالمی کتب خانے کی زینت ہیں اور بعض تو اس میں مردوں سے بھی بازی لے گئی ہیں ان سب کا ذکر کرنا اور پھر ایسے مجمع میں مشکل ہے۔

اس ملک میں مسلمان بن کر رہنے کی آدھی ذمہ داری عورتوں پر ہے

ہم صاف کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا اس ملک میں مسلمان بن کر رہنا قرآن شریف پڑھنے کے قابل ہونا اردو کتابوں سے فائدہ اٹھانا، اسلامی شعائر واحکام سے واقف ہونا، اسلامی تہذیب اختیار کرنا، اور اس پر قائم رہنا اور توحید کے عقیدے پر مضبوطی سے جمنا اس میں آدھی سے زیادہ ذمہ داری ہماری بیبیوں اور عورتوں پر ہے۔

اللہ جزائے خیر دے ہماری دینی تعلیمی کونسل کو اور قاضی جلیل عباس صاحب مرحوم کو اور ہمارے ڈاکٹر اشتیاق صاحب کو ان کی عمر میں صحت میں ترقی ہے کہ انہوں نے یہ بات گھر گھر پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ اس وقت کچھ کوشش کرلی جائے کہ یہ ہمارے بچے قرآن مجید پڑھنے کے قابل بن جائیں قرآن مجید تو عربی میں لکھا ہے اس کو پڑھ سکیں اور اردو پڑھ سکیں۔ دینیات کی کتابوں سے فائدہ اٹھائیں اور شرک وتوحید کا فرق سمجھیں، سنت و بدعت کا فرق سمجھیں اور گناہوں کو سمجھیں کہ کون کون سی چیزیں گناہ ہیں۔

ہماری پڑھی لکھی بہنوں کی ذمہ داری

اگر یہ نہ ہوا اور اس میں ہماری خواتین اور ہمارے گھر میں پڑھی لکھی دیندار بیبیوں نے اس طرف توجہ نہ کی اور نہ ہی دلچسپی لی تو میں آپ سے صاف کہتا ہوں اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں کہ اس ملک میں مسلمان کا مسلمان رہنا مشکل ہوگا، بلکہ یہ ملک اسپین بن جائے گا اور آج بتاتا ہوں آپ کو یہ نقشہ اور منصوبہ تیار ہے کہ اس ملک کو اسپین بنادیا جائے۔ اور اسپین کیا ہے بہت سی بڑی بڑی بیبیاں نہیں جانتی ہوں گی کہ اسپین یورپ کا ایک ایسا ٹکڑا تھا جو کہ خالصۃ مسلمان ملک تھا وہاں بڑی اسلامی شان وشوکت کی سلطنتیں قائم ہوئیں اور وہاں بڑے بڑے اولیاء اللہ پیدا ہوئے، شیخ اکبر کہ جن کا نام ہر شخص کی زبان پر ہے یہیں کے رہنے والے تھے مالکی مذہب کا ایک مسئلہ ہے کہ اگر یہ معلوم ہوجائے کہ مدینہ میں ایسا ہوا کرتا تھا تو اب کسی دلیل کی ضرورت نہیں، ان کا عمل حجت اور دلیل ہے۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک زمانہ ایسا تھا کہ مالکیوں میں یہ اصول بھی تھا کہ اہل قرطبہ کا عمل حجت ہے، اہل قرطبہ ایسا کرتے ہیں اس کی اہمیت ایسی ہے کہ قرطبہ کے متعلق یہ کہہ دینا کافی تھا کہ وہاں ایسا ہوتا ہے وہ اسپین جہاں اولیاء اللہ پیدا ہوئے چوٹی کے علماء مؤطا اور بڑے

بڑے مجاہدین پیدا ہوئے پیدا ہوئے کے شارمین اور پورے اسپین پر اسلامی حکومت تھی او رجامع قرطبہ اور جامع اشبیلیہ اور جامع غرناطہ کیسی کیسی مسجد ہیں جن کی مثال ملنی مشکل ہے۔

اس ملک کو وہاں کے غیر مسلم باشندوں نے منصوبہ بنا کر اور اسمیں کچھ ہمارے مسلمانوں کی بھی کوتاہی تھی کہ انہوں نے ان کو مانوس نہیں کیا تھا۔ اس طرح وہاں سے غیر مسلموں نے اسلام کو خارج کر دیا، جو بچے کھچے مسلمان تھے وہ غرناطہ سے مراکش پہنچ گئے اور آج پورا اسپین خالی ہے نہ کہیں سے اذان کی آواز آتی ہے اور نہ کہیں کوئی مدرسہ ہے۔

ویسے لوگوں نے کہا ہے کہ ہم نے فضا سے آوازیں سنی ہیں اذان کی ،قران کی یہ نہیں پتہ چلتا کہ کہاں سے آوازیں آرہی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ روحانی فضا سے آوازیں آرہی ہیں کہ کچھ اللہ کے مقبول بندوں نے قرآن پڑھا تھا۔ اللہ کے بندے جب ریکارڈ کر سکتے ہیں تو اللہ کیوں نہیں کر سکتا ہے تو اللہ نے اس کو ریکارڈ رکھا ہے، اور ان کی آوازیں سب سن رہے ہیں اور ہم آپ سے کہتے ہیں کہ آج ساری کوشش جو ہو رہی ہے یہ ندوۃ العلماء ہو یا جو بھی ہمارا خاص مدرسہ اور ادارہ ہو یا دارالعلوم دیوبند ہو، یا جامعہ ملیہ ہو یا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہو، اور بھی کوئی بڑا مدرسہ، کالج ہو یونیورسٹی ہو وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔

ہماری مستورات نے توجہ نہ کی تو ملک خطرہ میں ہے

مسلمان آئندہ مسلمان نسل کو مسلمان رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک ہمارے گھر کی مستورات، بیگمات، ہماری مائیں بہنیں اس کا ارادہ نہ کر لیں اور یہ طے نہ کر لیں کہ ہم اپنے بچوں کو دین سے واقف کرائیں گے۔ پرائمری اسکول جانا ضروری ہے جائیں لیکن ہم مغرب بعد انتظام کریں گے، کسی کو بلائیں گے یا صبح جانے سے پہلے کوئی انتظام کریں گے ان کو اردو پڑھائیے، ان کو اردو لکھنے کی مشق کرائیں ان کا کلمہ سن لیجئے یہ معلوم کر لیجئے کہ اتنی سورتیں ان کو یاد ہیں کہ نماز پڑھ سکیں، اگر اس کی طرف ہماری مستورات نے توجہ نہ کی تو یہ ملک خطرہ میں ہے بس اس جلسہ کا ہم بھی بڑا فائدہ سمجھتے ہیں اصل بات جو یہاں کہنے کی ہے اور میں اسے امانت کے طور پر چھوڑ کر جاتا ہوں وہ یہ ہے کہ اپنے بچوں کی خود فکر کیجئے اپنے ہی گھروں کے نہیں اپنے محلے اور بہنوں، سہیلیوں اور رشتہ دار بیویوں کو بھی توجہ دلائیے کہ دیکھو بی بی، دیکھو

بہن اپنے بچے کو جہاں چاہے بھیجو لیکن اس کو اللہ کا نام سکھا دو، کہ اللہ ایک ہے، وحدہ لا شریک ہے اور اللہ کے پیغمبر حضور آخری پیغمبر تھے، ورنہ آج تو ایسی ترکیبیں کی جارہی ہیں لوگوں نے بتایا کہ کہا جاتا ہے اگر تمہاری کوئی چیز گم ہو جائے یا کوئی کام ہو یا تکلیف ہو تو راستہ میں مندر آئے گا اس سے گزرتے ہوئے اس سے مانگ لینا اور یہاں تک سازشیں ہوتی ہیں کہ کوئی چیز چھپا دی جاتی ہے۔ ایک طالب علم نے ایک طالب علم کی کتاب یا کاپی کہاں ہے اس نے کہا رام کا نام لو، رام کا نام لو تو مل جائے گی۔ اس نے جو رام کا نام لیا تو اس نے چپکے سے نکال کر سامنے کر دیا اس طرح اس کے دل میں یہ عقیدہ ڈال دیا کہ رام کا نام لینے سے مسئلہ حل ہوتا ہے کام ہو جاتا ہے کھوئی چیز مل جاتی ہے یہ بڑی گہری اور بڑی وسیع سازش چل رہی ہے۔

ہندوستان کے اندر جو اولیاء اللہ کی سرزمین ہے، یہ مجاہدین کی سرزمین ہے مجددین کی سرزمین ہے، جہاں پر مجدد الف ثانی پیدا ہوئے یا خواجہ معین الدین چشتی آئے، یا شاہ ولی اللہ صاحب جیسا امام وقت آیا اور یہاں مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد علی صاحب مونگیری اور کیسے کیسے عالم، کیسے کیسے فاضل پیدا ہوئے اس ملک کے بارے میں یہ نقشہ بنایا جارہا ہے، نقشہ بنا ہوا موجود ہے نام تھوڑے دن مسلمان رہے باقی کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہئے آئندہ نسل جو ہو اسے بالکل اسلام سے ناواقف کر دیا جائے۔ بس یہ پیغام لے کر جائیے کہ اپنے گھروں میں پہلے اور پھر محلے میں اور پھر برادری میں کہیں اگر شادی بیاہ پر جانا ہو تو وہاں کہیں تقریب ہو تو وہاں جا کر کہیے، وہاں بھی توجہ دلائیے گا۔

بہنوں سن لو!

بہنو! بیویوں سن لو! اپنے بچوں کو مسلمان بناؤ مسلمان رکھو، اور اردو پڑھنا سکھاؤ قرآن مجید پڑھنے کے قابل بناؤ توحید ان کے دل میں بٹھاؤ شرک و بدعت سے، بت پرستی سے ان سب چیزوں سے روکو، اللہ ہمیں آپ کو توفیق دے اگر یہ کام ہو گیا تو اس میں بہت کچھ ضمانت ہے اسلام کے بقا اور تحفظ کی ورنہ محض خارجی اور تنظیمی کوششیں اور محض اخبارات و رسائل اور محض کانفرنسیں یہ منعقد ہوں لیکن کافی نہیں ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ترے ضمیر پر جب تک نہ ہو نزول کتاب

۳۰ ستمبر ۱۹۹۸ء کو بڑی مسجد مدراس میں قاری محمد قاسم صاحب نے کئی سال سے جاری تفسیر القرآن کا سلسلہ تکمیل کو پہنچا اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ نے دوسرے دور کا آغاز فرمایا۔ اس مبارک و مسعود موقع پر حضرت مولانا رحمہ اللہ نے بڑی اہم اور چشم کشا تقریر فرمائی۔

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد المرسلين و خاتم النبيين محمد واله وصحبه اجمعين و دعا بدعوتهم الى يوم الدين اما بعد فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم

بسم الله الرحمن الرحيم

لقد انزلنا اليكم كتاباً فيه ذكركم افلا تعقلون۔

ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا ذکر ہے کیا تم نہیں سمجھتے؟

میرے دینی وایمانی بھائیو! میں سب سے پہلے تو آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مقدر فرمایا میسر بھی فرمایا اور مقبول بھی فرمایا اور اس کے آثار ظاہر ہیں کہ آپ کے اس شہر مدراس میں قرآن مجید کا درس ہوا۔ اور آپ کے سامنے پورا قرآن مجید اس کے معانی وتشریح کے ساتھ پیش کیا گیا۔

آپ کو اندازہ نہیں کہ اس سے اس شہر پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی کیا رحمتیں نازل ہوئیں میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس شرف اس سعادت اور اس توفیق کی بنا پر معلوم نہیں کہ اس شہر سے کتنی بلائیں ٹلی ہوں گی اور کتنی نعمتیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے نازل فرمائی ہوں گی جن کا کوئی احساس نہیں کر سکتا، احساس تو بڑی چیز ہے ادراک بھی نہیں کر سکتا۔

میں سب سے پہلے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ موقع میسر فرمایا اور اس کی توفیق دی اور اللہ کے ایک مخلص بندے کی زبان سے ایک صحیح العقیدہ، صحیح الفہم، صحیح النسبت اور قرآن مجید پر نظر رکھنے والے ایک حافظ قرآن اور عالم وقاری کی زبان سے آپ نے قرآن مجید کی تفسیر سنی اس پر آپ کو شکر ادا کرنا چاہئے۔

میں سب سے پہلے آپ کو یہ مشورہ دوں گا اور آپ سے یہ عرض کروں گا کہ آپ چاہے اپنے دل اور چاہے اپنی زبان سے اور چاہے دل وزبان دونوں سے اس کا شکریہ ادا کریں اور اس وقت بھی اس کا ذرا ذہن میں تازہ کریں اور اس وقت بھی اپنے دل سے اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکریہ ادا کریں اے اللہ تیرا فضل ہے ہم اس قابل نہ تھے۔ ''**وما کنا لنهتدی لو لا ان هدانا الله**''، اگر اللہ ہم کو ہدایت نہ دیتا تو کوئی ہدایت دینے والا نہ تھا۔

تیری آسمانی کتاب، تمام صحف آسمانی میں سب سے معزز، سب سے محترم سب سے مشرَف، بلکہ مشرِف شرف بخشنے والی کتاب اور ہم ناچیز بندے تیرے گنہگار بندے ہم دنیادار انسان ہمارے شہر میں اس کو سنایا جائے اس کی تشریح کی جائے اس سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہوسکتی ہے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بڑے سے بڑا اعزاز اگر مدراس کو ملتا ہے تو اس سے بڑا اعزاز نہیں تھا کہ قرآن مجید سارا کا سارا آپ کے سامنے پڑھا گیا اور اس کی تشریح کی گئی۔

اب میں آپ کے سامنے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کا حق اور اپنا فرض سمجھتے ہوئے آپ کو ایک خاص نکتہ اور ایک حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہوں، یہ قرآن مجید اپنے معانی، آسمانی مطالب، آسمانی مضامین، اور مقدس مضامین کے ساتھ ہمارے لئے ایک آئینہ بھی ہے کہ ہم کو اس آئینہ میں اپنی صورت دیکھنی چاہئے کہ ہم کیسے نظر آتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے'' **لقد انزلنا اليكم كتاباً فيه ذكركم** ''۔ ہم نے تمہاری طرف کتاب نازل کی جس میں تمہارا تذکرہ ہے یہ بڑی بات ہے سوچنے کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ایسی کتاب نازل کی کہ جس میں تمہارا تذکرہ ہے تو ہم کو اپنا تذکرہ تلاش کرنا چاہئے ہم اس میں کس صف میں ہیں کس گروہ میں ہیں کس مرتبہ میں ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی کیا جزا دے گا، ہم نے اس کی کتنی قدر کی ہے ہمیں اپنی صورت، اپنا چہرہ، اس میں تلاش کرنا چاہئے ہمارا جو کردار ہے، ہمارا زندگی میں جو طرز عمل ہے اس کو اس کتاب کے نقطۂ نظر سے، اس کتاب کے آئینہ سے اس کتاب کے چشمہ سے دیکھنا چاہئے اور معلوم کرنا چاہئے۔

میں آپ کے سامنے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں ایک بہت بڑے تابعی تھے جن کا نام

حضرت انس بن قیس تھا تابعی کا مطلب ہوتا ہے کہ جنھوں نے ایمان کی حالت میں صحابہ کرامؓ کا زمانہ پایا اور صحابہ کرامؓ کو دیکھا ان کو تابعی کہتے ہیں صحابیت کے بعد سب سے بڑا شرف تابعیت کا ہے، تو حضرت انس بن قیس تابعی تھے، اور اپنے قبیلہ کے بڑے سردار تھے ۷۳ھ میں ان کی وفات ہوئی وہ ایک دن بیٹھے تھے کہ کسی نے یہ آیت پڑھی لقد انزلنا الیکم کتابا فیہ ذکرکم افلا تعقلون، ہم نے تمہاری طرف کتاب نازل فرمائی جس میں تمہارا ذکر ہے کیا تم غور نہیں کرتے، کہنے لگے ارے ہمارا تذکرہ، ہمارا تذکرہ **عَلَیَّ بِالْمُصْحَفِ علیّ بالمُصْحَفِ** قرآن شریف لاؤ۔ قرآن شریف لاؤ، میں دیکھوں گا کہ میرا تذکرہ کن الفاظ میں ہے اور مجھے کون سی جگہ دی گئی ہے کس گروہ میں مجھے جگہ دی گئی ہے اور مجھے کس نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اب قرآن شریف ان کے سامنے پیش کیا گیا وہ اہل زبان تھے عربی اللسان تھے تابعی تھے، عالم تھے انہوں نے ورک الٹنا شروع کر دیئے دیکھنا شروع کیا تو کہیں ایسی تعریف تھی نمونہ کے طور پر میں پیش کرتا ہوں۔

قد افلح المومنون الذین ھم فی صلاتھم خشعون، والذین ھم عن اللغو معرضون، والذین ھم لذکوۃ فعلون، والذین ھم کفروجھم حفظون الی علی ازوجھم او ماملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین.

وہ مومن کامیاب ہوئے جن کی نماز میں خشوع وخشیت طاری ہوگئی۔ جو لغویت سے اور ہر لغو کام سے اعراض کرتے ہیں اور جو زکوۃ دیتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

انہوں نے یہ پڑھا اور کہا۔

انی الااجد نفسی فی ھولاء ۔ میں اس درجہ میں اپنے کو نہیں پاتا میں اس میں نظر نہیں آتا پھر دیکھا۔

وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ھوناً واذا خاطبھم الجھلون قالو سلماً، الذین یبتیون لربھم سجداً وقیاما والذین یقولون ربنا اصرف عنا عذاب جھنم ان عذابھا کان غراماً، انھا سآءت مستقراً ومقاما۔

اللہ کے وہ بندے جو زمین پر ہلکے ہلکے چلتے ہیں، دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب جاہل ان

کے منہ نکلتے ہیں تو کہتے کہ جی معاف کرنا ہمارا سلام قبول ہو، اور جو اپنی راتیں اس طرح گزارتے ہیں کبھی کھڑے ہیں اور کبھی بیٹھے ہیں ساری ساری رات اس طرح گزر جاتی ہے۔

اسی طرح کی مومنین کی صفتیں انہوں نے دیکھیں اور انہوں نے کہا کہ میں اپنے کو اس میں نہیں پاتا یہ تو بڑا اونچا گروہ ہے پھر قرآن مجید کھولا کچھ بہت بڑے بڑے اولیاء اللہ کی اللہ تعالیٰ نے جو صفتیں بیان کی ہیں، صحابہ رسول کی جو صفتیں بیان کی ہیں مومنین اطہار کی جو صفتیں بیان کی ہیں اولیاء اللہ کی شان بیان کی ہیں تو وہ ایک سچے باضمیر انسان تھے وہ دھوکہ نہیں کھاتے تھے، صاف کہہ دیتے تھے کہ میں اپنے کو اس گروہ میں نہیں پاتا۔ یہ تو بہت اونچا گروہ ہے اب ایسی آیتیں اگر وقت ہوتا اور موقع ہوتا تو ایسے دس نمونے آپ کے سامنے پیش کئے جاتے کہ جہاں مسلمانوں کی، اہل ایمان کی، صحابہ رسول کی، مجاہدین اسلام کی، عباد و زہاد کی بڑی تعریف کی گئی ہے لیکن وہ اپنے آپ کو پہچانتے تھے اور اپنے کو پہچاننے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کو بھی پہچانتے تھے جو خدا کو پہچانے پھر اپنے کو پہچانے وہی صحیح انصاف کی بات کرسکتا ہے، وہ تو یہ کہتے تھے کہ میں اس قابل نہیں ہوں میں تو اس میں نظر نہیں آتا۔

یہاں تک کہ جب ان کے سامنے یہ آیت آئی۔

واخرون اعترفوا بذنوبهم خلطوا عملا صالحاً و اخرسيئا عسى الله ان يتوب عليهم و ان الله غفور رحيم ۔

اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کرلیا انہوں نے کچھ اچھے کام کئے اور برے کام بھی ان سے ہوگئے ملے جلے کام ہیں، حسنات بھی ہیں سیات بھی ہیں عبادات بھی ہیں اور کہیں تھوڑی لغزشیں بھی ہیں ایک گروہ ایسا بھی ہے وہ ہمیشہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا کوئی عجب کی بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرے بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

تو انہوں نے کہا کہ ہاں یہاں میرا تذکرہ ہے اور یہ میرا گروہ ہے یہاں ہماری تعریف کی گئی ہے "خلطو عملا صالحا و اخرسيئا" ہم ایمان لائے، ہم نمازیں پڑھتے ہیں، ہم روزے رکھتے ہیں، ہم زکوٰۃ بھی الحمدللہ دیتے ہیں جس کی توفیق ہوتی ہے حج بھی ہم نے کئی بار کئے ہیں لیکن کبھی کبھی ہماری زبان سے ایسی بات نکل جاتی ہے جو نہیں نکلنی چاہئے تھی، نظر ایسی

جگہ اٹھ جاتی ہے جہاں نہیں اٹھنی چاہئے تھی، کبھی کبھی غفلت ہوجاتی ہے کبھی کبھی سوجاتے ہیں اور تہجد میں ناغہ ہوجاتا ہے۔ تہجد قضا ہوجاتی ہے کبھی کسی وقت بات کرنے میں ہم کو غصہ آجاتا ہے۔ اور کسی کا حق ہے ابھی تک ہم اس کو ادا نہیں کرسکے، اور جیسی اللہ کے راستہ میں جدوجہد کرنی چاہئے اپنا سر کٹا دینا چاہئے اللہ کے راستے میں اپنا خون بہا دینا چاہئے جہاد فی سبیل اللہ میں وہ ابھی تک توفیق نہیں ہوئی۔

وہ اپنے خدا کو بھی پہچاننے والے تھے عارف باللہ بھی تھے اور اپنے آپ کو پہچاننے والے تھے عارف بالنفس بھی تھے، انہوں نے اپنا مقام پالیا اور اس جگہ کو دیکھ لیا جہاں وہ خود اپنے آپ کو نظر آتے تھے "واخرون اعترفو بذنوبھم" کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کو اقرار کرلیا "خلطوا عملاً صالحاً" اب اگر آپ غور کریں اپنے حالات پر میں آپ کے متعلق نہیں کہتا اور صفائی کے ساتھ اس کی جرات بھی نہیں لیکن اپنے متعلق کہتا ہوں کہ میں اپنے کو تو یہی سمجھتا ہوں کہ" واخرون اعترفوا بذنوبھم "مجھے اپنے گناہوں کا اقرار ہے اپنی کوتاہیوں کا اقرار ہے،"خلطو عملاً صالحاً"، کچھ اچھے کام بھی کئے کچھ کوتاہیاں بھی مجھ سے ہوئی لغزشیں بھی ہوئی ہیں دونوں ملی جلی ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بزرگ مقبول بندوں سے ملایا قرآن مجید کا درس لیا مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمۃ اللہ علیہ جو امام وقت تھے امامِ تفسیر تھے پورا قرآن مجید ان سے پڑھا، اول سے آخر تک امتحان دیا اور پھر اللہ نے اپنے اس عہد کے مقبول ترین بندوں سے اور اولیاء اللہ سے ملایا جن کے نام لئے گئے میرے تعارف میں اگرچہ اس قابل نہیں تھا اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے حج کی بھی سعادت نصیب فرمائی اور یہاں تک کہ جو واقعہ بیان کیا گیا اور جس کو سن میں میں شرمندہ بھی ہوا لیکن یہ بہر حال یہ اللہ کی ایک نعمت بھی تھی کہ بیت اللہ شریف کا دروازہ میرے گنہگار ہاتھوں سے کھلوایا گیا، کہاں یہ بندۂ خاکی و خاطی اور گنہگار اور کہاں وہ اللہ کا گھر جس سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی چیز ہے ہی نہیں قسم کھا کر کہیے کہ روئے زمین پر بیت اللہ شریف سے اونچی جگہ، مشرف جگہ، مکرم جگہ، معزز جگہ، مقبول جگہ نہیں تو بالکل صحیح ہے۔

یہ گنہگار ہاتھ، یہ ہندوستانی، ہندوستان کی مٹی کا بنا ہوا یہ ہاتھ اور یہ بیت اللہ شریف کو کھولے اور پھر اتنے بڑے عالم اسلام کے چند برگزیدہ بندوں کی موجودگی میں محض اللہ کا فضل

ہے کہ اللہ کے کسی بندے کی دعا تھی، ہمارے آباواجداد سے کوئی عمل اللہ کو پسند آ گیا کہ اللہ نے یہ رتبہ نصیب کیا،تو ہم آپ خلطو عملاً صالحا واخر سیئا میں ہیں بس قرآن مجید کو اس نظر سے دیکھئے کہ آپ کا حلیہ اس میں ملے گا یہ کوئی مرقع نہیں ہے تصویر تو حرام ہے۔ اسلام میں، اس میں تصویریں کیا ہوں گی لیکن اس میں ایسی تصویریں ہیں جو تصویروں سے بڑھ کر ہیں یہ تصویریں جو فوٹو گرافی کی تصویریں ہوتی ہیں یہ کیا ہیں، یہ تو ایک دھوکہ ہیں اور یہ جسم جو خاک میں مل جانے والا ہے، یہ کب تک رہے گا اس کی کیا تصویر ہے، اور اس میں کون سا جمال ہے

لیکن وہ تصویر جو اللہ تعالیٰ کی کتاب میں آئے۔ جو حلیہ اللہ کی کتاب میں بیان کیا گیا ہو اس سے بڑھ کر نہ کوئی تصویر ہو سکتی ہے نہ کوئی تشکیل ہو سکتی ہے نہ کوئی انعام ہو سکتا ہے اور نہ کوئی تشخیص ہو سکتی ہے، تشخیص بھی اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔

بس میرے بھائیو! پہلے تو میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کا یقیناً شکریہ ادا کیجئے کہ اللہ تبارو تعالیٰ نے آپ کو یہ نعمت نصیب فرمائی کہ یہاں پر گیارہ سال بارہ سال کی جو مدت گزری ہے اس میں قرآن کا درس ہوا، اس کا ترجمہ ہوا اور حالات کو اس کی روشنی میں دیکھا گیا، اور اس کو آئینہ کی طرح سامنے لایا گیا، کہ دیکھ لو اپنی اپنی صورتیں، دیکھ لو اپنے اپنے چہرے کہ تم کون ہو، کیا ہو، کس گروہ میں ہو۔

اللہ تعالیٰ نے یہ موقع عطا فرمایا کہ آپ حضوری کے ساتھ اور صحیح نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا اس پر شکر ادا کریں۔ اور اللہ کے جس بندے سے اللہ نے یہ کام لیا اس کا شکریہ ادا کریں۔ شکر خدا کا لیکن شکریہ اس کا بھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے ذریعے آپ کو قرآن مجید سنوایا۔ اس کا ترجمہ سنوایا۔ یہ بات اس لئے نہیں کہ یہاں پر ماشاء اللہ اتنا بڑا مجمع ہے صرف یہ کافی نہیں بلکہ اس کے دل میں اس پر خوشی ہونی چاہئے اور شکر کا جذبہ ہونا چاہئے اور زبان پر بھی شکر آنا چاہئے کہ الحمد اللہ الحمد للہ۔ اللہ نے ہم کو اس قابل سمجھا کہ اس ملک میں جہاں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں۔ یہاں دین خطرہ میں پڑ گیا ہے آئندہ مسلمانوں کی نسل خطرہ میں پڑ گئی ہے کہ یہ مسلمان رہتی ہے یا نہیں۔

میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر آپ سے یہ بھی اپنی اس حاضری کی قیمت وصول کرنے کیلئے اور اس کا شکریہ ادا کرنے کیلئے کہہ دیتا ہوں میں آپ کے سامنے قرآن مجید کی ایک آیت

پڑھتا ہوں بڑے غور کی ہے۔

ام کنتم شهدآء اذحضر یعقوب الموت اذ قال لبنیه ماتعبدون من بعد، قالو نعبد الهک و اله ابآئک ابراهیم و اسماعیل و اسحق الهاواجد و نحن له مسلمون۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اے قرآن مجید کے پڑھنے والو سننے والواور اے ایمان والو کیا تم اس وقت موجود تھے جب حضرت یعقوب جو حضرت ابراہیم کے پوتے ہیں اور حضرت اسحاق کے بیٹے ہیں جب ان کا آخیر وقت آیا تو ایسے موقع پر جمع ہوتے ہیں گھر کے لوگ جمع ہوجاتے ہیں جب حضرت یعقوب کے انتقال کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے بیٹوں، پوتوں، نواسوں جو سامنے موجود تھا ان سے کہا، ماتعبدون من بعد" میرے بیٹو، میرے پوتو اور میرے نواسو مجھے یہ بتادو، یہ اطمینان دلادو قبل اس کے کہ میں دنیا سے رخصت ہوجاؤں ماتعبدون من بعد تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے اب کوئی شخص کہتا کہ ارے یہ پیغمبر زادے ہیں انبیاء کی اولاد ہیں ان کے بارے میں ذرا بھی شک نہیں کرنا چاہئے یہ تو پیغمبر زادے ہیں ان کی رگوں میں تو پیغمبروں کا خون ہے ابراہیم علیہ لاسلام کا خون ہے اسماعیل علیہ السلام کا خون ہے، اسحاق علیہ السلام کا خون ہے، یعقوب علیہ السلام کا خون ہے بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے اور ان صاحبزادوں کو بھی اور ان پیغمبر زادوں کو بھی کہنا چاہئے اور وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ دادا جان، نانا جان آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں آپ کو اس کے پوچھنے کی ضرورت کیا پیش آئی۔ آپ ہمارے بارے میں خطرہ میں ہیں آپ کو ہمارے بارے میں شک ہے آپ پوچھ رہے ہیں "**ماتعبدون من بعد**" "تم میرے بعد کس کی عبادت کروں گے،" **قالو نعبدو الهک واله ابآئک ابراهیم واسماعیل واسحق الها واحد**"۔

ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں گے اور ابراہیم کے معبود کی عبادت کریں گے ہم نے دیکھا کیا ہے ہم نے اپنے بزرگوں کو کس کے سامنے سر جھکاتے دیکھا ہے ہم نے کس کو اللہ کے سوا کسی سے ڈرتے دیکھا ہے اور کسی سے مانگتے دیکھا ہے کیا آپ کو ہمارے ایمان کے بارے میں شک ہے لیکن عشق است ہزار بدگمانی

آدمی کی جب کوئی چیز پسند ہوتی ہے اور وہ پیاری ہوتی ہے تو اس کے بارے میں شک

ہوتا ہے اطمینان چاہتا ہے۔

میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس موقع پر اور اپنی حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور یہ قرآن مجید ہی کا پیغام ہے میں قرآن مجید کی آیت کی روشنی میں کہہ رہا ہوں کہ آپ کو اپنی آئندہ نسل کی فکر ہونی چاہئے کہ آپ یہاں گیارہ بارہ برس قرآن مجید کا درس ہوا اور آپ میں سے بیسوں اور سینکڑوں آدمی آتے رہے، سنتے رہے کیا آئندہ بھی ایسا ہو سکے گا کیا ہماری اولاد میں قرآن کی یہ قدر ہوگی کیا ان کے اندر ایمان کی روشنی ہوگی کہ اگر قرآن مجید کا یہ ترجمہ وتفسیر اس میں یا کسی مسجد میں تو وہ اس کیلئے کام چھوڑ کر، تفریح چھوڑ کر، کھانا پینا چھوڑ کر آرام چھوڑ کر آئیں، اس کی آپ کو فکر ہونی چاہئے اور اس کا اہتمام ہونا چاہئے۔

اتنا کافی نہیں کہ آپ نے سن لیا۔ آپ کے زمانہ میں قرآن مجید کا درس دس بارہ برس تک برابر ہوتا رہا اس کی تفسیر بیان ہوتی رہی، آپ آتے رہے آپ کو آئندہ کی متعلق بھی اطمینان حاصل کرنا چاہئے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا اور اس کی شکل یہ ہے کہ کلمہ توحید اور اسکا مطلب اپنے بچوں کے دل میں اتاریئے زبان ہی پر نہیں دل و دماغ میں اتار دیجیے اور پھر اس کے بعد ان کی تعلیم کا انتظام کیجئے۔ اسلامی مکتب ہو، دینی مکتب ہوں دینی مدرسے ہوں دینی کتابیں ان کے سامنے آئیں اور وہ پڑھیں اردو جانتے ہوں پھر اردو میں دینیات کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ الحمد للہ کسی اسلامی زبان سے کم نہیں ہوں گے وہ سب کتابیں وہ پڑھ سکیں آپ اپنے ہاں ایسے کتب خانے اور دارالمطالعہ قائم کریں محلّہ محلّہ قائم کریں، مسجد مسجد قائم کریں اور ان بچوں کو اس کا شوق دلائیں بس میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کا استحضار ہو یعنی اس پر آپ شکر ادا کریں محض یہ کافی نہیں کہ آج کچھ لوگ باہر سے آگئے ہیں اور جلسہ میں ان کی تقریریں سنیں گے آج قرآن مجید ختم ہوا ہے اس کی تقریب ہے نہیں بلکہ اس پر اللہ کا شکر ادا کریں یہاں سے جانے کے بعد بھی کہ اللہ تو نے توفیق دی ہمیں اتنا زندہ رکھا اور ہمیں اس کا موقع دیا کہ ہم نے تیرا کلام عالی، تیرا کلام معجزہ سنا، ہمیں اس کی توفیق ہوئی اور پھر اس کے بعد اپنی آئندہ نسل کی بھی فکر کیجئے کہ یہ سلسلہ جاری رہے اور ان کو بھی توفیق ہو اور ان کو بھی اس کا ذوق ہو یہ نہیں کہ وہ جو جدید سیکولر تعلیم جو ایجوکیشن ہے یہ غیر دینی جو تعلیم دی جا رہی ہے پرائمری اسکولوں میں اور پھر اس کے بعد اسکولوں میں اور کالجوں میں اور پھر وہ جو لٹریچر شائع ہوتا ہے اور سارے کا سارا بھرا

ہوا ہے یا تو اسلام پر حملوں سے یا اگر حملوں سے نہیں تو اسلام کو نظر انداز کرنے سے اس کی تحقیر کرنے سے اس سے استغنا برتنے سے، کہ کوئی ضرورت نہیں، یہ زمانہ نہیں ہے اسلام کا، وہ تو بہت پرانے زمانہ یعنی چھٹی صدی مسیحی میں آیا تھا تو اس کی آپ کو اپنے بارے میں فکر رکھنی چاہئے۔

آپ کو فرائض کی پابندی، حلال وحرام میں فرق اور قرآن مجید میں جن چیزوں کی فرضیت بیان کی گئی ہے ان کی پابندی اور جن چیزوں سے روکا گیا ہے خاص طور شرک اور شرک کی جو تمام شکلیں ہو سکتی ہیں مظاہر ہو سکتے ہیں جیسے غیر اللہ سے مانگنا، غیر اللہ سے اتنا ڈرنا جتنا کوئی خدا سے ڈرے، اور غیر اللہ کی ایسی تعظیم کرنا جو اللہ کے لائق ہے اللہ کیلئے ہونی چاہئے اور ان کو اپنا رازق سمجھنا اور ان کو اپنا مشکل کشا سمجھنا اللہ کے سوا کسی سے یہ جائز نہیں اور اس کی بالکل اجازت نہیں اور اس کا کوئی جواز نہیں۔

ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہمارے عقائد بھی درست ہوں، اعمال بھی درست ہوں اور یہ سلسلہ قرآن مجید کے سننے کا، ترجمہ سننے کا، درس میں شریک ہونے کا، اس کی قدر کرنے کا اور اس کی اہمیت کو سمجھنے کا اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرنے کا، اس پر فخر کرنے کا، یہ میں اور آپ کے بعد کی آئندہ نسلوں میں بھی جاری رہے، اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکرانہ اس اللہ کی نعت کے لائق عمل بس یہ ہے۔ یہ نہیں بس شریک ہوئے اور اسکے بعد زندگی آزاد گزر رہی ہے وہاں درس میں سنا تھا کچھ کر رہے ہیں کچھ وہاں کچھ عقائد بتائے گئے تھے اور کچھ اعمال واخلاق سکھائے گئے یہ نہیں بلکہ ہماری زندگیوں کو قرآن مجید کے سانچہ میں کم از کم اسلام کے سانچہ میں ڈھل جانا چاہئے۔ ہمیں بالکل نیا انسان بن کر نکلنا چاہئے، جس کے عقائد بھی درست ہوں، جس کا اخلاق بھی درست ہوں، جس کی معاشرت بھی درست ہو، اور جس کا حال بھی درست ہو، اللہ سے ڈرنے والا، آخرت پر یقین رکھنے والا، ثواب کا حریص اور گناہ سے خائف اور اس سے لرزاں اور ترساں اگر ہو چکا ہے تو اس سے توبہ کریں اور اگر نہیں ہوتو اس سے خائف نہیں یہ سب قرآن مجید کے درس کی قیمت ہے اگر کہنا صحیح ہو، درس کا احسان ہے، درس کا شکرانہ ہے یہ سب چیزیں آپ میں پیدا ہونی چاہئے آپ کی زندگی کا سانچہ بدل جانا چاہئے آپ کا کیریکٹر بدل جانا چاہئے آپ کے عقائد قرآن کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہونا چاہئے۔

میں باوجود اپنی بیماری اور اپنی کمزوری کے قرآن مجید کی عظمت کی وجہ سے اس کی نسبت کی وجہ سے اور پھر جناب قاری محمد قاسم صاحب اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے ان سے جو تعلق ہے کہ ہمارے استاذوں کے خاندان سے انہوں نے استفادہ کیا ہے اور وہ بھوپال کے اسی محلّہ کے رہنے والے ہیں جس محلّہ کے استادوں سے ہم نے عربی سیکھی، اور جن سے پڑھ کر ہم اس قابل ہوئے کہ ہم عربی پڑھ سکیں بول سکیں، اور عربوں سے خطاب کر سکیں، تو ان دونوں چیزوں کا خیال کر کے میں حاضر ہو گیا ورنہ حقیقت میں میں اس قابل نہیں تھا کہ لمبا سفر کروں اور کہیں دیر تک بیٹھوں اور زیادہ مجاہدہ کروں اس لئے آپ سے اجازت چاہتا ہوں، معذرت کرتا ہوں اور آپ کو پھر مبارکباد دیتا ہوں اور پھر اس کی بھی دعوت دیتا ہوں کہ یہ سلسلہ برابر جاری رہے آپ کی زندگی بھر جاری رہے اور آئندہ بھی جاری رہے اور اپنی نسل کو بھی اس کیلئے تیار کریں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

نصرت الٰہی کی شرائط

یہ تقریر انجمن نصرۃ الاسلام ہال میں ۴ نومبر ۱۹۸۱ بروز چہارشنبہ ۴ بجے سہ پہر کو کی گئی جہاں مقرر کے اعزاز اور وداع کی تقریب میں ایک عظیم جلسہ ہوا جس میں سری نگر اور اطراف کے علماء و اہل علم و فکر خاصی تعداد میں شریک تھے۔

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیا والمرسلین و علی آلہ صحبہ اجمعین۔

جناب صدر انجمن و صدر اجلاس علمائے کرام، معززین شہر اور برادران عزیز آج ایک ہفتہ کے قیام سری نگر کا اختتام اس جلسہ پر ہو رہا ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض اتفاق نہیں ہے، حسن اتفاق ہے میں دنیا کے بیشتر مشہور ممالک میں جا چکا ہوں، لیکن ایسا بدقسمت مسافر ہوں جس پر اقبال کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے۔

تسکین مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں

تاریخی مطالعہ

میں اسلامی ممالک میں جہاں جہاں گیا وہاں سے بجائے مسرتیں لے کر اور مطمئن ہو کر آنے کے، فکر لے کر آیا میرے نصیب میں یہی ہے معلوم نہیں یہ میری بڑھی ہوئی ذکاوت حس کی بناء پر ہے یا اس لئے کہ جہاں جاتا ہوں وہاں اپنا تاریخی مطالعہ فراموش نہیں کر پاتا جو واقعات تاریخ اسلام میں پیش آئے وہ میرے آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں اور ان سے جو نتائج نکالے جا سکتے ہیں میرا دماغ ان سے آزاد نہیں ہونے پاتا، خود قرآن مجید نے اس کی مذمت کی ہے کہ آدمی آنکھوں سے سب کچھ دیکھے لیکن کسی چیز سے سبق نہ لے۔

وکاین من ایتہ فی السموات والارض یمرون علیھا وھم عنھا معروضون۔

کتنی نشانیاں زمین و آسمان میں ایسی ہیں جس پر لوگ منہ پھیر کر چلے جاتے ہیں اور کچھ

سبق نہیں لیتے۔

حقیقت قرآن

میں اپنے کو بہت خوش نصیب سمجھتا اگر آپ کو پیام تہنیت دے جاتا، اور آپ کے اطمینان وسکون میں کچھ اضافہ کرتا، خدا نے جو آپ کو حسین سرزمین عطا فرمائی ہے جن نعمتوں کی بارش کی ہے جو قدرتی مناظر آپ کو یہاں عطا کیے ہیں بڑی خوشی کی بات ہوتی اگر میں آپ سے کہتا کہ آپ کو یہ مبارک ہو آپ مطمئن رہیں کوئی فکر کی بات نہیں۔

لیکن ایسا نہیں ہے اور اس کا سبب میرا قرآن مجید کا ٹوٹا پھوٹا مطالعہ ہے میں نے قرآن مجید کو اس نظر سے پڑھا کہ وہ ایک زندہ کتاب اور ایک بولتا ہوا مرقع یا آئینہ ہے جس میں افراد بھی اپنے اپنے چہرے دیکھ سکتے ہیں قومیں بھی اپنی صورتیں دیکھ سکتی ہیں اور قوموں، سلطنتوں، تمدنوں کی ترقیات وعروج کے انجام بھی اس کتاب میں دیکھے جاسکتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لقد انزلنا الیکم کتاب فیه ذکرکم افلا تعلقون۔

ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی جس میں تمہارا تزکرہ ہے تم اس پر غور نہیں کرتے۔

''ذکرکم'' کے معنی اور بھی مفسرین نے کیے ہیں، شرفکم عزکم لیکن اس کے متبادل معنی یہی ہیں کہ اسمیں تمہارا تذکرہ ہے۔ فیه حدیثکم۔ تو قرآن مجید میں عمل اور جزائے عمل کا بیان، اور اللہ تعالیٰ کا قانون مکافات پورا پورا موجود ہے، اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے۔

لیس بامانیکم ولا امانی اهل الکتٰب من یعمل سوءً الیجزب۔

نہ تمہاری امیدوں پر مداوا ہے اور نہ اہل کتاب کی امیدوں پر جو کوئی برا کام کرے گا اس کی سزا پائے گا۔

خدائی قانون بے لاگ ہے

مسلمانو! نہ تم پر کچھ منحصر ہے اور نہ اہل کتاب پر (جن کو بڑے بڑے دعوے ہیں ہمارا قانون بے لاگ ہے قانون الٰہی یہ ہے کہ ''من یعمل سوء ا یجزبه' 'جو کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ ملے گا، کمزوری کا، کوتاہی کا، غفلت کا، غداری اور بے وفائی کا انتشار کا، اختلاف

کا، بے عملی کا، دولت پرستی کا، اقتدار پرستی کا، سب کا خدا کے یہاں ایک نتیجہ ایک جزا ہے جس میں کوئی استثنا، اور رعایت جانبداری نہیں یہ مضمون قرآن مجید میں کہیں صراحتاً اور کہیں کنایتہً بیان کیا گیا ہے اس میں قوموں کی سلطنتوں کے بڑے بڑے جباروں کے تذکرے بھی ہیں اور کمزوروں کا ذکر بھی ہے اس میں یہ آیت بھی موجود ہے۔

واورثنا القوم الذين كانو يستضعفون مشارق الارض ومغاربها التى بركنا فيها ؕوتمت كلمت ربك الحسنىٰ على بنى اسرائيل بما صبرو دهرنا ماكان يصنع فرعون و قومه وما كانو يعرشون.

اور جو لوگ کمزور سمجھے جاتے تھے ان کو زمین (شام) کے مشرق و مغرب کا جس میں ہم نے برکت دی تھی وارث کر دیا، اور بنی اسرائیل کے بارے میں ان کے صبر کی وجہ سے تمہارے پروردگار کا وعدہ نیک پورا ہوا اور فرعون اور قوم فرعون جو (محل) بناتے اور (انگور کے باغ) جو چھتریوں پر چڑھاتے تھے سب کو ہم نے تباہ کر دیا۔

اور اس طریقہ سے دوسری جگہ فرمایا گیا ہے۔

ونريد ان نمن على الذين استضعفوا فى الارض ونجعلهم ائمته و نجعلهم والوٰرثين، و نمكن لهم فى الرض و نرى فرعون وهامن و جنودهما منهم ما كانو يحذرون۔

اور ہم چاہتے تھے کہ ان پر احسان کریں جو ملک میں کمزور کئے گئے تھے اور انہیں سردار بنا دیں، اور انہیں وارث کریں، اور انہیں ملک پر قابض کریں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ چیز دکھا دیں جس کا ان کو خطرہ تھا۔

قرآن دستورِ حیات ہے

اس طرح قرآن مجید قوموں، تاریخی ادوار، اور مختلف مراحل حیات اور مختلف زندگیوں کے انواع واقسام کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے، مرقع اور چمکتا ہوا صاف شفاف آئینہ جس کا جی چاہے فرد ہو یا قوم، جماعت یا انجمن، خاندان ہو یا قبیلہ اس میں اپنی صورت دیکھ لے اور اپنی جگہ تلاش کر لے اور اپنی متعلق خود فیصلہ کرتے کہ ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا اللہ تعالیٰ

سے کسی کا رشتہ نہیں اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے۔

وقالت الیھود والنصریٰ نحن ابنٰٓؤُا اللہ واحباؤُہ قل فلم یعذبکم بذنوبکم بل انتم بشر ممن خلق۔

اور یہود ونصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اوراس کے پیارے ہیں کہہ دو پھر تمہاری گناہوں کے باعث تمہیں کیوں عذاب دیتا ہے بلکہ تم بھی اورمخلوقات کی طرح ایک آدمی ہو۔

للکار کے فرمایا کہ یہودی اورعیسائیوں نے کہا کہ ہمارا کوئی کیا بگاڑسکتا ہے ہم تو بالاتر ہیں ہم انسانیت کی سطح سے بالاتر ہے ہم خدا کے اولاد ہیں خدا کے چہیتے ہیں لاڈلے بیٹے ہیں تو اللہ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ پھر خدا کا قانون مجازات تم پر کس طرح جاری اور ساری ہے تمہاری رعایت کیوں نہیں کی جاتی تم بھی ایسے ہی ایک انسان ہو جیسے اورمخلوق۔

ہمارے اکابرین کی خدمات

میرے بھائیو، بزرگو، اور دوستو! میں آپ حضرات کے خلوص ومحبت آپ کے اکرام وعزاز سے سے بہت متاثر ہوں میں ناشکر گذار انسان نہیں بننا چاہتا لیکن میں اس کا تقاضا یہ نہیں سمجھتا کہ میں آپ کو مطمئن کروں اورآپ کی تعریف کر کے چلا جاؤں، جب کسی کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو وہ خطرے کی نشاندہی کرتا ہے وہ اس کے چہرے کو دیکھتا ہے اس کی نبض دیکھتا ہے ہروقت اس کا منہ دیکھتا رہتا ہے کہ خدانخواستہ کوئی تکلیف تو نہیں میں آپ سے عرض کرتا ہوں، کہ آپ بہت نازک دور سے گزرر ہے ہیں میں انجمن نصرۃ الاسلام کے پلیٹ فارم سے بہتر کوئی پلیٹ فارم نہیں سمجھتا کہ آپ کواس حقیقت کی طرف متوجہ کروں جو عین ''نصرت اسلام'' ہے اس کے انجمن کے بانی ہمارے دعاؤں مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک مرکز قائم کیا جہاں بیٹھ کر اور جس کے ذریعہ اسلام کی نصرت کرسکیں، لیکن اسلام کا کام بہت وسیع ہے اورآپ سے کوئی فرد، کوئی جماعت، کوئی مقتدرہستی، کوئی قابل احترام بزرگ اس سے سبکدوش اور فارغ البال نہیں ہو سکتے۔

تم ہر وقت ایک اہم نا کہ پر کھڑے ہو!

میرے بزرگواور دوستو! حضرت عمرو بن العاصؓ نے جب مصر فتح کیا جو اس وقت دنیا

میں تمدن کی چوٹی پر تھا اور سرسبزی و شادابی میں اس پورے علاقہ کا کشمیر تھا حضرت عمرو بن العاصؓ نے وہ خوبصورت ترقی یافتہ معدنی، حیوانی، انسانی زمینی دولتوں سے بھرپور سرزمین کو فتح کیا، ایک فاتح کی جو خوشی جو اطمینان ہونا چاہئے تھا وہ ان کو نہیں ہوا اس لئے کہ انہوں نے صحبت نبویؐ پائی تھی، قران مجید کے تدبیر اور صحبت نبویؐ کی برکت نے ان کی آنکھیں، بلکہ ان کا دل و دماغ روشن کر دیا تھا ان کو اللہ تعالیٰ نے فراست مومن عطا فرمائی تھی۔ اور فراست ایمان سے آگے ایک قدم فراست صحابیت عطا کی تھی۔ انہوں نے عرب مسلمانوں سے جو اس ملک کے فاتح اور حکمراں تھے ایک بات کہی جو آب زر میں لکھنے کے قابل ہے ''**انتم فی رباط دائم**'' دیکھو یاد رکھو تمہیں یہاں کی زمین، فضا کی دلکشی و رعنائی، یہاں کی دولتیں اور تمدن اپنے میں مشغول نہ کرنے پائے اور تم اس سرزمین میں کھو نہ جاؤ، تم اپنے کو پالو اور حقیقت کو پالو، وہ کیا ہے ''**انتم فی رباط دائم**'' تم ہر وقت ایک اہم ناکہ پر کھڑے ہو تم یہ نہ سمجھنا کہ تم نے قبطیوں کو شکست دی اور رومن ایمپائر کے بہترین علاقہ پر تمہارا قبضہ ہو گیا، جزیرۃ العرب بالکل قریب ہے اور یہاں تم نے پورے انتظامات کر لئے ہیں اس پر تم دھوکہ نہ کھانا ''**انتم فی رباط دائم**'' تم ایسی جگہ پر کھڑے ہو کہ آنکھ جھپکی اور مارے گئے تمہیں یہاں ہر وقت بیدار رہنا چاہئے ہر وقت چوکنا رہنا چاہئے تم ایک پیام کے علمبردار ہو تم ایک دعوت لے کر آئے ہو تم ایک سیرت لے کر آئے ہو، اگر دعوت سے تم نے غفلت کی تو تم مارے گئے اور اگر تم نے اپنی سیرت کھو دی جو تم عرب سے لے کر آئے تھے جو تم آغوش نبوت سے اور مرکز رسالت (مدینہ) سے لے کر آئے تھے تو تمہیں کوئی برتری حاصل نہیں ہوگی، اگر تم نے کبھی یہ سمجھا کہ تم کھانے کمانے کے لئے یہاں آئے ہو، تم یہاں کی سرزمین سے، یہاں کے حسن و جمال سے متمتع ہونے کے لئے آئے ہو تم یہاں کے عیش و عشرت میں پڑ گئے اور تم نے ذرا سی غفلت کی تو پھر تم پر کوئی رحم نہیں کھائے گا تم یہاں بچ نہیں سکتے۔

حضرت صدیق اکبر کا تاریخی جملہ

آج سے ساڑھے چودہ سو برس پہلے جو بات عرب کے ایک سپاہی نے کی جو کسی دانشگاہ کا تعلیم یافتہ نہیں تھا، کہی تھی آج وہی بات صادق ہے آج بڑے بڑے اسلامی

ملکوں میں یہ بات صادق ہے کہ'' انتم فی رباط دائم '' آپ کی ذمہ داری اور ہر فرد کی ذمہ داری ہے جس وقت جزیرۃ العرب میں ارتداد کی آگ پھیل گئی تو یہ سب کی ذمہ داری تھی لیکن ذمہ داری کے احساس میں فرق ہوتا ہے یہی فرق آدمی کو بڑا اور زندہ جاوید بناتا ہے ابوبکر صدیقؓ اس وقت خلیفہ وقت تھے انہوں نے کہا ''اینقص الدین و أنا حیٌّ '' کیا میرے جیتے جی دین میں کوئی کتر بیونت ہوسکتی ہے کوئی قطع و برید ہوسکتی ہے حیف ہے میری زندگی پر، اگر میرے سامنے شریعت اسلامی میں ترمیم ہونے لگے، اور اسکے فرائض واحکام میں انتخاب کیا جانے لگے کہ نماز تو ٹھیک ہے، حج بھی ٹھیک ہے روزہ بھی ٹھیک ہے لیکن زکوٰۃ نہیں یا زکوٰۃ بھی ٹھیک روزہ نہیں میں زندہ ہوں اور میرے سامنے یہ تحریف ہو؟ یہ ہو نہیں سکتا۔ بس یہ حمیت تھی جو اہل کر ان کی زبان پر آئی اور یہ لفظ ان کی زبان سے نکلے اور اس نے زمانہ کی کلائی موڑ دی، اور تاریخ کا دھارا بدل دیا، ایک انسان کی حمیت اسلامی، ایک انسان کی احساس ذمہ داری نے، تہ بہ تہ مشکلات کو کائی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا تاریخ لمبی ہے اور واقعۂ ارتداد اور اس کی تفصیلات تاریخ میں محفوظ ہیں، لیکن حقیقت میں جو فیصلہ کن بات تھی وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی یہ بات تھی ''یہ نہیں ہوسکتا کہ میں زندہ ہوں اور دین پر حرف آئے، میں نے جو دین رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پایا تھا وہ بے کم وکاست سو فیصدی رہے گا، ایک نقطہ کو بھی اپنی جگہ سے مٹنے نہیں دوں گا اور انہوں نے کر کے دکھایا۔

کل قیامت کے دن تم سے باز پرس ہوگی

حضرت! آپ علمائے کرام ہیں آپ زعمائے قوم ہیں آپ میں بڑے بڑے خطیب و مقرر ہیں آپ انجمنوں کے بانی اور اس کے ستون ہیں آپ کشمیر کا قلب ودماغ ہیں آپ کا فیصلہ اصل میں فیصلہ کن ہوگا پہلی بات یہ ہے کہ اس سرزمین کی اسلامیت باقی رہے، یہ آپ کے ذمہ واجب ہے کل حشر کا میدان ہوگا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہوں گے اور اللہ تبارک وتعالیٰ عدالت کی کرسی پر ہوگا، اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ ہوگا اور آپ کا گریبان یا دامن ہوگا، آپ سے سوال ہوگا کہ اللہ نے اس سرزمین کو دولت اسلام سے مشرف کیا اولیائے کرام کو وہاں بھیجا، وہ اپنے کو خطرہ میں ڈال کر اس وادی میں پہنچے انہوں نے خدا کا کلام اور

پیغام وہاں کے باشندوں کو پہنچایا پھر ہم نے اسلام کے پودہ کو تن آور، بارآ ور اور پرثمر درخت بنایا اور درخت سینکڑوں برس تک سرسبز شادات اور پرثمر و سایہ دار رہا، ہزاروں مسجدیں بنیں، سینکڑوں مدرسے خانقاہیں قائم ہوئیں۔ جلیل القدر علماء ومحدثین وفقہاء پیدا ئے ہوئے لیکن تمہاری ذرا سی غفلت وسستی، یا اختلاف وانتشار یا کوتاہ نظری وکم نگاہی سے السلام کا یہ باغ خزاں کی نذر ہوگیا۔

لمحوں نے خطا کی، صدیوں نے سزا پائی

میں اسپین گیا وہاں سے دل پر یہ چوٹ لے کر آیا کہ خدا جانے وہ کیا غلطی تھی جس کی وجہ سے مردم خیز سرزمین، اولیاء وائمہ کا مرکز اسلام سے محروم ہوگیا بقول اقبال آج اس کا یہ حال ہے۔

آہ کے صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ غلطی اور غلطی کی سزا میں تناسب ہونا ضروری نہیں بعض مرتبہ چھوٹی غلط ہوتی ہے لیکن سزا بہت بڑی ہوتی ہے جس کے کچھ اسباب ہوتے ہیں، بعض مرتبہ ایک چھوٹے سے فیصلہ میں غلطی ہوئی اس کا نتیجہ صدیوں پر پھیلا ہوا ہے دنیا کی بہت سی قوموں نے اور جماعتوں نے غلطی کی اور کسی خاص موقعہ پر کمزوری دکھائی، صدیوں اس کی سزا ملتی رہی، اسپین میں اسلام کے زوال کی تاریخ اور اس کے اسباب کا سراغ لگائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عرب قبائل کی رقابت واختلاف یعنی ربیعہ ومضرؔ عدنانی اور قحطانی، حجازی اور یمنیوں کا اختلاف اس کا بڑا سبب تھا جن لوگوں نے اسپین کے اسلام اور مسلمانوں کے زوال کا تجزیہ کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ اس میں بڑا ہاتھ اس کا تھا کہ عدنانی اور حجازی چاہتے تھے کہ اقتدار ان کے ہاتھ میں ہو اور قحطانی، یمنی چاہتے تھے کہ اقتدار ان کے ہاتھ میں ہو انہوں نے کبھی تبلیغ واشاعت اسلام کی طرف توجہ نہیں کی، وہ جنوب کی طرف سمٹتے چلے گئے (جہاں سے مسلم ملک مغرب اقصیٰ مراکش قریب تھا) شمال کی طرف بڑھنے کی انہوں نے کوشش نہیں کی انہوں نے تعمیرات اور تمدن میں اپنی صلاحیت اور ذہانت صرف کی، لیکن اسلام کے استحکام اور اسلام کو وہاں کی آبادی کے دلوں میں اتارنے کی کوشش نہیں کی، انہوں نے مدینۃ الزہراء آباد کیا انہوں الحمراہ کا قلعہ بنایا

انہوں نے مسجد قرطبہ تعمیر کی جو فن معماری (Arcitec Ture) کا دنیا میں منفرد نمونہ ہے لیکن ان کو چاہئے تھا کہ اس کے بجائے وہ اپنے گرد و پیش کی آبادی کو اسلام سے مانوس کرتے اسلام سے متعارف کراتے، بجائے پیچھے ہٹنے کے (یعنی جبل الطارق کی طرف آنے کے) ان کو آگے بڑھنا اور یورپ میں پیش قدمی کرنی چاہئے تھی لیکن وہ تہذیب وتمدن کی ترقی اور فنون لطیفہ کی سرپرستی اور تعمیرات میں لگ گئے، شعر و شاعری میں منہمک ہوگئے، کسی وقت غلطی بہت بڑے اور دوررس نتائج پیدا کرتی ہے، کبھی کسی قوم نے بہت بڑا ظلم کیا اور اگر آدمی کے ہاتھ میں ترازو دے دیا جائے تو کہے کہ تختہ الٹ جائے لیکن ایسا نہیں ہوا، مگر ایک بیوہ کی آہ، ایک یتیم کی کراہ انقلاب سلطنت کا باعث بنی۔

اسلام ہر قیمت پر باقی رہے

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں کی اسلامیت ہر قیمت پر باقی رہے، یہ آپ کا فریضہ ہے اور یہ آپ کے حق میں بہتر ہے عالم اسلام کے حق میں بہتر ہے، ہندوستان کے حق میں بھی بہتر ہے، ہندوستان کے حق کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آپ اپنی خصوصیات اور اکثریت کے ساتھ باقی رہیں ہندوستان میں جب ہی صحیح توازن قائم ہوگا، ملک اسی وقت عزت پائے گا۔ اس کو استحکام حاصل ہوگا جب یہاں پر آپ اپنی خصوصیت اپنے پیام، اپنی امن پسندی، انسان دوستی تعمیری ذہنیت اور دماغی صلاحیتوں کے ساتھ باقی رہیں جب کوئی مسئلہ سامنے آئے تو فیصلہ کن بات یہ ہونا چاہئے کہ اس کا اس خطہ کی اسلامیت پر کیا اثر پڑتا ہے۔

عقیدہ کی صحت

اس سلسلہ میں سب سے اہم بات جو مجھے نظر آتی ہے وہ ہے عقیدہ کی صحت، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ موحدانہ تعلق اور اس کے سوا کسی کے سامنے سر نہ جھکانے کا عزم اس میں اگر کمی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی نصرت میں کمی ہوتی ہے اور قرآن مجید میں صاف صاف اشارے ہیں کہ جس امت کی توحید میں فرق آیا اس کی طاقت میں فرق آ گیا، طاقت کا سب سے بڑا سرچشمہ اور منبع عقیدۂ توحید ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب بما اشرکو باللہ مالم ینزل بہ سلطناً وما وھم النار و بئس مثو الظلمین۔

اب ہم کافروں کے دلوں میں ہیبت ڈال دیں گے، اس لئے کہ انہوں نے اللہ کا شریک ٹھہرایا، جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری، اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ظالموں کا بہت برا ٹھکانا ہے۔

ان الذین اتخذ والعجل سینالھم غضب من ربھم و ذلتہ فی الحیوٰۃ الدنیا...... وکذلک نجزی المفرتین۔

بے شک جنہوں نے معبود بنایا، انہیں ان کے رب کی طرف سے غضب اور دنیا کی زندگی میں ذلت پہنچے گی۔ اور ہم بہتان باندھنے والوں کو یہی سزا دیتے ہیں۔

شرک ضعف کا سبب ہے

شرک ضعف کا سبب ہے ہمیشہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا، سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل‘‘ اللہ تعالیٰ نے اشیاء میں خاصیتیں پیدا کی ہیں زہر میں ایک خاصیت ہے تریاق میں ایک خاصیت ہے پانی میں ایک خاصیت ہے آگ میں ایک خاصیت ہے اور اسی طرح شرک میں کمزوری کی خاصیت ہے اور توحید میں طاقت اور بے خوفی اور بے رعبی کی خاصیت ہے اس لئے سب سے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ عقائد کی تصحیح ہو خدا کے ساتھ ابراہیمی محمدی قرآنی تعلیم کے مطابق توحید کا رشتہ استوار ہو، رشتہ کو پھر استحکام کی ضرورت ہے اس لئے کہ شیطان ہمیشہ تاک میں رہتا ہے اور وہ ہمیشہ چھاپا مارتا رہتا ہے اور چور وہیں جاتا ہے جہاں دولت ہوتی ہے آپ کے پاس توحید کی، ایمان کی دولت ہے اس لئے آپ کے لئے خطرہ ہے ان کے لئے خطرہ میں نہیں بتاتا جن کی پاس سرے سے یہ نعمت نہیں آپ کے پاس خدا کے فضل سے نعمت ہے آپ کے باہر سے ملی اندر سے ملی وہ نعمت اب زمین کا جز بن گئی اس ملک کا حصہ بن گئی ہے یہاں کی تاریخ کا حصہ بن گئی ہے یہاں کی زندگی کا حصہ بن گئی ہے لیکن اس سے مطمئن نہیں ہونا چاہئے۔

آپس کی چپقلش سے اجتناب کریں

دوسری جس بات سے ڈرتا ہوں وہ انتشار اور افراق ہے اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے خاصیت ضعف کی رکھی ہے۔

واطیعو اللہ ورسولہ ولا تنازعو فتفشلو وتذھب ریحکم واصبرو ان اللہ مع الصابرین۔

اور اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانو اور آپس میں نہ جھگڑو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے دیکھو آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کرو، منازعت ومخاصمت سے کام نہ لو، ورنہ کمزور پڑ جاؤ گے، تمہاری بندھی ہوئی ہوا اکھڑ جائے گی اداروں کی کثرت بے شک زندگی کی علامت ہے اور بقدر ضرورت اس کو ہونا چاہئے لیکن یہ ہر محلہ پر ایک ایک جھنڈا، ہر گھر پر ایک جھنڈا ہو ہر جگہ ایک انجمن ہو یہ صحیح نہیں ہے۔

دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے

تیسری بات یہ ہے کہ اکثر کمزوریوں اور اکثر غلطیوں کی جڑ میں جو بات ملتی ہے وہ دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی محبت دولت کی حد سے بڑھی ہوئی محبت ہے میں کوئی حکم نہیں لگاتا، کوئی شہادت نہیں دیتا لیکن یہ کہتا ہوں کہ دنیا کی محبت، پیسے کی محبت بھی بہت بڑی کمزوری کا سبب ہے جہاں سے دولت آئے جس طرح سے بھی دولت ہاتھ لگے، جس طرح سے عزت واقتدار میسر ہو، جس طرح سے ترقی منصب اور عہدہ ملے، بہرحال وہ مطلوب ہے اس کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئے اس سے مطلب نہیں کہ یہ اجتماعی مفاد کے خلاف ہے یا موافق، یہ بیماری کی ایک بڑی علامت ہے، اس سے بھی زیادہ ڈرنے کی ضرورت ہے۔

اسراف سے اجتناب

چوتھی چیز تمدن کی خرابیاں، اسراف، فضول خرچی اور روایات پرستی، اور اس میں غلوہ اسراف تکبر وتفاخر ہے جو کو قرآن نے ''ترف'' اور ''بطر'' کے لفظ سے یاد فرمایا ہے۔

وما ارسلنا فی قریته من نذیر الا قال مترفوها انا ابما ارسلتم به کفرون۔

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوشحال لوگوں نے کہا کہ جو چیز دے کر تم بھیجے گئے ہو ہم اس کے قائل نہیں۔

دوسری جگہ فرمایا کہ:

و کم اهلکنا منه قریه بطرت معیشتها فتلک مسکنهم لم تسکن من بعد هم الا قلیلا و کنا نحن الوارثین۔

اور ہم نے بہت سی بستیوں کو ہلاک کر ڈالا جو اپنی (فراخی) معیشت پر اترا رہی تھیں سو یہ ان کے مکانات ہیں جن کو ان کے بعد آباد ہونے کی بہت کم نوبت آئی اور ان کے پیچھے ہمیں ان کے (شہر و دریا) کے مالک رہے۔

تمدن کی فضولیات کو کم کیجئے، یہ نہیں کہ جس طریقہ سے شادیوں میں ہوتا آیا ہے، جس طریقہ سے شاہانہ تجمل اور رئیسانہ دولت کا اظہار ہوتا ہے، ویسا ہی ہو، اب اس کا وقت نہیں، ذرا آنکھیں کھولئے، اور دولت کو پہچانئے، اور غریب طبقہ کا خیال کیجئے، جن کو یہ وسائل حاصل نہیں۔

ایک چیز یہ ہے کہ کیرکٹر میں صلابت ہونی چاہئے، یہ نہیں کہ آدمی بالکل پارے کی طرح ہو جائے کہ اس کو کسی وقت قرار نہیں، کبھی ادھر کبھی ادھر، کسی چیز میں اثبات نہیں، یہ بھی قوموں کیلئے بڑی مہلک بیماری ہے، اپنی سیرت میں صلابت اور استقامت پیدا کیجئے، یہ بات میں عام طور پر ہندوستانی مسلمانوں سے کہتا ہوں، اور صرف اہل عجم سے نہیں، عربوں میں بھی کہتا ہوں، الحمد اللہ میرے مضامین اس پر شاہد ہیں، جن تقریروں میں میں نے عربوں کو مخاطب کیا ہے، ان کا مجموعہ "العرب والاسلام" کے نام سے الگ چھپ گیا ہے، اس کو دیکھا جا سکتا ہے، یہ مشترک بیماریاں ہیں، مشرق کی، ایشیا کی اور ہم مسلمانوں کی خاص طور پر۔

تو ایک چیز تو یہ کہ عقائد کی تصحیح ہونی چاہئے اور دوسرے یہ کہ افتراق و انتشار کو دور کرنا چاہئے، اتحاد ہونا چاہئے، اور تیسری بات یہ کہ حب دنیا، دولت کی محبت پر کچھ پابندی عائد کرنی چاہئے، حدیث شریف میں آتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ معجزہ ہے ان معجزات میں سے جو حدیث کی شکل میں اور ارشادات نبویؐ کی شکل میں محفوظ ہیں، "**حب الدنیا رأس کل**

خـــطیـــئة ''(دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے، ہر غلطی کی جڑ ہے) آپ دیکھیں گے کہ فلاں افسوسناک واقعہ کیوں ہوا، اس نے کیوں بے وفائی کی؟ یہ اس سے کیوں ٹوٹا؟ وہ اس سے کیوں ملا؟ اس نے ملت فروشی کیوں کی؟ اس نے ملک فروشی کیوں کی؟ اس نے ضمیر فروشی کیوں کی؟ سب کی جڑ ملے گی، دنیا کی محبت اور کچھ نہیں۔

مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری

ایک اور کمزوری کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، جو مسلمانوں کی عام کمزوری ہے، اور کسی علاقہ میں (بعض خاص اسباب کی بناء پر) زیادہ پائی جاتی ہے، وہ ضرورت سے زیادہ ''جذباتیت'' ہے یہ کمزوری جہاں اور جب اجتماعی طور پر پائی جاتی ہے، اور جماعتی یا علاقائی مزاج بن جاتی ہے، بڑے خطرات اور نقصانات کا موجب ہوتی ہے، اور اس سے بعض غلط اندیش عناصر ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، بعض نادان دوست بھی سخت نقصان پہونچا دیتے ہیں، تاریخ میں بعض بڑے ملی حوادث ومصائب کا سبب یہی جذباتیت، اشتعال پذیری اور سرعت انفعال تھی، کسی شاعر نے صحیح کہا ہے۔

چواز قومے یکے بے دانشی کرو
نہ کہ راعزت ماند نہ مہ را

پھر اگر یہ ''بے دانشی'' ایک دو افراد کی طرف سے نہ ہو، بلکہ ایک بڑی جماعت یا عوام کی طرف سے ہو، تو وہ اور مہیب، ورسوا کن اور دور رس نتائج کا سبب بن جاتی ہے، اسی حقیقت کو مشہور حکیم عرب شاعر متنبی نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

وجـــرمٍ جـــرّهٗ سـفـهـاء قـومٍ
فـحـل بـغـيـر جـارمـه العقاب

(وہ غلطی جس کا ارتکاب کسی قوم کی خفیف العقل لوگوں نے کیا، اس کا نتیجہ میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گئے اور ناکردہ گناہ لوگوں کو بھی اس سزا بھگتنی پڑی)

جن قوموں یا جماعتوں نے دنیا میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، یا تاریخ

میں سلطنتوں اور تہذیبوں کی بانی قرار پائی ہیں یا یا انھوں نے دین حق کی دنیا میں جھنڈا بلند کیا ہے، وہ طبعی طور پر حلیم و بردبار، متحمل و عالی ظرف اور اسی کے ساتھ بہادر و غیور واقع ہوئی تھیں اور صدر اول کے مسلمان تو اس کا بہترین نمونہ ہیں، میں نے ایک مرتبہ ایک مجلس میں کہا کہ "میں ابھی اس شہر میں داخل ہو رہا تھا، تو میں نے دیکھا کہ میری کار کے سامنے ایک ٹینکر چل رہا ہے، اس کے پیچھے کی جانب جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔ "Highly Implameable" (جلد اور بہت زیادہ آگ پکڑ والی چیز) میں نے کہا کہ یہ پٹرول کی تعریف ہوسکتی ہے، بارود کی تعریف ہو سکتی ہے، کسی آتش گیر مادہ کی تعریف ہوسکتی ہے، مسلمان کی تعریف تو نہیں ہوسکتی کہ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھیں، اور عواقب و نتائج سے بے پرواہو کر جو چاہیں کر گزریں، عمل و ردعمل میں کوئی تناسب نہ ہو، رائی کا پربت بنا دیں، اور دوست دشمن خطاوار و غیرہ خطاوار، کمزور و طاقتور، بچوں بوڑھوں کسی کی تمیز نہ ہو، یہ جذباتیت اور سریع الانفعالی ایک خطرناک بیماری ہے، جس کے علاج کی فوری ضرورت ہے، اور ہمارے قائدیں داعیان دین اور تعلیم و تربیت و اصلاح و تبلیغ کا کام کرنے والوں کو اس کی طرف فوراً توجہ کرنا چاہئے۔

آپ سے دردمندانہ گزارش

حضرات: میں خوش ہوں کہ میرے قیام کشمیر اور میری حقیر تقریروں کا خاتمہ ایک ایسی جگہ اور ایک ایسے مرکز سے ہو رہا ہے، جہاں نصرت اسلام کے لئے ایک منظم، مخلصانہ و دانشمندانہ کوشش شروع ہوئی، خاص طور سے خدا کے ایک مخلص بندہ مولانا رسول شاہ صاحب نے نصرۃ الاسلام کی بنیاد ڈالی، اللہ تعالیٰ نے اس درخت کو قبول فرمایا، بارآور کیا اور سایہ دار بنایا۔

كشجرةٍ طيبة اصلها ثابت وفرعها فى السمآء، تؤتى اكلها كل حينٍ باذن ربها۔

"گویا وہ ایک پاک درخت ہے، جس کی جڑ مضبوط (زمین کو پکڑے ہوئے ہے) اور شاخیں آسمان میں ہیں، اپنے پروردگار کے حکم سے ہمیشہ پھل لاتا (اور میوے دیتا) ہے۔

اس درخت نے پہلے بھی پھل دیا اور اب بھی پھل دے رہا ہے اور اگر خدا کو منظور ہے تو اللہ سے امید ہے کہ آئندہ بھی یہ پھل دیتا رہے گا، اس کو مضبوط کیجئے۔

ان الفاظ کے ساتھ میں اپنی گذارش ختم کرتا ہوں، امید کرتا ہوں کہ میری یہ باتیں

کے دل و دماغ میں ضرور محفوظ رہیں گی، اور ان لوگوں کے ذہن میں ضرور رہیں گی، جو اس سلسلہ میں کچھ کر سکتے ہیں، وہ کمزوری کے اسباب کو رفع کر کے نصرت الٰہی کو کھینچنے اور بلانے والے اسباب اور شرائط کو پورا کرنے اور ان اسباب کو مہیا کرنے کی کوشش کریں، تا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد ہو۔

ان ینصرکم اللہ فلاغالب لکم و ان یخذلکم فمن ذاالذی ینصرکم من بعدہ، وعلی اللہ فلیتوکل المومنون۔

اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا، اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو پھر کون ہے کہ تمہاری مدد کرے اور مومنوں کو چاہئے کہ خدا ہی پر بھروسہ رکھیں۔

ان الفاظ کے ساتھ میں آپ کے اس اعزاز کا اور مولانا محمد فاروق صاحب کا خاص طور پر اس کے رفقائے کار اور حاضرین کا عام طور پر دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا ہوں، اور آپ بھی دعا کریں کہ میری اس حاضری کا کوئی لفظ قبول ہو جائے، خدا کے یہاں کوئی قدم قبول ہو جائے، میرے یہاں جو سات آٹھ دن گذرے ہیں، ان کی حرکات وسکنات سے اور ان کے اوقات میں سے کوئی چیز اللہ کے یہاں قبول ہو جائے، اور میرا آنا کسی درجہ میں بھی مفید ہو اور میں اپنی اس حاضری پر خدا کے یہاں شرمندہ نہ ہوں کہ میں کس مقصد کیلئے گیا تھا اور کیا کر کے آیا۔

و ما علینا الاالبلاغ المبین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غیر اسلامی تہذیب واقتدار کے مراکز میں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داریاں

یہ تقریر ۲۰ ستمبر ۱۹۹۲ء لندن میں اسلامی سینٹر کے ایک عظیم مجمع میں دعوت اسلامی سے تعلق رکھنے والے موضوع پر کی گئی۔

نحمده ونصلى على رسوله الكريم .امابعد.

بزرگو! ایک ایسے ملک میں جس میں اسلام ایک محکومانہ مذہب کی حیثیت رکھتا ہے اور مغربی اقتدار اور غیر اسلامی طرز معاشرت کی بالادستی ہو اور جس میں ذاتی مفاد اور سیاسی و جماعتی فائدوں ہی کو سب کچھ سمجھا جاتا ہو اور لذت کو ایک فلسفہ کی شکل دے دی گئی ہو، جس میں تمام تر اعمال واخلاق اور کاوشوں کا محور اسی کو سمجھا گیا ہو، ایسے ملک میں مسلمانوں کی (جب کہ وہ وہاں اقلیت میں ہوں) بہت بڑی ذمہ داری ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ان میں غیر متزلزل ایمان ہو، جرأت مندانہ کردار ہو، وہ پوری حکمت سے کام لیں، پھر ان میں اس پیغام ودعوت پر پورا اعتماد ہو جس سے اللہ نے ان کو مشرف فرمایا ہے۔ یہ بھی ان کے لئے ضروری ہے کہ ان کا ایک بلند معیار ہو اور وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہونے پائیں، اگر وہ اس بلند معیار پر نہ ہوئے تو اپنی ذات کو اور اپنی قوم کو حقارت کی نگاہ سے اور مغربی تہذیب کے مقلدوں اور اس کے خوشہ چینیوں کی حیثیت سے دیکھیں گے، اس صورت میں وہ کوئی موثر اور اہم کردار ادا نہیں کر سکتے جو لوگوں کی توجہ کو مرکوز کر سکے اور کچھ تبدیلی عمل میں لا سکے۔

میں آپ کے سامنے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے آپ کے سامنے بات بالکل واضح ہو جائے گی، اور ایک ایسے غیور مسلمان کا کردار بھی آپ کے سامنے آئے گا جس کو اپنی

دعوت اور پیغام پر پورا اعتماد تھا اور یہ ظاہری شان وشوکت اور دلفریب مناظر اس کی نظر میں ٹھیکروں سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے اور ظاہری عیش، عشرت پر جینے مرنے والوں اور جاہلی زندگی گزارنے والوں پر اس کو ترس آتا تھا، یہ تاریخ اسلام کے قرن اول کا واقعہ ہے، اس کو میں آپ کے سامنے بیان کررہا ہوں، اس میں عبرت ونصیحت بھی ہے اور یہ ہمارے لئے سبق آموز بھی ہے۔

ایرانی افواج کا سب سے بڑا قائد جس کو رستم کے نام سے یاد کیا جتا ہے اور جس کو اپنے دبدبہ اور شان وشوکت میں شہنشاہ ایران کے قریب ہی سمجھا جاتا تھا، اس نے لشکر اسلام کے قائد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ کسی ایسے آدمی کو بھیج دیا جائے جو اس مقصد کی وضاحت کرے جو عرب کے صحرانشینوں اور بدوؤں کو ان متمدن ملکوں تک لے آیا جو تہذیب وتمدن اور عسکری قوت میں نقطۂ عروج پر ہیں اور ملک عرب کو ان سے کوئی نسبت نہیں۔

اب غور کیجئے کہ وہ آدمی جو تختِ سیادت وقیادت پر بیٹھا ہوا ہے، اور ایک بڑے رقبہ پر اس کی حکومت ہے، اس کا عربوں کے بارے میں کیا تاثر ہوگا جو خیموں اور کچے مکانات میں بودو باش رکھتے تھے، اور جن کا گزارہ کھجور اور اونٹ کے گوشت پر تھا، وہ کس لاپرواہی اور حقارت کی نگاہ سے عربوں کی طرف دیکھتا ہوگا، اس نے کہلوایا کہ کوئی ایسا آدمی بھیج دیا جائے جو اس مقصد و محرکات کی ترجمانی کردے جوان کو یہاں لائے ہیں۔

یہ اسلام کا معجزہ ہے کہ اس نے تمام عربوں کو فکر وعقیدہ وایمان باللہ اور مقصد اسلام پر ناز و فخر کے ایک بلند اور بالا معیار پر پہنچادیا تھا، حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ نے حضرت ربعی بن عامرؓ کا انتخاب فرمایا۔ یہ حضرت ربعی بن عامرؓ جن سے اکثر علمائے تاریخ وسیر ناواقف ہیں، ان کو لشکر اسلامی میں کوئی شان امتیازی بھی حاصل نہ تھی، میں آپ کے سامنے یہ قصہ کوئی افسانہ کے طور پر نہیں بیان کررہا ہوں کہ جس میں صرف وقتی مزہ ہے یا قومی فخر وعزت کا سامان ہے، میں اسلئے آپ کے سامنے اس قصہ کا ذکر کررہا ہوں تا کہ آپ اس طاقتور ایمان واعتماد کا جس نے ایرانی لشکروں کے قائد اعظم رستم کے سامنے اس جرأتمندانہ اور آزادانہ گفتگو پر آمادہ کیا، کچھ اندازہ کرسکیں اور مومن کے کردار، جرأت وعزم اور ایمانی قوت کا، مغربی تہذیب و ترقی، اقتدار وغلبہ کے بارے میں اپنے موقف اور کردار سے موازانہ کرسکیں، یہاں ہمارا اپنے

آپ کے ساتھ اپنے پیغام کے ساتھ اور اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ کیا معاملہ ہے اور مغربی تہذیب جو یہاں رائج ہے، اور جس کو اس وقت معاصر دنیا میں سیادت وقیادت کا مقام حاصل ہے اس کی طرف ہم کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

حضرت ربعی بن عامرؓ رستم کے دربار میں تشریف لائے، ان کے لباس میں پیوند لگے ہوئے تھے، معمولی سی تلوار اور ڈھال ان کے ساتھ تھی، ایک معمولی اور پست قد وقامت گھوڑے پر سوار تھے، اسی حال میں قالینوں کو روندتے ہوئے تشریف لائے، پھر گھوڑے سے اترے، وہیں کسی تکیہ سے اس کو باندھ دیا اور رستم کی طرف بڑھنے لگے، ہتھیار ان کے ساتھ تھے، زرہ میں ملبوس تھے اور سر پر خود تھا، خدم وحشم اس پر معترض ہوئے اور کہنے لگے ہتھیار اتار دو، حضرت ربعی بن عامرؓ نے فرمایا، میں خود تمہارے پاس نہیں آیا، تمہاری دعوت پر آیا ہوں، اگر اسی حال میں جانے دیتے ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ میں واپس جاتا ہوں، رستم نے کہا کہ آنے دو۔ حضرت ربعیؓ اپنے نیزہ کو ان ریشمی قالینوں پر ٹیکتے ہوئے آگے بڑھے۔ حتیٰ کہ ان میں اکثر قالین پھٹ گئے۔

ربعیؓ رستم کے پاس پہنچے۔ رستم نے پوچھا کہ عرب کس مقصد سے یہاں آئے ہیں؟ انہوں نے پورے ایمان ویقین کے ساتھ جو ان کے رگ وریشہ میں سرایت کر چکا تھا، اور بھرپور اعتماد کے ساتھ جس نے ان کے اعصاب کو مضبوط بنا دیا تھا، اس لئے کہ ان کی پشت پر جو چیز کارفرما تھی وہ آسمانی کتاب تھی، نبوت صادقہ تھی، غیر متزلزل اور پختہ عقیدہ تھا، بلند ہمت تھی اور تیر بہدف نگاہ تھی، انہوں نے فرمایا: ہم کو اللہ نے اس لئے بھیجا ہے، تاکہ ہم ان لوگوں کو جن کو اللہ چاہے بندوں کی غلامی سے نکال کر خدائے واحد کی غلامی میں لے آئیں، دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعت میں لائیں اور مذاہب کے جور وستم سے نکال کر اسلام کا عدل وانصاف عطا کریں۔

بزرگو اور دوستو! اسلام کے پیغام ودعوت اور اس کے بنیادی مقصد کے بارے میں حضرت ربعیؓ نے جو فرمایا اس پر کامل یقین کے ساتھ اور جو انہوں نے لوگوں کو اللہ کی بندگی کی طرف لانے اور دوسرے مذاہب کے جور وستم سے نکال کر اسلام کے عدل وانصاف کی راہ دکھانے کا ذکر فرمایا، اس پر کوئی حیرت واستعجاب نہیں ہوتا کہ یہ ان کے عقیدہ اور یقین کی بات تھی، لیکن

مجھے ان کے اس جملہ پر بڑی حیرت واستعجاب ہے، جس میں انہوں نے فرمایا کہ ہمیں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ "دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعت کی طرف لائیں۔" اگر وہ دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی وسعت میں لانے کا ذکر فرماتے تو مجھے ادنی تعجب نہیں ہوتا، اس لئے کہ یہ تو ایسی حقیقت ہے، جس پر ہر مسلمان اور صاحب ایمان یقین رکھتا ہے، اور حضرت ربعیؓ کا واقعہ تو قرن اول کا ہے، میں ان کے اس جملہ پر غرق حیرت ہو جاتا ہوں کہ ہم تم کو دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعتوں میں لانا چاہتے ہیں، گویا کہ وہ فرما رہے ہیں ہم نے اپنے اوپر ترس کھا کر اور ان ملکوں کے عیش وعشرت کی طمع میں اپنے وطن کو ترک نہیں کیا، ہم تو یہاں تم پر ترس کھا کر آئے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ تم کو تنگ وتاریک قید خانے سے آزاد کریں جس میں تم اس پرندہ کی طرح زندگی گزار رہے ہو جس کو کسی ظرف یا قفس میں بند کر دیا جاتا ہے اور دانہ اور پانی اسی کے اندر دے دیا جاتا ہے، اس لئے کہ تم اپنی عادتوں اور ضرورتوں کے غلام ہو، خواہشات نفس کے غلام ہو، مروجہ فیشنوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے، تمہارے لئے تنہا ایک لمحہ گزارنا مشکل ہے، تم اپنی مرضی کے مطابق کوئی کام نہیں کر سکتے، تم کو قدم قدم پر خادموں اور معاونوں کی ضرورت ہے، پہرہ داروں اور چوکیداروں کی ضرورت ہے، کوئی کام بھی تم بغیر کسی مددگار کے انجام نہیں دے سکتے۔

تاریخی شواہد موجود ہیں کہ جب شاہ ایران یزدگرد اپنی مملکت سے فرار ہوا تو درمیان سفر اس کو پیاس لگی، ایک گھر میں داخل ہوا، اس کو ایک معمولی روزمرہ کے استعمال کے گلاس میں پانی دیا گیا تو اس نے کہا کہ میں اس گلاس میں پانی نہیں پی سکتا، اس لئے کہ وہ تو سونے اور چاندی کے گلاس میں پانی پینے کا عادی تھا۔ ایرانیوں کا تو یہ حال تھا کہ اگر ان میں کوئی بڑا آدمی ایک لاکھ درہم سے کم کا تاج پہنتا یا اس کے پاس عالی شان محل اور اس کے لوازمات، حوض و فوارہ اور باغات نہ ہوتے تو اس کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا۔

گویا کہ حضرت ربعیؓ یہ فرما رہے ہیں کہ تم تو اپنے خادموں کے خادم اور غلاموں کے غلام ہو اس لئے کہ ان سے زیادہ تم ان کے محتاج ہو، ہماری آرزو ہے کہ تمہیں اس تنگ وتاریک قید خانہ سے نکال کر وسعت وآزادی کی فضا میں لائیں، ہم یہاں اپنی ضرورت سے نہیں آئے، ہم نے تو یہ دور دراز کا سفر تمہاری ضرورت کے پیش نظر کیا ہے، ہمارے لئے اپنے وطن میں کوئی تنگی

نہیں۔ وہ صحرا تو بڑا کشادہ اور وسیع ہے، ہم کو تو تمہاری اس غیر فطری اور غیر طبعی معیشت پر بے چینی ہے، جس میں تم مست ہو، یہی بے چینی ہمیں یہاں لائی ہے، ہم لوگ خواہشات پر چلنے والے نہیں ہیں، ہم خاص پوشاک اور راتب کے غلام نہیں ہیں اور نہ خادموں اور حاشیہ برداروں کے محتاج ہیں، ہم صحرا میں آزادی کی زندگی گزارنے والے ہیں، جو میسر آتا ہے کھاتے ہیں اور شکر کرتے ہیں، ہم کو تو اللہ نے اس لئے بھیجا ہے کہ جس کو وہ چاہے اس کو ہم لوگوں کی غلامی سے نکال کر ایک اللہ کی غلامی میں لے آئیں، دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعت عطا کریں اور مذاہب کے جور وستم سے آزاد کرا کے اسلام کے عدل وانصاف سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیں، تم مذاہب کے ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے ہو، جس کے نتیجہ میں مصیبتوں میں گرفتار ہو، ذلت وخواری تمہارا مقدر بنی ہوئی ہے اور حقیقی سکون وراحت تم کو نصیب نہیں ہے۔

میرے بھائیو اور دوستو! میں طوالت دینا نہیں چاہتا، آپ کی بھی ذمہ داریاں اور مشغولیتیں ہیں۔ میں آپ سے مختصراً کہتا ہوں، آپ یہاں آزادانہ، موثر اور بنیادی کردار ادا کریں، آپ کی زندگی مثالی زندگی ہو، جو لوگوں کی نگاہیں پھیر دے اور توجہ مرکوز کردے، ذہنوں میں ایسے سوالات پیدا ہوں جو موازنہ کرنے پر مجبور کریں اور اسلام کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کا داعیہ پیدا ہو، اگر آپ نے بھی مغربی طرز معاشرت اختیار کرلیا، آپ انہی کے مقلد بن گئے اور اپنے بلند معیار سے اپنے کو نیچے گرا لیا تو آپ میں اور یہاں کے مغربی باشندوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہ سکتا اور نہ ان میں معلومات کا شوق اور غور وفکر کا جذبہ پیدا ہوسکتا ہے اور نہ آپ کا احترام ان کے دل میں آسکتا ہے، چہ جائیکہ وہ آپ کو قابل تقلید ونمونہ سمجھیں۔

لیکن جب آپ ان کے سامنے ایک ناموس طریقہ زندگی پیش کریں گے تو اس سے ان کے اندر ایک جستجو پیدا ہوگی، اور وہ آپ سے پوچھنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ طریقہ زندگی آپ نے کہاں سے اخذ کیا اور یہ بلند وبالا اقدار اور اخلاق فاضلہ آپ نے کس سے سیکھے، ان میں اشتیاق پیدا ہوگا کہ ان کو آپ ایسا لٹریچر دیں جس سے وہ اسلام سے متعلق مستند معلومات حاصل کریں، اور آپ ان کو رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ سے روشناس کرائیں اور ان کو وہ راستہ دکھائیں جس پر چل کر آپ کے اندر یہ قدریں پیدا ہوئیں اور یہ بلند کردار آپ کو حاصل ہوا، اس

وقت وہ آپ کو احترام وعقیدت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

مسلمان بھائیو اور یہاں کے باشندو! (خواہ وہ یہاں کے نیشنل ہوں یا کچھ مدت کے لئے آئے ہوں) ایسا نمونہ زندگی پیش کیجئے جو ان میں اسلام کے مطالعہ کا شوق پیدا کردے اور اس راستہ کو جاننے کا اشتیاق پیدا کردے جس پر چل کر یہ طرز زندگی اور طریقۂ فکر ہم کو عطا ہوا، یہی تنہا وہ انقلاب انگیز راستہ ہے، جس پر چل کر آپ ان غیر اسلامی ملکوں میں موثر کردار ادا کرسکتے ہیں، اگر آپ ان ہی کے رنگ میں رنگ گئے اور وہی طریقۂ زندگی اختیار کرلیا، (خواہ یہ احساس کمتری اور نقالی کا جذبہ عالم عرب میں ہو یا ہندوستان یا افریقہ کے کسی حصہ میں یا دنیا کے کسی بھی ملک میں) آپ ہرگز ان پر اثر انداز نہیں ہوسکتے اور کوئی تبدیلی عمل میں نہیں لا سکتے، خواہ سو سال یا اس سے زیادہ مدت تک وہاں قیام اور زندگی گزارنے کا موقع ملے۔

آخر میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے سکون واطمینان کی ساتھ تقریر سنی اور اگر مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواص
ملت میں ان کا مقام اور ذمہ داریاں

۲؍اپریل ۱۹۷۲ء کو گھورکھپور میں خواص اور شہر کے سر برآوردہ ایک مخصوص مجلس میں یہ تقریر کی گئی تھی جس میں طبقۂ خواص کے مقام اور ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

الحمد للہ و کفیٰ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ. اما بعد.

خواص کی اصطلاح:

حضرات! آپ سب حضرات کا تعلق طبقہ خواص سے ہے۔ یہ ایک عزت کی بات بھی ہے اور ذمہ داری کی بھی ''خواص'' کی اصطلاح بہت قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے، اور مذہب و تاریخ، تمدن و معاشرت اور ادب و شاعری سب میں یہ یا اس کے ہم معنی الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں، مگر اس کا صحیح مفہوم کیا ہے، اس کا تفصیلی اطلاق کس طبقہ پر ہوتا ہے؟ یہ بات تشریح طلب ہے، اور اس کی کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے، میں اس وقت اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

''خواص'' کا جاہلی مفہوم:

خواص کا ایک ''جاہلی'' مفہوم ہے اور ایک ''اسلامی'' اس کا جاہلی مفہوم یہ ہے کہ کسی معاشرے، ملت یا ملک میں ایک ایسا طبقہ وجود میں آ جائے جو ہر چیز میں عوام سے الگ ہو، وہ اپنی دنیا خود بنائے اور اسی دنیا میں عمر بسر کر دے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا معیار بلند ہو، جہاں ایک روپے سے کام چلتا ہو، وہاں سو روپے سے کام چلائے، جو کام سادہ طریقے پر ہوتا ہو وہ دھوم دھام اور نہایت تزک و احتشام کے ساتھ انجام دیا جائے، ہر چیز میں نام و نمود اور عزت و وجاہت پیش نظر ہو، جب مسرتوں اور شادیوں کا موقع آئے تو تھیلوں کے منہ کھول

دیئے جائیں اور دولت پانی کی طرح بہائی جائے اور اس میں ایسی شان وشوکت کا اظہار ہو کہ شہر میں ہفتوں اور مہینوں اس کے چرچے رہیں اور اپنی خیالی دنیا میں پوری عمر گزار دی جائے اور عوام پر جو کچھ گزرتی ہے اور جن مصائب ومشکلات سے دن رات ان کا سامنا ہے ان کی اس طبقہ کو ہوا بھی نہ لگے، کسی دینی تحریک اور کسی اصلاحی کوشش سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ ہو، ساری دلچسپیاں اپنے، اپنی اولاد اور اپنے ذاتی مفادات تک محدود ہوں، جس کام سے شہرت وعزت حاصل ہوتی ہو اور حکومت وسوسائٹی کی نگاہ میں وقعت بڑھ سکے اس کے لئے اشرفیوں کی لوٹ ہو اور جس کام سے یہ مفید مقصد حاصل نہ ہوتا ہو اس کے لئے کوڑیوں پر مہر ہو اخلاقیات میں جو بات عوام کے لئے ناجائز ہے، اس طبقہ کے لئے جائز، جو بات ان کے حق میں عیب، اس کے حق میں ہنر ہے۔

حالی نے اپنے زمانے کے امراء وخواص کے اسی طبقے کی تصویر ان اشعار میں کھینچی ہے:

امیروں کا عالم نہ پوچھو کہ کیا ہے
خمیر ان کا اور ان کی طینت جدا ہے
سزاوار ہے ان کو جو ناسزا ہے
روا ہے انہیں سب کہ جو نا روا ہے
شریعت ہوئی ہے نکونام ان سے
بہت فخر کرتا ہے اسلام ان سے

قرآن مجید میں ''مترفین'' کی اصلاح اوران کا کردار:

خواص کے ایسے طبقہ کے لئے جس کی یہ سیرت اور اخلاق ہوں، قرآن مجید میں ''مترفین'' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، قرآن مجید نے اس کو معاشرے کے ایک مریض وفاسد گروہ کی حیثیت سے ذکر کیا ہے، جو تکبر وانانیت کے مرض میں مبتلا ہے اور جو ہر نیک دعوت واصلاحی کوشش کی مخالفت میں ہمیشہ پیش پیش رہتا ہے۔ ارشاد ہے:

وما ارسلنا فی قریة من نذیر الا قال مترفوها انا بما ارسلتم به کافرون(۱)

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوشحال لوگوں نے کہا کہ جو

چیز دے کر تم بھیجے گئے ہو ہم اس کے قائل نہیں۔

اس کو اپنی اولاد اور دولت کی کثرت پر ناز ہوتا ہے اور اس سے وہ نتیجہ نکالتا ہے کہ وہ ہر نعمت سے بہرہ ور اور ہر مصیبت و ناکامی سے محفوظ رہے گا۔

وقالوا نحن اکثر اموالاو اولادا و ما نحن بمعذبین.

اور یہ بھی کہنے لگے کہ ہم بہت سا مال اور اولاد رکھتے ہیں اور ہم کو عذاب نہیں ہوگا۔

کبھی اس گروہ کو ''اکابر مجرمین'' کے لقب سے یاد کیا گیا ہے جس کا کام ہی سازش کرنا ہے، اصلاحی کوششوں کی راہ میں مشکلات پیدا کرنا اور ان کو ناکام بنانے کی کوشش کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وکذلک جعلنا فی کل قریة اکابر مجرمیها لیمکرو فیها وما یمکرون الا بانفسهم وما یشعرون .

اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں بڑے بڑے مجرم پیدا کئے کہ ان میں مکاریاں کرتے رہیں اور جو مکاریاں یہ کرتے ہیں ان کا نقصان انہیں کو ہے اور وہ (اس سے) بے خبر ہیں۔

ان کا کام ہر فساد و انتشار کا ساتھ دینا ہے، ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

واتبع الذین ظلموا ما اترفوا فیه و کانو مجرمین.

اور جو ظالم تھے وہ انہی باتوں کے پیچھے لگے رہے جن میں عیش و آرام تھا اور وہ گناہوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔

اس طبقے کا عروج، اس کی بے عنوانیاں، اس کی اخلاقی انارکی، اس کا آزادانہ طریقے سے داد عیش دینا اور ہر قسم کے حدود و قیود کو پھلانگ جانا اور اس کی خرمستی، ملکوں اور قوموں، شہروں اور بستیوں کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے، قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی بستی کی تباہی کے دن آتے ہیں، اور اس کا پیمانہ حیات لبریز ہو جاتا ہے تو پہلے اس طبقے میں بگاڑ آتا ہے اور وہ اپنے اعمال و اخلاق سے عذاب خداوندی کو دعوت دیتا ہے اور پوری پوری آبادی پر مصیبت لے آتا ہے، قرآن مجید اپنے خاص اسلوب میں فرماتا ہے:

واذا اردنا ان نهلک قریة امرنا مترفیها ففسقوا فیها فحق علیها القول فدمرناها تدمیراً

اور جب ہمارا ارادہ کسی بستی کے ہلاک کرنے کا ہوا تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو (فواحش) پر مامور کر دیا تو وہ نافرمانیاں کرتے رہے پھر اس پر (عذاب کا) حکم ثابت ہو گیا اور ہم نے اسے ہلاک کر ڈالا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وکم اھلکنا من قریۃ بطرت معیشتھا فتلک مساکنھم لم تسکن من بعدھم الا قلیلاً و کنا نحن الوارثین۔

اور ہم نے بہت سی بستیوں کو ہلاک کر ڈالا جو اپنی (فراخی) معیشت میں اترا رہے تھے سو یہ ان کے مکانات ہیں جو ان کے بعد آبادی نہیں ہوئے مگر بہت کم اور ان کے پیچھے ہم ہی ان کے وارث ہوئے۔ یہ ہے خواص کا جاہلی مفہوم۔

''خواص'' کا اسلامی مفہوم اور ان کی سیرت و اخلاق:

خواص کا اسلامی مفہوم اس سے بالکل جدا ہے، اس سے مراد ملت اور اسلامی معاشرے کا ایک ایسا طبقہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے فہم و فراست کی وافر دولت عطا فرمائی ہے، اس کو ذمہ داری اور اپنے فرائض کا احساس عوام اور دوسرے طبقوں کے افراد سے زیادہ ہوتا ہے، جو اپنی قسمت کو دین و ملت کی قسمت سے اور عام فلاح و بہبود سے وابستہ سمجھتا ہے، جس کا عقیدہ ہے کہ افراد کی زندگی جماعت سے ہے اور موج دریا سے باہر اپنی ہستی باقی نہیں رکھ سکتی، وہ ملت کے ہر دکھ درد میں شریک رہتے ہیں بلکہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو معاشرے میں دل و دماغ کا درجہ عطا کیا ہے، اس لئے ان کو دل و دماغ ہی کی طرح عوام و ملت کا درد سب سے پہلے اور سب سے زیادہ محسوس ہوتا ہے، ان کی حیثیت جب معاشرے کے جسم میں آنکھ کی ہے تو وہ اسی طرح نازک و حساس ہوتے ہیں اور ایک معمولی ذرے سے ان کے اندر کھٹک پیدا ہو جاتی ہے، وہ ملت اور معاشرے میں مقیاس الحرارہ (بیرومیٹر) کی حیثیت رکھتے ہیں کہ وہ سب سے پہلے موسم کے تغیرات اور درجہ حرارت و برودت کو بتاتا ہے وہ ہر خطرے کے وقت سینہ سپر اور ملت کی پہلی صف میں نظر آتے ہیں اور ہر نفع اور مفاد کے موقع پر ملت کی آخری صف میں دکھائی دیتے ہیں، جب خدمت و قربانی کا کوئی موقع آتا ہے اور عمل و سرگرمی کے لئے پکارا جاتا ہے تو وہ سمجھتے

ہیں کہ انہیں کو آواز دی گئی ہے اور وہی مخاطب ہیں اور انعامات اور مال غنیمت کی تقسیم کا وقت آتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کے مستحق نہیں ہیں اور ان کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے، ملی و اجتماعی حادثوں کے وقت ان کی راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے، اور خواب و خور حرام ہوا جاتا ہے، وہ اس کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں اور جب تک اس صورت حال میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی ان کے اندر سکون و اعتدال نہیں ہوتا، وہ دوسروں کے حق میں حاتم اور اپنے حق میں انتہاء درجہ کے محتاط اور کفایت شعار ہوتے ہیں، اس معیار و پیمانہ کو لے کر امت کے ''خاص الخاص'' افراد کی زندگی کا مطالعہ کریں۔

اپنے ''خواص'' اور ''عزیزوں'' کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا طرز عمل:

سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کیا جائے، حضرت علیؓ خاندان نبوت کے ایک فرد اور محرم اسرار تھے، وہ کہتے ہیں کہ جب بڑے زور کا رن پڑتا تھا اور گھمسان کی لڑائی ہوتی تھی تو آپ ﷺ ہم لوگوں کو اور خاندان بنی ہاشم کو آگے کر دیا کرتے تھے، لڑائی کا سارا زور ہم پر پڑ جاتا تھا، میدان بدر میں جو کچھ پیش آیا وہ اس کی تصدیق کرتا ہے، جس وقت قریش کے سورما اور نامی گرامی لڑنے والے عتبہ، شیبہ، ربیعہ میدان میں نکلے اور انہوں نے مقابلہ کے لئے للکارا اور عرب کے دستور کے مطابق ''مبارز'' طلبی کی تو ان کے مقابلہ کے لئے تین انصاری میدان میں آئے۔ انہوں نے کہا کہ شریف مقابل ہیں مگر ہم لوگ مقابلہ کے لئے اپنی برادری قریش کے جوان چاہتے ہیں جو مکہ آئے ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ سرداران قریش کی سپہ گری و مردانگی اور ان کے جنگی کمالات سے خوب واقف تھے، وہ قریش کی بڑی بڑی جنگوں میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھا چکے تھے اور بڑا نام پیدا کیا تھا۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے مہاجرین میں بھی بڑے بڑے آزمودہ کار سپاہی اور ان کے برابر لڑنے والے موجود تھے، جن میں سے حضرت سعدؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت ابوعبیدہؓ کا نام لیا جا سکتا ہے، جنہوں نے بعد میں پورے پورے ملک فتح کئے اور ایران و شام میں اسلام کا جھنڈا گاڑ دیا، لیکن اس موقع پر آپ نے ان میں سے کسی کو زحمت نہ دی، آپ اپنے اپنے تین قریب ترین عزیزوں اور افراد خاندان کو حکم دیا

کہ وہ ان کے مقابلہ میں جائیں۔ یہ کون تھے؟ ایک حقیقی چچازاد بھائی علی ابن ابی طالب، ایک چاہنے والے اور جان نثار چچا حمزہ اور ایک دوسرے چچازاد بھائی عبیدہ ابن الحارث۔ یہ بھی خیال رہے کہ حضرت علیؓ آپ کے داماد ہونے والے تھے اور ان کو جان بوجھ کر ہلاکت میں ڈالنا اپنی چہیتی بیٹی کے مستقبل کو خطرے میں ڈالنا تھا، ایسے موقعوں پر دامادوں کی زندگی فرزندوں کی طرح عزیز سمجھی جاتی ہے، چنانچہ یہ حضرات مقابلہ کے لئے نکلے، حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ فائزہ المرام زندہ سلامت واپس آئے اور حضرت عبیدہؓ بن الحارث زخمی ہوئے، یہ اس طرزِ عمل کی ایک مثال تھی جو آپ نے اپنے خاندان اور اپنی ذات کے ساتھ اختیار کر رکھا تھا۔

دوسری مثال لیجئے، آپ کو سود کی حرمت کا اعلان کرنا تھا، جس کے لئے آپ کو ایک عملی مثال پیش کرنی تھی، عرب میں جن لوگوں کا بڑے پیمانہ پر سودی کاروبار تھا ان میں آپ کے چچا حضرت عباسؓ بھی تھے، آپ اس موقع پر کسی قریشی مہاجر اور کسی مسلمان سرمایہ دار کا نام لے سکتے تھے، جو سود کے حرام ہونے سے پہلے یہ کاروبار کرتا تھا، لیکن آپ نے اس کے لئے صرف حضرت عباسؓ کے نام کا انتخاب کیا، مجھے معلوم نہیں ہے اور غالباً سیرت کی کسی کتاب میں اس کا تذکرہ نہیں ہے کہ آپ نے ان سے پہلے ذکر فرمادیا تھا یا نہیں، آپ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ مین اعلان فرمایا کہ اس قانون کا سب سے پہلا اطلاق حضرت عباس ابن عبدالمطلب پر ہوگا، ان کا جو کچھ مطالبہ اور سود دوسروں کے ذمہ ہے وہ کالعدم قرار دیا جاتا ہے۔ **"واول ربا اضعه ربا عباس ابن عبدالمطلب"** (پہلا سود جو میں ختم کرتا ہوں وہ عباس ابن عبدالمطلب کا سود ہے۔)

اسی طرح آپ کو یہ اعلان فرمانا تھا کہ جاہلیت (ماقبل اسلام) میں جو خون کے مطالبے چلے آرہے تھے، اور ایک مقتول کے بدلے میں قاتل قبیلہ کے کسی آدمی کا قتل کر دینا جائز سمجھا جاتا تھا، میں اس جاہلی رسم کو بھی ہمیشہ کے لئے ختم کرتا ہوں، اس کے لئے بھی آپ بطور نمونہ کے کسی ایسے مقتول کا نام نہ لے سکتے تھے، جس کے خون کا بدلہ ابھی نہیں لیا گیا تھا اور آپ کو بہت سی ایسی مثالیں مل سکتی تھیں، لیکن اس کے لئے بھی آپ نے اپنے ہی خاندان کے ربیعہ ابن الحارث ابن المطلب کے بچے یعنی اپنے ایک بھتیجہ کا نام لیا، آپ نے فرمایا **"وان اول دمائکم اضع دم ابن ربیعه ابن الحارث ابن عبدالمطلب وکان مسترضعاً فی**

بني ليث فقتله هذيل فهو اول مابعد ابه من دماء الجاهلية"(۱)

ترجمہ:۔ اور پہلا جاہلی خون جس کو میں ساقط کرتا ہوں وہ ربیعہ ابن الحارث ابن عبدالمطلب کے بچہ کا خون ہے جو قبیلہ بنولیث میں دودھ پیتا تھا، اس کو قبیلہ ہذیل نے قتل کردیا تھا، وہ جاہلیت کا پہلا خون ہے جس سے میں آغاز کرتا ہوں۔

لیکن جب زکوٰۃ کے مستحقین کے ذکر کا موقع آیا اور یہ بتانے کی ضرورت ہوئی کہ زکوٰۃ کس کس کو دی جاسکتی ہے اور اس سے کون کون فائدہ اٹھا سکتا ہے؟ تو آپ نے اپنے خاندان بنی ہاشم اور قیامت تک ان کی نسل کو اس نفع بخش اور دائمی سلسلے سے فائدہ اٹھانے سے محروم کردیا اور فرمایا کہ بنی ہاشم کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔

خواص امت کا طرز عمل:

آیئے اب امت کے خواص کے صف اول کے لوگوں کی زندگی کا جائزہ لیں، ان میں سب سے پہلے رفیق غار اور خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام آتا ہے، انہوں نے جب خلافت کی ذمہ داری سنبھالی تو اپنے گزر اوقات کے لئے مسلمانوں کے بڑے اصرار سے جو روزینہ قبول کیا وہ ایسا تھا کہ جس سے کم میں شاید اس وقت کسی معمولی سے معمولی مسلمان شہری کی گزر بسر نہیں ہوسکتی تھی۔ حالانکہ وہ خلافت سے پہلے مسلمانوں کے آسودہ حال طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور مکہ و مدینہ کے ایک کامیاب تاجر تھے، اس روزینہ میں بھی ان کے احتیاط کا یہ حال تھا کہ جب ان کی اہلیہ محترمہ نے منہ کا مزہ درست کرنے کے لئے اس وظیفہ میں سے کچھ رقم حلوے کے لئے پس انداز کرلی تو انہوں نے بیت المال کے ذمہ داروں کو ہدایت کردی کہ اب اتنی رقم کاٹ کر روزینہ دیا جائے اس لئے کہ تجربے نے بتایا ہے کہ اس سے کم رقم میں ابوبکرؓ کے گھرانے کا گزر ہوسکتا ہے۔

یہ ان کی احتیاط اور طرز معیشت کا ایک نمونہ تھا کہ وہ طبقہ خواص میں ہونے اور سب سے بڑے اسلامی منصب پر فائز ہونے کا مطلب یہ نہیں سمجھتے تھے کہ وہ سب سے اچھا کھائیں، سب سے اچھا پہنیں اور سب سے بہتر زندگی گزاریں، بلکہ اس کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ

(۱) (سیرۃ ابن ہشام جلد ۴، صفحہ ۲۷۵)

وہ سب سے کم پر قناعت کریں یا کم سے کم سب کے مساوی زندگی گزاریں۔

اب ان کے احساس ذمہ داری کا ایک اور نمونہ دیکھئے، اسلام اور ملت کو جو خطرات پیش آئے اور ان کی زندگی میں جو نازک ترین گھڑیاں آئیں، اس موقع پر ان کا احساس اور ان کے قلب و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے اور وہ اس کا درد اپنے جگر میں کس طرح محسوس کرتے ہیں؟ اس کے لئے ایک ہی واقعہ اور ان کا ایک ہی جملہ کافی ہے اور اسی میں ان کی سیرت کا پورا جوہر اور ان کا مزاج اور انداز فکر آ گیا ہے، وہ جملہ طبقہ خواص کے لئے ایک تازیانہ اور ایک درس موعظت و عبرت ہے۔

جب عرب قبائل میں ارتداد کی آگ بھڑکی اور بہت سے قبائل نے صاف صاف یہ کہنا شروع کیا کہ ہم نماز، روزہ اور حج کی فرضیت کے قائل ہیں لیکن ہم زکوۃ کو یہ مقام دینے کے لئے تیار نہیں اور اس طرح فرائض و ارکان دین میں تبدیلی کا فتنہ اور اسلام میں تحریف کا دروازہ کھل رہا تھا، تو حضرت ابوبکرؓ تڑپ اٹھے، ان کی زبان سے اس وقت جو فقرہ نکلا وہ تاریخ نے جوں کا توں محفوظ کر دیا ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ "اینقص الدین و انا حی" کیا میرے جیتے جی دین میں قطع و برید ہو سکتی ہے، میں زندہ ہوں اور رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین میں کتر بیونت ہونے لگے؟ یہ قیامت تک نہیں ہو سکتا، بس اسی وقت اس فتنے کے سدباب کے لئے اور اس دروازے کو ہمیشہ کے لئے بند کرنے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی اور بپھرے ہوئے شیر کی طرح میدان میں آ گئے۔ ان کی دینی غیرت اور ان کی صدیقی شجاعت و استقامت نے ہمیشہ کے لئے دین کو ایسی تحریف سے اور امت کو ایسے خطرے سے محفوظ کر دیا کہ آج زکوۃ کا رکن اسی طرح زندہ اور تابندہ ہے جس طرح نماز، روزہ اور حج۔

اہل فکر و قائدین کا مقام اور ذمہ داری:

ملت کو جو خطرات و مصائب پیش آتے ہیں ان میں بہت سے خطرات و مصائب وہ ہیں جن کو عالی اور کم پڑھے لکھے افراد بھی محسوس کرتے ہیں، ان کے احساس کے لئے کسی خاص ذہانت و فراست اور کسی خاص دور بینی اور باریک بینی کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً اتلاف جان و مال، فسادات و ہنگامے، تنگدستی اور بے روزگاری وغیرہ وغیرہ۔ لیکن کچھ خطرات اور مصائب وہ

ہیں جن کو صرف وہ خواص ہی محسوس کر سکتے ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے فہم و فراست کی دولت بخشی ہے، ان کی نگاہ معاملات کی تہہ تک پہنچتی ہے، اقوام و ملل کی تاریخ پر ان کی نظر ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو دینی حمیت اور ملی غیرت کا جوہر بھی عطا فرمایا ہے، وہ ان خطرات اور مصائب سے بدرجہا زیادہ "معنوی خطرات اور مصائب کو محسوس کرتے ہیں، اور مستقبل کے تصور سے ان کی راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ مثلاً ذہنی و تہذیبی ارتداد کا خطرہ اس زبان و کلچر سے محرومی جو دینی معلومات سے مالا مال اور اسلامی روح و مزاج کی حامل ہو اور جس سے نئی نسلوں کا اپنے اسلاف اور حال کا ماضی سے رشتہ قائم ہوتا ہے۔ نیا نظام تعلیم جس کے اثر سے مسلمانوں کی نئی نسل کا اسلامی تعلیمات سے نا آشنا اور خلاف اسلام اور منافی توحید عقائد و افکار سے متاثر ہونا بالکل قدرتی امر ہے، مسلمانوں کی اپنی مستقل شخصیت اور ملی خصائص اور اسلامی تہذیب سے محرومی اور اکثریت کی تہذیب، فلسفہ اور شخصیت میں تحلیل ہو جانے کا خطرہ ہے، یہ وہ خطرات ہیں جن کی سنگینی کو صرف طبقہ خواص کے لوگ ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ وہ اکثر اقبال کے الفاظ میں اس طرح گویا ہوتے ہیں:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

قرآن شریف کی آیت ہے: "یآیھا الذین آمنوا اصبروا و صابروا و رابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون"

ترجمہ: اے ایمان والو! صبر کرو ایک دوسرے کو صبر کی ترغیب دو اور موروچوں پر جمے رہو اور ہر حال میں خدا سے ڈرتے رہو تا کہ (اپنے مقصد میں) کامیاب ہو۔

اس آیت میں "اصبروا" کے ساتھ "صابروا" کی ہدایت و تلقین کی حکمت اور اس کا راز بڑا غور طلب ہے، اقوام و ملل کی زندگی اور قوموں کے عروج و زوال کے مسئلہ میں صرف انفرادی صبر و استقامت کافی نہیں ہوتی، اجتماعی صبر و استقامت اور ہمت و استقلال کی ایک عام فضا اور ماحول کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہر فرد دوسرے فرد کے لئے باعث تقویت، اس کا پشت پناہ، اپنی جگہ پر صابر و تقسیم اور دوسروں کے لئے صبر و استقامت کا داعی و مبلغ ہو، ا ، کی زندگی، اس کا ایمان و یقین، اس کا صبر و توکل، اس کا عزم و حوصلہ، اس کا بلند کردار، دوسر ، ،

میں اعتماد پیدا کرنے کا ذریعہ اور ان کے لئے مشعلِ راہ ہو، اس کو دیکھ کر اکھڑتے ہوئے قدم جم جائیں، افسردہ طبیعتیں اور پست ہمتیں بلند و مستحکم ہو جائیں، اس فضا میں بے ہمتی اور بے صبری کی بات کہنا اور کرنا ایسا ہی مشکل ہو جائے اور معیوب سمجھا جائے جیسے تردد و تذبذب کے ماحول اور خوف و ہراس کے عالم میں صبر و ہمت کی تلقین و ثبات واستقامت کی ہدایت۔

حفاظتِ دین و ملت کا مورچہ:

پھر فرمایا ''ورابطوا'' (اور مورچوں پر جمے رہو) اس موقع پر یاد رکھنا چاہئے کہ مورچے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک فوجی اور زمینی مورچہ، دوسرے معنوی مورچہ، فوجی و زمینی مورچہ بھی بہت اہم ہے، اور زندہ و غیور قومیں اس پر گھٹنے ٹیک دیتی ہیں اور اس کی حفاظت میں جان کی بازی لگا دیتی ہیں، مگر یہ مورچہ قومی زندگی میں فیصلہ کن حیثیت نہیں رکھتا، قوموں کی زندگی میں میدانِ جنگ کی شکست یا کسی مورچے سے پسپائی ان کی قسمت پر مہر نہیں لگا دیتی، دنیا میں قومیں شکست بھی کھاتی رہی ہیں، اور فتح بھی حاصل کرتی رہی ہیں، اپنے مورچوں سے ہٹتی بھی رہی ہیں اور ان کو واپس بھی لیتی رہی ہیں، عہدِ نبوی ﷺ، دورِ صحابہؓ اور تاریخ اسلام کے ہر عہد میں یہ نشیب و فراز اور یہ سرد و گرم پیش آتے رہے ہیں اور جو قوم اس نشیب و فراز سے نہیں گزرتی اور شکست کی تلخی سے اس کے کام و دہن کبھی آشنا نہیں ہوتے وہ صرف فتح کی لذت و حلاوت سے آشنا ہوتی ہے۔ اس قوم کی صلاحیت پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اس لئے قوموں کی تربیت کے لئے یہ دونوں تجربے ضروری ہیں اور خدا نے اپنے محبوب پیغمبر اور اس کے برگزیدہ اصحاب کو ان دونوں راستوں سے گزارا ہے۔

لیکن معنوی مورچوں کا معاملہ ان سے بالکل مختلف ہے، کسی معنوی مورچہ پر شکست و پسپائی بعض اوقات صدیوں و ہزاروں برس کا فیصلہ کر دیتی ہے اور بعض اوقات اس سے کسی قوم و ملت کی قسمت پر مہر لگ جاتی ہے۔ آج ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ کو یہی معنوی مورچہ درپیش ہے، ملت کی جداگانہ شخصیت کا مورچہ، اسلام کی مستقل تہذیب کا مورچہ، اسلام کے عائلی قانون (پرسنل لاء) کا مسئلہ، زبان و کلچر کا مسئلہ، آئندہ نسلوں کی تعلیم کا مورچہ، ان مورچوں کی حفاظت ''خواص'' ہی کر سکتے ہیں، اس کے لئے جس علم، جس فہم، جس احساس، جس دروں بینی

اور حقیقت شناسی اور مقصد کی تکمیل کے لئے جن وسائل وذرائع کی ضرورت ہے، وہ اسی طبقہ کے پاس ہے، ان کی بروقت فرض شناسی اور مستعدی، ان کی بے چینی اور دردمندی مدتوں کے لئے اس خطرہ کو ٹال سکتی ہے اور ملت کو اس خطرے سے محفوظ بنا سکتی ہے اور ان کی ذرا سی غفلت وسستی ملت کے قافلہ کو سالوں اور صدیوں کے حساب سے منزل سے دور کر سکتی ہے۔ انہوں نے اگر اپنے ذاتی مقاصد ومفادات کو ملت کے مفاد پر، اپنی ذات کو پیش آنے والے دور، از کار، خطرات کو ملت کے حقیقی خطرات پر ترجیح دی تو ان مورچوں پر شکست یقینی ہے:

رفتم کہ کار از پا کشم محمل نہاں شداز نظر
یک لحظہ غافل بودم وصد سالہ راہم دور شد

ملت کے نمائندوں کی کمزوری کا خمیازہ:

ان خواص کی جو صرف اپنی دولت، تمول، کاروبار اور نسبی وخاندانی تفوق کی وجہ سے طبقہ خواص میں سمجھے جاتے ہیں، اور معاشرے میں "بڑے آدمی" کہلاتے ہیں، ملت کے مفادات وضروریات سے غفلت اور چشم پوشی، اسراف بے جا، دولت کا غلط استعمال اور ملت فراموشی کا اثر، ملت اور اس کے مستقبل پر اتنا اثر انداز نہیں ہوتا، اور اس کی قسمت کا فیصلہ اس طرح نہیں کرتا جس طرح ملت کے ان نمائندوں، زعماء وقائدین، ممتاز اہل فکر اور دانشور طبقہ کی وہ کمزوری کرتی ہے، جس کو اگر ہم ان کے احترام میں ملت فروشی نہ کہیں تو ملت فراموشی کہنے پر مجبور ہیں۔

یہ طبقہ جو اپنے دل کی آواز، ملت کی پکار اور ضمیر کے تقاضے کے بجائے اپنے ذاتی مفادات اور شخصی کامیابیوں کو ترجیح دیتا ہے اور جاہ پرستی وحصول اقتدار کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور اسی کو زندگی کا نصب العین اور ترقی کی معراج سمجھنے لگتا ہے، حق بات کہنے میں اس کی زبان گنگ، اور اس کے لب بستہ ہوتے ہیں، بڑے بڑے ملی مصائب کے وقت بھی اس کے اندر حمیت وغیرت کا کوئی جذبہ انگڑائی نہیں لیتا اور اس کو ظالم کہنے کی توفیق نہیں ہوتی، وہ اپنی نشست محفوظ رکھنے، اپنے عہدے اور اعزاز کو برقرار رکھنے یا اس کے حصول کے لئے بڑے سے بڑے ملی نقصان کو برداشت اور بڑے سے بڑے المیہ کو انگیز کر لیتا ہے، بڑے سے بڑے محضر قتل پر دستخط کرنے میں اس کو باک نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات اپنے ایک موہوم فائدے اور

محدود عارضی جاہ واقتدار کے لئے پوری ملت کو خطرے میں گرفتار اور اس کے بڑے سے بڑے مقدس اثاثہ اور ورثہ کا سودا کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اقبال نے "شیخ حرم" کہہ کر اسی طبقہ کی تصویر کھینچی ہے، جس کے ہاتھ میں بدقسمتی سے ملت کی قیادت ونمائندگی آجاتی ہے، وہ کہتے ہیں:

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ ودلق اویسؓ و چادر زہراؓ

ملتوں اور قوموں کی تاریخ اور خصوصیت کے ساتھ اس ملت کی تاریخ شاہد ہے کہ اسی طبقہ کی ضمیر فروشی، یا بے ضمیری، مفاد پرستی، جاہ طلبی اور اقتدار کی ہوس نے بڑی بڑی مستحکم اور طویل العمر سلطنتوں کا چراغ گل کر دیا اور پوری ملت کو آن کی آن میں ذلیل کر کے رکھ دیا، خلافت عباسیہ کا خاتمہ، بغداد کی تباہی، بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ، سلطنت مغلیہ کا زوال، میسور کی ابھرتی ہوئی طاقت کا خاتمہ اور ٹیپو کی ناکامی، ترکوں کی شکست اور مقامات مقدسہ اور ممالک عربیہ کا اتحادیوں کے زیر اثر آنا، سب اسی طبقہ کی ملت فروشی، جاہ واقتدار کی ہوس اور انانیت کا نتیجہ ہے۔

ملت کے نمائندوں اور منتخب افراد کی ذمہ داری:

ایک جمہوری، آزاد وترقی یافتہ ملک میں یہ اچھا یا برا کردار ملت کی حفاظت یا ملت کی ہلاکت کا پارٹ "خواص" کا وہ طبقہ ادا کرتا ہے جو مجالس قانون ساز، پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں اس ملت کا نمائندہ یا حکومت وانتظامیہ میں بڑے بڑے عہدوں اور منصوبوں پر فائز ہوتا ہے، یا صحافت وسیاست میں اونچا مقام رکھتا ہے، یا ملک کے دانشوروں، اہل قلم اور مفکرین میں ان کا شمار ہوتا ہے، اسی طبقہ کا ایک ایک فرد ہزاروں، لاکھوں کے مقابلے میں زیادہ وزن واعتبار رکھتا ہے۔

اس طبقہ کی دینی حمیت وملی غیرت، اخلاقی جرأت، معمولی قربانیاں، صدیوں کے لئے ملت کا مستقبل محفوظ کر دیتی ہیں، اور جو کام بعض اوقات لاکھوں کروڑوں انسان انجام نہیں دے سکتے، وہ یہ مٹھی بھر جماعت انجام دے دیتی ہے، وہ اگر کسی ملی مسئلہ پر یک زبان و یک

آواز ہو جائے اور ملت کے دین، اس کی تہذیب یا اس کی ثقافت اور کلچر یا اس کے قانون و شریعت کو بچانے، یا ملت کو باعزت با اصول رکھنے کے لئے اپنے ذاتی مفاد کو ٹھکرا دیتے ہیں اور اقتدار کی کرسی اور جاہ و اعزاز سے دستبردار ہو جانے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں، ایوان ہائے قانون ساز کی رکنیت، صدارتیں اور قیادتیں، عہدے اور اس مقصد عزیز کے سامنے پرکاہ کے برابر بھی نہ معلوم ہو، تو چشم زدن میں بڑے بڑے فیصلے بدل جائیں، ناممکن ممکن ہو جائے، خطرے کے پہاڑ اور چٹانیں ریت کے ذرات میں تبدیل ہو جائیں اور پوری ملت، عزت و توقیر، شرف و اعتبار سے ہمکنار ہو۔

لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے، ان کو ملت کے اجتماعی مفاد کے مقابلے میں اپنی کرسی عزیز ہوتی ہے اور اپنا مفاد مقدم، ان کو ادنیٰ سے ادنیٰ خطرہ مول لینے کی جرأت نہ ہوتی، یا حکومت و اکثریت کی پیشانی پر ادنیٰ سی شکن پڑنے کی ہمت نہیں ہوتی، وہ اپنے حقیر فائدے کے لئے ملت کے بڑے سے بڑے نقصان، اس کی تہذیب کا زوال اور اس کے ذہنی و دینی ارتداد تک گوارا کر لیتے ہیں اور ملت کے تمام مفادات، اس کی موت و حیات کے مسئلے سے آنکھیں بند کر کے اپنے منصوبوں کی تکمیل، اپنے خوابوں کی تعبیر اور اپنے محلوں کی تعمیر میں لگے رہتے ہیں، اور کوئی بڑے سے بڑا واقعہ یا حوادث کا تازیانہ، ان کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لئے کافی نہیں ہوتا، تو پھر اس ملت کی قسمت پر مہر لگ جاتی ہی اور اس کے بڑے سے بڑے مخلص و ناصح اور چارہ گر و مسیحا اس کے درد کی دوا نہیں کر سکتے۔

یہاں آ کے دیتا ہے رو ابر نسیاں

دین کی نبوی مزاج، اوراس کی حفاظت کی ضرورت

یہ تقریر حضرت مولانا علی میاں نوراللہ مرقدہ نے مورخہ ۳ نومبر ۱۹۸۱ء کو کشمیر کے دورے پر مرکز جماعت اسلامی سرنگر میں فرمائی تھی، اس موقعہ پر جماعت کے رفقاء، ہمدردوں اور کارکنوں کے علاوہ دوسرے تعلیم یافتہ حضرات کی بھی خاص تعداد موجود تھی۔

الحمد لله رب العلمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين خاتم النبيين محمد واله وصحبه اجمعين ومن تبعهم باحسان ودعا بدعوتهم الى يوم الدين امابعد ـ

جناب قائم مقام امیر جماعت، رفقاء، احباب اور معزز حاضرین، میں سب سے پہلے تو آپ کی اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کا اظہار آپ نے اس دعوت اور پھر اس سپاسنامہ کے ذریعہ کیا، اللہ تعالےٰ آپ کے حسن ظن کے حق بجانب ثابت کرے اور توقعات کو پورا کرے، جن کا آپ نے اس محبانہ سپاسنامہ میں اظہار فرمایا ہے، میرا احساس ہے کہ اس وقت میں ایک ایسی صاحب علم وفکر جماعت سے خطاب کر رہا ہوں، جس کی تشکیل فکر ومطالعہ پر ہوئی ہے، یہ عوام کا کوئی مجمع نہیں ہے، اس لئے میری تقریر میں اگر خطیبانہ عنصر نہ ہوتو آپ اس کو بے محل نہ سمجھیں۔

آپ نے جس محبت، حسن ظن اور اعتماد کا اظہار فرمایا ہے، اس کا بھی حق ہے اور میرے ضمیر اور میرے محدود فکر ومطالعہ اور تجربہ کا بھی تقاضہ ہے کہ میں آپ کے سامنے وہ چیز رکھوں جو مجھے خود بھی عزیز ہے، اور اس کو اہم اور ضروری سمجھتا ہوں، حدیث میں آتا ہے، ''لایؤمن أحدکم حتی یحب لأخیه مایحب نفسه'' تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا (لفظ تو حدیث کے یہی ہیں، مگر ہمارے علماء نے بہت سے اعتراضات اور خدشوں سے بچنے کے لئے اس کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے کہ ''تم میں سے کوئی شخص مومن کامل نہیں ہوسکتا'') جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، ذمہ دار حضرات اور

جماعت کے افراد سے اس کی بھی امید کرتا ہوں کہ جس تناسب اور جس انداز سے میں بات کہہ رہا ہوں، اسی تناسب اور انداز کے ساتھ آپ اخذ بھی کریں گے، اور اسی طرح دوسروں تک بھی پہونچائیں گے۔

حضرات! جس جماعت سے کسی تعلیم، تحریک، فلسفہ یا دعوت کا اخذ کیا جائے، اسی جماعت کا مزاج اس تحریک، تعلیم یا دعوت یا فلسفہ میں جاری ساری ہوتا ہے، یہ ایک قدرتی بات، ایک فطری عمل اور سنة اللہ ہے، آپ جن استادوں سے پڑھتے ہیں، ان استادوں کا طریق فکر، بلکہ انداز گفتگو بعض اوقات چال ڈھال بھی اس سے ملنے لگتی ہے، آپ جس گروہ کے ساتھ زیادہ اٹھتے بیٹھتے ہیں، شعوری یا غیر شعوری طریقہ پر آپ کے فکری سانچہ کو، آپ کے احساسات کو، آپ کے طریق تعبیر اور اظہار مافی الضمیر کو متاثر کرتا ہے، یہ قدرتی بات ہے کہ ایک فن طب ہی کو لیجئے (خواہ طب قدیم ہو یا طب جدید) میں نے دیکھا ہے، اسی طریقے سے ہونہار شاگرد نسخہ لکھتے ہیں، اسی طرح سے مرض کی تشخیص کرتے ہیں، وہی پرہیز اور اسی طرح کی احتیاطیں بتاتے ہیں، بلکہ بعض اوقات دیکھا ہے کہ وہ نقل بالکل مطابق اصل ہوتی ہے، اسی طریقہ سے جو لوگ کشتی کا فن سیکھتے ہیں، وہ اپنے استادوں کے کرتب داؤں پیچ، اکھاڑے میں اترنے اور دو دو ہاتھ کرنے کا انداز اپنا لیتے ہیں۔

اقبال نے اپنی غزل اور شاعری کے متعلق کہا ہے، مگر حقیقت اس سے زیادہ وسیع ہے۔

ہے رگ ساز میں رواح صاحب ساز کا لہو

میرے بھائیو! یہ دین جس کی نعمت سے اللہ نے ہم کو اور آپ سب کو سرفراز فرمایا ہے، نہ دانشوروں سے اخذ کیا گیا ہے، نہ حکماء فلاسفہ سے، نہ سیاست دانوں سے، نہ اہل حکومت و بانیانِ سلطنت سے، نہ فاتحین سے نہ خالص ذہین لوگوں سے یہ ماخوذ ہے انبیاء علیہم السلام سے، اس لئے اس دین کے اخذ کرنے والوں میں اس دین پر چلنے والوں میں اس دین کی دعوت دینے والوں اور دین کا فکر پیش کرنے والوں میں انبیاء علیہم السلام کا مزاج جاری و ساری ہونا چاہئے، یہی اس'' دانشگاہ'' کے طالب علموں کی سب سے بڑی ترقی، سعادت اور (تعبیر غلط نہ ہو تو) معراج ہے کہ وہ ''نبوی مزاج'' زیادہ سے زیادہ اخذ کریں، اس میں کامیاب ہوں۔

میں اس موقعہ پر آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں، جس سے شاید میری بات زیادہ سمجھ میں

آئے، کہتے ہیں اورنگ زیب عالمگیر کے پاس ایک بہروپیا آتا تھا، وہ مختلف روپ بدل کر آتا تھا، اورنگ زیب ایک فرزانہ و تجربہ کار شخص تھے، جو اس طویل وعریض ملک پر حکومت کر رہے تھے، اس کو پہچان لیتے، وہ فوراً کہہ دیتے کہ فلاح ہے، میں جانتا ہوں، وہ ناکام رہتا، پھر دوسرا بھیس بدل کر آتا پھر وہ تاڑ جاتے اور کہتے کہ میں نے پہچان لیا تو فلاں کا بھیس بدل کر آیا ہے تو تو فلاں ہے، بہروپیا عاجز آ گیا، اخیر میں کچھ دنوں تک خاموشی رہی، ایک عرصہ تک وہ بادشاہ کے سامنے نہیں آیا، سال دو سال کے بعد شہر میں یہ افواہ گرم ہوئی کہ کوئی بزرگ آئے ہوئے ہیں، اور فلاں پہاڑ کی چوٹی پر خلوت نشین ہیں، چلہ کھینچے ہوئے ہیں، بہت مشکل سے لوگوں سے ملتے ہیں، کوئی بڑا خوش قسمت ہوتا ہے جس کا وہ سلام یا نذر قبول کرتے ہیں، اور اس کو باریابی کا شرف بخشتے ہیں، بالکل یکسو اور دنیا سے گوشہ گیر ہیں، بادشاہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریک کے مکتب کے پروردہ تھے، اور ان کو اتباع سنت کا خاص اہتمام تھا۔ وہ اتنی جلدی کسی کے معتقد ہونے والے نہیں تھے، انھوں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا،، ان کے ارکین دربار نے کئی بار عرض کیا کہ کبھی جہاں پناہ بھی تشریف لے چلیں، اور بزرگ کی زیارت کریں، اور ان کی دعا لیں، انھوں نے ٹال دیا، دو چار مرتبہ کہنے کے بعد بادشاہ نے فرمایا کہ اچھا بھئی چلو کیا حرج ہے، اگر خدا کا کوئی مخلص بندہ ہے، اور خلوت گزیں ہے، تو اس کی زیارت سے فائدہ ہی ہو گا، بادشاہ تشریف لے گئے، اور مؤدب ہو کر بیٹھ گئے، اور دعا کی درخواست کی، اور نذر دکھائی، درویش نے لینے سے معذرت کی، بادشاہ وہاں سے رخصت ہوئے تو درویش کھڑے ہو گئے اور آداب بجالائے، فرشی سلام کیا اور کہا کہ جہاں پناہ مجھے نہیں پہچان سکے، میں وہی بہروپیا ہوں جو کئی بار آیا، اور سرکار پر میری قلعی کھل گئی، بادشاہ نے اقرار کیا، کہا کہ بھائی بات تو ٹھیک ہے، میں اب کی بار نہیں پہچان سکا، لیکن یہ بتاؤ کہ میں نجیب تمہیں اتنی بڑی رقم پیش کی جس کے لئے تم یہ سب کمالات دکھاتے تھے، تو تم نے کیوں نہیں قبول کیا، اس نے کہا سرکار، میں نے جن کا بھیس بدلا تھا، ان کا یہ شیوہ نہیں، جب میں ان کے نام پر بیٹھا، اور میں نے ان کا کردار ادا کرنے کا بیڑہ اٹھایا تو مجھے شرم آئی کہ میں جن کی نقل کر رہا ہوں، ان کا طرز نہیں کہ وہ کسی بادشاہ کی رقم قبول کریں، اس لئے میں نے نہیں قبول کیا، اس واقعہ سے دل و دماغ کو ایک چوٹ لگتی ہے کہ ایک بہروپیا یہ کہہ سکتا ہے، تو پھر سنجیدہ لوگ، صاحب دعوت، انبیاء علیہم السلام کی دعوت

قبول کر کے ان کا مزاج اختیار نہ کریں، یہ بڑے ستم کی بات ہے، میں نے یہ لطیفہ تفریحِ طبع کے لئے نہیں بلکہ ایک حقیقت کو ذرا آسان طریقہ پر ذہن نشین کرنے کے لئے سنایا۔

ہم داعی و مبلغ ہوں، یا دین کے ترجمان، یا شارح، ہمیں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ یہ دین اور دعوت ہم نے انبیاء علیہم السلام سے اخذ کی ہے، اگر انبیاء علیہم السلام یہ دعوت لے کر نہ آتے تو ہم کو اس کی ہوا بھی نہ لگتی، قرآن شریف میں آتا ہے کہ جب جنت والوں کو آخرت میں انعام ملے گا، اور وہ جنت میں پہونچیں گے تو وہ کہیں گے، کہ ''الحمد لله الذی هدانا لهذا وما كنا لنهتدی لو لا ان هدانا الله'' (شکر ہے اس خدا کا جس نے کہ ہمیں یہاں تک پہونچایا، اور ہم یہاں تک پہونچنے والے نہ تھے، اگر اللہ ہمیں یہاں تک نہ پہونچاتا) ہدایت کے معنی پہونچانے کے ہیں، اس کے بعد انھوں نے ایک بڑی حقیقت بیان کی، جس کی طرف میں متوجہ کرنا چاہتا ہوں، ہم جو یہاں تک پہونچے، عقل و دانش کی راہ سے نہیں پہونچے، تجربہ کی راہ سے نہیں پہونچے، اشراقیت نفس کشی اور ریاضت و مجاہدہ کی راہ سے نہیں پہونچے، فلسفہ و حکمت کی راہ سے بھی نہیں پہونچے، پہلے تو انھوں نے اجمالاً کہا ہے'' وما كنا لنهتدی لو لا ان هدانا الله'' (ہماری رسائی یہاں تک نہ تھی، اگر خدا ہمیں یہاں تک نہ پہونچا دیتا) لیکن خدا کے پہونچانے کے طریقے ہوتے ہیں، اس کا بھی ایک ذریعہ ہوتا ہے، تو اس کا ذریعہ کیا ہوا، ''لقد جآءت رسل ربنا بالحق'' ہمارے رب کے قاصد حق لے کر آئے، جانِ سخن یہ ہے کہ خدا کے ایلچی اور سفیر حق لے کر نہ آتے تو ہم یونہی بھٹکتے رہتے اور آج جنت کے بجائے ہمارا کوئی دوسرا مقام ہوتا، تو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ جس چیز نے ہم کو اس قابل بنایا، وہ چیز دانشوروں، فلسفیوں، سیاستدانوں اور تجربہ کاروں سے سے اخذ کی ہوئی نہیں ہے، پیغمبروں سے اخذ کی ہوئی ہے، اور اس کا کوئی ذریعہ نبوت و رسالت اور اس کے حاملین (انبیاء کرام) کے علاوہ نہیں ہوسکتا، ہم نے اس کو قبول کر لیا تو اس قابل ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ان نعمتوں ان سعادتوں اور صداقتوں سے فیض یاب اور بہرہ اندوز ہوں، اور دوسروں تک بھی ان کو پہونچائیں۔

اب ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ نبوت کا مزاج کیا ہے؟ نبوت کیلئے متحرک کیا چیز ہوتی ہے؟ نبی کے سوچنے کا اندازہ کیا ہوتا ہے؟ اس لئے اس وقت آپ ﷺ کے سامنے تین چیزیں عرض کرتا

ہوں۔

پہلی بات یہ ہے کہ نبی کی دعوت، جدو جہد اور قول و عمل کا سب سے بڑا محرک رضائے الٰہی کا جذبہ ہوتا ہے، کوئی اور چیز ان کے سامنے نہیں ہوتی کہ اس کے نتیجہ میں یہ ملے یا وہ ملے، یہ جذبہ ایک ایسی شمشیر برہنہ ہے، جو ہر چیز کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے، سوائے رضائے الٰہی کے، ان کا کچھ مطلوب نہیں ہوتا، میرا مالک مجھ سے راضی ہو جائے، بس مجھے سب کچھ مل گیا طائف کی دعا کی روح پر آپ غور کریں، اور طائف کے منظر کو آپ سامنے رکھیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بڑی امیدوں، اور بڑی توقعات کے ساتھ طائف تشریف لے جاتے ہیں، طائف کا سفر آسان نہیں تھا، سخت دشوار گذار راستہ، پہاڑ کی چڑھائی اور خچر کی سواری، ایک اکیلا رفیق (زید ابن حارثہؓ) آپ وہاں پہونچے تو کیا ہوا؟ وہاں کے سرداروں نے کچھ اوباشوں کو اشارہ کر دیا اور انھوں نے پتھر پھینکنے شروع کئے اور اتنی سنگ باری کی کہ نعلین مبارک سے قدم مبارک نہیں نکلتے تھے، قدم مبارک لہولہان ہو گئے تھے، اس وقت پاؤں پر اتنا زخم نہیں آیا تھا، جتنا دل پر آیا تھا، کیا امید لے کر آئے تھے، اور کیا ہوا، یہاں تو کوئی بات سننے کا بھی روادار نہیں ہے، اسی حالت میں آپ نے یہ دعا فرمائی، اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ رضائے الٰہی کی قیمت کیا ہے، آپ نے فرمایا" **اللھم الیک أشکو ضعف قوتی وقلة حیلتی وھوانی علی الناس، رب المستضعفین الی من تکلنی الی بعید یتجھّمنی أو الی عدو ملّکته أمری** "فرماتے ہیں کہ اے میرے پروردگار میں تجھ سے فریادی ہوں اپنی کمزوری کا، اور اپنی بے چارگی اور بے سروسامانی کا، لوگوں کی نگاہوں میں بے وقعتی، بے بسی اور بے کسی کی آپ سے شکایت کرتا ہوں، اے کمزوروں کے پروردگار ن تو مجھے کس کے حوالہ کرتا ہے؟ ایک ایسے بیگانہ کے جو مجھ سے ترش روئی کے ساتھ پیش آتا ہے، یا کسی دشمن کے حوالہ کرتا ہے کہ جس کے ہاتھ میں تو نے میری زمام اختیار دے دی ہے۔

اب دیکھئے یہاں نبی کا مزاج اپنی پوری شان تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے، اوپر کے الفاظ کے بعد جو نقل ہوئے معاً فرماتے ہیں "ان لم یکن بک علی غضب فلا اُبالی غیر اَن عافیتک ھی اوسع لی" (اگر تو ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی بات کی پروا نہیں ہے، البتہ اتنا ضروری ہے کہ انسان ہوں تیری عافیت کا طلب ہوں) تو پہلی چیز جو نبی کے مزاج کی بنیادی ہوتی ہے، وہ

رضائے الٰہی ہے، وہ پیغام پہونچاتے ہیں، اور جب ان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم نے پیغام پہونچادیا، اور ہمارا رب ہم سے راضی ہوگیا تو پھر ان کو بالکل پروانہیں ہوتی کہ نتیجہ کیا نکلا۔

اس کی ایک واضح مثال حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ "لبث فیھم الف سنة الا خمسین عاماً" پچاس برس کم ایک ہزار برس وہ دعوت دیتے رہے اور انھوں نے کس طرح دعوت دی، دن رات ایک کردیئے، سورہ نوح کی آیات پڑھئے:۔

قال رب انی دعوت قومی لیلا ونهاراً (نوح. ۵)

کہا اے میرے رب میں نے اپنی کو رات اور دن بلایا۔

ثم انی اعلنت لھم واسررت لھم اسراراً (نوح. ۹)

پھر میں نے انھیں علان یہ بھی کہا، اور مخفی طور پر بھی کہا۔

اس سب کے بعد کیا ہاتھ آیا کہ "وما امن معه الا قلیل" ان کے ہاتھ پر چند آدمی ایمان لائے جو انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، لیکن ان کو ان اس پر کوئی ملال، کوئی شکوہ نہیں، جو میرا کام تھا، وہ میں نے کردیا، میں نے اپنے رب کو راضی کردیا، اب آگے اللہ کا کام ہے۔

سیدنا حضرت حسینؓ کا کارنامہ

تو پہلی بات یہ ہے کہ دین کے ہر عمل کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہونا چاہئے، اس رضائے الٰہی کے سلسلہ میں اگر ساری سلطنت ہمارے ہاتھ سے نکلتی ہو تو وہ سلطنت نکلتی نہیں بلکہ آئی، اور رضائے الٰہی کے بغیر ہفت اقلیم کی سلطنت ملتی ہو تو وہ سلطنت ملی نہیں بلکہ کھوئی، اس لئے میں حضرت حسینؓ کے کارنامہ کو بہت بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں، اور میں ان کو بالکل ناکام نہیں سمجھتا، انھوں نے ایک نظیر قائم کردی کہ حق کے لئے کس طرح سینہ سپر ہوا جاتا ہے، کس طرح جان دی جاتی ہے، انھوں نے اس کی نظیر قائم کردی کہ کسی غلط چیز کے خلاف (واہ اس پر کوئی لیبل لگا ہو) اگر آدمی جدوجہد کرے تو اس کا جواز ہے، اگر حضرت حسینؓ کا یہ کارنامہ نہ ہوتا تو بعد میں بڑی مشکل پیش آتی، کہیں کھلے طریقہ پر دین کو پامال کیا جارہا ہے، یا اسلام کشی، اسلام دشمنی کی جارہی ہے، یا دین میں بالکل تحریف کی جارہی ہے، لیکن اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہ کی جاسکتی کہ عہد سعادت میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔

فرق تو بہت بڑا ہے، تاریخ کا بھی بڑا فاصلہ ہے، اور شخصیت کا بھی بڑا فرق ہے، لیکن یہی معاملہ شہدائے بالاکوٹ اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہید کا ہے، کہ آج ایک چپہ زمین پر ان کی جماعت کی حکومت نہیں، اور خدا کا شکر ہے، اور میں اس پر اللہ تبارک تعالےٰ کی بارگاہ میں شکر ادا کرتا ہوں، میرا بھی ان کے خاندان سے

تعلق ہے، الحمدللہ ہم نے ان کے کام اور ان کے نام سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، ہمارے خاندان کے افراد ملازمتیں کرتے ہیں، محنت کرتے ہیں، عام مسلمانوں کی طرح رہتے ہیں، نہ کوئی سجادگی ہے، نہ کوئی مجاوری، اور نہ یہ کہ انھوں نے جو ریاست بنائی تھی، اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، لیکن ہم خوش اور مطمئن ہیں کہ انھوں نے اپنا فرض ادا کیا، اور خدا کے سامنے سرخرو ہیں۔

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا

قابل غور مقام

انبیاء علیہم اسلام نے کے پیش نظر صرف رضائے الٰہی کا مسئلہ ہوتا ہے اور ہر چیز میں وہ سوچتے ہیں کہ اس سے اللہ راضی ہوتا ہے یا نہیں؟ سربلندی اور اقتدار اور حکومت یہ سب چیزیں اللہ تعالےٰ کے انعامات ہیں، اپنے وقت پر اپنی شرطوں کے ساتھ ملتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی چیز مطلوب نہیں، چنانچہ آپ دیکھئے کہ قرآن مجید میں ایک جگہ تو یہ ہے کہ :۔

تلک الدار الاٰخرة نجعلها للذين لايريدون علواً فى الارض و لا فساداً، و العاقبة للمتقين.

یہ دار آخر ہم ان لوگوں کے لئے مخصوص کریں گے، جو زمین میں سربلندی نہیں چاہتے اور نہ فساد چاہتے ہیں، اور اچھا انجام متقین کے لئے ہے (القصص۔۸۳)

لیکن دوسری جگہ فرماتا ہے:

و لا تهنوا و لا تحزنوا وانتم الاعلون ان كنتم مؤمنين (آل عمران ۱۳۹)

ہمت نہ ہارو، غم نہ کرو، تم ہی اعلیٰ ہو تم ہی کو علو حاصل ہوگا، اگر تم مومن ہو۔

اب دونوں میں تطبیق کس طرح دیں گے؟ صاف مطلب یہ ہوا کہ تم علومت چاہو، ہم

علوم دیں گے، چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرام کسی نے علو نہیں چاہا، اور تواضع اور ایثار اور قربانی سے کام لیا، اللہ تعالیٰ نے جتنا منظور تھا، ان کو علوم عطا فرمایا، تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ مطلوب صرف رضائے الٰہی ہو، اور رضائے الٰہی کے ساتھ اگر ساری دنیا کے فوائد اور ساری دنیا مفادات سے دست بردار ہونا پڑے تو وہ کامیابی ہے، اور رضائے الٰہی کے بغیر اگر ساری دنیا کی سلطنت ملتی ہو تو وہ ناکامی ہے، یہ نبوتی مزاج ہے، جو بغیر کسی تکلف کے اور بغیر کسی پلاننگ کے پیغمبروں اور ان کے سچے متبعین میں پیدا ہو جاتا ہے، قرآن شریف میں اسی مضمون کو اس طرح سے ادا کیا گیا ہے، ''یوم لاینفع مال و لا بنون، الامن اتی اللہ بقلب سلیم'' جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا نہ بیٹے، ہاں جو شخص خدا کے پاس پاک دل لے کر آیا (وہ بچ جائے گا) اس میں غیر اللہ کے مقابلہ میں کوئی اور محرک، کوئی اور طاقت، کوئی اور خواہش نہ ہو اور حضرت ابراہیم کی تعریف ان لفظوں میں کی گئی ہے ''اذ جآء ربہ بقلب سلیم ۔ جب وہ اپنے رب کے پاس (عیب سے) پاک دل لے کر آئے) قلب کو قلب سلیم بنانے کی کوشش ہمیشہ جاری رہنی چاہئے، اور برابر اپنے قلب کا احتساب جاری رہنا چاہئے، کہ اس کے اندر سیاسی مقاصد، مادی مفادات، علو اور سربلندی کا شوق تو کام نہیں کر رہا ہے، اقبال نے صحیح کہا ہے۔

براہیمی نظر پیدا ذرا مشکل سے ہوتی ہے
ہوس سینے میں چھپ چھپ کر بنالیتی ہے تصویریں

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ان الشیطان یجری من المؤمن مجری الدم'' شیطان مومن کے جسم میں بعض اوقات اس طرح سرایت کر جاتا ہے، جس طرح خون رگوں میں دوڑ جاتا ہے، حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت یہی قلب سلیم کی دعوت تھی، تزکیہ واحسان کا لب لباب، اور اللہ کے مخلص بندے جو نفوس اور قلوب کا علاج کرتے تھے، ان کا کام یہی تھا کہ قلب سلیم پیدا ہو وہ چاہتے تھے کہ ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے قلب سلیم کے حامل ہو جائیں، ان کے اندر سے دنیا کی محبت، مال کی محبت، جاہ کی محبت، اور اولاد کی وہ محبت (جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں مزاحم ہو) نکل جائے۔

دوسری یہ ہے کہ وہ انبیاء (اور نائبین انبیاء) دین کی تعلیم اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام

کے بارے میں بڑے غیور ہوتے ہیں، وہ اس میں کوئی ردو بدل نہیں کرتے، وہ اس کو جوں کا توں، بے کم و کاست پہونچاتے ہیں، نہ کوئی (ذہنی) رشوت قبول کرتے ہیں، اور نہ کوئی رشتے دیتے ہیں، کوئی مانے نہ مانے، کوئی ان کی طرف آئے یا نہ آئے، وہ اپنی بات اسی انداز میں کہتے ہیں، جس انداز میں خدا نے ان کو وہ بات عطا کیا اور سمجھائی ہے، مثلاً ایسا ہوا کہ کفار نے مسلمان سے کہا کہ کچھ دن ہمارے بتوں کی عبارت کرلو، اور کچھ دن ہم تمہارے بتوں کی، خدا کے پیغمبرؐ نے جواب دیا، ہرگز نہیں:۔

لا اعبد ماتعبدون و لا انتم عبدون ما اعبد، (الکافرون۲-۳)

نہ تو میں تمہارے معبودوں کی عبادت کرتا ہوں، اور نہ تم ہی میرے معبود کی عبادت کرتے ہو

طائف کے قبیلۂ ثقیف نے چاہا تھا کہ ''لات'' کو جو قبیلہ بنی ثقیف کا بڑا بت تھا، گویا قریش کا بت ''ہبل'' کا ہمسر تھا، نہ توڑا جائے، اور اس کی کچھ عرصہ تک عبادت کرنے کی اجازت دے دی جائے، انھوں نے کہا کہ ایک سال: فرمایا ہرگز نہیں چھ مہینے، فرمایا ہرگز نہیں، ایک مہینہ، فرمایا ہرگز نہیں، ایک دن ہرگز نہیں، اور اس کے بعد حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا، انھوں نے جا کر اس کو پاش پاش کر دیا، انھوں نے کہا کہ ہم دین میں داخل ہوتے ہیں، لیکن نماز سے ہم کو معاف کر دیا جائے، فرمایا ''**لا خیر فی دین لا رکوع فیہ**'' ایسے دین میں کچھ رکھا نہیں جس میں خدا کے سامنے جھکنا نہ ہو۔

میرے بھائیوں، دوستوں!

تو ایک بات تو یہ ہے کہ وہ کسی قسم کا سمجھوتہ (Comrpomize) نہیں کرتے، وہی زبان، وہی الفاظ بولتے ہیں، جو ان کے پیغام اور کار رسالت سے مناسبت رکھتے ہیں، آخرت کی صاف صاف دعوت دیتے ہیں، جنت ودوزخ کو پیش کرتے ہیں، ایمان بالغیب کا مطالعہ کرتا ہے، ان کے زمانہ میں بھی مختلف فلسفے ؛ تے ہیں، ان کے زمانہ میں بھی مختلف گروہوں کی مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں، وہ اس ۔ ناواقف نہیں ہوتے، ان کے زمانہ کے بھی رائج الوقت سکے ہوتے ہیں، وہ ایسا ایک سکہ بھی ' نمال نہیں کرتے، صاف بات کہتے ہیں، اللہ پر ایمان لاؤ، اس کی صفات پر، اس کے افعال پر ۔ لاؤ، اگر ایسا کروگے تو تمہیں جنت ملے گی، ایک مرتبہ بھی نہیں کہتے کہ تمہیں حکومت ملے گی، کہتے ہیں، تمہیں جنت ملے گی، خدا کی

رضا ملے گی۔خدا تم سے راضی ہوگا،قرآن وحدیث میں مجھے کہیں نہیں ملتا کہ دین کہ دین کی دعوت قبول کرنے سے تم کو دنیا میں علو واقتدار اصل ہوگا،اگر کہیں حکومت اور امن وحفاظت کا وعدہ فرمایا ہے تو اس کا اندازہ یہ ہے۔

وعد الله الذين امنوا منكم وعملوا الصلحت ليستخلفنهم في الارض كما استخلف الذين من قبلهم وليمكنن لهم دينهم الذى ارتضىٰ لهم وليبدلنهم من بعد خوفهم امنا. يعبدو ونني لايشركون بي شيا. ومن كفر بعد ذلك فاؤلئك هم الفسقون (النور. ۵۵)

اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے، جو تم میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کئے کہ انھیں ضرور ملک کی حکومت عطا کرے گا، جیسا کہ ان سے پہلوں کو عطا کی تھی، اور ان کے لئے جس دین کو پسند کیا ہیا، اسے ضرور مستحکم کردے گا اور البتہ ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا، وہ میری عبادت کریں گے (اور) میری ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے، اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں

دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

الذين ان مكنهم في الارض اقاموا الصلوٰة و آتوا الزكوٰة (الحج۔۴۱)

وہ لوگ اگر ہم انھیں دنیا میں حکومت دے دیں، تو نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں

یعنی یہ اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ جو ہے، یہ مقصود ہے، ذریعہ نہیں ہے، اس کے راستہ سے حکومت الٰہی تک نہیں پہونچنا، ہے بلکہ حکومت الٰہی کے ذریعہ سے اس کی طرف بڑھنا ہے، اس کے لئے زیادہ سے زیادہ ماحول سازگار کرنا ہے پھر ان کو رائج کرنا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے دین کے مقاصد، مبادی وحقائق اور عقائد کے بارے میں حد درجہ کے غیور، بلکہ ذکی الحس ہوتے ہیں، اور اس میں ذرا سی بھی تبدیلی وتحریف گوارہ نہیں کرتے۔

جب مدینہ والوں نے بیعت عقبہ میں پوچھا کہ یارسول اللہ ہم آپ کا ساتھ دیں گے، اور آپ کی پوری نصرت کریں گے تو ہمیں ملے گا کیا؟ آپ کے لئے بڑا آسان تھا (اور اس کے قرائن موجود تھے) کہ ارے بھائی ہم آجائیں گے اور تم ہمارے ساتھ مل جاؤ گے، تو بادشاہت قائم کرلیں گے، تم کمزور ہو طاقت آئے گی، لیکن اس کے جواب میں فرمایا تو یہ فرمایا

کہ اللہ کی رضا حاصل ہوگی۔

اس کی ایک مثال اور دیتا ہوں، جبلہ ابن ایہم ایک بڑا عرب سردار تھا، غسانی ریاست ملک شام میں ایک پورا اسٹیٹ تھا، ایسے ہی جیسے برطانوی عہد میں، ہمارے یہاں حیدرآباد وغیرہ کی ریاستیں تھیں، وہ اسلام لایا تو ہزاروں اس کے ساتھ مسلمان ہوئے، مکہ آیا تو طواف کرنے لگا، ایک معمولی عربی بدو بھی طواف کر رہے تھے، طواف میں اس کا شاہی لباس چادر لٹک رہی تھی، جیسا کہ بڑے آدمیوں کا دستور تھا، اس پر اس بدو کا پاؤں پڑ گیا، چادر گر گئی تو اتنا جسم کا حصہ اس کا کھل گیا، اس نے اس بدو کو تھپڑ مار دیا، بدو کی یہ ہمت تو نہیں ہو سکتی تھی کہ وہیں تھپڑ مارتا، اس نے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کے پاس شکایت کی اور کہا کہ جبلہ ابن ایہم نے مجھے تھپڑ مارا ہے، جبلہ نے کہا کہ میں تو ایسے دین میں نہیں رہ سکتا جہاں میری ایسی بے حرمتی ہو، وہ چلا گیا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیشانی پر شکن بھی نہیں آئی، جائے، وہ جانے اس کا کام جانے، لیکن ہم حکم الٰہی کو نہیں بدلیں گے، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے سفارش کی فلاں معزز قبیلہ کی عورت نے چوری کی ہے، اس پر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حد جاری نہ ہو، آپ نے فرمایا "**لو سرقت فاطمه بنت محمد لقطعت يدها**" "اگر فاطمہ بنت محمد...... **اعاذها الله تعالىٰ** کاہے کو ایسا ہوتا، کبھی نہ ہوتا...... بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ کاٹتا، فرمایا کہ اللہ کے حدود میں سفارش کرتے ہو اور اتنا فرما کہ حضرت اسامہؓ دہل گئے، پھر کچھ نہ کہا اور حد جاری ہوئی۔

تو ایک بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام دین کو اس طرح پہونچاتے ہیں، انہیں اصطلاحات کے ساتھ پہنچاتے ہیں، جو پیغمبروں کی دعوت اور آسمانی کتابوں میں آئے ہیں، بلکہ الفاظ تک کا تحفظ کرتے ہیں، اور دین کی تعبیر ایسی نہیں کرتے کہ جس سے یہ خیال ہو کہ بہت سے لوگ تو پڑھے لکھے ہیں، بہت ذہن ہیں کھینچ کر چلے آئیں گے، بالکل جیسی چیز ان کو ملتی ہے ویسی ہی چیز ان کے سامنے رکھ دیتے ہیں، لیکن حکمت کے ساتھ، ان کا عمل اس آیت پر ہوتا ہے۔

اُدْعُ الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة (النحل ۱۲۵)

"اپنے رب کے راستہ کی طرف دانشمندی اور عمدہ نصیحت سے بلاؤ۔

لیکن اس میں یہ خطرہ مول نہیں لیتے کہ ذہن دوسرے رخ پر چلا جائے، یہ نبوی مزاج او

رہ یہ دین جو اس وقت تک محفوظ رہا ہے وہ خداداد کے فضل کے بعد اسی وجہ سے ہے کہ امت کے ہر دور میں علمائے ربانی اس کی حفاظت کرتے رہے، انہوں نے اس کی روح کی بھی حفاظت کی، مراتب کی بھی حفاظت کی کہ دین کا جس حکم جس رکن کا جو مقام ہے وہ باقی رہے، جو چیز جس مقام کی ہے وہیں رکھی جائے عبادت عبادت ہے، فرائض فرائض ہیں، ارکان ارکان ہیں، ایمانیات ایمانیات ہیں، آخرت آخرت ہے، انہوں نے دنیا کو آخرت پر غالب ہونے نہیں دیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امت میں بے عملی ہے، ہم سب خطا کار اور کمزور ہیں لیکن یہ دین محفوظ ہے، آج تک دین میں تحریف نہیں ہو سکی، اس کے برخلاف عیسائی کلیسا کے ذمہ داروں اور بائبل کے شارحین نے اپنے زمانہ کے بعض جدید نظریات بائبل میں شامل کر لئے۔ بائبل میں شامل نہ ہو سکے تو اس کی شرح اور اس کی تفسیر میں ان کو شامل کرلیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ نظریہ بدلا تو بائبل بھی متزلزل و مشکوک اور ساقط الاعتبار ہوگئی، بائبل کی تفسیر میں انہوں نے لکھ دیا کہ زمین چپٹی ہے اس لئے کہ اگر چپٹی نہ ہو گول ہو تو خدا کا دیدار قیامت کے دن سب کو کیسے ہوگا؟ بائبل کی یہ تشریح غلط ثابت ہوگئی اور زمین کی کرویت کا نظریہ تسلیم کرلیا گیا، بائبل پر بھی قدرتاً اس کا اثر پڑا،، اس کی حقانیت پر اس کی منزل من اللہ اور کلام الٰہی ہونے پر بھی اثر پڑا۔

”آخری بات عقیدہ آخرت کا اہتمام ہے، وہ انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت کا بنیادی نقطہ ہے جو لوگ انبیاء کرام علیہم السلام کے اقوال و احوال کے مطالعہ میں زندگی گزارتے ہیں اور ان کے کلام کا صحیح ذوق رکھتے ہیں وہ صاف محسوس کرتے ہیں کہ جیسے آخرت ہمیشہ ان کی نظروں کے سامنے ہوتی ہے اور اس تصویر (نعمت و مصیبت اور سعادت و شقاوت کی تمام تفصیلات کے ساتھ) ان کی آنکھوں کے سامنے کھڑی رہتی ہے، وہ ہمہ وقت جنت کے شدید اشتیاق اور جہنم سے شدید خوف کے عالم میں رہتے ہیں، یہ بات ان کے لئے بالکل مشاہدہ اور ایک واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے، جو ان کے شعور و احساس اعصاب اور قوت فکریہ پر غالب آ جاتا ہے۔

آخرت پر ایمان اور وہاں ملنے والی ابدی سعادت اور لازوال شقاوت اور ان تمام انعامات (جنہیں اللہ نے اپنے نیک بندوں کیلئے مہیا کر رکھا ہے) اور تمام عذابوں (جو نافرمان کافروں کیلئے تیار کئے گئے ہیں) کا ہمہ وقت نگاہوں کے سامنے ہونا، یہی انبیاء کرام

علیھم السلام کی دعوت، اور ان کی پند و نصیحت کا اصل محرک تھے، یہی ان کو پریشان کرتا رہتا ہے، ان کی آنکھوں کی نیندیں اڑا دیتا ہے، ان کی پرسکون و پاکیزہ زندگی کو مکدر کر دیتا ہے، اور ان کو کسی حالت میں سکون اور کسی پہلو قرار نہیں ملتا، نگاہوں کے سامنے پھیلے ہوئے شر و فساد، حالات کی ابتری اور ماحول میں خرابیوں کے پروان چڑھنے کی صورت میں (جس سے وہ سخت اذیت محسوس کرتے ہیں) ان کے دل و دماغ پر سب سے زیادہ اثر انداز اور ان کے لئے سب سے طاقتور محرک یہی فکر آخرت ہے، اور وہ اس کو اپنی دعوت و تبلیغ کی اصل وجہ اور خوف و اضطراب کا اصل سبب قرار دیتے ہیں۔

پھر وہی شروع کی بات عرض کرتا ہوں کہ یہ دین جو ہم کو ملا ہے، یہ دانشوروں سے نہیں ملا ہے، مصنفوں سے نہیں ملا، مفکروں سے بھی نہیں ملا، سیاستدانوں سے بھی نہیں ملا، حکما اور فلاسفہ سے بھی نہیں ملا، یہ ملا ہے پیغمبروں سے اس لئے ہر بات میں ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس موقعہ پر پیغمبر ہوتا تو کیا کہتا، نبی ہوتا تو کس زبان میں بات کرتا کس چیز کی دعوت دیتا، اس کی دعوت میں کس چیز کا تناسب کیا ہوتا، مجھے امید ہے کہ جو حضرات محض طالب دین ہیں وہ اسی کو معیار بنائیں گے، اور ہمیشہ کو پیش نظر رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

والذین اذا ذکروا بآیٰت ربھم لم یخروا علیھا صماً و عمیاناً (الفرقان)

اور وہ لوگ جب انہیں ان کے رب کی آیتوں سے سمجھایا جاتا ہے تو ان پر بہرے اندھے ہوکر نہیں گرتے۔

میں آپ کا شکر گزار ہوں، اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اور آپ سب کو توفیق دے اور ہمیں استقامت عطا فرمائے اور ہم جب اس کے سامنے حاضر ہوں، تو ہم سرخرو ہوں، وہی آیت مبارکہ جس سے اس مجلس کا افتتاح کیا گیا ہمارے پیش نظر رہنی چاہئے۔

یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ فاما الذین اسودت وجوھھم اکفرتم بعد ایمانکم فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون و اما الذین ابیضت وجوھھم ففی رحمة اللہ ھم فیھا خلدون (آل عمران ۱۰۶-۱۰۷)

جس دن بعضے منہ سفید، اور بعضے منہ سیاہ ہوں گے، سو وہ جن کے منہ سیاہ ہوں گے ان سے کہا جائے گا، تم ایمان لاکر کافر ہو گئے تھے، اب اس کفر کے بدلہ میں عذاب چکھو، اور وہ لوگ جن کے منہ سفید ہوں گے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اے اللہ ہمیں ان لوگوں میں شامل فرما جن کے متعلق تو نے فرمایا ہے:۔

واما الذين ابيضت وجوهم ففي رحمة الله، هم فيها خلدو ن

(آل عمران ۱۰۷)

اور وہ لوگ جن کے منہ سفید ہوں گے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

بس اسی پر آپ سے رخصت ہونے کی اجازت چاہتا ہوں

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

دعوت اور حکمتِ دعوت

یہ فکر انگیز تقریر ۲ نومبر ۱۹۸۱ء مطابق ۴ محرم الحرام ۱۴۰۲ھ بوقت صبح ۱۰ بجے جمعیت اہل حدیث جموں وکشمیر کے صدر دفتر ہال میں کی گئی، حاضرین میں ایک بڑی تعداد علماء، اساتذہ اور اہل علم و فکر کی تھی۔ حضرۃ مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ ان دنوں کشمیر کے دعوتی دورے پر تھے!

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید الا نبیاء والمرسلین و علی آلہ وا صحابہ اجمعین ۔اما بعد.

بھلی بات کو بھلی طرح کہنا ہی حکمت ہے۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجاد لهم بالتی احسن ان ربک هو اعلم بمن ضل عن سبیله وهو اعلم بالمهتدین (النحل۔۱۲۹)

آپ اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلائیے حکمت سے اور اچھی نصیحت سے اوران کے ساتھ بحث کیجئے پسندیدہ طریقے سے، بیشک آپ کا پروردگار (ہی) خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہی ہدایت پائے ہوؤں کو (بھی) خوب جانتا ہے۔

حضرات! رب العزت کا یہ خطاب اپنے آخری نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آخری امتی کے لئے ہے، کیونکہ اس امت کے بعد اور کوئی امت نہیں، یہ سورہ نحل کے آخری رکوع کی آیت ہے، جس میں دعوت وارشاد کے طریقہ کو بیان کیا گیا ہے، فرمان الٰہی ہے:

ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة (النحل. ۱۲۵)

آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم وحکمت اور اچھی نصیحتوں کے ذریعے بلائیے۔

حکمت سے مراد ہے عقل، دانائی، سلیقہ، حسن تدبیر، سچی اور صحیح بات کو واضح کر کے دل میں اتارنے کا طریقہ، اس طرح کہ مداہنت، یا موقعہ پرستی کا شائبہ نہ ہونے پائے، سیاست کا اس میں دخل نہ ہو، سیاست الگ چیز ہے اور حکمت وموعظمت الگ ہے۔

اپنے عہد میں خدا کے محبوب ترین بندہ موسیٰ علیہ السلام کو اس عہد کے خدا کے معضوب

ترین بندہ ظالم و جفا کار فرعون کے پاس جانے اور دعوت دینے کا حکم ملتا ہے، لیکن سلیقہ اور نرمی سے بات کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

اذھب الیٰ فرعون انه طغی (طه۔۴۳)

دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت نکل چکا ہے۔

اس سرکش اور طاغی کے ساتھ بھی دعوت کا کیا طریقہ اختیار کرنا ہے؟

فقولا له قولاً لینا۔ (طٰہٰ۔۴۴)

پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا۔

بات پکی اور سچی ہو، مگر انداز تکلم سلیقہ، نرمی، خوش آہنگی کا ہو:۔

لعله یتذکر اویخشی (طٰہٰ۔۴۴)

شاید وہ (برغبت) نصیحت قبولکر لے یا (عذاب الٰہی سے ڈر جائے)۔

تا کہ وہ نصیحت پکڑے، یا سلیقہ کی بات سن کر اس کے دل میں خشیت وخوف پیدا ہو جائے، اور اپنے کفر وطغیان، اور شر وظلم سے باز آئے، اگر بھلی بات کے کہنے کا انداز بری طرح ہوتو وہ کارآمد ثابت نہیں ہوتا، شاعر نے سچ کہا ہے۔

کہتے ہیں وہ بھلے کی ولیکن بری طرح

بھلی بات کو بھلی طرح کہنا ہی حسن سلیقہ اور حکمت ہے، اگر مخاطب سے سوال وجواب بھی کرنا پڑے تو اس میں بھی سلیقہ ہونا چاہئے، مناظرہ اور مجادلہ کے موقعہ پر بھی اس کی ہدایت ہوئی۔

وجادلھم بالتی ھی احسن (النحل۔۱۲۵)

اوران کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے۔

تا کہ سننے والے اور دیکھنے والے داعی کے طریقہ استدلال سے متاثر ہوں، چاہے مخاطب پر اثر نہ ہو، اگر طریقہ بحث ومجادلہ احسن طریقہ پر ہوگا تو مخاطب عقل سلیم اور نیک فطرت کی بناء پر خود متاثر ہوگا، اگر ایسا نہ ہوا تو بھی حاضرین وسامعین پر حسن مجادلہ کا ضرور اثر پڑے گا، یہی حقیقت اس آیت سے بھی واضح ہوتی ہے:

ان ابراھیم کان أمة قانتا لله حنیفاً، ولم یک من المشرکین (النحل۔۱۲۰)

بیشک ابراہیم بڑے مقتدر تھے اللہ تعالےٰ کے فرمانبردار تھے بالکل ایک طرف کے ہو

رہے تھے اور وہ شرک کرنیوالوں میں نہ تھے۔

ان کو اس طریقہ استدلال، سلیقہ حکمت وموعظت اور احسن مجادلہ کے باوجود:

حنیفاً مسلماً وماکان من المشرکین

طریق مستقیم والے (یعنی) صاحب اسلام تھے اور مشرکین میں سے (بھی) نہ تھے۔

کا خطاب عطا فرمایا گیا، اس لئے کہ ان کی دعوت میں حکمت تھی، مداہنت نہ تھی، لینت تھی، سیاست نہ تھی، لہٰذا ایک مومن مسلمان کو بھی یہ طرز تبلیغ اختیار کرنا لازم ہے، عقائد کی اصلاح کے لئے بھی " ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ " کا طریق کار ہی مفید ہے، بات کتنی ہی ضروری اور لازمی ہو، داعی کے سامنے مقصد یہ ہونا چاہئے کہ مریض کا علاج کرنا ہے، اس میں پیار، نرمی اور محبت ہو، سختی درشتی، تیزی وتندی کی وجہ سے مریض تجربہ کار مشہور ڈاکٹر اور حکیم کے پاس جانے سے بھی ڈرتا ہے، علاج معالجہ کی بات ہی الگ ہے، امت کو پیغام ملتا ہے:

لقد جآء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ماعنتم حریص علیکم بالمومنین رء وف رحیم (التوبہ۔۱۲۸)

(اے لوگو) تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس (بشر) سے ہیں جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے جو تمہارے منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے بالخصوص ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں۔

اس پر عمل کرنا آپ کے ایک امتی پر بھی لازم ہے، وہ دوسرے انسان کو حکمت عملی اور محبت وپیار سے دعوت دے کر سلیقہ سے سمجھا کر عقائد کی اصلاح کے لئے مائل وراغب کرے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی فکر وتبلیغ اور دل سوزی کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

فلعلک باخع نفسک علیٰ آثاھم ان لم یؤمنوا بھذا الحدیث اسفاً

(الکہف۔٦)

اے پیغمبر تمہاری حالت تو ایسی ہو رہی ہے کہ جب لوگ یہ (واضح) بات بھی نہ مانیں، تو عجب نہیں ان (کی ہدایت) کے پیچھے مارے افسوس کے اپنی جان ہلاکت میں ڈال دو (حالانکہ یہ ماننے والے نہیں)۔

لعلک باخع نفسک الایکو نوا مومنین (الشعراء-۳)
کیا آپ اپنی ذات کو ان کے ایمان لانے کی خاطر ہلاکت میں ڈال دیں گے؟

آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اور درد دلی کا تقاضا تھا کہ ایک ایک آدمی اپنے مالک مختار کے آستانہ پر سر جھکائے، اور کوئی اس در سے محروم نہ جائے، آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا ہے:

لان یھدی اللہ بک رجلا خیر لک من حمر النعم
سرخ اونٹوں سے بھی کہیں بہتر ہے کہ ایک آدمی کو تمہارے ذریعہ سے ہدایت ہو جائے

واقعات سے مربوط رہیئے

مبلغ کو بھی ایک دردمند اور دانشمند ڈاکٹر اور معالج کی طرح مریض کا خیر اندیش بن کر علاج کرنا ہے، حکیم یا ڈاکٹر کا مقصد مریض کو مارنا نہ ہو بلکہ صحت یاب کرنا ہونا چاہئے، عقیدہ توحید کی بات تو بالکل صاف کہی جائے اور شرک کی تردید بھی ہو، لیکن دوا کی مناسب خوراک ... اگر دوا زیادہ تیز یا مقدار میں زیادہ ہوگی یا یکدم کھلا دی جائے گی، یا قوت برداشت سے زیادہ ... تو مریض کا کام تمام ہو جائے گا چونکہ بات واقعات سے مربوط ہو کر زیادہ خوبی کے ساتھ سمجھ میں آتی ہے اس لئے دو ایک واقعات سنئے۔

چند واقعات

دیکھئے اللہ کے بندے جن کے دلوں میں عشق الٰہی کی آگ لگی تھی، وہ بھی حکمت سے کس طرح کام کرتے رہے ہیں، شیخ جمال الدین ایرانی کہیں جارہے تھے، تاتاریوں نے اسلامی سلطنتوں کو تاراج کیا تھا، اتفاق سے اسی روز ایک تاتاری شہزادہ تغلق تیمور

شکار کھیلنے نکلا ہوا تھا، اور یہ تاتاری شہزادہ چغتائی شاخ کا ولی عہد تھا، جو ایران پر حکومت کر رہی تھی، شہزادہ کی شکارگاہ میں جب شیخ جمال الدین اتفاقاً داخل ہوئے گئے اور پہرہ داران کو پکڑ کر شہزادے کے سامنے لائے تو شہزادہ نے ایک مسلمان فقیر صورت دیکھ کر اور وہ بھی ایرانی کو دیکھ کر (جو کو تاتاری اس وقت بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے) بدشگونی لی، اور غصہ سے پوچھا، بتاؤ میرا یہ کتا اچھا ہے، یا تم شہزادہ نے غیظ وغضب سے بات کی تھی، شیخ جمال الدین نے سنجیدہ انداز

میں جواب دیا، انھوں نے فرمایا: اس کا قطعی فیصلہ کرنے کا یہ موقعہ نہیں، شہزادہ بولا، پھر اس کا کون سا موقعہ ہوگا؟ فرمایا وہ میرے خاتمہ یعنی وفات کے وقت ہی واضح ہوگا، اگر میں کائنات کے پیدا کرنے والے مالک وحدہ لاشریک کی صحیح معرفت اور اقرار پر فوت ہوا تو میں آپ کے کتے سے بہتر ثابت ہوں گا، بصورت دیگر یہ کتا ہی مجھ سے بہتر اور خوش قسمت ہوگا، ان کے اس جواب سے شہزادہ کے دل پر ایک چوٹ لگی، شہزادہ نے شیخ سے کہا، جب تم سنو کہ میں تخت نشین ہوا ہوں تو اس وقت مجھ سے آکر ملنا، شیخ جمال الدین کا شہزادہ کی ولی عہدی ہی کے زمانہ میں دنیا سے کوچ کرنے کا وقت آگیا، آپ نے اپنے بیٹے کو بلا کر کہا کہ میں دنیا سے رخصت ہوتا ہوں، جو کام میرے ذمہ تھا، وہ ادھورا رہا شاید تم اس کو پورا کرسکو، اور یہ تمام واقعہ بیان کیا۔

شیخ جمال الدین کی وفات کے بعد جب ولی عہد کی تاج پوشی ہوئی تو پھر شیخ کے فرزند اپنے والد بزرگوار کی وصیت پورا کرنے کی خاطر روانہ ہوئے، شاہی محل کے دروازہ پر سپاہیوں نے ٹوکا اور دروازہ سے ہٹایا، آپ نے ایک درخت کے نیچے مصلیٰ بچھایا، اور علی الصباح اذان دی، جس سے بادشاہ کی آنکھ کھل گئی، تحقیقات سے معلوم ہوا کہ کوئی مسکین صورت آدمی باہر بیٹھا ہے، اس نے ہی یہ آواز لگائی ہے، جس سے بادشاہ کی نیند میں خلل پڑا، بادشاہ نے غصہ ہوکر اس کو گرفتار کر کے لانے کا حکم صادر کیا، چنانچہ ان کو پکڑ کر سپاہی بادشاہ کے پاس لائے، پوچھنے پر انھوں نے اپنے والد کا سلام پہونچا کر بتایا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ ان کا خاتمہ ایمان پر ہوا، اور اس سوال کا جواب مل گیا، جو آپ نے کیا تھا، اور شکار کا واقعہ جو ولی عہدی کے زمانہ میں پیش آیا تھا، یاد دلایا، بادشاہ کے دل پر اب دوسرا چرکا لگا، اور فوراً اپنے اسلام لانے کا اقرار کر کے وزیر سلطنت کو بلایا اور اس سے یہ قصہ کہا، وزیر نے جواب دیا کہ میں تو پہلے ہی مسلمان ہو چکا ہوں، مگر میں نے اس کو پوشیدہ رکھا تھا، اس طرح ایران کی یہ چغتائی تاتاری شاخ تمام اہل کاروں، فوج سمیت حلقہ بگوش اسلام ہوئی، اس طرح ایک اللہ والے نے ایرانی تاتاری سلطنت میں اسلام کو کیسے پھیلایا کہ ساری تاتاری قوم مسلمان ہوگئی۔

ایسے ہی ایک دوسرا واقعہ ہے کہ مولانا یحییٰ علی صاحب جو حضرت مولانا ولایت علی صاحب صادقپوری کے تربیت یافتہ تھے، اور ان کو مجاہدین سرحد کی مدد کرنے کے الزام میں۔ (جنھوں نے حضرت سید صاحب کے بعد ان کا کام جاری رکھا تھا) ۱۸۶۴ء میں پھانسی کی سزا

ہوئی تھی، وہ انبالہ جیل کی ایک تنگ وتاریک کوٹھری میں محبوس تھے، جس میں ہوا اور روشنی کیلئے کوئی راستہ نہ تھا، سخت گرمی کے دن تھے، جیل آفیسر معائنہ کے لئے آیا تو اس کو خیال ہوا کہ ایسے حال میں تو یہ مر جائیں گے، مقدمہ ابھی باقی ہے، اس نے حکم دیا کہ دروازہ کھلا رہے اور سنتری پہرہ پر کھڑے رہیں، یہ سنتری بالعموم سکھ یا گورکھا ہوتے تھے۔

وہ جہاں اپنی ڈیوٹی سنبھالتے، آپ ان کو مخاطب کر کے حضرت یوسفؑ کا وعظ توحید سنانے لگتے:

يصاحبي السجن أ ارباب متفرقون خير ام الله الواحد القهار ماتعبدون من دونه الا اسماءً سميتموها انتم وآباؤكم ما انزل الله بها من سلطٰن. ان الحكم الا لله، امر الاتعبدوا الا اياه، ذلك الدين القيم ولكن اكثر الناس لايعلمون . (يوسف. ۳۹.۴۰)

اے قیدخانہ کے رفیقو: متفرق معبود اچھے یا ایک معبود برحق جو سب سے زبردست ہے وہ اچھا، تم لوگ تو خدا کو چھوڑ کر صرف چند بے حقیقت ناموں کی عبادات کرتے ہو، جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے (آپ ہی) ٹھہرالیا ہے، خدا تعالیٰ نے تو ان (کے معبود ہونے) کی کوئی دلیل (عقلی یا نقلی) بھیجی نہیں، (اور) حکم دینے کا اختیار (صرف) خدا ہی کا ہے (اور) اس نے حکم دیا ہے کہ بجز اس کے اور کسی کی عبادت نہ کرو یہی (توحید) کا سیدھا طریقہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

وہ ان آیات کی تلاوت اور تشریح فرماتے یہ سن کر ان پہرہ داروں کے آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے اور ان پر سناٹا چھا جاتا، اور جب ان کا پہرہ بدلا جاتا تو وہ خوشامد کرتے کہ ان کو یہیں رہنے دیا جائے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں کتنے بندگان خدا کے دل میں توحید کا بیج پڑ گیا اور ان کو ایمان نصیب ہوا۔

مولانا جعفر تھانسری کی للٰہیت

اسی طرح مولانا جعفر صاحب کو جب ''کالا پانی'' کی سزائی ہوئی تو کوئی غم، فکر ان کے چہرہ پر نمودار نہ تھا، انگریز تماشائیوں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انھوں نے فرمایا، یہ موت نہیں شہادت ہے، جو ایک ایسی نعمت ہے، جس کے مقابلہ میں تمام دنیا کی سلطنت ہیچ ہے، وہاں بھی

وہ تبلیغ دین حکمت سے انجام دیتے رہے، جیل اور پورٹ بلیر میں بھی وہ اور ان کے رفقائے کرام توحید کی دعوت اور تبلیغ کرتے رہے، اور بہت سے بندگان خدا نے ہدایت پائی، مولانا یحییٰ علی صاحبؒ کے پاس ایک رات کو ایک بدکردار بدنام قیدی کا بستر آ گیا، جب اس نے مولانا کی عبادت گذاری، اور دعائیں اور آہ وزاری دیکھی تو وہ بھی تائب ہوا، اور تہجد گزار بن گیا، اسی طرح جیل میں بیسیوں بندگان خدا کو ہدایت ہوئی اور ان کی زندگی بدل گئی۔

اس طرح اللہ کے بندوں میں جب دل کا سوز، اور دماغ کی روشنی ہو اور دونوں مل کر کام کریں تو پھر نتیجہ واضح ہے، اگر ایک شکاری جانور شکار کرنے کیلئے حکمت استعمال کرتا ہے، تو ایک مبلغ اپنے مقدس کام میں حکمت سے کام کیوں نہ لے جو اس سے بہتر مقصد رکھتا ہے، شرک سب سے بڑا مہلک مرض ہے، اس کا علاج بھی حکمت سے کرنا لازم ہے، لہجہ نرم ہو مگر بات سچی ہوتا کہ سننے والا مانوس ہو تو علاج کا اثر جلد ہوگا، شرک ہی کے متعلق اعلان ہے:۔

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر مادون ذلک لمن یشآء (النساء۔ ۱۱۶)

بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دے گا۔

تو ہم پرستی اور مخلوق پرستی سے نکالنے کے لئے جتنی نرمی برتی جائے، مناسب ہے، ایک پورے شہر پورے ملک کو حکمت ہی سے خدا کے صحیح راستہ پر لایا جا سکتا ہے، آنحضرت صلے اللہ علی وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے دن جب سنا کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان کو دیکھ کر کہا:

الیوم یوم الملحمۃ الیوم تستحل الکعبۃ الیوم اذل اللہ قریشا

آج بدلے کا دن ہے، آج کعبہ میں آزادی کے ساتھ عمل کیا جائے گا، آج اللہ نے قریش کو ذلیل کیا ہے۔

تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بدلے "**الیوم یوم المرحمۃ الیوم یعز اللہ قریشان ویعظم اللہ الکعبہ**" (آج رحمت عام کا دن ہے، آج اللہ قریش کو عزت دے گا، آج کعبہ کی عزت بڑھائی جائے گی) کا اعلان فرمایا، اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے جھنڈا لے کر ان کے بیٹے کو دیا، جھنڈا پکڑنے میں باپ کی جگہ بیٹے کا ہاتھ آیا، تو اس حکمت عملی

نے ابوسفیان کے دل میں تلاطم پیدا کر دیا، آپ نے ان کے گھر کو جب دارالامان کا درجہ دیا، تو ابوسفیان کی دشمنی محبت اور دوستی سے بدل گئی، اب حکمت کا اندازہ کر لیجئے، ابوسفیان کو جو یہ اعزاز بخشا گیا، تو ان کی نفرت کی آگ ٹھنڈی ہوئی، اور دل کے دروازے کھلے، تاریخ وتذکرہ کی کتابیں بتاتی ہیں کہ ہمارے بزرگ جس راستہ سے گذرتے توحید کی تبلیغ اور بدعات وشرکیات سے پرہیز کا وعظ کہتے ہوئے گزرے، جو بھی قافلہ ہمارا جہاں سے گذرا وہاں توحید کی ہوا چلی، حضرت سید علی ہمدانی، سید عبدالرحمٰن بلبل شاہ وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ کشمیر کی گل پوش وگل پاش وادی یا چشموں کی سیرابی کا نظارہ کرنے آئے، بلکہ کوہستانوں، لق ودق بیابانوں، خارزاروادیوں کو قطع کر کے کلمہء حق کی اشاعت وتبلیغ کی خاطر آئے، جس کے نتیجہ میں آپ کشمیر میں لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کو توحید کا حلقہ بگوش پاتے ہیں، میں نے یہی بات ذرا تفصیل سے جامع مسجد کی تقریر میں کہی تھی، اخباروں میں شائع ہوا کہ میں نے سارے کشمیریوں کو مشرک بنایا، بھلا مجھے بلاتحقیق اس کا کیا حق تھا، اور میں مسلمانوں کو بیک زبان کیسے کافر کہہ سکتا ہوں، میری پوری تقریر اس مجموعہ میں شامل ہے۔

توحید کی دعوت میں انس پیدا کیا جائے

توحید کی دعوت میں انس پیدا کیا جائے، اختلافی مسائل کو درمیان میں نہ لایا جائے، اختلافی مسائل میں ترجیح الگ بات ہے، علمی اختلافات کی گنجائش بہر حال ہے، وہ بعد میں ہو گا۔ پہلے توحید کا مضمون لانا ہے، آستانہ الٰہی پر سر جھکنا ہے، علمی اختلافات کا موقعہ اس کے بعد ہے، بزرگوں کا کام توحید پھیلانا اور شرک وبدعت کو دور کرنا ہے، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ کے ایک بڑے شیخ طریقت تھے، جو مسلک حنفی پر عمل کرتے تھے، ایک اہل حدیث عالم ان کے مرید ہوئے اور رفع یدین چھوڑ دی، کہ مولانا کو خبر ہوئی تو فرمایا، اگر آپ کی تحقیق رفع یدین سے متعلق بدل گئی ہے تو الگ بات ہے، لیکن اگر میری وجہ سے چھوڑ دی ہے، تو میں سنت چھوڑنے کے لئے نہیں کہہ سکتا ہوں۔

آپ کو دیکھنا ہے کہ اللہ کی مخلوق کہاں جا رہی ہے؟ اور سب سے بڑی بات قرآن وحدیث کی تبلیغ ہے، یہی چیز دعوت وتبلیغ کی اصل واساس ہونی چاہئے، مسلکی خصوصیات اس کے بعد آتے ہیں، مسلمان تعداد میں بہت بڑھ گئے ہیں لیکن جذبۂ دین وہ نہ رہا جو پہلے تھا،

عامۃ المسلمین کے لئے کوئی خطرہ ہوتو اس کے لئے سینہ سپر ہو جائیں، اس بات کا خیال رہے کہ کسی کی دل آزاری نہ کی جائے، ہمیشہ وسعت قلبی کا ثبوت دیا جائے، نفرت نہ پھیلائی جائے۔

صادقپوری اور غزنوی خاندان کے حضرات، اہل حدیث علماء تھے، ان میں مولانا ولایت علی، مولانا احمد، مولانا یحییٰ علی، مولانا عبدالرحیم، مولانا سید عبداللہ غزنوی، مولانا عبدالجبار غزنوی، جیسی دیندار اور خدادوست ہستیاں تھیں کہ ان کے چہروں سے نور ٹپکتا تھا اور ان کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا، انھوں نے ہندوستان بھر میں کس طرح موعظمت وحکمت یا بضرورت استدلال واثبات سے لوگوں کے عقائد کی تصحیح کی۔

امرتسر میں ندوہ کا جلسہ تھا، جس میں ہندوستان کے چوٹی کے علماء شریک تھے، علامہ شبلیؒ کا زمانہ تھا، صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، صاحب کی زبانی میں نے سنا ہے کہ صبح مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی کا درس قرآن ہوتا تھا، غالباً فارسی میں درس دیتے تھے، مولانا شبلی ایک مرتبہ شریک ہوئے تو مولانا شروانی سے کہا، جس وقت مولانا عبدالجبار صاحب اللہ کا نام لیتے تھے تو روح وجسم میں ایک بجلی سی دوڑ جاتی تھی، اور دل چاہتا تھا کہ سر اُن کے قدموں میں رکھ دیا جائے۔

ہندوستان پر خدا کی ایک بڑی رحمت شاہ ولی اللہ کا خاندان تھا، جس نے قرآن وسنت کو رواج دیا، اور شرک وبدعت کا قلع قمع کیا، ترجمہ قرآن کرنے پر ان کی سخت مخالفت کی گئی، مگر وہ اللہ کے بندے کب دعوت دین سے ہچکچانے والے تھے؟ اس خاندان میں شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، شاہ اسماعیل، شاہ اسحاق جیسے علماء ربانیین اور مجاہدین پیدا ہوئے۔

مولانا اسماعیل شہید کے صرف ایک وعظ سے ایک جلسہ میں بیسیوں طوائف اور پیشہ ور عورتیں نیکوکار اور پارسا بن گئیں، تفصیل میری کتاب ''کاروان ایمان وعزیمت'' میں دیکھئے۔

تقریر کے اختتام پر جمعیۃ کے ناظم تبلیغ صوفی محمد مسلم صاحب نے اقبال کا یہ شعر پڑھا۔ اسی پر یہ تقریر ختم کی جاتی ہے کہ اس تقریر کی روح آ گئی ہے۔

نگہ بلند ، سخن دل نواز، جاں پر سوز
یہی ہے رخت سفر م، میر کارواں کے لئے

صلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مناور کو کس طرح منارۂ نور بنایا جاسکتا ہے؟

یہ تقریر ۲۸ نومبر ۱۹۸۳ء بروز یکشنبہ بعد نماز فجر کی گئی

نحمده و نصلی علیٰ رسوله الكريم. امابعد.

دین کا اصل موضوع اور رضائے الٰہی کی قیمت

میرے بھائیو، اور دوستو! آپ جانتے ہیں کہ اللہ کا یہ دین جو خدا کے پیغمبر اپنے اپنے زمانہ میں اور اشرف المرسلین وسید الاولین والآخرین، خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری بار اور ہمیشہ کے لئے لے کر آئے، اس دین کا اصل موضوع ہے آخرت میں انسان کو اللہ کی رضا اور اس کے انعام سے سرفراز کرنا اور آخرت کی ابدالآباد کی زندگی کو ہمیشہ رہنے والی زندگی کو، کبھی نہ فنا ہونے والی زندگی کو، پرراحت نہیں، پرعشرت بنانا اور آخری ترقیوں تک اور ان نعمتوں تک جن کا تصور بھی اس دنیا میں ممکن نہیں ہے اور جن کے متعلق آتا ہے کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی دل میں خیال گذرا، ان نعمتوں تک پہونچانا، اصل موضوع اس کا اس آخرت میں اس زندگی کے بعد کی زندگی میں میں راحت اور لذت، وعزت اور دوام عطا کرنا ہے، پھر " لا خوف عليهم ولا هم يحزنون " یعنی نہ وہاں کوئی خوف ہوگا، نہ غم، خوف کیا ہے؟ آئندہ کا کھٹکا کل کیا ہوگا؟، پیسہ نہ رہا تو کیا ہوگا؟، کوئی بیمار ہو گیا تو کیا ہوگا؟، کوئی عزیز مر گیا تو کیا ہوگا؟، کوئی حملہ ہو گیا تو کیا ہوگا؟، قحط سالی ہوئی تو کیا ہوگا؟، طوفان آ گیا تو کیا ہوگا؟ کوئی ذلیل کرنے کے درپے ہوا تو کیا ہوگا؟ اور سب سے آخر میں موت آئے گی تو کیا ہوگا؟ اور حزن ہوتا ہے، ماضی پر، گزشتہ پر، ہائے حسرت یہ کام کیوں کیا، یہ چوک کیوں ہو گئی، یہ انتظام کیوں نہیں کر لیا، یہ بات پہلے کیوں سمجھ میں نہیں آئی، تو جنت میں دونوں چیزیں نہیں ہوں گی " لا خوف عليهم ولا هم يحزنون " نہ آئندہ کا کھٹکا، نہ پچھلے کا افسوس، اس کی کھٹک اور خلش اور پھر اس کے ساتھ سب سے بڑھ کر " ورضوان من الله

اکبر "اللہ تعالےٰ کی رضا سب سے بڑی ہوگی، اس کا ذائقہ تو وہی کچھ سمجھ سکتا ہے، جس کے دل میں کسی کی محبت ہو اور کسی کی عزت ہو، محبت تو اس لئے کی ذرا سی پسندیدگی، اس کا دیکھ لینا، یہی انسان کے لئے جس کو اللہ تعالےٰ نے محبت سے حصہ عطا فرمایا ہو، بس آخری کامیابی ہے، اور عزت اس لئے کہ جب کوئی معزز آدمی کسی سے خوش ہو جاتا ہے، خوشی کا اظہا کرتا ہے، تعریف کرتا ہے، تو پھر آدمی پھولے نہیں سماتا، اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے، بہت سی اس کی مثالیں ہیں، پہلے انگریز حکام کے زمانہ میں ریاستوں میں ایسا ہوا کرتا تھا کہ وہاں سے آنے اور کہا "مہاراجہ صاحب ہنس کر بولے تھے، اور مہاراجہ صاحب نے یہ کہا تھا کہ خیریت ہے؟ کہتے ہوئے ہاتھ بھی ذرا سا اٹھ گیا تھا، اور ہونٹوں پر تھوڑی مسکراہٹ بھی تھی، اس وقت بہت آدمی بیٹھے تھے، لیکن مہاراجہ صاحب نے میری طرف دیکھا اور فرمایا کہ کہو قاضی صاحب مزاج اچھا ہے؟ بال بچے اچھے ہیں؟ ایک صاحب کا واقعہ ہے کہ گھر آئے تو بات نہیں کرتے تھے، بیوی بچوں نے کہا کہ کیا بات ہے؟ کوئی تکلیف ہوگئی؟ بہت مشکل سے بولے کہ میں حکام سے بات کر کے آیا ہوں، اب اس منہ سے کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا، جیسے کوئی بہت مزیدار چیز کھائی ہو تو اس کے بعد کوئی کڑوی چیز یا دوا کھلائے تو آدمی کہتا ہے منہ کا مزا خراب ہو جائے گا، ابھی مزا آ رہا ہے اس کا، تو انھوں نے کہا کہ اب حاکم سے بات کر کے آیا ہوں، اب کس سے بات کروں، بات کرنے کو جی نہیں چاہتا، یعنی وہ جو عزت ملی تھی، وہ جاتی رہے گی، وہ لذت جو حاصل ہوئی تھی، جاتی رہے گی۔

آخرت کی عظمت و وسعت

میرے دوستو: وہ آخرت اس کا تو ہم تصور ہی نہیں کر سکتے، ماں کے پیٹ میں جو بچہ ہو اس سے آپ کہئے یا ابھی پیدا ہوا ہو، اس سے کوئی اگر بات کر سکتا ہو اور وہ بات سمجھ سکتا ہو، تو اس سے کہے کہ بیٹا، جب تم دنیا میں آؤ گے تو بڑا وسیع میدان ہوگا، ہزاروں ہزار میل کا، وہاں باہر ہوائیں چل رہی ہوں گی، اور پانی برسے گا، وہاں پر ریلیں چلتی ہیں، اور بچہ بے چارہ ماں کے پیٹ میں کیا سمجھے کہ ریل کیا بلا ہوتی ہے، ریل کاہے پر چلتی ہے، اور کتنی تیز چلتی ہے، اور تو اور ہوائی جہاز اڑیں گے، بچہ ماں کے پیٹ میں ہے اور یہ اس سے کہہ رہا ہے کہ ایسا بھی وقت آ سکتا ہے کہ ہوائی جہاز میں بیٹھو گے، بالکل ایسے ہی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر آخرت کا معاملہ

ہے۔

یہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت ہے، اور اس کی مصلحت ہے کہ اتنا بھی ہماری سمجھ میں آ گیا، ورنہ ہماری سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے کہ اس زندگی کے بعد کی زندگی میں کیا ہوگا، کیا ملے گا، وہ کتنی وسیع ہوگی، "عرضها السموات والارض" اس کی وسعت میں زمین وآسمان ایسے ہیں کہ جیسے سمندر میں کوئی کنکری، ٹکی ڈال دے، یہ بھی پتہ نہیں چلے گا، گئی کہاں؟ تو ایسے ہی یہ ساری دنیا حدیث میں آتا ہے "فوضع سوط فی الجنة خیر من الدنیا ومافیها" ایک کوڑا (پھیلا کر نہیں کھڑے کر کے) رکھنے کی جگہ ساری دنیا سے وسیع ہے، تو اس آخرت کا تو کیا کوئی تصور کر سکتا ہے، اور پھر آخری بات یہ ہے کہ "ورضوان من اللہ اکبر" اللہ کی رضا کہ جب بندوں کو معلوم ہوگا جنت میں اللہ راضی ہوا، میرا مالک یہاں راضی ہے، رب مجھ سے خوش ہے، اب ناراضگی کا کوئی کھٹکا نہیں اس کی لذت کو، اس کی عزت کو تو کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔

تو دین کا اصل موضوع ہے اس آخرت میں کامیابی دلانا، اس آخرت کے خطروں سے بچانا، اچھی طرح سمجھ لیجئے، اس آخرت کا عیش نصیب کرنا، اس آخرت میں زندگی، دوام ہمیشہ رہنے والی، کبھی فنا نہ ہونے والی، زندگی عطا کرنا ہے، اللہ فرماتا ہے: "لا یذوقون فیها الموت الا الموتة الاولیٰ" جب اس دنیا سے جانے لگیں گے تو ایک مرتبہ موت کا تجربہ ہوگا، اور اس کے بعد موت کا کوئی امکان نہیں، پھر موت نہیں آئے گی، یہ دین کا اصل موضوع ہے، اسلئے کہ دین جتنا بڑا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس سے جتنا خوش ہوتا ہے، اس کے انعام کی دنیا میں کوئی گنجائش نہیں، اس دنیا میں تو بہت چیزوں کی گنجائش نہیں، کتنے آدمی ہیں، جن کو شادی مرگ ہو جاتی ہے، ایسی خوشی حاصل ہوئی کہ برداشت نہیں کر سکے اور دم نکل گیا، تو اللہ تعالیٰ کے اصل انعامات کی تو اس دنیا میں گنجائش نہیں، اس لئے اس نے آخرت رکھی ہے۔

وہ جنت حقیقی جنت ہے، اور وہ زندگی حقیقی زندگی ہے، اور وہ گھر حقیقی گھر ہے۔

دین پر عمل کرنے سے دنیا میں بہشت کا مزہ

لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دین میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو اس زندگی میں بھی جنت کا کچھ لطف آنے لگے، عارفوں کو چھوڑیئے وہ تو کہتے تھے کہ اگر لوگوں کو

معلوم ہو جائے کہ ہم کیا عیش کر رہے ہیں، کس لطف میں ہیں تو ہمیں بیٹھنے نہ دیں، تلوار لے کر ہم پر حملہ کریں، اور کوئی اللہ کا بندہ کہتا تھا کہ میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے، مجھ سے کیا چھین سکتا ہے، میری جنت میرے سینہ کے اندر ہے، میں کھڑا ہوں تو جنت، میں بیٹھوں تو جنت ''جنتی فی صدری '' میری جنت میرے سینہ کے اندر ہے، متوسط درجہ کے مسلمانوں کو بھی اس زندگی میں وہ راحت، وہ عزت، وہ سکون حاصل ہو سکتا ہے، کہ جس کی غیر مسلم جو دین سے نا آشنا ہیں، تصور نہیں کر سکتے، مگر شرط یہ ہے کہ اس دین پر عمل کریں، اور وہ دین محض قومیت کا دین نہ ہو، رجسٹر میں نام لکھانے کا دین نہ ہو، اور فائدے حاصل کرنے کا دین نہ ہو کہ مسلمان کے گھر میں اس کی وجہ سے شادی ہو جاتی ہے، رشتہ ہو جاتا ہے، اور عید بقر عید میں ملنے کا مزہ آتا ہے، اور شادی بارات میں پوچھے جاتے ہیں،، بلائے جاتے ہیں، یہ دین اس کا نہ ہو، اس دین سے راحت نہیں حاصل ہوگی، اس دین سے کوئی سکون نہیں ہوگا، اس دین سے کسی بستی میں رحمت وبرکت نازل نہیں ہوگی اور آفتیں دور نہیں ہوں گی، دین جو محض فائدہ اٹھانے کے لئے نہ ہو، بلکہ بندگی کا دین ہو، شریعت میں جو حکم ہو اس کو مانے، ایسی بستیوں کا پھر حال یہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے۔

ولو ان اهل القریٰ امنوا واتقوا لفتحنا علیهم برکٰت من السمآء والارض.

(المائدہ۔ ۶۶)

اگر بستیوں والے کچھ ہم سے ڈرتے اور ہمارا پاس کرتے اور ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمانوں اور زمین کی برکتوں کے دہانے کھول دیتے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اس دنیا میں بھی، دین کا جو مقام ہے، جو مرتبہ ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں جو اس کی عزت ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ آخرت ہو اور آخرت میں یہ سب کچھ ملے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے آخرت کی زندگی بنائی ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے ان انعامات کی، اس کی خوشنودی کی یہاں سمائی نہیں، آپ ایک سیارہ پر آباد ہیں، جو سب سے چھوٹا سیارہ ہے، اگر دوسرے سیاروں کو آپ دیکھیں، ان کے رقبہ کو آپ معلوم کریں، ان کے فاصلے معلوم کریں اور ان کی تعداد معلوم کریں تو معلوم ہو کہ یہ زمین کا ذرہ ہے، اس نظام شمسی میں یہ زمین حقیر ترین چیز ہے، اس پر ہم اور آپ اتنے رتجھ رہے ہیں، معلوم نہیں کیا کیا دعوے کر رہے ہیں، تو اللہ

تعالیٰ کی کائنات اتنی وسیع ہے کہ جس کا آپ کوئی تصور ہی نہیں کر سکتے "في يوم كان مقداره خمسين الف سنة" وہ فاصلہ ہے کہ یہاں کی چیز جب وہاں جاتی ہے تو آپ کے حساب سے پچاس ہزار برس، اور کم سے کم ایک ہزار برس لگ جاتا ہے، اور ابھی خلا میں جو لوگ گئے ہیں، وہ اس طرح کے حسابات بتاتے ہیں۔

لیکن میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ :۔

ولو ان اهل القرىٰ امنوا واتقوا لفتحنا عليهم بركٰت من السمآء والارض (الاعراف. ۹۶)

اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور پرہیز گار ہو جاتے، تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے۔

دین پر عمل کرنے کی برکتوں کو دیکھنے کے لئے دنیا سفر کر کے آئے گی

خدا کی قسم اگر مسلمان کسی بستی میں خلوص کے ساتھ، سنجیدگی سے اور ایمانداری کے ساتھ شریعت پر عمل کریں تو جنت کا ایک نمونہ یہیں اللہ تعالیٰ دکھا دے، آپس میں وہ محبت ہو، دلوں میں وہ اعتماد ہو، وہ اطمینان ہو، ایسی سکھ کی نیند سوئیں، ایسے آرام کے ساتھ اپنا کام کریں، ہر کام بنتا چلا جائے ہر چیز میں برکت ہو، کہ لوگ باہر سے آ آ کر جیسے سینٹوریم میں لوگ جاتے ہیں، صحت افزا مقامات پر جاتے ہیں، اسی طرح یہ دنیا کے مارے ہوئے لوگ، یہ جن کا قیمہ کر دیا گیا ہے، جن کے دل و دماغ کا قیمہ کر دیا گیا ہے، جن کو سکون نصیب نہیں ہے، امریکہ و یورپ کے لوگ جن پر خدا کا عذاب نازل ہوا ہے، بشکل دولت، بشکل طاقت، بشکل وسائل، بشکل ترقیات وہ لوگ سانس لینے کے لئے آئیں گے، ایسی بستیوں میں اور بڑی سے بڑی قیمت ادا کریں گے کہ ایک درخت کے نیچے ہم کو آپ چار گھنٹے رہنے دیجئے کہ ہم اس فضا میں سانس لے لیں، تاکہ جب ہم یہاں سے جائیں تو ہمارے اندر ایک طاقت ہو۔

دین پر ناقص عمل اور شریعت کے حصے بخرے

مگر کیا کہیں سے فریاد کی جائے کہ مسلمانوں نے اس شریعت کی قدر ہی نہیں کی، اللہ کے رسول کی لائی ہوئی اس نعمت کی قدر ہی نہیں کی، کہیں ایک چیز ہے، تو چار چیزیں نہیں، کہیں چار

چیزیں ہیں تو دس چیزیں نہیں، کہیں نماز ہے تو روزہ نہیں، کہیں روزہ ہے تو نماز نہیں، کہیں نماز روزہ دونوں ہیں تو زکوٰۃ نہیں، اور کہیں نماز، روزہ، زکوٰۃ ہے تو حج نہیں، اور کہیں یہ چاروں چیزیں ہیں تو آپس میں جو حقوق ہیں مسلمان کے جن کا ادا کرنا ضروری ہے، ان کا ذکر نہیں، کہیں عقائد درست ہے، تو عبادات درست نہیں، اور اگر عقائد و عبادات درست تو معاملات درست نہیں، گھر گھر ناچاقی، بھائی بھائی کے خون کا پیاسا، اس کی عزت و آبرو کے درپے کہیں، جعلی مقدمہ، کہیں افیون رکھوادی، کہیں چرس اور بھنگ رکھوادی، کہیں کوکین رکھوادی، پکڑوادیا، یہ مسلمانوں کی بستیوں میں ہو رہا ہے، انشاء اللہ آپ کی بستی اس سے محفوظ ہوگی، اور مجھے کچھ معلوم بھی نہیں، میں تو اچھی ہی باتیں یہاں کے متعلق سنتا رہا، قاضی قدرۃ اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے حالات برسوں سے سن رہا ہوں ان کا معتقد ہوں، ایسے ہی اور اللہ کے بندے آپ کے یہاں اچھے گذرے ہوں گے، میں واقف نہیں، بہت سفر کرتا رہتا ہوں، جس بستی میں گیا وہاں شکایت سنی کہ صاحب بس یہاں پوچھئے نہیں، جو حالت ہو رہی ہے، ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتا، اللہ کی شریعت کی یہ قدر؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کی یہ قدر، کہ ایک چیز پکڑی اور چار چیزیں چھوڑیں، آج کوئی بستی دنیا، میں روئے زمین پر یہ کر کے دکھادے، تو دیکھئے وہاں ٹکٹ لگ جائے سینکڑوں ہزاروں روپے کا ٹکٹ لگ جائے داخلہ کا، یہ بھی مجبوری سے کہ اگر سب کو آنے دیا جائے تو پھر آدمی بیٹھ کیسے سد کے گا، عورتیں کیسے رہ سکیں گی، بچے کیسے کھیل سکیں گے، اسلئے ٹکٹ لگایا جائے، انتظاماً کہ یہاں قدم رکھنے کیلئے پانچ سو روپیہ کی فیس داخل کرو، تو یہاں تم آسکتے ہو، اور یہاں سے گذر جاؤ ایک مرتبہ، ایسی وہ زمین متبرک بن جائے گی، مگر افسوس ہے کہ سب کچھ کریں گے مسلمان، ہزار تدبیریں کریں گے کافر بھی بتادے کہ یہ آرام کا طریقہ ہے تو اس کو اختیار کریں گے، لیکن اللہ کا رسولؐ جو کہتا ہے، کہ اس میں آرام ہے اس میں راحت، اس میں عزت ہے، اس کو نہیں اختیار کریں گے، بھلا بتائیے، اس ناقدری کی بھی کوئی حد ہے، کہ اگر کوئی حکیم کہہ دے، ڈاکٹر کہہ دے، کوئی غیر مسلم اکسپرٹ کہہ دے، کوئی سیاسی لیڈر کہہ دے کہ دیکھو یہ کرو تو کرنے کے لئے تیار، ہزاروں روپے خرچ کرنے کے لئے تیار، لیکن اللہ کا محبوب رسولؐ یہ کہتا ہے کہ اس میں تمھارا فائدہ ہے، اس میں تمھارا نقصان ہے، اس کو نہیں مانیں گے۔

امتِ محمدیہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ

ہمیں شکایت ہے صاحب مسلمان ہی ہر جگہ ذلیل ہیں، مسلمان ہی ہر جگہ مارے جاتے ہیں، مسلمان ہی ہر جگہ پریشان ہیں، وہ جیسے کوئی اپنا مریض ہوتا ہے، تو اس کو بد پرہیزی نہیں کرنے دیا جاتا، اس طریقہ سے اس امت مرحومہ امت محمدیؐ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ پاؤ گے تو اس راستہ سے پاؤ گے، تمھارے لئے راستہ مقرر ہے، یہ محبت کا راستہ ہے، یہودیوں کا مرض کیا تھا؟ ان کو جو کچھ ملا وہ دین کے راستے سے ملا، نبوت کے راستہ سے ملا، لیکن خدا کے بندے اسی راستہ کے باغی تھے، وہ دوسرے راستوں سے عزت چاہتے تھے، اسی لئے ''المغضوب علیھم'' کہا کہ خدا کا غضب ان پر ہو، ہم نے ان کو عزت دی۔

یبنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم وانی فضلتکم علی العلمین. (البقرہ. ۱۲۲)

اے بنی اسرائیل میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کئے، اور یہ کہ میں نے تم کو اہل عالم پر فضیلت بخشی

دو مرتبہ تین مرتبہ کہا، اور اس کے بعد ''اوفوا بعھدی اوف بعھد کم'' (تم میرے عہد کو پورا کرو، میں تمھارے عہد کو پورا کروں گا) انھوں نے کہا نہیں، اب آپ ہی اپنا عہد پورا کیجئے، ہم تو نہیں عہد پورا کریں گے۔

عقائد و عبادات میں مسلمانوں کا طرزِ عمل

مسلمانوں کا حال یہ ہو رہا ہے کہ پوری شریعت پر نہیں چلتے، بھئی ایک حکم کے نسخہ ہی میں آپ ترمیم کر کے دیکھ لیجئے کہ کیا انجام ہوتا ہے، کیا حکیم اور کیا اس کا نسخہ! لیکن چار چیزیں دی تھیں، ہر دوا جو اس میں تھی، ہر جز جو تھا، وہ کسی مصلحت سے تھا، اب آپ نے اس میں کتر بیونت شروع کر دی، اور کہا، چار چار چیزیں کیا کریں، بس دو ہی چیزیں کافی ہیں، اب کہتے ہیں کہ صاحب نزلہ نہیں گیا، پیٹ کا درد نہیں گیا، تو حکیم کے نسخہ میں ترمیم کرنے سے تو آپ کو یہ نقصان پہونچتا ہے اور کوئی عقلمند آدمی نہیں کرتا، اور اللہ کے رسولؐ کے بتائے ہوئے نسخہ میں ترمیم، صاحب عقائد لیں گے، عبادات سے مطلب نہیں، عبادات لیں گے، عقائد سے

مطلب نہیں، عقیدہ اور عبادات کا حال یہ ہے کہ

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر
جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر
کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

وظیفے جتنے چاہو پڑھوا لو، لیکن اگر یہ کہو کہ نہیں اس میں شرک ہے، یہ بدعت ہے، یہ خلاف شریعت ہے، تو آپ کو اس سے مطلب نہیں، یہ شریعت پر چلنا ہے، اس کا نام اطاعت ہے؟ یہی تو یہودیوں نے کیا تھا، اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، کہ اے اہل کتاب، تمھارا کام نہیں چلے گا، جب تک کہ تم پوری کتاب پر نہ چلو، سورۂ مائدہ میں دیکھئے، فرمایا کہ نہیں، تمھیں پوری کتاب پر عمل کرنا ہے، تمھیں پورے دین پر چلنا ہے، جب جا کر کام بنے گا، تو میں یہ کہہ رہا ہوں کہ دین کی قدر تو آئے گی آخرت میں، اس کو تو کوئی بیان ہی نہیں کر سکتا، دنیا میں بھی اس کا مزہ دیکھئے۔

ہم نے اپنی زندگی سے لوگوں کو اسلام سے روکا

آج ہم مسلمانوں کی زندگی اگر اسلامی ہوتی تو یہ ملک اسلام سے اتنا نا آشنا ہوتا؟ یہ اسلام سے اتنا متنفر ہوتا؟ ہرگز نہ ہوتا، مگر لوگ کہتے ہیں کہ تمھاری ہی زندگی مسلمانوں کی نہیں، تمھارے گھر جو نااتفاقیاں ہیں، جو مقدمہ بازیاں ہیں، وہ ان سے زیادہ ہیں، ہم جتنی ناسمجھی کرتے ہیں، اور جتنے عقل کے خلاف کام کرتے ہیں، وہ نہیں کرتے، ہم جتنے سست ہیں، غافل ہیں، بے کار ہیں، وہ نہیں ہیں، ہم جتنے جاہل ہیں، بے پڑھے ہیں، وہ نہیں ہیں، تو کیا کشش ہو کہ وہ اسلام کی طرف راغب ہوں، جہاں کہیں کوئی بستی ایک نمونہ کی بستی بن جاتی تھی، مثالی بستی بن جاتی تھی، وہاں دیکھ لیجئے، اسلام کس طرح پھیلتا تھا، انڈونیشیا میں کیا ہوا؟ یہ جو آپ سنتے ہیں کہ مسلمان اکثریت میں ہیں، یہ صورت کیا ہمیشہ سے تھی؟ یہ تو بحر ہند کے جزیرے

ہیں، عرب سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، اور جزیرے کی طرح جزیرے ہیں، تو یہ تو یہ، سینکڑوں، ہزاروں جزیرے ہیں، جن کے مجموعہ کا نام انڈونیشیا ہے، اور وہاں اسلام ایسا پھیلا، ایسا پھیلا کہ تھوڑے سے وہاں غیر مسلم ہیں، باقی سب مسلمان ہیں، وجہ کیا؟ وہاں جو عرب تاجر گئے، دکان کھول لی، وہاں بیٹھ گئے، ان کی صورت و سیرت دیکھ کر، ان کے اخلاق دیکھ کر، ان کی ایمانداری دیکھ کر، ان کی اللہ کے یہاں قبولیت دیکھ کر اور ان کی دعاؤں کی مقبولیت دیکھ کر، ملک کا ملک مسلمان ہو گیا، عرب تاجر اور عرب صوفی، اللہ کا نام سکھانے والے دو ہی طبقے ہیں، جنھوں نے ہر جگہ اسلام پھیلایا ہے، وہاں انڈونیشیا میں، ملیشیا میں، اور یہاں ہندوستان میں انھیں دو طبقوں نے اشاعت اسلام کا کام کیا، خود مشرقی بنگال جو ہندوستان کا بالکل مشرقی حصہ ہے، انھیں لوگوں کی کمائی ہے۔

احکام شریعت پر عمل نہ کرنے کی نحوست

یہ بھی شرفاء کی ایک بستی ہے، یہ بھی سمجھدار لوگوں کی اور تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک بستی ہے، اور بھی ہر طرح کے لوگ ہیں، دین پر پورا عمل تو بہت بڑی بات ہے، اللہ نصیب کرے، لیکن دین پر عمل کرنے کی سنجیدہ کوشش کریں، ایمانداری کے ساتھ دین کے تمام شعبوں پر، ہم نے اچھے اچھے گھروں کو دیکھا ہے، سب کچھ ہے، لیکن ترکہ تقسیم نہیں ہوتا، شرعی طریقہ پر، نتیجہ یہ ہے کہ فساد کا ایسا بیج بو دیا گیا ہے کہ پشتوں تک وہ ختم نہیں ہوتا۔

بس بھائیو: یہی کہنا ہے کہ اصل تو اس دین کا فائدہ اور اس دین کی برکت تو ظاہر ہوگئی، مرنے کے بعد آنکھ بند ہوئی اور پتہ چل گیا کہ نماز کیا دلا رہی ہے اور کلمہ کیا دلا رہا ہے، اور کہاں ہو تم، اللہ نصیب کرے ہر مسلمان کو ہم کو اور آپ کو خاص طور پر، لیکن اس دنیا میں بھی اس شریعت کی برکت ظاہر ہو کر رہتی ہے۔

عقائد و اعمال کی تاثیر اور معاصی کے نتائج و اثرات

جب اللہ تعالیٰ نے سنکھیا میں اثر رکھا ہے، ہزاروں برس سے، آج بھی کوئی سنکھیا کھائے، صاحب پرانی باتیں ہیں، کسی نے لکھ دیا ہوگا، سنکھیا کو بہت عرصہ ہو گیا، اب کہاں کوئی سنکھیا سے مرتا ہے، کوئی تجربہ کر کے دیکھے، اس کا تجربہ تو کوئی نہیں کرے گا، میں کہتا ہوں کہ کل

بنفشہ اور برگ گاؤزباں اور عناب ولایتی اور یہ حکیم فضل اللہ صاحب [1] کے یہاں جو دوائیں ملتی ہیں، حکیم قاضی قدرۃ اللہ صاحب بھی یہی کہتے تھے، اور اگر ان کی مورث طبیب رہے ہوں گے تو وہ بھی یہ کہتے تھے، سینکڑوں برس سے یہ بتایا جاتا ہے کہ گل بنفشہ کی یہ تاثیر ہے، اور برگ گاؤزباں کی یہ، اور خطمی کی یہ اور خبازی کی یہ اور فلاح کی یہ اور آج تک سینکڑوں ہزاروں برس سے چلی آرہی ہے، طبی یونانی کب تھی؟

یونان کہاں تھا؟ کب تھا؟ یہ حضرت مسیح علیہ السلام سے بھی پہلے کا زمانہ ہے، یونان کے عروج کا زمانہ حضرت مسیح کو دو ہزار برس کے قریب ہو گئے، تو حضرت عیسیٰ سے بھی معلوم نہیں کتنے سو برس پہلے یونان کا عروج ہوا ہے، اس وقت ان لوگوں نے یہ خاصیتیں دریافت کی تھیں، دواؤں کی، ہمارے یہاں طب یونانی چلی آرہی ہے، بعد میں عربوں نے اس میں بڑا اضافہ کیا، مگر اس کی اصل جو ہے، وہ یونانی ہے، تو یونانی حکماء جو کہیں وہ تو آج تک پورا ہو، اور اللہ کے رسولؐ جو کہیں، اور ابھی جن کو زمانہ بھی اتنا نہیں گذرا، اور اس میں ہم کو شک ہو، یہ کیسا ایمان ہے؟ کہاں کا ایمان ہے؟ کہ گل بنفشہ کے اثر پر تو تمہیں ایمان ہے، اور اللہ کے رسولؐ کا کہنا کہ ''سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم'' جو ہے ''کلمتان خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان حبیبتان الی الرحمن'' یہ زبان پر ہلکے اور اللہ کی ترازو میں بھاری اور اللہ کو بہت محبوب ہیں یہ ''سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم'' اس پر ہمیں اعتماد نہیں؟ ترکہ تقسیم کرنے سے یہ برکت ہوتی ہے، ہمارا اس پر عقیدہ نہیں، گناہ میں یہ یہ خاصیت ہے، بعض گناہ ایسے ہیں، جن سے وبائیں پیدا ہوتی ہیں، بعض گناہ ایسے ہیں، جس میں رزق میں برکت اٹھ جاتی ہے، بعض گناہ ایسے ہیں، ان سے موتیں جلد ہونے لگتی ہیں، زندگیاں کم ہوتی ہیں، حضرت تھانوی قدس سرہ کا رسالہ دیکھئے ''جزاء الاعمال'' اس میں دیکھئے کہ کن کن اعمال پر کیا کیا اثرات شریعت کی طرف سے بتائے گئے ہیں، کہ اس کی یہ نحوست، اس کی یہ نحوست، آج دیکھ رہے ہیں، ہم دنیا میں اس پر ہمارا ایمان ہے، جس خطۂ زمین پر جس زمانہ میں، جتنی دیر کے لئے، جتنے وقت کے لئے، شریعت پر عمل ہوا کھلی ہوئی برکتیں خدا کی نظر آئیں، اس کے خلاف۔

---

(۱) مناور کے مشہور حکیم، حکیم فضل اللہ ندوی فرزند قاضی قدرۃ اللہ مرحوم

ومن یشاقق الرسول من بعد ماتبین له الهدیٰ و یتبع غیر سبیل المومنین نوله ماتولی ونصله جهنم (النساء ۱۱۵)

اور جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہونیکے بعد پیغمبر کی مخالفت کرے، اور مومنوں کے رستے کے سوا اور رستہ پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے ادھر ہی چلنے دیں گے، اور (قیامت کے دن) جہنم میں داخل کریں گے۔

جو اس کے خلاف کرے گا، وہ دیکھ لے گا، چاہے سو سر کا ہو جائے، اور سر کاٹ کر کے رکھ دے اور ساری دنیا کے سامنے ناک رگڑے، تب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ عزت ملے گی، نہ راحت ملے گی، نہ سکون، مسلمان کیلئے ایک ہی راستہ ہے اور وہ دین و شریعت کا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دین حق اور دعوت اسلام
ایک فلک بوس اور سدا بہار درخت

حضرت مولانا کی وہ تاریخی تقریر ۳ رستمبر ۱۹۹۱ء کو لیسٹر انگلستان کے اسلامک فاؤنڈیشن میں اہل علم اور دعوتی و تحقیقی کام کرنے والوں کا ایک وسیع مجمع میں کی گئی تھی۔

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذبالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا الله ونشهد ان محمدا عبده ورسوله الذى ارسله الله تعالىٰ الى كافة الناس بشيرا ونذيرا وداعيا الى الله باذنه وسراجا منيرا . اما بعد .فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم. بسم الله الرحمن الرحيم.

الم تر كيف ضرب الله مثلاً كلمة طيبة كشجرة طيبة اصلها ثابت وفرعها فى السمآء تؤتى اكلها كل حين باذن ربها ويضرب الله الامثال للناس لعلهم يتذكرون .

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے پاک بات کی کیسی مثال بیان فرمائی؟ (وہ ایسی ہے) جیسے پاکیزہ درخت جس کی جڑ مضبوط (یعنی زمین کو پکڑے ہوئے) ہو اور شاخیں آسمان میں، اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا (اور میوے دیتا ہو) اور خدا لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے کہ وہ نصیحت پکڑیں۔

قرآن کریم کا اعجاز

حضرات! میں یہاں حاضر ہوا تو مجھے یہاں کی سرگرمیوں اور یہاں کی دعوتی و تحقیقی کاموں کو دیکھنے کا شوق تھا اور میرے ذہن میں کوئی خاص مضمون نہیں تھا اور نہ یہ بات متعین تھی

کہ مجھے کچھ عرض کرنا ہے، میں تو یہاں ایک زائر اور ایک استفادہ کرنے والے کی حیثیت سے آیا تھا، لیکن مجھے حکم ہوا کہ میں آپ کے سامنے کچھ عرض کروں، میں بیٹھنے کے بعد بالکل خالی الذہن تھا اور میں نے اس کو خدا پر چھوڑ دیا تھا اور اس کا بارہا تجربہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوتی ہے، اور قرآن مجید ہر موقع پر مدد کرتا ہے اور راستہ کھول دیتا ہے اور نئی نئی حقیقتیں اپنے اعجاز کے نئے پہلو سامنے لاتا ہے، ابھی آپ کے سامنے جو آیت پڑھی گئی وہ تنہا کافی ہے، دنیا کے کسی عہد میں بھی دین کی دعوت کا، اسلام کے تعارف کا، اور لوگوں کو دنیا کے خطرات سے نکالنے کا اور زندگی کو نہ صرف برباد کرنے بلکہ زندگی کو باعث اذیت اور خدا سے بعد کا ذریعہ بنانے کی، آزمائش سے نکال کر نجات کے راستہ پر لگانے کا جب بھی ذکر کیا جائے گا تو یہ آیت اس کی رہنمائی کے لئے کافی ہے اور اس کے اندر قرآن مجید کا اعجاز جھلک رہا ہے۔

قرآن مجید جیسا کہ میں نے بعض مرتبہ عرض کیا کہ مجموعی حیثیت سے بھی وہ معجزہ ہے اور انفرادی حیثیت سے بھی، یعنی ایک ایک آیت بھی اس کا الگ الگ معجزہ ہے بلکہ اگر میں (عربی زبان کے ایک طالب علم کی حیثیت سے) یہ کہوں کہ اس کا ایک ایک لفظ بھی مستقل معجزہ ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

کسی ملک اور کسی عہد میں بھی دین کا کام کیا جائے، دین کے تعارف کا کام کیا جائے، اسلام کی طرف دعوت دینے کا کام کیا جائے، اسلام کے محاسن کو پیش کرنے کا کام کیا جائے اور لوگوں کو زندگی اور زندگی کے بعد کے خطرات سے نکالنے کا کام کیا جائے تو یہ آیت اس کی پوری تصویر کھینچ دیتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمن الرحیم الم تر کیف ضرب اللہ مثلاً کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السمآء تؤتی اکلھا کل حین باذن ربھا ویضرب اللہ الامثال للناس لعلھم یتذکرون.

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے پاک بات کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے؟ (وہ ایسی ہے) جیسے پاکیزہ درخت جس کی جڑ مضبوط (یعنی زمین کو پکڑے ہوئے) ہو، اور شاخیں آسمان میں، اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا (اور میوے دیتا) ہو اور خدا لوگوں کے

لئے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔"

اس آیت میں مکانی رقبہ بھی آ گیا اور زمانی رقبہ بھی آ گیا اور اس کی بنیاد اور اس کا سرچشمہ بھی آ گیا اور اس کے نقطۂ عروج اور جن بلندیوں تک اسلام کی دعوت پہنچ سکتی ہے اس کا ذکر بھی آ گیا۔

آپ ایک درخت کی حقیقت پر غور کیجئے (کشجرۃ طیبۃ) پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ اچھا درخت ہو "شجرۃ طیبۃ" اور یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں شرط ہے کام کی کامیابی کے لئے، کتنی ہی بڑی ذہانت اور کتنے ہی بلند مقاصد، کتنے ہی وسیع وسائل، کتنی ہی بڑی جمعیت، کتنی ہی اپنے عہد کی علمی وصنعتی ترقیاں سب ساتھ ہوں تو وہ اللہ کے یہاں معتبر نہیں ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ مقصد صحیح ہو، دافع اور محرک صحیح ہو اور وہ دعوت بذاتِ خود صحیح ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "الم تر كيف ضرب الله مثلاً كلمة طيبة" (کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے پاک بات کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے؟)

پہلی شرط تو یہ ہے کہ کلمہ طیبہ ہو، صرف کلمہ ہونا کافی نہیں، دنیا میں ایک بہت بڑی غلطی یہ ہوتی رہی ہے، ادبیات کی تاریخ بتاتی ہے، شاعری کی تاریخ بتاتی ہے، ذہانت وحکمت کی تاریخ بتاتی ہے، یونان کے فلسفہ ومنطق کی تاریخ بتاتی ہے کہ لوگوں نے کلمہ کو کافی سمجھ لیا، کلمہ ہونا چاہئے اور اس کے اندر انسان کی ذہانت جھلکنی چاہئے، اس کے اندر مضمون آفرینی ہونی چاہئے، انسان کے مطالعہ کی گہرائی ہونی چاہئے، اظہارِ بیان کی طاقت ہونی چاہئے، دنیا میں زیادہ تر اسی پر زور دیا گیا ہے۔ آپ ساری دنیا کے ادبیات کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان سب میں "کلمہ" پر زور ہے، کلمہ طیبہ پر زور نہیں۔

پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ کلمہ طیبہ ہو، اس کا مقصد صحیح ہو، بات جو کہی جائے تو صرف اتنا کافی نہیں کہ وہ فصیح وبلیغ ہے، بعض لوگوں نے اس کو کافی سمجھا ہے، اگر آپ مذہبی، دینی نفسیات کی تاریخ پڑھیں اور دعوتوں کی تاریخ پڑھیں، تو بہت جگہ ایسا ہوا ہے کہ بہت سے لوگوں نے کلمہ کو کافی سمجھا ہے کہ بات اچھی طرح (Tactfully) کہی جا رہی ہے، لیکن وہ خود بجائے خود صحیح ہے، اس کا رشتہ صحیح ہے، وہ خالقِ کائنات سے الہام اور اس کی رہبری سے اخذ کی گئی ہے، وہ صحفِ سماویہ سے لی گئی ہے، وہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے ماخوذ ہے، یا صرف اس میں انسان

کی فصاحت وبلاغت ہی ہے، اس کا زور بیان ہے، اس کی شاعری کی لطافت ہے؟!

کلمہ طیبہ کی مثال دینے کے لئے دنیا میں سینکڑوں، ہزاروں چیزیں ہوسکتی تھیں، موتی، جواہرات، سونا، چاندی، پھول، پھل، سب سے تشبیہ دی جاسکتی تھی، لیکن "کلمہ طیبہ" کے بارآور ہونے اور اس کے ثمردار ہونے اور اخیر عہد تک اس کی کام کرتے رہنے کی مثال درخت سے بہتر نہیں ہوسکتی، درخت کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ وہ شجرۂ طیبہ ہو، یہ نہیں کہ آپ نیم کا درخت لگائیں اور آپ اس سے آم کی امید رکھیں، آپ کانٹے بوئیں اور آپ اس سے پھول کی توقع کریں، خود وہ شجرہ بھی طیبہ ہونا چاہئے، جیسے کلمہ طیبہ ہوتا ہے، اس کی تعریف میں کہا گیا ہے "کشجرة طيبة" اب اس کے بعد قرآن مجید کا اعجاز ہے، وہ کہتا ہے: "اصلها ثابت وفرعها في السمآء" جس کی جڑ مضبوط ہو اور شاخیں آسمان میں۔ آپ ان الفاظ کی وسعت اور ان کی لطافت پر غور کریں تو ان میں سب کچھ کہہ دیا گیا ہے، اس میں ادیان سماویہ کی تاریخ آگئی ہے، اس میں نبوت اور پیغمبروں کی مساعی اور کوششوں کی تاریخ آگئی، اس میں ان روحانی تبدیلیوں اور انقلابات کی تاریخ آگئی، جس کا احاطہ اس وقت تک نہیں کیا گیا اور احاطہ کرنا مشکل ہے، سینکڑوں نہیں، ہزاروں نہیں، لاکھوں مثالیں ایسی ہوں گی مخلصین کے کلام کی کہ جن کا کوئی ریکارڈ ہمارے سامنے نہیں ہے۔

تو ایک تو یہ کہ وہ ایسا شجرۂ طیبہ ہو کہ "اصلها ثابت" اس کی جڑ تو زمین میں ہوگی "وفرعها في السمآء" اور اس کی شاخ آسمان سے باتیں کرتی ہوگی، ایک انسان کی زبان سے کلمہ نکلے گا، لیکن وہ قوموں کی تقدیر بدل دے گا، زمانہ کا رخ بدل دے گا، سوچنے کا طریقہ بدل دے گا، قوموں کی قومیں دین حق میں داخل ہوں گی۔

اس کے لئے ایک مثال جو اس وقت میرے ذہن میں آئی آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں کہ آپ یہ دیکھیں کہ ایک چھوٹا سا کلمہ کیا کام کرتا ہے؟ اس کے لئے میں عرض کردوں اپنے فاضل دوستوں کے سامنے کہ محض ــــ، محض ذہانت، محض پیش کرنے کا بہتر سے بہتر طریقہ، الفاظ کا انتخاب، انشاء پردازی اور خطابت کا زور تنہا کافی نہیں ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا اور اسلام کو جو اس وقت آپ دنیا میں پھیلا ہوا دیکھ رہے ہیں، اسلام کی جو فتوحات ہیں، ان میں ایک بہت بڑا عامل یہ تھا کہ جو بات دل سے نکلتی ہے اثر

رکھتی ہے:

ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد

اس کی ایک مثال میں دیتا ہوں جو اس وقت میرے ذہن میں آئی ہے، مثالیں تو بہت ہیں، پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب Preaching of Islam میں ایک واقعہ لکھا ہے، ترکی اور ایرانی تاریخوں میں بھی یہ واقعہ آیا ہے، لیکن تھوڑے فرق کے ساتھ، پہلے تو میں ''آرنلڈ'' کے بیان کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اس کے بعد پھر ترکی اور فارسی تاریخوں میں جو واقعہ مذکور ہے وہ بیان کروں گا، تو قلق تیمور تاتاریوں کی ایک شاخ کا شہزادہ تھا، جس کا پایہ تخت کاشغر تھا، آپ کو معلوم ہے کہ ساتویں صدی ہجری اور تیرہویں صدی عیسوی میں تاتاریوں نے ترکستان اور ایران پر حملہ کیا اور پھر اس کے بعد وہ بغداد تک پہنچ گئے، اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور عالم اسلامی کی چولیں ہلادیں، ایسا نظر آنے لگا کہ اب اسلام دنیا میں ایک طاقت کی حیثیت سے باقی نہیں رہے گا، ان کی ایک شاخ (وہ مختلف شاخوں میں تقسیم ہوگئے تھے) جو ترکستان پر حکمران تھی (یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ اس وقت ترکستان میں ایک نیا انقلاب ہوا اور ہم اس حالت میں اس کا ذکر کر رہے ہیں کہ اس کا نام لینے سے ہمارے دل میں چوٹ نہیں لگتی) جس میں ایران بھی شامل تھا، اس کا وہ ولی عہد تھا، ابھی اس کی تاج پوشی نہیں ہوئی تھی، تاج پوشی کے بعد وہ اپنے پورے قلمرو کا حکمران ہوتا، وہ شکار کے لئے نکلا اور آپ کو معلوم ہے (شاید آپ میں سے بہت سے لوگ شکار کھیلتے ہوں) کہ شکاریوں کے کچھ توہمات ہوتے ہیں، ان کے یہاں کچھ روایات ہوتی ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں، وہ محض اتفاقات ہوتے ہیں۔ لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا، تو قلق تیمور ہرن کا شیر کا شکار کرنا چاہتا تھا، اور اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ دین حق اس کو اپنا اسیر اور تابع بنالے اور تاتاریوں کی ایک پوری شاخ اسلام کے حلقہ بگوش بن جائے۔

تو قلع تیمور اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں شکار کے لئے نکلا، ہر طرف پہرے بٹھا دیئے گئے کہ کوئی باہر کا آدمی شکارگاہ میں داخل نہ ہونے پائے، ایک ایرانی بزرگ شیخ جمال الدین کہیں جارہے تھے، وہ نادانستہ اس شکارگاہ میں داخل ہوگئے، ان کو مشکیں باندھ کر شہزادہ کے سامنے حاضر کیا گیا، خان نے ان سے غضبناک ہوکر کہا کہ ایک ایرانی سے تو کتا ہی بہتر ہوتا

ہے۔ شیخ نے کہا کہ ہاں یہ سچ ہے، اگر ہم کو اللہ تعالیٰ دینِ حق کی نعمت و عزت نصیب نہ فرماتا تو ہم سے کتا ہی بہتر ہوتا۔ خان نے شیخ سے پوچھا کہ "دینِ برحق کیا چیز ہے؟" شیخ نے اسلام کے عقائد ایسی گرم جوشی اور ایسے دینی ولولے سے بیان کئے کہ اس کا پتھر دل موم کی طرح پگھل گیا۔ شیخ نے حالت کفر کا بھی ایسا ہیبت ناک نقشہ کھینچا کہ خان پر لرزہ طاری ہو گیا، خان نے شیخ سے کہا کہ جب آپ سنیں کہ میری تاج پوشی ہوگئی تو آپ مجھ سے ضرور ملیں۔

یہ دل سے نکلی ہوئی بات تھی، اس لئے اس میں کوئی منطقی اثر ہو یا نہ ہو، لیکن اس کے دل پر اس کا اثر پڑا، اور یہ من جانب اللہ بات تھی، یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جب تک دعوت میں وہ دل شامل نہ ہو جو نورِ باطن سے منور اور دردمند ہے اور وہ بات دل کی گہرائی سے نہ نکلی ہو تو اس کا وہ اثر نہیں ہو سکتا کہ زندگی میں انقلاب پیدا کر دے۔

یہ تو روایت ہے آرنلڈ کی، لیکن ترکی اور فارسی کے مآخذ میں جو زیادہ معتبر ہیں یہ ہے کہ اس نے ان سے پوچھا کہ کتا زیادہ عزت رکھتا ہے یا ایرانی؟ انہوں نے نہایت اطمینان سے یہ جواب دیا کہ ابھی اس کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، اس نے کہا ابھی اس کا فیصلہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ یا کہو کتا زیادہ عزت رکھتا ہے یا کہو کہ میں، وہ اس کی تیاری میں تھا کہ اگر وہ یہ کہہ دیتے کہ میں بہتر ہوں تو وہ تلوار سے ان کا سر اڑا دیتا، اور اگر کہتے کہ کتا زیادہ عزت والا ہے تو کہتا کہ چلے جاؤ۔ اس نے کہا کہ اس میں انتظار کی کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ اگر میرا خاتمہ ایمان پر ہوا تو میں عزت والا ہوں، ورنہ یہ کتا معزز ہے۔ اس نے پوچھا کہ ایمان کیا ہوتا ہے؟ انہوں نے ایمان کی تشریح کی۔

اس کے بعد وہ برابر اس کے انتظار میں رہے کہ یہ اطلاع ملے کہ تغلق تیمور کی تاجپوشی ہوگئی ہو تو میں جاؤں اور یہ واقعہ یاد دلاؤں، لیکن ان کی قسمت میں نہیں تھا۔ جب وہ عالم سکرات میں تھے، آخری وقت تھا تو انہوں نے اپنے صاحبزادہ شیخ رشید الدین کو بلایا اور کہا کہ دیکھو بیٹا! میری قسمت میں تو یہ سعادت نہیں تھی، لیکن شاید تمہاری قسمت میں ہو، جب سننا کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہوگئی اور وہ بادشاہ ہو گیا تو اس سے ملنا اور یہ واقعہ یاد دلانا۔

یہاں سے آرنلڈ اور ترکی کتابوں کا بیان مشترک ہے۔ وہ یہ کہ جب شیخ رشید نے سنا کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہوگئی تو وہ گئے، اس کے شاہی محل میں، ان کو کون اندر جانے دیتا، جب ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو انہوں نے ذرا فاصلہ پر ایک درخت کے نیچے مصلیٰ بچھالیا اور وہاں نماز

پڑھنی شروع کی، جب نماز کا وقت آتا اذان دیتے اور نماز پڑھتے۔ اور وقتوں میں تو اذان کی آواز نہیں پہنچتی لیکن فجر میں ایک دن جو کہ سناٹے کا وقت ہوتا ہے محل میں آواز آئی۔ اس نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ یہ کیسی مجنونانہ صدا ہے؟ یہ کیا صدائے بے ہنگام ہے؟ لوگوں نے کہا کہ بادشاہ سلامت! (وہ جس طرح بھی خطاب کرتے ہوں) ایک مجذوب سا شخص ہے، وہ کچھ اٹھتا بیٹھتا ہے اور یہ آواز لگاتا ہے، اس نے کہا کہ پکڑ لاؤ اسے، وہ لائے گئے تو اس نے کہا تم کون ہو؟ اور یہ کیا آواز لگاتے ہو؟ انہوں نے کہا آپ کو کچھ یاد ہے، ایک مرتبہ آپ شکار میں گئے تھے، تو ایک ایرانی عالم آپ کو ملے تھے شیخ جمال الدین، ان سے آپ کا کچھ مکالمہ ہوا تھا، اس نے کہا کہ ہاں یاد ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں یہ شہادت دینے آیا ہوں کہ ان کا ایمان پر خاتمہ ہوا، اس نے اسی وقت کلمہ پڑھا۔ آرنلڈ نے بھی یہ لکھا ہے اور ترکی فارسی کتابوں میں بھی یہی لکھا ہے، اس نے کلمہ پڑھا اور اپنے ایک رازدار اور سربرآوردہ امیر کو بلایا اور تنہائی میں کہا کہ دیکھو میں نے اپنے متعلق فیصلہ کیا ہے کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں، اب تم اپنے متعلق سوچو، انہوں نے کہا کہ حضور میں تو بہت دنوں سے مسلمان ہوں، آپ کے ڈر سے ظاہر نہیں کرتا تھا، اس کے بعد پھر اس طرح پوری کی پوری شاخ سو فیصدی مسلمان ہو گئی۔

میں عرض کر رہا تھا ''کشجرة طيبة'' یہ محض اتفاقی لفظ نہیں ہے، قرآن مجید میں کوئی اتفاقی لفظ نہیں ہوتا، پہلی شرط یہ ہے کہ ''شجرۂ طیبہ'' ہو، یہ نہیں کہ آپ برگد کا درخت لگا دیں، نیم کا درخت لگا دیں، کانٹے بو دیں اور آپ ان سے اچھے پھل پھول کی امید کریں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ ''شجرۂ طیبہ'' ہو پھر اس شجرۂ طیبہ کی جو صفت خدا نے بیان کی وہ بالکل اس کے دین کی صفت ہے کہ ''اصلها ثابت وفرعها في السماء'' جڑ تمہیں نظر آئے گی زمین پر، اور شاخیں تمہیں نظر آئیں گی آسمان پر، اب آپ اسلام کی تاریخ پڑھیے کہ کس پستی کی حالت میں، کس بے سروسامانی کی حالت میں، کس کمزوری کی حالت میں اس کی ابتداء ہوئی اور پھر اس کی شاخیں کہاں تک پہنچیں؟

''تؤتي اكلها كل حين باذن ربها'' یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے، ہر زمانہ میں وہ اللہ کے حکم سے پھل دیتا رہے گا، یہ محض ''شجرۂ طیبہ'' نہیں۔ ''شجرۂ طیبہ خالدہ'' ہے، یہ زمانہ کے تغیرات کا تابع نہیں ہے، بہت سے درخت ہیں، جو اپنی عمر پوری کر لیتے ہیں، اور ختم ہو جاتے

ہیں، جانوران کو تباہ کر دیتے ہیں اور خود ان کا لگانے والا کبھی ان کو کاٹ دیتا ہے، تو اس میں بتایا کہ اس کی مکانی تو یہ ہے کہ وہ زمین سے اٹھتا ہے اور آسمان تک جاتا ہے یہ تو اس کی مکانی وسعت ہے اور زمانی وسعت یہ ہے کہ "تؤتی اکلها کل حین باذن ربها" وہ اپنے پھل ہر زمانے میں اللہ کے حکم سے دیتا ہے۔

اب آپ دیکھئے یہ برطانیہ ہے، جب اس کی حکومت ہندوستان کے برصغیر پر تھی تو کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ خاص اس کے دارالحکومت لندن میں اور اس کے قرب وجوار میں اسلامی مطالعہ کے مراکز قائم ہوں گے، اور اسلام کی دعوت وہاں پیش کی جائے، ایک وقت تو ایسا آیا تھا کہ ہندوستان میں عیسائیت کے مبلغ (پادری) میدان میں آگئے تھے، اور انہوں نے حکومت کو بھی یہ یقین دلا دیا تھا کہ یسوع مسیح نے ہم کو یہ ملک دیا ہے، اور ہمیں ان کے مذہب کی تبلیغ کرنی چاہئے، مسلمانوں کے (خاکم بدہن) ارتداد کا بڑے پیمانے پر خطرہ پیدا ہو گیا تھا، اس کی بناء پر مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی نے "اظہار الحق" جیسی معرکۃ الآراء کتاب لکھی اور آگرہ میں پادری فنڈر سے ان کا مناظرہ ہوا جس میں اس کی شکست فاش ہوئی، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے اس خطرہ سے ندوۃ العلماء کی تحریک چلائی، مجھے معلوم ہے کہ اس کے پس منظر میں عیسائی مبلغین کی سرگرمیوں اور ان کے نتائج کا خطرہ کام کر رہا تھا، انہوں نے ایسے علماء و مبلغین کا تیار کرنا ضروری سمجھا جو دوسرے مذاہب کا مطالعہ کر سکیں، وہ کسی مغربی زبان (بالخصوص انگریزی سے) بھی واقف ہوں اور جغرافیہ اور تاریخ سے بھی آشنا ہوں، اور اس نئی نسل کو اس کی مانوس زبان میں خطاب کر سکیں اور مسائل حاضرہ میں مسلمانوں کی رہنمائی کریں۔

"تؤتی اکلها کل حین باذن ربها" ہر زمانہ میں وہ پھل دے گا اللہ کے حکم سے۔

آج آپ اپنی آنکھوں سے اس آیت کا تحقق دیکھ رہے ہیں کہ وہ شجرۂ طیبہ جو آخری رسول نے لگایا تھا اور جس کی جڑ زمین میں تھی، کہاں تھی؟ جزیرۃ العرب میں تھی، جو سیاسی حیثیت سے، فکری حیثیت سے، علمی حیثیت سے، اور مالی حیثیت سے، ہر حیثیت سے دنیا کا پسماندہ ترین علاقہ تھا، اور ساری دنیا سے کٹا ہوا تھا "اصلها ثابت وفرعها فی السماء" اس کی شاخیں کہاں تک گئیں؟ اس کی شاخیں آسمان تک گئیں، آپ دیکھیں کہ اس کی اشاعت وفتوحات کے نتیجہ میں کتنی سلطنتیں پیدا ہوئیں، اس کے نتیجہ میں کتنی دانش گاہیں، کتنی جامعات وجود میں آئیں، کتنے

مراکز ہدایت وتربیت قائم ہوئے، کتنے محقق پیدا ہوئے، کتنے مفکر پیدا ہوئے، کتنے ادیب پیدا ہوئے اور کتنا بڑا لٹریچر تیار ہوا، کسی ایک زبان میں بھی اگر آپ اس کا احاطہ کرنا چاہیں تو مشکل ہے، جو کلمہ کہا گیا تھا، جزیرۃ العرب میں بیٹھ کر وہ کلمہ آج ساری دنیا میں پھیل رہا ہے، اور وہ اپنے پھل دے رہا ہے، شجرۂ طیبہ کی طرح پھل پھول رہا ہے۔

اس وقت کسی طویل تقریر کی ضرورت نہیں، اہل علم کا مجمع ہے، اہل فکر اور مطالعہ کرنے والوں کا مجمع ہے، میں عرض کروں گا کہ دعوت کے لئے دو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔

ایک تو واقفیت کی ضرورت ہے کہ نفسیات انسانی سے واقفیت ہو۔ اور بیان کی ضرورت ہے، زبان کی بڑی اہمیت ہے اور آپ حضرات نے بہت صحیح قدم اٹھایا ہے، میں اس کی داد دیتا ہوں اور اس کی تحسین کرتا ہوں کہ آپ نے بہتر سے بہتر انگریزی زبان میں اسلام کو پیش کرنے کا انتظام کیا ہے اور اس کے لئے آپ لوگوں کو تیار کر رہے ہیں تو ایک تو عقل سلیم کی، ذہانت کی ضروت ہے اور دوسرے زبان کی ضرورت ہے کہ اچھی سے اچھی زبان میں دعوت دی جائے، بہت سے حلقوں میں یہ غلط فہمی ہے کہ زبان کی کوئی اہمیت نہیں ہے، آدمی کو جس طرح بن پڑے، اپنے خیالات ظاہر کر دینے چاہئیں، لیکن جب ہم سیدنا عبدالقادر جیسے زاہد فی الدنیا اور متوکل علی اللہ اور ان سے پہلے امام حسن بصری کے مواعظ پڑھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ زبان کی کیا اہمیت ہے، اور انہوں نے زبان کو کیا اہمیت دی ہے اور کس زبان میں انہوں نے اپنے مخاطبین اور معاصر نسل کو خطاب کیا ہے کہ اس سے بہتر مشکل ہے، یہ مسلم ہے، عربی ادب کی تاریخ میں کہ حجاج اور حسن بصری سے بڑا کوئی بلیغ نہیں تھا اور حسن بصری کو فوقیت حاصل ہے حجاج پر۔ پھر اس کے بعد ہر دور میں آپ دیکھیں گے۔ حضرت علی مرتضیٰؓ کو چھوڑ دیجئے وہ تو ابلغ البلغاء تھے، لیکن اس کے بعد ہر دور میں آپ دیکھیں گے، آپ ابن الجوزی کو لیجئے، اعلیٰ سے اعلیٰ زبان انہوں نے استعمال کی اور تاریخ وادب کے ایک مدرس کی حیثیت سے بھی اور ادب کے نمونوں کو جمع کرنے والے ایک جامع کی حیثیت سے بھی کہتا ہوں کہ جن کی طرف خیال بھی نہیں جا سکتا تھا ان کی کتابوں میں وہ ادبی ٹکڑے ملتے ہیں جن کو ادب کے شہ پارے کہنا چاہئے، ہم نے اس سلسلہ میں امام ابن تیمیہ کا بھی نام لیا ہے اور شیخ محی الدین ابن عربی کا بھی نام لیا ہے، جہاں خیال بھی نہیں جا سکتا، وہاں بھی آپ کو ایسے ادبی نمونے ملیں گے، پھر

سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ سے بڑھ کر دنیا میں زاہد اور مدح وذم سے بے پرواہ کون ہوگا؟ ان کے جو مواعظ محفوظ ہیں، ان کو دیکھئے اور میں یہ عرض کروں گا کہ بزرگوں کے مواعظ زیادہ قابل اعتبار ہیں، اس لئے کہ لوگوں نے تبرکاً ان کو جوں کا توں نقل کیا ہے، بادشاہوں کے فرامین یا ادباء کا کلام اتنا محفوظ نہیں ہے، اس کو لوگ بدل دیتے ہیں، لیکن بزرگوں کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو لوگ بجنسہٖ نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ ان میں برکت سمجھتے ہیں، یہ بات تاریخی وادبی لحاظ سے بھی ایک واقعہ ہے کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، پورے وثوق کے ساتھ کہ یہ انہیں کے الفاظ ہیں، اگر آپ ان کے مواعظ کے مجموعہ کو دیکھیں تو آپ کو حیرت ہوگی، بعض مرتبہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل گرج رہا ہے اور بجلیاں کوندرہی ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ اب بجلی گری، اب بجلی گری۔

تو ایک تو چیز ہے علم ومعرفت، دوسری چیز ہے زبان کی تاثیر اور قوت اور تیسری چیز ہے اخلاص ودردمندی، یعنی خود دل پر چوٹ ہو اور جو چیز نکلے صرف قلم سے نہ نکلے بلکہ قلب سے نکلے، تب اس کا اثر ہوگا، اگر ہم نے ان ''عناصر اربعہ'' کا خیال رکھا تو مغربی ممالک میں، اور اس نئے بدلے ہوئے زمانہ میں اور مختلف زبانوں کے بولنے والوں میں تحریری وتقریری طور پر دین صحیح کی دعوت ضرور اثر انداز ہوگی، اور اللہ تعالیٰ اس کے بہتر سے بہتر نتائج عطا فرمائے گا، اس میں ہمارے لئے بہت بڑی بشارت اور فال نیک ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "تؤتی اکلها کل حین باذن ربها" ورنہ آدمی یہ کہتا ہے کہ زمانہ گذر گیا، اب یہ بیسویں صدی ہے، دنیا نے کتنی ترقی کرلی ہے، سائنس، پالیٹکس، ٹیکنالوجی کی ترقی کہاں سے کہاں پہنچی، ذہن وفکر کا معیار بدل گیا ہے، اب وہ زمانہ نہیں رہا، اب اس وقت اسلام کی دعوت کوئی اثر نہیں کرے گی، تو قرآن نے "تؤتی اکلها کل حین باذن ربها" کہہ کر تسلی دی ہے اور تقویت کا سامان کیا ہے کہ کسی زمانہ کے، کسی جگہ کے لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ہمارے اسلام کی دعوت دینے کا کیا فائدہ؟ قرآن نے ''کل حین'' کہہ کر زمانہ کی تحدید کو ختم کردیا۔

لیکن یہ سب اللہ کے ارادہ اور قدرت سے ہوگا اس نے ''باذن ربها'' کہہ کر یہ بتادیا کہ اپنی ذہانت پر، اپنی زبان کی مہارت پر اعتماد نہ کرو، بلکہ یہ بھی سمجھو کہ اللہ ہی اگر چاہے تو اثر ہوگا، اس کے اندر دعوت کا پورا نقشہ آگیا ہے۔

میں اس کو محض اتفاقی بات نہیں کہوں گا، میں اتفاقات کا قائل نہیں، یہ بھی منجاب اللہ

بات تھی، میں یہاں آ کر اسی کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور میرا ذہن خالی تھا، میں نے سوچا کہ تقریر کہاں سے شروع کروں گا؟ قاری صاحب کو اللہ جزائے خیر دے انہوں نے یہ آیت پڑھی، میں نے کئی بار تجربہ کیا، امریکہ اور یورپ کے دورہ میں خاص طور پر کہ میں بعض اوقات بالکل خالی الذہن ہوتا تھا، پے درپے پروگرام ہوتے تھے، ابھی ایک جگہ سے آیا، دوسری جگہ سے آیا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں اور کیا بات کہوں، میں نے قاری پر چھوڑ دیا، قاری نے آیت پڑھی اور گویا بالکل میرے لئے آیت پڑھی۔

حضرات! میں اس مرکز کے ذمہ داروں، خاص طور پر محترمی مناظر احسن صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے مدعو کر کے اس قابل قدر مرکز کے معائنہ کا موقع دیا، میں آپ کے علمی، تحقیقی اور تربیتی واشاعتی شعبوں اور اس عظیم عمارت اور اس کے سلیقہ ونظام کو دیکھ کر بہت مسرور ہوں، لیکن میں دین کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ بات ضرور کہوں گا کہ دعوتی و تعلیمی مرکز کسی خاص مکتب خیال، دعوت و جماعت کی تشہیر ودعوت کا ذریعہ نہ بنایا جائے، صرف اللہ کی رضا مطلوب ہو، اور یہ کہ اسلام اپنی صحیح وعمومی شکل میں دوسروں تک پہنچے اور اللہ ان کو ہدایت دے، اس کا ثواب ان کو ضرور پہنچے گا، جنہوں نے اسلام کے تعارف و تفہیم کی طرف رہبری کی اور اس کا سامان مہیا اور مواد فراہم کیا، لیکن اس میں جماعتی عصبیت یا شخصی تقدس و عظمت کا عقیدہ نہیں ہونا چاہئے، اسلام کو بحیثیت اسلام و دین حق کے پیش کرنا چاہئے، اس میں کسی کی اجارہ داری نہیں، ہمارا شعار اور اعلان خاص طور پر عیسائی ملک اور مغربی ماحول میں وہی ہونا چاہئے جس کی قرآن نے تعلیم دی۔ "تعالوا الی کلمة سواءٍ بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ" (جو بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں (تعلیم کی گئی) ہے اس کی طرف آؤ وہ یہ کہ خدا کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے۔

میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یہ اعزاز بخشا، اعتماد کا اظہار فرمایا اور خطاب کا موقع دیا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

داعیانِ اسلام کی حکمت وبصیرت

ہم نے گذشتہ خطبات میں جہاں تین اولوالعزم انبیائے کرام کے طرز ہائے دعوت کے نمونے پیش کئے تھے (یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام) اور ان کے وہ مکالمات نقل کئے تھے، جو ان کے اور ان کی امت دعوت اور امت اجابت کے درمیان (۱) ہوئے، وہاں ہم نے ایک ایسے فرد کا بھی مکالمہ نقل کیا ہے، جس کو نبوت ورسالت کے لئے نہیں منتخب کیا گیا تھا، وہ کسی قوم کی طرف مبعوث نہیں کیا گیا تھا، بات صرف اتنی تھی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہم عصر ایک مرد مومن تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کے سینے کو ایمان وحکمت کے لئے کھول دیا تھا، اس کی قوت گویائی نرم ونازک بات کی ادا کرنے کے لائق ہوگئی تھی، ایک بلیغ اور پاکیزہ وعظ اس طرح اس کے زبان سے نکلا کہ معلوم ہوتا تھا، پہلے سے ایک اسکیم کے تحت اس نے اپنی باتوں کو مرتب کرلیا تھا، جس میں فکر کے ساتھ سنجیدگی کا عنصر نمایاں تھا، اس نے ''فی البدیہ'' اور فضول گوئی نہیں کی، جس پر وہ شرمندہ ہوتا یا معذرت کی ضرورت محسوس کرتا، یا اپنی بات واپس لینے پر مجبور ہوتا۔ اللہ تعالیٰ جس کو دعوت جیسے مقدس فریضہ کے لئے تیار کرتا ہے، اس کے اندر یہ صلاحیت ابھر آتی ہے، ہر وہ مخلص جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اس طرح کی خدمت انجام دینے کے لئے کھڑا ہوتا ہے، اور اپنی طرف سے اتمام حجت جس کا مقصد ہوتا ہے وہ اس طرح کی تائید ربانی سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

ہم نے اس سے پہلے کے خطبہ میں سید الانبیاء خاتم النبیین محمد ﷺ کی دعوت کے دو نمونے پیش کئے تھے، جہاں تک سیرت نبوی ﷺ کا تعلق ہے، وہ ایسے دل کش نمونوں اور بیانی ودعوتی معجزات کا ایک مجموعہ ہے جن کا احاطہ مشکل ہے، اس خزانے کے موتی کبھی کم نہیں ہوتے، آج کی مجلس میں ہم ایک دوسرے موضوع کی طرف آتے ہیں، جوان صاحب ایمان و

....

(۱) پیغمبر کے معاصرین جن کو وہ دعوت دیتا ہے، وہ دعوت قبول کریں یا نہ کریں، سب کو امت دعوت کہا جاتا ہے اور جو لوگ اس کی دعوت قبول کرلیں اور ایمان لے آئیں وہ امت اجابت میں شمار ہوتے ہیں۔ (مترجم)

عزیمت مومنین کی دعوت سے متعلق ہے، جو آغوش نبوت کے پروردہ اور تربیت مصطفوی کے ساختہ پرداختہ تھے، ان کی تعداد بھی کم نہیں ہے، سردست ہم ان میں سے ایک ممتاز فرد کا نمونہ پیش کرتے ہیں، اور وہ ہیں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، آنحضرت ﷺ کے چچازاد بھائی۔ یہ وہی جعفر ہیں جن کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا "اشبهت خلقي وخلقي" (اے جعفر تم ظاہری شکل وصورت اور اخلاق دونوں میں میرے شبیہ ہو)۔(۱)

وہ نازک اور خوف و ہراس کا عالم جس نے اس گفتگو کی تقریب پیدا کی

قبل اس کے کہ اس دعوت کا نمونہ پیش کیا جائے اور اس کی بلاغت، دعوتی روح اور نفسیات انسانی کے گہرے مطالعہ کی جو شان اس کے اندر جلوہ گر ہے اس کا جائزہ لیا جائے، مناسب ہوگا کہ اس ہولناک اور نازک موقع و ماحول کو اپنے سامنے رکھیں، جس میں اسلام کے تعارف، وترجمانی و مکی مسلمانوں کی مظلوم و مہاجر جماعت کی نمائندگی کا نازک و دشوار فرض انجام دیا گیا اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تھے، اس واقعہ کا پس منظر جس نے یہ حالات پیدا کئے تھے، سامنے رکھنا ضروری ہے۔

وہ مجلس جس میں حضرت جعفرؓ اسلام کی حقیقت بیان کرنے اور دعوت حق دینے کھڑے ہوئے تھے، اس کے بارے میں سیرت نگار لکھتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے جب صحابہ کرامؓ پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے ہوئے دیکھے اور یہ محسوس فرمایا کہ آپ ﷺ دشمنوں کو روک نہیں سکتے تو ان سے فرمایا "بہتر ہوتا کہ تم لوگ حبشہ کی سرزمین کی طرف چلے جاتے، وہاں ایک بادشاہ ہے جس کی سرزمین میں ظلم نہیں ہوتا، اور یہ اچھا ملک ہے۔ اس وقت تک وہاں رہو جب تک کہ اللہ ان مصائب سے نجات کا راستہ نہ دکھا دے۔" اس پر مسلمانوں کی ایک جماعت نے حبشہ کا رخ کیا، اور یہ اسلام کی تاریخ میں پہلی ہجرت تھی۔ یہ لوگ دس نفر تھے، آپ نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو ان کا امیر منتخب فرمایا۔ ان

(۱) صحیح بخاری، باب عمرۃ القضاء، مؤلف نے اپنی مرتبہ سیرت نبوی ﷺ میں اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے، ملاحظہ ہو نبی رحمت صفحہ ۳۶۴

کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالبؓ گئے، پھر سلسلہ لگ گیا۔ یہاں تک کہ تراسی (۸۳) نفر ہو گئے۔

جب قریش نے دیکھا کہ یہ لوگ امن کی جگہ پہنچ گئے اور حبشہ جاکر محفوظ ہو گئے تو انہوں نے عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عمرو بن العاص بن وائل (۱) کو حبشہ بھیجا اوران کے ساتھ بہت سی مکہ مکرمہ کی سوغاتیں شاہ نجاشی والی حبشہ کے لئے روانہ کیں۔ یہ دونوں نجاشی کے پاس پہنچے، وہ دربار کے بڑے مشیروں کو تحفہ دے کر پہلے سے ملا چکے تھے، بادشاہ کے دربار میں پہنچ کر بولے:

''بادشاہ عالی جاہ کے ملک میں ہمارے چند بے عقل چھوکرے آ کر بس گئے ہیں، جو اپنے مذہب کو بھی چھوڑ چکے ہیں، اور آپ کے مذہب میں بھی داخل نہیں ہوئے ہیں، وہ ایک ایسے نئے قسم کے مذہب کی پیروی کر رہے ہیں، جسے نہ ہم جانتے ہیں اور نہ آپ، ہم کو آپ کی خدمت میں ان کے سرپرستوں (باپ، چچا) خاندانی بزرگوں اور قبیلہ کے سرداروں نے بھیجا ہے کہ آپ ان لوگوں کو ہمارے ساتھ واپس کر دیں، وہ لوگ ان کی حقیقت سے زیادہ واقف ہیں اوران کی رائے ان کے بارے میں ہر طرح سے معتبر ہے۔''

دربار کے بڑے مشیروں نے ایک زبان ہو کر کہا۔ ''بادشاہ معظم یہ لوگ اپنے مطالبہ میں حق بجانب ہیں، ان جوانوں کا ان دونوں کے سپرد کر دیا جانا ہی مناسب ہے۔''

مسلمان پناہ گزینوں کا پرفریب اور نفرت انگیز تعارف:

ان الفاظ پر غور کیجئے جن کے ذریعہ ان مسلمانوں کا تعارف کرایا گیا تھا، جو حبشہ کی طرف ہجرت کر کے گئے تھے، یہ کتنا متوحش و متنفر بنانے والا تعارف تھا اور کس قدر چالاکی کے ساتھ خالص سیاسی انداز میں یہ بات کہی گئی تھی، ان دونوں (قریش کے نمائندوں) نے ان غریب الوطن مسلمانوں پر بھرپور وار کیا تھا، جو عام حالات میں خالی جانے والا نہ تھا۔

پہلے تو انہوں نے ان مسلمان مہاجروں کی حیثیت کو بہت کم کر کے اور حقیر انداز میں دکھایا، پھر ان کی ایسی تصویر پیش کی جو اور بھی تحقیر و استہزاء کا باعث ہو، کہنے لگے ''بادشاہ معظم کے ملک میں چند بے عقل چھوکرے آ کر بس گئے ہیں۔'' شاہی دربار میں اس لفظ کا خاص

---

(۱) یہ دونوں عرب کے اونچے درجے کے سیاسی دماغ کے آدمی تھے

مفہوم ہے، جہاں اونچے درجہ کے پختہ کار وزراء اور شہزادے اور دنیا دیکھے ہوئے گھاگ قسم کے پادری اور دانشور جمع تھے، ان دونوں نے بادشاہ اور اس کے حاشیہ نشینوں کے اندر ان مہاجروں کی طرف سے نفرت وتحقیر کا اور بھی احساس یہ کہہ کر بڑھایا کہ یہ لوگ اپنے مذہب کو چھوڑ چکے ہیں، (یعنی بے دین ہیں) اور آپ کے مذہب میں بھی داخل نہیں ہوئے ہیں، اور ایک ایسے نئے قسم کے مذہب کی پیروی کررہے ہیں، جسے نہ ہم جانتے ہیں اور نہ آپ۔ ان الفاظ کے ذریعہ ان دونوں (قریش کے نمائندوں) نے بڑی ایمانداری، انصاف اور غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسی بات کہی (بظاہر) جو عقل سلیم کے لئے قابل قبول تھی، اور زمانہ کے عرف ورواج کے مطابق تھی، ایسے مذہب کی کیا حیثیت ہوسکتی ہے، جس کا دنیا کے مانے ہوئے مذاہب میں سے کسی مذہب سے تعلق نہ ہو، نہ جمہور نے اس کو تسلیم کیا ہو اور نہ کسی حکومت نے؟ ایسا مذہب تو ایک بالکل نو ایجاد طریقہ زندگی ہوگا، جس کا دائرہ چند بے فکر اور ناسمجھ جوانوں تک محدود ہوگا۔

اس کے بعد ان دونوں نے جو کہا وہ بھی ایسی بات تھی، جس کو عام حالت میں ہر صاحب عقل قبول کرلیتا، کہنے لگے:

''ہمیں آپ کے پاس اے بادشاہ معظم! ان کے سرپرستوں (باپ، چچا) خاندانی بزرگوں اور قبیلے کے سرداروں نے بھیجا ہے کہ آپ ان کو ہمارے ساتھ واپس کردیں، وہ لوگ ان کے رشتہ دار، ہم وطن اور ان کی رگ رگ سے واقف ہیں۔''

نازک اور کشمکش میں ڈالنے والی پوزیشن:

یہ بات جو ان دونوں (نمائندگان قریش) نے کہی تھی کوئی معمولی بات نہ تھی، سفارتی قابلیت اور سیاسی ذہانت کا نمونہ تھی۔ یہ انداز گفتگو بادشاہ اور اس کے حاشیہ نشینوں کو اپنی طرف مائل کرنے اور ان کی تائید وہمدردی حاصل کرنے کے لئے بالکل کافی تھا، اس پر مزید یہ کہ دربار کے پادریوں نے (جو شاہ کے خاص الخاص مشیروں میں تھے) بھی کہہ دیا کہ یہ لوگ ٹھیک کہتے ہیں اے بادشاہ معظم! آپ ان (پناہ گزینوں) کو ان کے (قریش کے دونوں نمائندوں) کے سپرد کردیجئے! مسلمانوں کے لئے یہ بڑی فیصلہ کن اور نازک گھڑی تھی۔ کوئی آدمی بھی ان کی

جگہ ہوتا، ان کے اوسان خطا ہوجاتے اور نہ جانے اضطراب میں کیا کہہ دیتا یا زبان بالکل بند ہوجاتی، اس پوزیشن میں جو بھی ہوتا اور مسلمانوں اور اسلام کی نمائندگی کی جس پر ذمہ داری ہوتی اس کا فرض تھا کہ ایسی صورت حال نہ پیدا ہونے دے کہ بادشاہ کا پروقار دربار مناظرہ کا اکھاڑہ بن جائے، جہاں سوال جواب اور لے دے ہونے لگے، اس کو ایسی بات کہنے سے بھی احتیاط کرنا تھا جس سے اس عیسائی بادشاہ کا احساس برتری مجروح ہو، جو ملک کا حکمران ہونے کے ساتھ اپنے مذہب کا محافظ وسرپرست بھی تھا، اگر کوئی بات ایسی زبان سے نکل گئی تو وہ اپنے مذہب پر حملہ سمجھے گا، اور اس کی عیسائیت کی رگ حمیت بھڑک اٹھے گی، اور اس کے اندر اپنے مذہب کے دفاع کا جذبہ ابھر آئے گا۔

اس کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والا خالص علمی قسم کی بات منطق وفلسفہ کی زبان میں نہ چھیڑے، کیونکہ مسیحیت کے بڑے بڑے عالم وہاں موجود تھے، جو اپنے سے زیادہ کسی کو دینی علوم میں متبحر نہیں سمجھتے تھے، علوم سماوی میں کسی کو بال برابر بھی اہمیت دینے کے لئے تیار نہ تھے۔

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا حکیمانہ طرز:

حضرت جعفر نے اس جال اور مخمصہ سے کس طرح اپنے آپ کو اور مسلمانوں کو نکالا جسے قریش کے نمائندوں نے بنا تھا؟ اور وہ کیا طرز گفتگو تھا جو انہوں نے اس نازک گھڑی میں اختیار کیا؟

نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ کی تقریر پڑھنے والے کو پہلی نظر میں معلوم ہوگا کہ یہ ایک سادہ سی تقریر تھی جو انہوں نے مجبوری کے عالم میں فی البدیہ کردی، اور اس سے زیادہ ایک ایسے عرب سے توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی، جو ترقی یافتہ ومتمدن دنیا سے دور سیاسی داؤپیچ سے بے خبر اور علم وثقافت سے نابلد تھا۔

لیکن ایسا نہیں ہے، حضرت جعفرؓ کی تقریر حکمت وموقع شناسی اور سلامت عقل کا نمونہ تھی، ٹھیک وقت پر اور صحیح ومناسب موقع پر اللہ نے ان سے بات کہلادی، ان کی تقریر سے ان کی لسانی مہارت وبلاغت سے زیادہ ان کی ذہنی توازن اور عقلی پختہ کاری کا پتہ چلتا ہے اور وہ

ایک القائی والہامی تقریر معلوم ہوتی ہے، یہ تقریر اللہ کی طرف سے دین حق کی تائید کا ایک مظہر تھی، اور اس بات کی شہادت کہ اللہ تعالیٰ نے مقدر فرمادیا ہے کہ اسلام کی روشنی مکمل ہو کر رہے گی، اور اللہ اس کو ہر دین پر غالب کر کے رہے گا، اس کے ساتھ فطرت سلیم اور عقلی بلندی کا بھی پتہ چلتا ہے، جس میں تمام عربوں کے مقابلہ میں قریش فائق تھے، اور قریش میں بنو ہاشم تھے۔

حضرت جعفرؓ نے بجائے خطابت واستدلال اور مذاہب کے تقابل کے، اس بات کو ترجیح دی کہ وہ صرف اس صورت حال کا نقشہ کھینچ دیں جس میں جزیرہ عرب کے لوگ زندگی گزار رہے تھے، اور اب رسول برحق کی بعثت اور ان پر ایمان لانے کے بعد ان کی کیا حالت ہے، اور یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو ایمان لانے کی تزکیہ نفوس اور تہذیب اخلاق کی صحیح اور سچے دین کی پیروی کرنے کی جو دعوت دی ہے، اس نے ان کے اندر کیا انقلاب عظیم برپا کر دیا اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے!

جب صورت حال بیان کی جاتی ہے، اور اگر اس میں مبالغہ اور مناظرہ کا رنگ نہ ہو تو اثر کرتی ہے اور جو مفہوم بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، وہ آسانی سے ذہنوں میں جم جاتا ہے، مقاصد کی تکمیل کی راہ ہموار ہوتی ہے، اور غور وفکر، انصاف اور ہمدردی کے ساتھ بات سننے کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔

نجاشی کے دربار میں:

اب سنئے، حضرت جعفر ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نجاشی کے دربار میں تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بادشاہ معظم!

ہم جاہلیت کی زندگی گزارنے والے لوگ تھے، بت پوجتے، مردار کھاتے، بے حیائی کے کام کرتے اور خونی رشتوں کے حقوق کو نظر انداز کرتے تھے، ہم اپنے پڑوسیوں کے ساتھ برا سلوک کرتے تھے، ہم میں جو طاقتور تھا وہ کمزور کو دبا کر رکھتا تھا۔

ہمارے یہی شب وروز تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف اپنا ایک پیغمبر مبعوث کیا، جو ہم ہی میں سے ہے، اور ہم ان کے خاندان کو اچھی طرح جانتے ہیں، ان کی سچائی اور امانت داری

اور پاک دامنی سے واقف ہیں، انہوں نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا اور تلقین کی کہ ہم اس کو یکتا اور بلاشریک مانیں، اس کی عبادت کریں اور ان اعمال سے باز آجائیں، جو ہمارے آباء و اجداد کرتے آئے ہیں، جو خدا کو چھوڑ کر پتھروں اور مورتیوں کو پوجا کرتے تھے، ان پیغمبر نے ہمیں سچ بات کرنے، امانت کی ادائیگی، صلہ رحمی، پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی کی تعلیم دی، لوگوں کے حقوق پر دست درازی اور خون ناحق کے جرائم سے روکا، بے حیائی کے کاموں سے باز رہنے کا حکم دیا، جھوٹ بولنے، یتیموں کا مال کھانے، شریف خواتین پر تہمت لگانے سے منع کیا اور ہمیں تعلیم دی کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں، ہمیں نماز ادا کرنے، زکوٰۃ نکالنے اور روزہ رکھنے کی تلقین کی۔ (اسی طرح حضرت جعفرؓ نے ارکان اسلام شمار کرائے) تو ہم نے ان کی تصدیق کی اور ان پر ایمان لائے۔ اور اللہ کی طرف سے جو باتیں لے کر آئے تھے، ان کی تعمیل کی، خدائے واحد کی عبادت کرنے لگے، شرک سے مجتنب ہوئے، ان باتوں کو اپنے اوپر حرام قرار دیا جنہیں اللہ کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا اور ان باتوں کو حلال سمجھا جن کو اللہ کے رسول ﷺ نے ہمارے لئے حلال قرار دیا۔

جب ہم نے ایسا کیا تو ہماری قوم نے ہم سے زیادتی شروع کی، طرح طرح کی ایذائیں پہنچانے لگے، ہم کو اپنے اس دین سے پھیرنے کی تدبیریں کرنے لگے، تاکہ پھر اللہ تعالیٰ کی عبادت چھوڑ کر اصنام کی پوجا شروع کر دیں، اور جن ناپاکیوں میں ہم آلودہ تھے، پھر سے ان میں جا گریں۔

جب ان لوگوں نے ہم کو حد سے زیادہ ستانا شروع کیا، ظلم کرنے لگے، زندگی تنگ کرنے لگے، اور ہمارے دین پر قائم رہنے کی راہ میں روڑے اٹکانے لگے تو ہم نے آپ کے ملک میں پناہ لی اور دوسروں کی بہ نسبت آپ کو ترجیح دی اور آپ کے جوار کو پسند کیا اور یہ توقع قائم کی کہ آپ کے ہوتے ہوئے اے بادشاہ ہم پر ظلم نہ ہوگا۔

ایوان شاہی میں حضرت جعفرؓ کی تقریر کا اثر:

مؤرخوں کا بیان ہے کہ نجاشی نے یہ پوری تقریر بڑے اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ سنی۔ غالباً اس کا سبب یہ بھی ہوگا کہ حضرت جعفرؓ نے اس کے عدل و انصاف پر اعتماد کا اظہار کیا ۔اس وصف کو سراہا تھا کہ وہ اپنے زیر انتظام رہنے والے باشندوں کے ساتھ حسن معاملگی

کے ساتھ پیش آتا ہے، کیونکہ سمجھدار حکمران ہمیشہ اپنی نیک نامی اور اچھی شہرت کے طلب گار رہتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ لوگوں میں ان کی خوبیوں کا چرچہ ہو اور ان کا اعتماد بحال رہے۔

نجاشی نے سوال کیا: ''تمہارے رہنما جو اللہ کی طرف سے پیام لے کر آئے ہیں، ان میں سے کچھ تمہیں یاد ہے؟''

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہاں!'' کہا، سناؤ۔ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیتیں پڑھ کر سنائیں، ان کو سن کر نجاشی پر گریہ طاری ہو گیا، وہ اتنا رویا کہ اس کی داڑھی تر ہو گئی، اور جو پادری اور ارکان سلطنت وہاں جمع تھے، ان پر بھی رقت طاری ہو گئی اور اتنا روئے کہ ان کے سامنے جو صحیفے کھلے ہوئے تھے، وہ آنسوؤں سے تر ہو گئے۔

نجاشی نے کہا۔ ''یہ قرآن اور وہ صحیفہ جو عیسیٰ (علیہ السلام) لے کر آئے تھے، دونوں ایک ہی چراغ کی لو ہیں۔'' اس کے بعد وہ قریش کے دونوں فرستادوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا:

''تم دونوں چلے جاؤ۔ ہم بخدا ان لوگوں کو تمہارے یہاں واپس نہ کریں گے۔''

عقیدہ کی آزمائش اور حاضر جوابی:

مصیبت یہاں پر ختم نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کو ایک اور آزمائش کا سامنا کرنا پڑا، جو شاید پہلے سے زیادہ سخت تھی۔ عمرو بن العاص نے اپنی ترکش کا آخری مگر زہر میں بجھا ہوا تیر اپھینکا اور دوسرے دن کی صبح کو جا کر نجاشی کے کان اس طرح بھرے۔ ''اے بادشاہ! یہ لوگ حضرت عیسیٰ بن مریم کے بارے میں بہت بری اور سخت بات کہتے ہیں۔'' بادشاہ پھر مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوا اور دریافت کیا۔ ''تم لوگ حضرت مسیح کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہو؟''

حضرت جعفرؓ نے فرمایا: ''ہم ان کے بارے میں وہی کہتے ہیں جو ہمارے نبی ﷺ لے کر آئے ہیں، یعنی وہ اللہ کے بندے اور اس کے پیغمبر تھے، اس کی روح اور کلمہ...... جس کو اس نے ناکتخدا، عفت مآب مریم میں جلوہ گر کیا۔''

یہ سن کر نجاشی نے زمین پر ہاتھ مارا اور ایک تنکا اٹھا کر کہا۔ ''واللہ جو تم نے کہا ہے، اس سے ایک تنکا برابر بھی عیسیٰ بن مریم نے اضافہ نہیں کیا ہے۔''

اگر یہاں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی اور شخص ہوتا جس کو اس

مشکل کا سامنا کرنا پڑتا اور اس نئے قسم کی آزمائش سے دوچار ہوتا تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ مداہنت کی راہ اختیار کرتا اور موقع کی نزاکت کا خیال کرکے کوئی سیاسی قسم کا جواب دیتا، اور ایسی گول مول بات کرتا جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشریت واضح نہ ہوتی۔ بلاشبہ حضرت جعفر فصیح و بلیغ عرب تھے، اور حاضر جوابی، اور اسلوب کلام پر قدرت رکھتے تھے، لیکن وہ اسلام کے بے داغ عقیدہ کے نمائندہ تھے، اور اگرچہ وہ پیغمبر نہیں تھے، مگر اس ایوان شاہی میں وہ انبیائے کرام ہی کی قائم مقامی کررہے تھے، اس لئے مداہنت کرنے اور حق و باطل میں آمیزش کرنے کے وہ مجاز نہ تھے، اس لئے جو کہا صاف کہا اور کھل کر واضح انداز میں کہا، اگرچہ عقل وحکمت اور توازن وتناسب کے ساتھ اپنی بات نپے تلے الفاظ میں کہی جس میں نہ زیادتی تھی نہ کمی۔

ایک ذہنی ودعوتی معرکہ میں فتح ونصرت:

اس سچائی اور اخلاص کا حاصل، اور اس بلاغت وحکمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت جعفرؓ اس خطرناک کشمکش اور دشمنوں کے جال سے معزز اور کامیاب ہوکر بے داغ نکل آئے، معرکہ میں کامیابی حاصل کی، روایتوں میں آیا ہے کہ نجاشی نے انتہائی شریفانہ سلوک اور احترام کے ساتھ مسلمانوں کو رخصت کیا اور قریش کے دونوں نمائندے عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص بن وائل شرمسار ہوکر نجاشی کے دربار سے لوٹے، مسلمان ایک اچھے ملک میں اچھے پڑوسی کے ساتھ رہنے لگے۔

دعوت دین کے ادبی شہ پاروں اور حکمت تبلیغ کے تابناک نمونوں کا بیان ہم اس واقعہ پر ختم کرتے ہیں جس کا مظاہرہ ایک لرزہ خیز اور زلزلہ انگیز ماحول میں ہوا، اور دنیا کے ایک پرعظمت اور پروقار ایوان میں پیش آیا، جس کا سہرا رسول اللہ ﷺ کے صحابی اور آپ ﷺ کے خانوادے کے فرد کے سر رہا، جنہیں اللہ تعالیٰ نے حکمت اور دوٹوک بات کرنے کی صلاحیت بخشی تھی، دعوت کا کام کرنے والوں اور مبلغوں کے لئے یہ دلیل راہ ہے، اور علم وادب کے شیدائیوں کے لئے مطالعہ کا موضوع۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس ملک کی قسمت اسلام سے وابستہ ہے!

بنگلہ دیش کی راجدھانی ڈھاکہ کی مرکزی جامع مسجد بیت المکرم میں ۱۶ مارچ ۱۹۸۴ء کو حضرت مولاناؒ کا دردبھرا فکرانگیز تاریخی خطاب

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ، ونشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له ، ونشهد ان سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله.صلى الله عليه وعلى آله واصحابه اجمعين. اما بعد فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم .واعتصموا بحبل الله جميعاً ولا تفرقوا واذكروا نعمت الله عليكم اذ كنتم اعداءً فالف بين قلوبكم فاصبحتم بنعمته اخوانا وكنتم على شفا حفرة من النار فانقذكم منها كذلك بين الله لكم آيته لعلكم تهتدون .

اور سب مل کر خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے، تو خدا نے تم کو اس سے بچالیا۔ اس طرح خدا تم کو اپنی آیتیں کھول کھول کر سناتا ہے، تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

میرے عزیز بھائیو! اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اللہ نے ایک جگہ اتنے مسلمان بھائیوں کی شکلیں ہمیں دکھائیں، پہلے مسلمان کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں، اور دنیا میں کلمہ گو اتنے کم تھے کہ انگلیاں اٹھتی تھیں، کہا جاتا تھا کہ وہ مسلمان جارہا ہے، یہ مسلمان ہے،

اب خدا کے فضل وکرم سے مسلمانوں کا ایک سمندر ہے، اس وقت جبکہ میں آپ سے باتیں کر رہا ہوں، جمعہ کی اس مبارک ساعت میں کتنی جگہ کتنے مسلمان مسجدوں میں اپنے مالک کے سامنے سر جھکانے کے لئے اور جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لئے جمع ہوں گے۔

لیکن ہم کو اور آپ کو بھی اس کا احساس ہونا چاہئے کہ اللہ نے ہم کو کیا دولت عطا فرمائی ہے، کلمہ نصیب ہونا، اللہ اور اس کے رسول پر صحیح طور پر ایمان اور توحید کی دولت کا نصیب ہونا، یہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے، ہفت اقلیم کی سلطنت کلمہ شہادت پر قربان کر دینے کے قابل ہے، ایمان کی قیمت یہ ہے کہ اگر ساری دنیا کی سلطنت ایک طرف رکھی جائے، اور مسلمان سے کہا جائے کہ یہ سلطنت تم کو مل سکتی ہے، لیکن ایمان سے محروم ہونا پڑے گا، تو اس کی چیخ نکل جائے، وہ یک لخت بے ہوش ہو جائے کہ مجھ سے کیا گناہ ہوا تھا، کہ یہ کہا جا رہا ہے کہ تم کو سلطنت دی جائے گی، ایمان لیا جائے گا۔

ایک زمانہ میں ترکی میں قانون بن گیا تھا کہ ترکی ہی میں اذان دی جائے، عربی میں اذان نہ دی جائے، ترک تڑپ تڑپ کر رہتے تھے کہ ہم عربی میں اذان سننے سے محروم ہیں، ترکوں نے بتایا کہ جب پہلی مرتبہ عربی میں اذان ہوئی اور اللہ اکبر، اللہ اکبر، اشهد ان لاالہ الا اللہ، اشهد لاالہ الا اللہ، اشهد ان محمد رسول اللہ، اشهد ان محمد رسول اللہ کی آواز ان کے کان میں پڑی تو ترک دیوانے ہو گئے، اور سڑکوں پر خوشی کے مارے ناچنے لگے، لوگ کہتے تھے کہ ہزاروں دنبے اس خوشی میں ذبح کئے گئے کہ اللہ نے ہمیں دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے نبی ﷺ کی زبان کے یہ الفاظ انہیں کی زبان میں سننے کا موقع دیا۔ میں نے قسطنطنیہ میں جامع سلیمانی میں نماز پڑھی، جو وہاں کی سب سے بڑی مسجد ہے اور دوسری مسجدوں میں بھی نماز پڑھی۔ میں نے دیکھا کہ فرض نماز کے بعد پہلا لفظ جو ترکوں کی زبان سے نکلتا ہے وہ "علی نعمة الاسلام الحمد للہ" ہے، یعنی اسلام کی نعمت پر خدا کا شکر ہے، میں نہیں کہتا کہ آپ بھی یہ کہیں، علماء اس کو صحیح نہیں قرار دیں گے، ہمیں وہی کہنا چاہئے جو رسول اللہ ﷺ نے سکھایا، اور جو کلمات احادیث میں آئے ہیں، لیکن ترکوں کی یہ ادا مجھے پسند آئی کہ ان کو اس بات کا احساس ہے کہ اللہ نے ان کو اسلام کی شکل میں سب سے بڑی نعمت عطا فرمائی ہے۔

میرے بھائیو، میرے عزیز دوستو! اس پر فخر کرو اور شکر کرو، اور اس وقت تک تمہاری خیریت اور اس ملک کی خیریت ہے، جب تک تم سب سے زیادہ اسلام پر فخر کرو گے، تم دنیا کی ہر چیز سے دستبردار ہونے اور اس کی قربانی کے لئے تیار رہو، لیکن اسلام کی نعمت سے محروم ہونا، ایک منٹ کے لئے گوارہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

واذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا و کنتم علیٰ شفا حفرة من النار فانقذکم منھا۔

اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے، تو خدا نے تم کو اس سے بچالیا۔

اللہ تعالیٰ کے احسان کو یاد کرو کہ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے" فالف بین قلوبکم" اللہ نے تمہارے دل ملا دیئے "فاصبحتم بنعمته اخوانا" تم اللہ کے احسان و فضل سے بھائی بھائی بن گئے، بتاؤ کہاں اس طرح بڑا اور چھوٹا، امیر غریب صدر اور عام شہری کاندھے سے کاندھا ملا کر بیٹھتا ہے، کوئی جگہ دنیا میں ایسی کہ جہاں محمود و ایاز کی تفریق نہ ہو، جب مسجد میں گئے سب ایک ہو گئے تو "فاصبحتم بنعمته اخوانا"۔

آج تاریخ میں ان جھگڑوں کا پورا رکارڈ نہیں ہے، جو جھگڑے پہلے دنیا میں پائے جاتے تھے نسل کے جھگڑے، رنگ کے جھگڑے، بڑے چھوٹے کے جھگڑے، طبقات کے جھگڑے، امیر و غریب کے جھگڑے، زمیندار اور کسان کے جھگڑے، زبانوں کے جھگڑے، تمدنوں کے جھگڑے، یہ سارے جھگڑے دنیا میں تھے، اور ایک دوسرے کا خون بہایا جارہا تھا "فاصبحتم بنعمته اخوانا" پھر اللہ فرماتا ہے "و کنتم علیٰ شفا حفرة من النار فانقذکم منھا" تم جہنم کے گڑھے کے کنارہ کھڑے تھے، اللہ نے تم کو صاف بچالیا، یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے، اگر یہ دین نہ آتا، اگر اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو مبعوث نہ فرماتا، اگر خدا کے آخری نبی ﷺ نہ آتے تو ہمارے جہنم کے گڑھے میں پھاند پڑنے، کود پڑنے، جست لگانے میں کوئی کسر باقی نہیں تھی، آج آپ دیکھئے دنیا میں کیسے بڑے بڑے فلاسفر، کیسے بڑے بڑے دانشور، کیسے بڑے بڑے اسکالرز، حکومتوں کے کیسے کیسے سربراہ اسلام کی جیسی عام فہم (Common Sense) سمجھ میں

آنے والی چیز کے سمجھنے سے محروم ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم کو اور آپ کو اسلام کی دولت نصیب فرمائی، اس اسلام کے مقابلہ میں کسی متوازی (Parallel) چیز کسی فلسفہ، کسی تحریک، قومیت کے کسی نعرہ، کسی عصبیت کی دعوت کا اثر نہیں پڑنا چاہئے۔ بخاری شریف کی حدیث ہے "ثلاث من جمعهن فقد استکمل الایمان" تین باتیں ہیں، اگر کسی شخص نے ان کو جمع کر لیا تو ان کا ایمان مکمل ہوگیا "ان یکون الله ورسوله احب الیه مما سواهما" ایک یہ کہ اللہ اور رسول ﷺ اس کے نزدیک ماسوی اللہ سے زیادہ محبوب ہوں، اللہ ورسول کے علاوہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں، سب سے زیادہ اللہ ورسول محبوب ہوں، اور ایک یہ کہ "وان یکره ان یعود الی الکفر کما یکفره ان یقذف فی النار" اس خیال سے کہ وہ کفر کی طرف واپس جا سکتا ہے اس کو ایسی تکلیف محسوس ہو، ایسی وحشت محسوس ہو جیسے کسی کو آگ میں پھینک دیئے جانے سے محسوس ہوتی ہے، بالکل طبعی وجسمانی (Physical) طریقہ پر، وہ اگر خواب میں دیکھ لے کہ وہ کوئی کفر کا کام کر رہا ہے، اسلام کو نقصان پہنچانے والا کوئی کام کر رہا ہے، وہ کسی سازش کا شکار ہو گیا ہے، وہ اللہ ورسول ﷺ کے خلاف کسی اور جھنڈے کے نیچے جا رہا ہے تو اس کی چیخ نکل جائے، سارے گھر کے لوگ جمع ہو جائیں اور کہیں خیریت ہے؟ خیریت ہے؟ آپ نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا؟ تو وہ کہے گا کہ ڈراؤنا خواب، ڈرانا خواب، کوئی چیز ہے؟ میں نے ایسا برا خواب دیکھا کہ اللہ پھر کبھی نہ دکھائے، میں نے دیکھا کہ میرے گھر میں کفر کی پرچھائیں آرہی ہیں، کفر کا سایہ آرہا ہے، یہ وہ چیز ہے، جو انبیاء علیہم السلام کی وراثت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ام کنتم شهداء اذ حضر یعقوب الموت اذ قال لبنیه ماتعبدون من بعدی قالوا نعبد الهک واله ابائک ابراهیم واسماعیل واسحق الهاً واحداً ونحن له مسلمون.

بھلا جس وقت یعقوب وفات پانے لگے تو تم اس وقت موجود تھے، جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ تو انہوں نے کہا کہ آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے اور ہم اسی کے حکمبر دار ہیں۔

کیا تم اس وقت موجود تھے جب سیدنا یعقوب علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کا آخر وقت آیا، جب ان کے انتقال کا وقت آیا، تو ان کے سب بچے جمع ہوگئے، ان کے بیٹے، پوتے، نواسے، ماشاءاللہ ان کی بڑی عمر تھی، ان کا کنبہ بڑا تھا، بہت بڑا پریوار تھا، سب جمع ہوگیا تو انہوں نے کیا کہا؟ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ بیٹو! میں نے اتنی دولت جمع کی ہے، اتنی دولت زمین میں گاڑی ہے فلاں جگہ سے نکال لینا، انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میرا فلاں فلاں پر قرض ہے، اس سے وصول کر لینا، انہوں نے وہ نہیں کہا جو سب سے اچھی اور ہلکی بات ہو سکتی تھی کہ دیکھو مل جل کر رہنا، اتحاد اور اتفاق کے ساتھ رہنا، اور اگر وہ یہ کہہ دیتے تو کوئی بات نہیں تھی، لیکن انہوں نے کیا کہا؟ انہوں نے کہا کہ میرے بیٹو! میرے جگر کے ٹکڑو! تم مجھے یہ بتادو کہ "**ماتعبدون من بعدی**" میری آنکھ بند ہونے کے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ میری پیٹھ قبر سے نہیں لگے گی، جب تک کہ مجھے یہ اطمینان نہ ہوجائے کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟

انہوں نے کہا کہ ابا جان! دادا جان، نانا جان، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، یہ بھی کوئی ڈرنے کی بات ہے، ہماری رگوں میں ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ کا خون ہے، آپ نے ہمیں شرک سے نفرت دلائی، کفر سے نفرت دلائی، ہم مرجانا گوارہ کریں گے، لیکن کفر و شرک میں مبتلا ہونا پسند نہیں کریں گے، آپ اطمینان سے دنیا سے جائیے "**نعبد الٰھک والٰہ اٰبائک**" ہم آپ کے معبود کی پرستش کریں گے، آپ کے بزرگوں، آپ کے پرکھوں، آپ کے باپ، چچا، دادا کے معبود (اللہ) کی ہم پرستش کریں گے۔ "**الٰھک والٰہ اٰبائک ابراھیم واسماعیل واسحٰق الٰھاً واحداً ونحن لہ مسلمون**" ہم سب اس کے فرماں بردار ہیں، تب ان کو اطمینان ہوا۔

یہی ہر مسلمان کی شان ہونی چاہئے، اپنے متعلق بھی ہمیشہ ڈرنا ہے، اپنے ایمان کی خیر مناتا رہے، اپنے لئے دعا کرتا رہے کہ ہمارا ایمان سلامت رہے، ہمارا خاتمہ ایمان پر ہو، اور اپنی اولاد کے متعلق بھی اطمینان حاصل کر لے کہ یہ ہماری زندگی میں بھی اور ہمارے بعد بھی اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کے آستانہ پر سر نہیں جھکائے گی۔ یہ اطمینان گارنٹی سب سے زیادہ ضروری ہے، یہ گارنٹی آدمی کو حاصل کر لینی چاہئے، ایمان کے ساتھ کفر اور کفر کی چیزوں سے نفرت بھی ضروری ہے "**فمن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ**" اللہ تعالیٰ اس کو مقدم رکھتا ہے کہ جو سرکش

شیطان کا انکار کرے گا، اور اس کو ٹھکرادے گا، اور اللہ پر ایمان لائے گا، تو اس نے اللہ کے کڑے کو مضبوط پکڑ لیا تو "فمن یکفر بالطاغوت" بھی ضروری ہے اور "لا الہ الا اللہ" میں نفی پہلے ہے، اثبات بعد میں ہے، نہیں ہے کوئی معبود، نہیں ہے وہ جو پورے طور پر محبوب بنایا جائے "الا اللہ" پہلے نفی ہے، پھر اثبات ہے، ایسے ہی نفی و اثبات پر ہم کو بھی قائم رہنا چاہئے۔

بھائیو اور دوستو!

شکر کرو کہ اللہ نے تمہیں کتنا بڑا ملک دیا ہے، مسلمانوں کی اکثریت ہے، اس ملک کے لئے تقدیر الٰہی کا فیصلہ ہے، قضا و قدر کا فیصلہ ہے کہ یہ ملک مسلمان رہے۔ اور اس ملک کی خیریت اور سلامتی بھی اسی میں ہے، میں رسول اللہ ﷺ کے منبر کے قائم مقام منبر پر محراب میں بیٹھ کر مسجد میں آپ سے کہتا ہوں، یہ ملک کبھی خوشحال نہیں ہوسکتا، اس ملک میں کبھی خیریت نہیں رہ سکتی، اس ملک کی چول کبھی بیٹھ نہیں سکتی، اگر اس نے اسلام کو چھوا، اپنے دل پر لکھ لیجئے، اس ملک کی سلامتی، اس ملک کی خیریت، اس ملک کی خوشحالی، اس ملک کی عزت اسلام سے وابستہ ہے، یہ ملک اسی وقت تک محفوظ رہے گا جب تک یہ مسلمان ہے، اگر اس نے خدانخواستہ اللہ کی نعمت کی ناشکری کی اور وہ جاہلیت کے کسی جھنڈے کے نیچے چلا گیا تو اس ملک کی خیریت نہیں، کوئی پروجیکٹ، کوئی پلان، کوئی باہر کی مدد اندر کی باہر کی سیکورٹی کوئی اس ملک کو بچا نہیں سکتی، اس ملک کی قسمت اسلام کے ساتھ وابستہ کردی گئی ہے، سمجھنے والے اس بات کو سمجھ لیں اور لکھنے والے اس بات کو لکھ لیں، اگر کسی کی زندگی رہی اور خدانخواستہ وہ وقت آیا تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا اور لوگ اس زمانہ کو یاد کریں گے، جب یہاں اسلام تھا، اس ملک کی تاریخ ہی میں نہیں اس ملک کی تقدیر میں بھی ہے کہ یہ مسلمان رہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اللہ کا مطالبہ یہ ہے کہ "یاایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ" یہ نہیں ہوتا کہ مسجد میں سر اندر کرو، پاؤں باہر رکھو، یہ مسجد میں آنا نہیں ہوا، مسجد میں آنا یہ کہ پورے جسم سے آجاؤ، اس طریقہ سے اسلام کے اندر بھی یہ نہیں ہے کہ آدھے آؤ، اور آدھے نہ آؤ، تہائی آؤ اور تہائی نہ آؤ نہیں، پورے کے پورے آؤ، اسلام کے عقائد کو قبول کرتے ہوئے، اسلام کے شعائر کو قبول کرتے ہوئے، عبادات کو قبول کرتے ہوئے، احکام کو

قبول کرتے ہوئے، اسلامی تہذیب اور اسلامی معاشرہ کو قبول کرتے ہوئے اور اسلامی قانون کو قبول کرتے ہوئے، اسلام میں آؤ، جب ہی اسلام میں آنا معتبر ہے، تحفظات اور ریزرویشن کے ساتھ نہیں، ریزرویشن کے ساتھ اسلام میں کوئی نہیں آسکتا، اس کا اسلام قبول نہیں ہے "اذقال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین" جب ابراہیم علیہ السلام سے کہا گیا کہ سب حوالہ کردو، کہا "اسلمت لرب العالمین" میں نے سب کچھ اللہ کے حوالہ کردیا، ایسے ہی آپ کو بھی سب کچھ اللہ کے حوالہ کردینا چاہئے۔ اسلام کو ہر چیز پر مقدم رکھنا چاہئے۔

میرے دوستو اور بھائیو! اللہ تبارک وتعالیٰ کے سایہ رحمت کے نیچے آجاؤ، پھر دیکھو اللہ تعالیٰ اس ملک کو کیسا نوازتا ہے۔ "ولو ان اھل القریٰ آمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکت من السماء والارض" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر بستیوں والے اللہ تعالیٰ کی کتاب پر عمل کرتے تو ہم ان پر آسمانوں اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔ دہانے کھول دیتے، اگر آپ لوگوں نے بھی اللہ کی نعمت کا شکر کیا اور اس کی نعمتوں کی دی ہوئی فرصتوں کی، سہولتوں کی ناقدری نہیں کی، اور ان لوگوں کا طرز عمل اختیار نہیں کیا جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "الم تر الی الذین بدلوا نعمت اللہ کفرا واحلوا قومھم دار البوار" کیا تم نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا، جنہوں نے اللہ کی نعمت کو، اس کے احسان کو، کفر سے بدل دیا، امن کو بدامنی سے، اتحاد کو انتشار سے، اعتماد کو بے اعتمادی سے بدل دیا، یہ مسلمان کی شان نہیں ہے کہ جب روز صبح اٹھے تو "ھل من جدید، ھل من جدید" پکارے، یہ مسلمان کا شیوہ نہیں ہے کہ روز نیا آئین ہو، روز نیا حاکم ہو، اللہ نے آپ کو امن کی دولت عطا فرمائی، رزق عطا فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ایسی سرسبز، ایسی زرخیز زمین آپ کو دی ہے کہ بہت سے ملکوں کو نصیب نہیں، کیسے کیسے گھنے جنگلات، پٹسن (جوٹ) کی کتنی افراط، سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ مسلمان یہاں اکثریت میں ہیں، ان مسلمانوں کا اسلام سے تعلق مضبوط کیجئے، ان مسلمانوں میں خلوص پیدا کیجئے، گرم جوشی پیدا کئے، یہاں کی قوم میں ایمان کا جوش ہے، اس میں خلوص کا خزانہ ہے، اس میں محبت کا دفینہ ہے، اس میں ذہانت کے سوتے ہیں، ان میں آپ کام لیں، اور اس خلوص سے، اس صداقت سے ایک نئی طاقت پیدا کریں، آپ قدر کریں ان لوگوں کی

جن کو اللہ تعالیٰ نے انتظام سپرد کیا ہے، ناشکری نہ کریں۔

دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس ملک کو ہمیشہ اسلام کے دامن سے وابستہ رکھے، اور رسول عربی ہاشمی، مطلبی، قریشی ﷺ کے دامن سے وابستہ رکھے، اور اس کو اپنی تمام نعمتوں کا اور رزق کا مستحق بنائے، اور یہاں ہمیشہ امن وامان رہے، یہاں ہمیشہ باہمی اعتماد رہے، یہاں ہمیشہ محبت والفت رہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترتیبِ خلافت میں حضرت حسنینؓ کے مثالی اقدام

یہ تقریر ۱۵ محرم الحرام ۱۴۱۲ھ مطابق ۲۸ جولائی ۱۹۹۱ء کو مولانا عبدالشکور ہال واقع احاطہ شوکت علی لکھنؤ میں شہدائے اسلام کے عنوان کے تحت ایک منعقدہ جلسہ میں کی گئی

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على رسوله الا مين محمد وآله وصحبه اجمعين، ومن تبعهم باحسان ودعا بدعو تهم الى يوم الدين اما بعد! أعوذبالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم والشمس تجرى لمستقرلها. ذلک بتقدير العزيز العليم.

اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ آفتاب اپنے مستقر کی طرف (اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے طلوع اور غروب کی جو جگہ متعین کی ہے) بے اختیارانہ بڑھتا اور اس کی طرف چلتا رہتا ہے، اور یہ اس مالک کا مقدر کیا ہوا اور بنایا ہوا نظام وحساب اور اس کا قانون ہے، جو ''العزیز'' بھی ہے، ''العلیم'' بھی، غالب بھی ہے، اور علم والا بھی، نظام بنانے والا اور حساب مقرر کرنے والا بھی، اگر کوئی صرف غالب ہو تو ضروری نہیں کہ اس کا نظام وحساب حکمت پر بھی مبنی ہو، وہ محض اپنی قوت سے کام لیتا ہے، لیکن اس کی ساری کارروائی اور کارفرمائی ضروری نہیں کہ حکمت پر مبنی ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حکم دینے والا علیم ہو، لیکن غالب نہ ہو تو سارا کام پورا ہونا مشکل ہے۔

حضرات! آپ کو تعجب ہورہا ہوگا کہ آج کے اس جلسہ سے جس کا تعلق صحابۂ کرام اور شہدائے اسلام کے فضائل ومناقب سے ہے، اس آیت مبارکہ کا کیا تعلق ہے، جس میں نظام شمس کا ذکر کیا گیا ہے کہ آفتاب اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ایک خاص جگہ سے چلتا ہے، اور ایک خاص جگہ پہنچتا ہے، اور وہ اپنا پورا سفر اللہ کی قدرت اور اس کے علم کے مطابق طے کرتا ہے؟

میں یہ عرض کروں گا کہ اس آیت کی روشنی اور رہنمائی میں جس میں نظام شمسی کا ذکر ہے،

آفتاب رسالت، آفتاب دین حق آفتاب دین و دعوت کے نظام شمسی کے انضباط اور اپنے مقاصد کی تکمیل کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس میں اتفاقات کوئی چیز نہیں ہیں، وہ سب اللہ کے منشاء اور اس کے حکم کے مطابق اور اس کی حکمت کے عین موافق گردش کرتے ہیں، اور اس کے تابع ہو کر ان کا نظام چلتا ہے۔

آپ اس نظام نیابت کو دیکھیں جو''خلافت راشدہ'' کے لقب سے مشہور ہے کہ آنحضرت محمد رسول ﷺ کے دنیا سے سفر کرنے کے بعد جو شخصیتیں مسند خلافت پر آئیں اور پھر جس ترتیب کے ساتھ مسند خلافت پر متمکن ہوئیں، اور اللہ تعالیٰ نے فرائض خلافت ادا کرنے کا جو موقعہ ان کو عطا فرمایا یہ بالکل''ذلک تقدیر العزیز العلیم'' کا مظہر ہے۔اس سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی ترتیب اور ایسے نظام کے ساتھ چلایا کہ وہ اس کی رحمت واسعہ، اس کی حکمت بالغہ اور اسکی قوت قاہرہ کی ایک مثال ہے۔

دنیا کے مذاہب وادیان اور اقوام وملل اور فلسفہ تاریخ پر نظر رکھنے والے مفکرین اگر کہیں جمع ہوں اور ان کو اس کا پورا اختیار دیا جائے کہ وہ اپنے تاریخی تجربہ اور مذاہب وادیان اور اقوام وملل کے اسباب زوال وارتقاء کے مطالعہ کی مدد سے اس سے بہتر ترتیب قائم کریں، تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں، اور تاریخ اور فلسفہ تاریخ کے ایک طالب علم اور خاص طور پر ادیان وملل کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے فرد کی حیثیت سے پورے دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ اس سے بہتر ترتیب سوچ نہیں سکتے اور اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، اکثر ایسا ہوا ہے کہ کوئی عہد گزر گیا ہے، یا ملوک وسلاطین کا کوئی سلسلہ مکمل وختم ہو چکا ہے، کوئی سلسلہ حکومت یا شاہی خاندان اپنی مدت ختم کر چکا ہے، بعد میں فلسفہ تاریخ پر نظر رکھنے والے جو لوگ آئے اور انہوں نے ان کی ترتیب پر اور اس ترتیب کے نتائج پر اور پھر ملک و معاشرہ پر پڑنے والے اس کے اثرات پر غور کیا تو ان کو کہیں نہ کہیں یہ کہنے کا موقعہ ضرور مل گیا کہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو زیادہ بہتر تھا، فلاں کے بعد اگر فلاں آیا ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا، اگر وہ پہلے نمبر پر ہوتا تو زیادہ مفید ثابت ہوتا، اگر وہ دوسرے نمبر پر آیا ہوتا تو زیادہ بہتر ثابت ہوتا، اور پھر جیسا کہ کسی کہنے والے نے کہا ہے کہ ایک حرف''کاش'' ایسا ہے کہ مجھے سو جگہ لکھنا پڑا ہے۔

یک حرف کاشکیست که صد جا نوشته ایم

وہ بھی سوجگہ لکھنے پر مجبور ہوتا کہ کاش ایسا ہوتا، کاش ویسا ہوتا، میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ صرف مسلمان ہی نہیں دنیا کی دوسری قوموں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات اور مغربی اقوام کے بہترین مفکرین، تاریخ داں اور فلاسفہ اور بڑے بڑے مبصرین جمع ہو کر اسلام کے عہد اول کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے، اور کہہ دیا جائے کہ وہ اپنے ذہن و دماغ سے اور اپنے تاریخ مطالعہ کی روشنی میں اس دین کی حفاظت کرنے والوں، اور اس کو دنیا میں پھیلانے والوں کا ایک چارٹ تیار کریں اور ایک نقشہ بنائیں کہ کس کو کس کے بعد آنا چاہئے تھا، تو میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس سے بہتر چارٹ بنا نہیں سکتے۔

ایمان کی قدر:

مذاہب و ادیان کی تاریخ بتاتی ہے کہ دین کے لئے جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے (میں ریڑھ کی ہڈی نہیں کہوں گا اس کے لئے یہ روح کا درجہ رکھتی ہے) وہ اس دین کی حفاظت کا کام ہے، اس کا لانے والا، اس کا حامل اول اس کو جس طرح لایا ہے، اور اس میں جس چیز کا جو مقام ہے اور جس چیز کا درجہ، اور اس کی جو ترتیب ہے، اس کے مطابق اس کا جانشین اس کو قائم رکھے، اور اس میں ذرا بھی تبدیلی کا روادار نہ ہو، یہ سب سے ضروری اور اہم کام ہوتا ہے، مذاہب کی تقدیر کا اس پر انحصار ہوتا ہے کہ پیغمبر ﷺ کے بعد، (اس دین کے اولین لانے والے کے بعد) کون اس کی جگہ لیتا ہے کہ دین اپنی اصلی حالت اور صحیح ترتیب پر، اور اس کی تعلیمات اپنی اہمیت کے مطابق اپنے مقام پر قائم و باقی رہیں؟

ایمان کامل کے بعد، معرفت الٰہی کے بعد، اور توحید خالص کے بعد دنیا میں جو بہترین اوصاف ہو سکتے ہیں، اور نفسیات انسانی کے ماہرین اور مراتب کمال کے نبض شناسوں نے جو اعلیٰ ترین اوصاف تجویز کئے ہیں وہ سارے اوصاف اور وہ سارے کمالات ایک طرف رکھے جائیں ان میں سب سے زیادہ کسی مذہب کے بقاء کے لئے (میں ارتقاء نہیں کہتا، ارتقاء تو بعد کی چیز ہے) جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے، وہ ہے جذبۂ حفاظت، اور نبی کی تعلیمات کے بارہ میں شدید غیرت، میں تقویٰ کا ذکر یہاں نہیں کرتا، خلفاء اربعہ بلا کسی استثناء کے تقویٰ کے ایسے مقام پر فائز تھے جس کا تصور بھی بڑے بڑے مفکروں اور تقویٰ شناسوں کے لئے مشکل ہے، میں ان کے علم اور ان کی ذہانت کا بھی ذکر نہیں کرتا، میں ان کی انسانی ہمدردی اور خدمت خلق

کے جذبہ، اوران کی نیک نفسی، خداترسی اور انسان دوستی کا بھی ذکر نہیں کرتا، پہلی چیز اور پہلی شرط جو ہے، وہ یہ کہ پیغمبر کی پہلی جگہ لینے والا اوراس کی نیابت اولیٰ کا فرض انجام دینے والا، اس دین شریعت کے معاملہ میں اتنا غیور ہو کہ اس سے بڑھ کر غیور، اس سے بڑھ کر ذکی الحس، اس سے بڑھ کر خوددار وحساس، اس کے ایک ایک نقطہ کی حفاظت کا جذبہ رکھنے والا کوئی دوسرا نہ ہو۔

نیابت رسول اللہ ﷺ!:

دوسری صفات بعد کی ہیں اوراپنی اپنی جگہ پران سب کا مقام ہے، لیکن پہلی شرط جس پر دین کی بقاء کا انحصار ہے وہ یہ کہ نبی ﷺ کا جانشین، اس کا نائب، اس کی جگہ پر امت کی رہنمائی کا منصب سنبھالنے والا جو کچھ بھی ہو اپنی جگہ پر، لیکن دین کے معاملہ میں وہ حد درجہ غیور ہو، وہ اپنے گھر والوں اوراپنی بہو بیٹیوں کی عزت وآبرو کے مقابلہ میں بھی اس دین کے ایک ایک نقطہ کے بارے میں زیادہ غیور، زیادہ باحمیت اور ذکی الحس واقع ہوا ہو، سارے مذاہب وادیان کی تاریخ بتاتی ہے کہ سب سے زیادہ یہ مذاہب اس وجہ سے تحریف کا شکار ہوئے اورانہوں نے بہت جلد اپنی شکل بدل دی اورایک دوسرے راستہ پر پڑ گئے کہ ان مذاہب کو اپنے لانے والوں کے بعد (لاکھوں درود وسلام ہوں ان پر) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا جانشین، محافظ وامین، اور وفادار وغیور جانشین نہیں ملا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کس مرتبہ کے انسان تھے؟ ان کی صفات، ان کی سیرت وسوانح کی کتابوں میں پڑھئے، وہ کن کمالات کے حامل تھے، حضور ﷺ نے ان کے بارہ میں کیا فرمایا، ان کو کس درجہ کی فضیلت حاصل ہے، ان پر امت کو کتنا اتفاق ہے، یہ سب حدیث اور سیرت کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے، لیکن ان کی سب سے بڑی اور غالب صفت جس کی پہلے مرحلہ میں سب سے بڑھ کر ضرورت تھی، وہ ان کی دین کے بارے میں حد سے بڑھی ہوئی غیرت، ذکاتِ حس، اس کے ایک ایک نقطہ کی حفاظت کا جذبہ اور منشائے رسول ﷺ کی تکمیل کا غیر متزلزل عزم وفیصلہ تھا۔

ان کا خدا کے ساتھ جو تعلق تھا، وہ اپنی جگہ پر، ان کی راتوں کی گریہ وزاری، ان کی دعائیں، اور خلق خدا پر ان کی شفقت اور ان کا عدل وتقویٰ، ان کا زہد وایثار، وہ صفات وخصوصیات ہیں، جو اپنی جگہ پر بڑی قدر وقیمت کی حامل ہیں، مگر حفاظت دین اوراس کے بارہ میں شدید غیرت، یہ ان کا وصف خاص اوران کی سیرت کی کلیدی صفت ہے، جس کے بارے

کہا جا سکتا ہے کہ آج دین پر جو عمل ہو رہا ہے، فرائض اور شرعی احکام زندہ ہیں، دین تحریف اور امت کلی طور پر ضلالت سے جو محفوظ ہے، جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اسی حفاظت دین کی جذبہ کا نتیجہ اور ظہور ہے، خدا کے فضل سے آج بھی خدائے واحد کے ماننے والے موجود ہیں، بنیادی عقائد پر ایمان رکھنے والے اور فرائض کے پابند ہیں، جن کے بغیر کسی مسلمان کا مسلمان رہنا مشکل ہے، یہ سب رہین منت ہے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت اولیٰ کا، اور میں کیا چیز ہوں، میری کیا حیثیت ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جن سے زیادہ حدیث کے راویوں میں کسی سے روایات منقول نہیں، اور جن کی عدالت وصداقت پر امت کا اتفاق ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

"**واللہ الذی لا الہ الا ھو لو لا أن ابا بکر استخلف ما عبداللہ**"

لوگوں نے کہا دیکھئے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ انہوں نے پھر کہا "**واللہ الذی لا الہ الا ھو لو لاأن ابا بکر استخلف ما عبداللہ**" (خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں اگر حضرت ابو بکرؓ مسند خلافت پر متمکن نہ ہوتے تو دنیا میں خدائے واحد کی عبادت واطاعت کا سلسلہ جاری نہ رہتا۔)

بات کیا تھی؟ بات یہ تھی کہ حضرت ابو بکرؓ دین کے بارے میں ایسی غیرت رکھتے تھے، جو غیرت عزت وآبرو کے بارے میں ہوتی ہے، اور یہی ان کا سب سے بڑا وصف تھا، اور یہی ان کا اصل جوہر جس کی اس وقت سب سے زیادہ ضرورت تھی، ان کے اس وصف کو ان کا وہ جملہ بتاتا ہے، جس کو تاریخ نے انہیں کے لفظوں میں نقل کیا ہے، اور وہ جملہ خود بول رہا ہے کہ وہ کس دل سے نکلا ہے، اور کس ایمان ویقین کے ساتھ نکلا ہے، وہ جملہ ہے "**أینقص الدین وأنا حی**" (میرے جیتے جی دین میں کتر بیونت ہو سکتی ہے؟) میری آنکھوں کے سامنے اللہ کے دین میں ایک حرف کیا ایک نقطہ کی بھی کمی ہو سکتی ہے؟

یہ ہے وہ چیز جس کی مذاہب وادیان کو سب سے پہلے ضرورت پڑتی ہے، اور یہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ میں بدرجہ کمال موجود تھی۔

اب میں آپ کے سامنے اس دینی غیرت وحمیت اور ذمہ داری کے بڑھے ہوئے احساس کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

وفات نبوی کے بعد!

۱۔ وفات نبوی ﷺ کے بعد ہی جزیرۃ العرب میں فتنہ ارتداد اٹھا، اب کچھ ایسی نئی تحقیقات سامنے آئی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فتنہ ارتداد میں باہر کے یہودیوں اور عیسائیوں کا بھی ہاتھ تھا، ابھی تک یہ بات تاریخ کی روشنی میں نہیں آئی تھی، انہوں نے یہ کوشش کی کہ وہیں جزیرۃ العرب میں ایک ایسی انتشار پسند اور انتشار انگیز تحریک پیدا ہو جس سے اسلام کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ایمانی وحدت، اعتقادی وحدت، ذہنی وحدت، قلبی وحدت اور اخلاقی وحدت، ختم ہو جائے، یہ فتنہ شروع ہوا، جو لوگ اسلام کا کلمہ پڑھتے تھے، اور نماز ادا کرتے تھے، زکوٰۃ کے بارے میں ایک گروہ اس کی فرضیت کا بالکل منکر ہو گیا اور اس نے نماز و زکوٰۃ میں تفریق کی، دوسرے فریق نے کہا کہ ہم زکوٰۃ بیت المال کو ادا نہیں کریں گے، بلکہ اپنے طور پر اس کی ادائیگی کا انتظام خود کر لیا کریں گے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے اولوالعزم صحابی کو بھی تامل تھا، اور یہ تامل ان کے احتیاط اور تقویٰ پر مبنی تھا، نہ کسی کمزوری کی وجہ سے کہ جب یہ لوگ کلمہ پڑھتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں، اور اسلام کا انکار بھی نہیں کرتے تو ان سے جنگ کیسے کی جائے؟ لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا "واللہ لأ قاتلن من فرق بین الصلاۃ والزکوٰۃ، فان الزکوٰۃ حق المال" (بخدا میں اس سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے بارے میں مختلف رویہ اختیار کرے گا کہ نماز پڑھے گا اور زکوٰۃ نہ دے گا، اسلئے کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے) اور یہ بھی فرمایا کہ "ایک رسی بھی اگر کوئی حضور ﷺ کے زمانہ میں دیا کرتا تھا، اگر نہ دے گا تو میں اس سے بھی جنگ کروں گا" حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک طرف تھے، اور اچھے اچھے لوگوں کو تامل تھا، یہ خالص الہامی بات تھی، اللہ کو، دین کو چونکہ باقی رکھنا تھا، لہذا انہوں نے کہا کہ نہیں یہ نہیں ہو سکتا، اگر اس میں تساہل برتا گیا، اور زکوٰۃ کے بارے میں ڈھیل دی گئی تو کل حج کی باری ہے، اس کے بعد روزہ کی باری ہے، پھر نماز کی باری ہے، اور پھر عقیدہ کی باری ہے، اور یہ سلسلہ رکتا نہیں، انہوں نے دنیا کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا تھا، لیکن یہ الہامی بات تھی جو خدا نے ان کے دل میں ڈالی تھی، کیونکہ اس دین کو اللہ تعالیٰ کو قیامت تک باقی رکھنا تھا، کیسی کیسی قوموں کو اس میں داخل کرنا تھا، کن کن بلندیوں تک اس کو پہنچانا تھا، لہذا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ اگر اس وقت ذرا بھی تساہلی برتی گئی

اور ذرا بھی رعایت کی گئی تو دین باقی نہ رہے گا، اور وہ بالکل ادیان سابقہ عیسائیت اور یہودیت کی طرح محرف ہو کر رہ جائے گا، چنانچہ وہ اپنے موقف پر اڑ گئے اور انہوں نے جہاد کیا اور اس جہاد میں خود بھی جانے کا ارادہ کیا، لیکن سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے جا کر رکاب تھام لی کہ ہم آپ کو جانے نہیں دیں گے اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلوص اور محبت کی کھلی ہوئی دلیل ہے، انہوں نے خیال کیا کہ اگر خدانخواستہ کوئی واقعہ پیش آ گیا تو اسلام کے شیرازہ کو مجتمع کرنے والی کوئی طاقت نہیں، یہ خلوص کی اعلیٰ ترین مثال ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ کی بات مان لی اور حضرت خالد بن ولیدؓ بہت سے صحابہ اور حفاظ قرآن کو جنگ کے لئے روانہ کیا، اتنی بڑی تعداد میں حفاظ قرآن کو بھیجا کہ ڈر ہوا کہ اگر یہ حفاظ جنگ میں کام آ گئے تو یہ قرآن کیسے باقی رہے گا؟ لیکن وہ اڑ گئے، خدا کی مدد ان کے ساتھ تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فتنہ ارتداد ختم ہوا، دعویداران نبوت مارے گئے اور اب یہ واقعہ صرف تاریخ کی ایک امانت رہ گیا ہے، وہ بھی پڑھے لکھے لوگوں کے لئے، بہت سے لوگ شاید ایسے ہوں گے جو پہلی مرتبہ اس واقعہ کا ذکر سن رہے ہوں گے۔

ہم اس واقعہ کی اہمیت اور اس کی سنگینی کا اندازہ نہیں کر سکتے، وہ عرب جو اسلام سے قریب العہد تھا، ابھی اللہ کے رسول نے وفات پائی تھی، اور دنیا سے آخرت کا سفر فرمایا تھا، ایک طرف رومن امپائر تھا، جو تقریباً نصف متمدن دنیا پر قابض تھا، دوسری طرف ساسانی سلطنت تھی، پھر عیسائیت، یہودیت اور مجوسیت جیسے مذاہب تھے، اور یہاں ہندوستان میں ہندو مذہب اور بودھ مذہب تھا، ان سب کی موجودگی میں اسلام اپنی اصل شکل میں کیسے باقی رہا، یہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا کارنامہ ہے، اور یہ کارنامہ خلافت نبوت کا مظہر اول ہے، انہوں نے کہا خواہ کچھ ہو، میں دین کے ایک نقطہ سے دست بردار ہونے کے لئے بھی تیار نہیں ہو، نتیجہ یہ ہوا کہ آج وہ دین اسی شکل میں باقی ہے، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ دوسرے مذاہب کا کیا حال ہوا، میں اس وقت صرف دنیا کے ایک وسیع ترین مذہب عیسائیت کا ذکر کروں گا۔

عیسائیت کی اصلیت وحقیقت:

یہ عیسائیت جس کا دنیا میں ڈنکا بج رہا ہے اور جو دنیا کے متمدن ترین اور ترقی یافتہ خطوں میں حکومت کر چکی ہے، بحیثیت مذہب کے بھی اور بحیثیت اپنے علمبرداروں کے بھی، اس

عیسائیت کا یہ حال ہے کہ نصف صدی کی مدت کے اندر بھی، یہ اپنی اصلی حالت پر قائم نہ رہ سکی، اب کتابیں نکل رہی ہیں، ابھی حال ہی میں ERNEST DE BENSEN کی کتاب جس کا نام ہے ISLAM OR TRUE CHRISTIANTY شائع ہوئی ہے، اس میں صاف لکھا ہے:۔

''موجودہ عیسائیت کسی طرح بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی پیش کی ہوئی عیسائیت نہیں ہے، یہ وہ عیسائیت نہیں، جس کی دعوت اور اشاعت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کی تھی، یہ عیسائیت سینٹ پال کی بنائی ہوئی عیسائیت ہے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ سینٹ پال اور حضرت مسیح علیہ السلام کے درمیان صرف ۶۰۔۶۵ برس کا فصل ہے، ان چند برسوں میں عیسائیت کا یہ حال ہوا کہ اس نے رومی اثرات اور بودھ مذہب کے بہت سے تصورات قبول کر لئے، اور اگر آپ مذاہب کی انسائیکلو پیڈیا اور عیسائیت پر لکھی گئی دوسری کتابیں دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ عیسائیت نے رومی دیو مالا اور بودھ مذہب کی کتنی چیزیں مثلاً تمثیل، اتحاد وحلول کو اور کتنے ان عقائد ونظریات واقدار کو جو ہندوستان کے مذاہب سے تعلق رکھتے تھے، قبول کیا، اور بالکل محرف ہو کر رہ گئی اور برابر اسی راستہ پر چل رہی ہے۔

یہ قرآن کریم کا معجزہ ہے کہ اس نے عیسائیوں کے لئے ''الضالین'' کا لفظ استعمال کیا ہے، ضالین کے معنی کیا ہیں؟ آپ کلکتہ جانا چاہتے ہوں اور دہلی جانے والی گاڑی پر بیٹھ جائیں، یہ ہے ضلال، آپ بجائے اس جلسہ گاہ میں آنے کے ریلوے اسٹیشن چلے جائیں، اس کو کہتے ہیں راستہ بدل دینا اور پھر اسی راستہ پر چلتے رہنا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی جتنا زیادہ چلتا ہے منزل مقصود سے اتنا ہی، دور ہوتا چلا جاتا ہے، عیسائیت تیز چلی اور اب تو ہوائی جہاز پر جارہی ہے (ہوائی جہاز بھی اسی کی پیروؤں کی دین ہے) تو یہ عیسائیت صرف زمین کے رقبہ میں نہیں اپنے مذہبی اور دینی سفر میں بھی ہوائی جہاز کی رفتار سے چلی، یعنی چل کر منزل مقصود سے دور نہیں ہوئی بلکہ اڑ کر دور ہوئی، آج کی موجودہ مسیحیت بالکل دوسری مسیحیت ہے، جس کو سینٹ پال کا تحفہ اور اس کی دین کہنا چاہئے، اور وجہ اس کی یہ ہے (مجھے معاف کیا جائے اور خدا بھی مجھے معاف کرے) کہ عیسوی مذہب کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسا پاسبان اور خلیفہ نہیں

ملا، اب یہ حکمت اللہ کی تھی، اور کوئی اس پر اعتراض نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، اس کی ذات غنی ہے، اس نے حضرت مسیح علیہ السلام پر دوسرے بہت سے انعامات فرمائے، حضرت مسیح حضرت مسیح ہیں، ہمارا ان پر ایمان ہے، اور ان کی نبوت کا اقرار کئے بغیر ہم مسلمان نہیں ہو سکتے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے، اس کو چونکہ عیسائیت کو قیامت تک باقی رکھنا مقصود نہ تھا "**لیظهره علی الدین کله**" اس کے لئے کہا نہیں گیا، "**الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً**" کی بشارت اس کو نہیں دی گئی، ایک یہودی عالم نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے کہا "اے امیر المومنین! ایک آیت قرآن مجید میں آپ آسانی سے پڑھ لیا کرتے ہیں، اگر کہیں وہ آیت ہم یہودیوں کے بارے میں نازل ہوتی تو ہم اس دن کو تہوار بنا لیتے، آپ نے فرمایا کون سی آیت؟ اس نے کہا "**الیوم اکملت لکم دینکم الخ**" فرمایا کہ یہ آیت رکھے رکھائے تہواروں میں ہی نازل ہوئی تھی، یہ تو یوم عرفہ میں نازل ہوئی تھی اور وہ دن بھی جمعہ کا تھا، ہم لوگ اس طرح کے تہوار منانے کے عادی نہیں، ہمارے یہاں یہ طریقہ رائج نہیں۔

یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کارنامہ تھا کہ وہ دین کے ایک نقطہ کو بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ کرامات چاہے ایسے ہوں کہ آدمی ہوا میں اڑے، اور زبان ایسی ہو کہ جو بات نکلے پوری ہو جائے، اور نظر ایسی کہ جس پر پڑے مسلمان ہو جائے اور ولی کا درجہ پائے، سب چیزیں ایک جگہ مسلم اور قابل اعتراف ہیں، مگر جہاں تک دین کے باقی رہنے کا تعلق ہے تو سب سے اہم اور بنیادی چیز جو ہے وہ یہ کہ اس کے بارے میں غیرت اور اس کی حفاظت کا جذبہ سب پر غالب ہو، یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان تھی، اور اس میں وہ ساری امت میں ممتاز ہیں، کسی دوسرے مسئلہ میں کسی کا وصف ان سے نمایاں ہو، اس انکار نہیں کرتا، لیکن اس معاملہ میں ان کا کوئی مثیل نہیں۔

آپ کا دوسرا نمونہ یہ ہے کہ جس وقت آپ مسند خلافت پر بیٹھے تو آپ کو یہ بات معلوم تھی کہ حضور ﷺ کی آخری خواہشات اور تمناؤں میں یہ بات شامل تھی کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو رومیوں سے جنگ کرنے کے لئے بھیجیں، ادھر فتنہ ارتداد پھیلا ہوا تھا اور صرف دو تین مقامات ایسے بچے تھے، جہاں نماز ہو رہی تھی، پورا جزیرۃ العرب خطرہ میں اور ارتداد کی زد پر تھا،

اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر یہ ارتداد کچھ اور پھیلا تو پورا جزیرۃ العرب اسلام کی دولت سے محروم ہو جائے گا، اور مسلمانوں کی جو کچھ بھی فوجی طاقت تھی وہ جیش اسامہ میں تھی، اور یہ وہ لشکر تھا جس کو حضور ﷺ نے رومیوں سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار کیا تھا، لیکن اس کو بھیجنے کی نوبت نہیں آئی اور آپ اس دنیا سے رحلت فرما گئے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس نازک موقعہ پر فرمایا کہ میں یہ لشکر بھیجوں گا، کبار صحابہؓ نے سمجھایا کہ اے خلیفہ رسول اللہ! یہ وقت اس لشکر کے بھیجنے کا نہیں، کیونکہ جو کچھ بھی ہمارے پاس فوجی طاقت ہے وہ یہی لشکر ہے، اگر اس لشکر نے مدینہ سے باہر قدم رکھا تو یہ قبائل جو ہماری تاک میں ہیں ہم پر حملہ آور ہو جائیں گے، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم میں اس لشکر کو روانہ کر کے رہوں گا، اس لئے کہ حضور ﷺ کی یہ تمنا اور وصیت تھی، اور میں اس کو پورا کر کے رہوں گا، اس کے بعد ایسے الفاظ کہے جن کو میں آپ کے سامنے صاف طریقے سے بیان نہیں کر سکتا، یعنی یہاں تک کہہ دیا کہ ہمارے گھروں اور گھر والوں کی سلامتی اور حفاظت پر بھی اثر پڑ جائے اور وہ خطرہ میں پڑ جائیں، جب بھی میں اس وصیت پر عمل کر کے رہوں گا، اس لئے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کی ساری نصرت اور اس کی قدرت کاملہ کا ظہور اور نظام عالم کو بدل دینے کی اس کی عادت اور سنت ظاہر ہوتی ہے۔ نبی ﷺ کے منشاء کی تکمیل کی صورت میں، نہ کہ اس کو ملتوی رکھنے میں، یہ ان کا دین کا فہم تھا اور قرآن مجید کا مطالعہ۔

چنانچہ یہ واقعہ تاریخ میں ہے کہ اِدھر اس لشکر نے مدینہ طیبہ سے قدم نکالا اور اُدھر سارے عرب قبائل پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی کہ او ہو اب بھی مسلمانوں کے یہ دم خم ہیں کہ ان حالات میں بھی رومیوں سے آنکھیں ملانے کے لئے تیار ہیں، اور لشکر جا رہا ہے، ہم لوگ کیا ہیں، ہم غیر منظم قبائل ہیں، ہمارے پاس وہ ہتھیار بھی نہیں، وہ عسکری تنظیم بھی ہم نہیں جانتے، جب رومیوں سے لڑ سکتے ہیں تو ہم کیا چیز ہیں، ان پر دھاک بیٹھ گئی اور بالکل الٹا اثر ہوا۔

یہ ہے اخلاص کا نتیجہ اور یہ ہے دین کے فہم اور حقیقی نیابت، نبوت کا کارنامہ کہ سب ڈر رہے تھے، بڑے بڑے صحابہ ڈر رہے تھے، یا اللہ خیر کرے، ابوبکرؓ مانتے نہیں، اسامہؓ کا لشکر باہر بھیج رہے ہیں، وہ باہر نکلا تو لوگ سمجھیں گے کہ اب یہ لوگ بالکل لاوارث ہیں، کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں، اس سے بہتر موقعہ ہو نہیں سکتا اور وہ مدینہ پر چڑھائی کر دیں گے، لیکن اس کا

بالکل الٹا اثر ہوا اور تمام مورخین نے بالاتفاق لکھا ہے کہ پورے عرب پر دھاک بیٹھ گئی اور سہم گئے۔

یہ تھی پہلی بات اور دیکھئے یہی ہے تقدیر الٰہی "**ذلک تقدیر العزیز العلیم**" سے میں اسی کی طرف اشارہ کررہا ہوں، آپ روز سورج کو مشرق سے نکلتے اور مغرب میں ڈوبتے دیکھتے ہیں، یہی تنہا اللہ کے قہار ہونے اور حکیم وغالب ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ آفتاب رسالت کے اللہ تعالیٰ نے جو منازل مقرر کئے اور جن منازل سے اس کو گذرا، اور جس طرح اس نے دین کو تکمیل تک پہنچایا، اور جس طرح اس کے جانشین مہیا کئے اور اپنے نبی کو جو خلفاء دیئے یہ بھی "**ذلک تقدیر العزیز العلیم**" کا مظہر ہے۔

اب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کام پورا ہوا اور فتنہ ارتداد ایسا ختم ہوا کہ آج صرف تاریخ میں اس کا نشان باقی ہے، یہ صرف اللہ کی قدرت تھی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عزیمت جو اللہ ہی کو دی ہوئی تھی، اور اس کے نبی کی تربیت کی ہوئی تھی کہ وہ ارتداد کا فتنہ ختم ہوگیا، ورنہ پورے جزیرۃ العرب کا نام ہی تاریخ میں اس حیثیت سے آتا کہ وہاں تھوڑے دن کے لئے اسلام ظاہر ہوا تھا اور وہاں ایک ایسی ہستی پیدا ہوئی تھی، جو اپنے آپ کو نبی کہتی تھی، اور اس کے بعد کچھ دن وہ دین چلا، اور اس کی صرف ایک تاریخ رہ جاتی۔

اب دوسرے نمبر پر ضرورت تھی کہ دین تو محفوظ رہ گیا لیکن حاملین دین بھی محفوظ رہیں اور جو داعیان اول ہیں اور اس کے نمونہ اکمل ہیں اور جو اس کے عملی پیکر اور اس کا مظہر کامل ہیں، ان کا مزاج بدلنے نہ پائے، بڑی شاندار تاریخ اور ماضی رکھنے والی، اعلیٰ مقاصد کی حامل، مستحکم سیرت وتربیت کی مالک قوموں اور جماعتوں کا حال یہ ہوا ہے کہ فتوحات حاصل کرنے اور متمدن اور باوسائل ذخائر رکھنے والے ممالک فتح کر لینے کے بعد برف کی طرح گھل اور موم کی طرح پگھل گئیں اور انہوں نے سارے اصول ومعیار سے دستبرداری حاصل کرلی۔

اس وقت کہ روم اور شام اور ایران فتح ہورہے ہیں، مصر وشام کی دولت امنڈ امنڈ کر آرہی ہے اور بارش کی طرح برس رہی ہے، جن کی آنکھوں نے کبھی دیکھا نہیں تھا، وہ چیزیں ان کے ہاتھوں میں آرہی ہیں، عربوں کا حال یہ تھا کہ جب انہوں نے پہلی مرتبہ کافور دیکھا تو نمک سمجھ کر کھانے میں ڈالنے لگے، یہ عرب تھے، اونٹوں کے چرانے والے، خیموں میں رہنے والے،

اونٹ کا گوشت کھانے اوراس کا دودھ پینے والے ان کو سابقہ پڑا رومن امپائر سے، سا سانیوں کی سینکڑوں سال پرانی سلطنت سے، جہاں تمدن ارتقاء کے آخری درجہ تک پہنچ گیا تھا، اب خطرہ یہ تھا کہ امت تمدن کے اس سیلاب میں بہہ نہ جائے، اللہ تعالیٰ اس موقعہ پر ایسی ہستی کو سامنے لایا جو اس وصف میں سب سے زیادہ ممتاز تھی۔ کہا نہیں، بالکل نہیں، میرے سامنے عربوں کا، امت اسلامیہ کا مزاج نہیں بدل سکتا، یہ تمدن کا شکار نہیں ہو سکتے، یہ عیش وعشرت میں نہیں پڑ سکتے، انہوں نے عربوں کو بڑی تاکید سے سادگی، جفاکشی، شہسواری، زہد وقناعت اور اپنی قدیم نسلی سپاہیانہ ومتقشفانہ خصوصیات کو قائم رکھنے کی ہدایت وتلقین کی۔

خود ان کا یہ حال تھا کہ جب آپ جابیہ کی طرف سفر کر رہے تھے، تو اس شان کے ساتھ گئے کہ آپ ایک اونٹ پر بیٹھے ہوئے ہیں، جس پر ایک معمولی کپڑا پڑا ہوا ہے، اگر زمین پر لیٹنا ہو تو وہی اس کا بستر ہے، اور اگر اوڑھنے کی ضرورت پڑے تو وہی ان کی چادر، جسم پر ایک موٹی سوتی کپڑے (کرباس) کا کرتہ تھا، جس پر جگہ جگہ سے نشان پڑ گئے تھے اور جا بجا پھٹا ہوا تھا، بیت المقدس کے سفر میں جہاں آپ کو اس کی چابیاں لینی اور مسلمانوں کی تولیت میں اس کو لینے کا عمل کرنا تھا، راستہ میں پانی پڑا تو کھل کھل کر اس کو پار کرلیا، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے رہا نہ گیا، عرض کیا کہ اے امیر المومنین! آپ نے یہاں جو مظاہر فرمایا یہ مناسب نہیں تھا۔ یہ رومی جو بڑے ترقی یافتہ اور تمدن سے آراستہ ہیں کہیں گے کہ یہ مسلمانوں کے خلیفہ اعظم ہیں؟ ان کا حال یہ ہے کہ پانی میں اس طرح کھل کھلاتے چلے آرہے ہیں، آپ کسی معزز سواری پر تشریف لائے ہوتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بات برداشت نہ ہو سکی اور انہوں نے یہ فرمایا "اولو غيرك قالها يا أبا عبيدة أنكم كنتم أذل الناس فاعزكم الله بالاسلام فمهما تطلبوا العز بغيره يذلكم الله."

مذاہب کی تاریخ، وارثین انبیاء کی تاریخ میں ان الفاظ کی مثال نہیں ملتی، انہوں نے کہا کہ ارے ابوعبیدہ! تم یہ کہہ رہے ہو؟ اگر کوئی اور کہتا تو ہمیں افسوس نہ ہوتا، دل پر چوٹ نہ لگتی، تم جیسا آدمی یہ کہہ رہا ہے، امین الامت! خدا کی قسم تم (اہل عرب) سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ذلیل وحقیر وقلیل نہ تھا، ہم کو اللہ نے اسلام کے ذریعہ عزت دی، اب تم جس راہ سے بھی عزت تلاش کرو گے اللہ تم کو ذلیل کرے گا، پھر جب وہاں پہنچے تو کہنے لگے، ارے تم نے اتنی جلدی اپنا

لباس تبدیل کر دیا؟ ایسے کپڑے پہنے ہوئے ہو؟ تو حضرت ابوعبیدہ اور حضرت عمرو بن العاص نے کہا اے امیر المومنین یہ ٹھنڈا ملک ہے، یہاں اس طرح کپڑوں کی ضرورت پڑتی ہے، اور دیکھئے ہمارے نیچے وہی کپڑے ہیں، انہوں نے کہا کہ اچھا خیر، اس کے بعد کسی پادری کو کرتہ دیا کہ پھٹ گیا ہے ذرا اس کو سی دیں، پادری نے ایک دوسرا قیمتی کرتہ اس کے بدلہ دے دیا، آپ نے فرمایا کہ یہ کیا چیز ہے؟ پادری نے کہا کہ حضرت یہ بڑے اچھے کپڑے (کتان) کا بنا ہوا ہے، آپ نے فرمایا کہ نہیں، ہمارا وہی کرتہ لاؤ، چنانچہ وہ کرتا لایا گیا اور آپ نے اس کو پہنا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب حاکم ومحکوم کے درمیان وہ فرق ہوتا تھا جو انسان اور جانور سے بھی زیادہ ہوتا ہے، آپ، ہندوستان کو دیکھئے، یہاں جو طبقاتی تفاوت تھا اور اونچی اور نیچی ذاتوں کے درمیان جو فرق تھا، وہ دیکھئے، منوشاستر پڑھئے تو آپ کو اس وقت کے حالات کا علم ہوگا۔

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو عدل الٰہی اور مساوات انسانی کے علمبردار تھے، اور ان کو اس صفت کو قائم بھی رکھنا تھا اور اللہ کو ان کے ذریعہ اس وصف کو اس وقت تک پہنچانا بھی تھا، ان کی عدل گستری اور مساوات انسانی کا صرف ایک واقعہ میں آپ کو سناتا ہوں۔

ایک مرتبہ مصر میں گھوڑوں کی ریس ہو رہی تھی، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جو مصر کے فاتح اور اس کے گورنر ہیں، ان کے صاحبزادہ اس ریس میں شریک تھے، مقابلہ میں ایک قبطی کا گھوڑا ان کے گھوڑے سے جب آگے بڑھنے لگا تو انہوں نے ایک کوڑا گھوڑے پر لگایا، وہ رک گیا تو انہوں نے اس قبطی پر بھی ایک کوڑا مارا اور کہا کہ میں ایک شریف زادہ ہوں اور تم مجھ سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہو؟ قبطی نے اس واقعہ کی شکایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے گورنر صاحب کو اور ان کے صاحبزادہ دونوں کو طلب کیا اور فرمایا کہ تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنایا، حالانکہ سب اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے تھے، پھر آپ نے اس قبطی کو بلایا اور اس کے ہاتھ میں کوڑا دیا اور حکم دیا کہ اس شریف زادہ گورنر صاحب کے صاحبزادہ کے سر پر ایسا ہی پھیرو جیسا کہ انہوں نے تمہارے سر پر پھیرا تھا۔

یہ تھی وہ چیز جس کی وجہ سے اسلام میں یہ نظام عدل اور مساوات انسانی اور انسانیت کا احترام اور اس کا شرف اور اس کی عزت وباقی رہی۔

اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ تیسرے نمبر پر کس چیز کی ضرورت تھی؟ فتنہ ارتداد ختم ہو چکا تھا، دین میں تحریف کا دروازہ بند ہو چکا تھا، انسانی مساوات اور عدل کا نظام ہو چکا تھا، اب ضرورت تھی کہ یہ اسلامی مملکت قائم رہے گی تو خیر کا دروازہ کھلا رہے گا، کیسی کیسی قومیں حلقہ بگوش اسلام ہوں گی، کیسے کیسے باکمال افراد پیدا ہوں گے، کیسے کیسے عالم ربانی پیدا ہوں گے، کیسے کیسے ائمہ ومجتہدین پیدا ہوں گے، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل جیسے، کیسے کیسے محدث پیدا ہوں گے، امام بخاری اور امام مسلم جیسے، کیسے کیسے قانون ساز پیدا ہوں گے، امام ابو یوسف اور امام محمد جیسے، کیسے کیسے فاتح پیدا ہوں گے، عقبہ بن نافع اور طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم جیسے۔

چنانچہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب فرمایا، کیونکہ انہیں کے خاندان کے لوگ زیادہ تر ملکوں کے فاتح اور حاکم ومنتظم تھے، اور یہ انسانی فطرت ہے کہ جب اہلکاران سلطنت کا خونی رشتہ بھی ہوتا ہے، نسبی ووطنی رشتہ بھی ہوتا ہے تو وہ اس کو اپنی چیز سمجھتے ہیں، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ہم محض ملازم ہیں اور جوابدہ ہیں، تو وہ اس وقت اس کے ساتھ خیر خواہی کرتے ہیں، اب یہاں پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ضرورت تھی، چنانچہ وہ آئے اور تاریخ بتاتی ہے کہ کیسی فتوحات ان کے زمانہ میں ہوئیں، آپ کے زمانہ میں قبرص، افریقہ کا ایک بڑا حصہ، آذربائیجان، اصطخر، نیشاپور، شیراز، اصفہان، طبرستان، سجستان اور نیشاپور فتح ہوئے۔

خلافت عظمیٰ پر فائز اور وسیع مملکت کے حاکم اور ذاتی طور پر فراخ معیشت اور صاحب اموال ہونے کے باوجود دیکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ ہم نے دیکھا کہ آپ جمعہ کا خطبہ دے رہے ہیں اور آپ کے جسم پر ایک موٹی چادر ہے جس کی قیمت چار درہم سے زیادہ نہیں۔ ایسا بار ہا ہوا کہ باہر کے وفود آئے، ان کو لذیذ کھانے کھلائے اور خود گھر جا کر نہایت سادہ غریبانہ کھانا کھایا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جب محاصرہ ہوا تو آپ نے اگرچہ خلافت سے دستبرداری منظور نہیں کی وہ نبی کی نیابت تھی اور منشاء رسول اور مصالح اسلامی کے مطابق اور اس طرح استقامت وعزیمت کی ایک شاندار نظیر چھوڑی، لیکن اپنی سلامتی وحفاظت کے لئے مسلمانوں کے خون کا ایک قطرہ بہانے کی اجازت نہیں دی، شہادت سے ایک روز قبل آپ کے مکان پر

سات سو کے قریب مہاجر و انصار جمع ہو گئے، جن میں متعدد جلیل القدر صحابی بھی تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا جس پر بھی میرا کوئی حق ہے، اس کو قسم دیتا ہوں کہ وہ اپنا ہاتھ روک لے اور اپنے گھر چلا جائے، اپنے غلاموں سے فرمایا، جو تلوار میان میں کر لے وہ آزاد ہے۔

اسلام کی طرف سے اب بالکل اطمینان ہو چکا تھا۔ سیاسی، انتظامی اور عسکری طور پر اب کوئی خطرہ باقی نہ تھا، اب ضرورت تھی کہ مسلمان اتنے دنوں تک حکومت کر چکے تھے اور تمدن کا اثر پڑنا لازمی تھا، اور سیاسی طرزِ فکر کا آنا بھی ضروری تھا کہ آدمی سیاسی اقدار کے ذریعہ سوچے اور فیصلہ کرے کہ اس وقت یہ کرنا مناسب ہے اور یہ کرنا نامناسب، سیاسی مصلحت کا تقاضہ یہ ہے، اور دین کا مطالبہ یہ ہے۔

اب ضرورت تھی کہ خلیفہ رابع سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو لایا جائے جن کا اصل وصف اور اصل امتیاز یہ تھا کہ سیاسی اصولوں اور سیاسی منافع اور مفادات پر خالص دینی اصولوں کو ترجیح دی جائے، اور اس کی ذرا پرواہ نہ کی جائے کہ خلافت ہاتھ میں رہے گی یا نکل جائے گی، نہیں یہ چیز یہاں کے لئے مناسب نہیں، اس کو بدل دینا چاہئے، یہ کام یہاں نہیں ہونا چاہئے، یہاں تک کہ ان کی نظر اس پر بھی تھی کہ اپنے عمال سلطنت کا محاسبہ کرتے تھے، ایک صاحب ایک دعوت میں چلے گئے، ان کے نام خط ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم ایسی دعوت میں گئے ہو، جہاں غریبوں کو ہٹایا جاتا ہے اور امیروں کو بلایا جاتا ہے، تم نے وہاں کی دعوت میں شرکت کی اور انواع واقسام کے کھانے کھائے! پھر ان کی آخری زندگی کا یہ حال تھا کہ بعض مرتبہ کوئی مہمان آیا اور اس کو خیال تھا کہ آج امیر المومنین کے یہاں آئے ہیں، آج تو خوان نعمت لگے گا، طرح طرح کے کھانے رکھے جائیں گے، لمبا چوڑا دستر خوان بچھے گا، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک تھیلی منگوائی، اس پر مہر لگی ہوئی تھی، آپ نے مہر توڑی اور اس کو کھولا تو اس میں سے ستو نکلا، اس نے کہا اے امیر المومنین یہاں تو اس وقت بصرہ اور کوفہ میں لذیذ اور عمدہ کھانے کی فراوانی ہے، اور آپ ستو کھاتے ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں یہ میرا خریدا ہوا ہے، اور یہی میرا کھانا ہے، میں نے اس پر مہر لگا رکھی ہے تا کہ اس میں کوئی باہر کی چیز داخل ہونے نہ پائے۔

آپ ہی کا واقعہ ہے کہ ایک زرہ کے معاملہ میں آپ کا عدالت جانا ہوا، آپ کی زرہ ایک

یہودی کے ہاتھ لگ گئی تھی، جو کھوگئی تھی، اس کا مقدمہ قاضی کے پاس گیا اور حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کو ایک فریق کی حیثیت سے عدالت جانا پڑا، آپ اپنے صاحبزادہ حضرت حسنؓ اور ایک غلام کو لے کر عدالت گئے، قاضی صاحب نہ ان کے لئے کھڑے ہوئے اور نہ ان کو اس جگہ بٹھایا جہاں امیر المومنین کو بٹھانا چاہئے تھا اور جب آپ نے گواہ پیش کئے تو قاضی صاحب نے ان کی گواہی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ان میں تو ایک آپ کا صاحبزادہ ہیں اور دوسرے آپ کے غلام، لہذا ان کی گواہی معتبر نہیں، آپ نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن وہ یہودی اس واقعہ سے اتنا متاثر ہوا کہ وہ اسی وقت مسلمان ہوگیا اور کلمہ پڑھا کہ امیر المومنین اس طرح قانون پر چلتے ہیں اور اپنی طاقت اور شان اور حیثیت سے بالکل کام نہیں لیتے۔

آپ کے عہد خلافت کی یہ بھی ایک خصوصیت وافادیت تھی کہ آپ نے اس کا نمونہ پیش کیا کہ اندرونی فتنوں، ہم مذہبوں کی مخالفتوں اور انتشار کے دور میں کس طرح اصول پر قائم رہا جاتا ہے اور سیاست دین پر غالب نہیں ہونے پاتی، امام ابو حنیفہؒ نے خوب فرمایا ہے کہ اگر حضرت علی کا دور نہ ہوتا تو ہمیں خیر القرون کی کوئی مثال اور نمونہ نہ ملتا کہ فتنوں اور خود مسلمانوں کی مخالفت کی حالت میں کیا کرنا چاہئے۔

یہ تھا وہ جوہر جس کی چوتھے نمبر پر ضرورت تھی۔ اب میں آپ سے کہتا ہوں کہ اسی طریقہ سے اللہ تعالی نے اس سلسلہ کو جاری رکھا، اور یہی حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا معاملہ ہے، میں صفائی سے کہتا ہوں کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کا معاملہ بھی آیات الٰہی اور اللہ تعالی کی نشانیوں میں سے ہے، حضور ﷺ کے ساتھ خدا تعالی کا جو مخصوص معاملہ رہا ہے۔ اور اللہ تعالی نے آپ کو دنیا کی جو بہتر سے بہتر نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ ان میں سے آپ کے یہ دو پھول بھی ہیں، جن کو "ریحانتی رسول اللّٰہ" کا لقب ملا ہے۔

میں اپنے تاریخ کے مطالعہ کی روشنی میں صاف کہتا ہوں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا اقدام بالکل صحیح تھا جو انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں کیا تھا اور پھر خود آنحضرت ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھ کر فرمایا تھا "ان ابنی ھذا سید وسیصلح اللّٰہ بہ بین فئتین من المسلمین" میرا یہ بیٹا سردار ہے، امید ہے کہ اللہ تعالی اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دو بڑے جماعتوں میں صلح کرادے گا۔ یہ بات حضرت حسن رضی

اللہ عنہ کے لئے ایک خبر نہیں تھی، بلکہ یہ آپ کے لئے ایک وصیت تھی، منشاء رسول تھا، اللہ کے رسول کا منشاء بھی اور پیارے نانا جان کا منشاء بھی، چنانچہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنے خالص حکم نبوی سمجھا اور اس کے مطابق جو اقدام کیا وہ بالکل صحیح تھا کہ معاملہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ تھا، وہ صحابی تھے، کاتب وحی تھے، قریبی رشتہ دار تھے اور کوئی بات موجب خروج اور تلوار اٹھانے کی نہ تھی، ان کی مخالفانہ فوجی اقدام کا نتیجہ خونریزی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ ان کو جب بعض جوشیلے لوگوں نے طعنہ دیا کہ یہ ننگ وعار کی بات ہے تو فرمایا "العار خير من النار"۔

اس طریقہ سے جب معاملہ یزید کا آیا تو میرے نزدیک حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اقدام سو فیصد صحیح تھا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یہی کرنا چاہئے تھا، ورنہ قیامت تک کے لئے قرن اول کا کوئی نمونہ ہمارے سامنے نہ ہوتا کہ جب کوئی غلط اقتدار قائم ہو جائے اور جب معاشرہ کی سیرت وکردار کے تبدیل ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے، جب حکومت بجائے امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور بجائے تقویٰ اور طہارت پیدا کرنے اور بجائے خدا ترسی اور عبادت کا ذوق بنانے کے، سیر وشکار اور تعیش ولذت اندوزی کا ذوق پیدا اور دولت واقتدار کا غلط استعمال ہونے لگے تو ہمارے سامنے کوئی نمونہ اس کا بھی ہونا چاہئے تھا کہ کوئی اللہ کا بندہ اٹھے اور اس کو چیلنج کرے اور اس کے مقابلہ میں آ جائے، اگر یہ نہ ہوتا تو آپ اسلام کی بعد کی تاریخ میں دیکھتے کہ وہ ساری کی ساری اس شعر کی تعمیل ہوتی:

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

جو غلط اقتدار آ جاتا، جو غلط حکومت قائم ہو جاتی، ہم بس اس کے تابع بن جاتے کہ یہی تقدیر الٰہی ہے، ہمارے پاس صدر اول کا کوئی نمونہ نہیں ہے، ہمارے پاس کوئی قابل اقتدا مثال نہیں ہے کہ ہم کچھ کر سکیں، پھر اس میں یہ اندیشہ ہے کہ اس سے اسلامی وحدت پر اثر پڑے گا، مسلمانوں کی اجتماعیت خطرہ میں پڑ جائے گی، سب خاموش تماشائی بنے رہیں گے۔

اس کے لئے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا نمونہ قائم کیا گیا کہ نہیں کچھ لوگ ایسے ہونے چاہئیں کہ وہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں آئیں اور کسی چیز کی پرواہ نہ کریں، چنانچہ بعد کے مجاہدین کی اگر آپ تاریخ پڑھیں اور ان کی نفسیات کا مطالعہ بھی کریں اور ان کے مکالمے بھی اگر دیکھیں اور ان کی باتیں بھی سنیں، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مختلف عہدوں اور ملکوں

میں جو اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں اور جو انقلابی کوششیں پروان چڑھیں، ان سب میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یہ نمونہ کام کر رہا تھا، امیر عبدالقادر جزائری ہوں یا عبدالکریم ریفی، شیخ سنوسی ہوں یا شیخ شامل داغستانی یا سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید سب کے حوصلے کو بڑھانے والی، ان کے اندر جذبہ پیدا کرنے والی چیز حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یہ نمونہ ہے کہ یہ کوئی طفلانہ حرکت نہیں، کوئی اشتعال انگیز، کوئی انتشار پیدا کرنے والی حرکت نہیں بلکہ حسینی سنت ہے۔

یہ سلسلہ ہمارے اس دور تک قائم ہے، تحریک خلافت جس کا لکھنؤ ایک بڑا مرکز تھا، اس کے جو سب سے بڑے قائد تھے یعنی رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر ان کے اندر بھی حضرت حسین کی تقلید کا یہ جذبہ کام کر رہا تھا، وہ کہتے ہیں:

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو
خوش ہوں کہ وہ پیغام قضا میرے لئے ہے

پھر آپ دیکھیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے حضرت زین العابدین کے صاحبزادے زید بن علی بن حسین جب ہشام بن عبدالملک (جو یزید سے یقینا اچھا ہی ہوگا) مقابلہ میں کھڑے ہوئے تو امام ابوحنیفہ نے دس ہزار درہم جو اس زمانہ کے لحاظ سے اور امام ابوحنیفہ کے اعتبار سے (جو ایک مجتہد اور فقیہ تھے کوئی سرمایہ دار نہیں تھے) بہت بڑا عطیہ ہے، ان کو بھیجے اور برابر آپ ان سے ہمدرد تھے، اور پھر اس کے بعد جب حضرت محمد ذوالنفس الزکیہ (محمد ذوالنفس الزکیہ کون ہیں؟ محمد ذوالنفس الزکیہ بن عبداللہ المحض بن حسن مثنی بن حسن المجتبی بن سیدنا علی المرتضی) جب منصور کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے (منصور کون؟ ہارون رشید کا دادا اور بغداد میں خلافت عباسیہ کا بانی) تو تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے ان کا ساتھ دیا، اور فتویٰ بھی دیا، اور حسن ابن قحطبہ جو منصور کا جنرل تھا، امام ابوحنیفہ نے روک دیا کہ تمہارے لئے جائز نہیں کہ تم محمد ذوالنفس الزکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم سے جنگ کرو، یہ دو بھائی تھے، محمد بن عبداللہ جو مدینہ میں کھڑے ہوئے اور حدیث موجود ہے کہ میری اولاد میں ذوالنفس الزکیہ ہوگا جو مدینہ میں احجار زیت میں شہید ہوگا، یہ پیشین گوئی آپ پر صادق آئی، دوسرے بھائی ابراہیم تھے جو بغداد

میں کھڑے ہوئے تھے، لیکن تاریخوں کے اختلاف کی وجہ سے ذرا سا فرق ہو گیا، چنانچہ دونوں مل کر مقابلہ نہیں کر سکے، امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نے دونوں کا ساتھ دیا اور رقم بھی بھیجی۔

اب اگر کوئی حضرت حسینؓ، زید بن علیؒ اور محمد نفس الزکیہ کے اس اقدام پر اعتراض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ جمعیت اسلامی اور اقتدار اسلامی کے خلاف ایک غیر مستحسن اقدام اور ایک ناعاقبت اندیشانہ عمل تھا، تو وہ گویا یہ کہتا ہے کہ وہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ سے زیادہ فقیہ اور مجتہد ہے، اور زیادہ خداترس اور اسلام دوست، اور آپ یہ بھی یاد رکھیں کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نہ صرف فقیہ اور مجتہد تھے، بلکہ ایسے فقیہ اور مجتہد تھے کہ میں شریعت اور فقہ اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ملتوں میں ان دونوں کی مثال نہیں ملتی، انہوں نے نہیں سوچا کہ اسلامی اقتدار اعلیٰ کے خلاف یہ لوگ قدم اٹھا رہے ہیں؟ ان کے پاس کیا فوجی طاقت ہے؟ اس کا نتیجہ سوائے انتشار کے کچھ نہیں، دونوں نے بالکل خم ٹھونک کر ان لوگوں کی تائید کی۔

یہ ہم اہل سنت کا امتیاز ہے کہ ہم صحابہ کرام کی عظمت کرتے ہیں، ان کی فضیلت کے قائل ہیں اور اہل بیت سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے اس سرمایہ پر فخر کرتے ہیں اور یہ حال جس کی یادگار ہے، میں خود اس کے متعلق یہ گواہی دیتا ہوں کہ یہی ان کا مسلک تھا، یہی حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے بعد ان کے خاندان کا مسلک تھا، یہی مجدد الف ثانیؒ کا مسلک تھا، میں نے صاف پڑھا ہے کہ جب ان کے والد (حضرت شیخ عبدالاحد سرہندیؒ) کا انتقال ہونے لگا، بالکل سکرات کا وقت تھا، حضرت مجدد صاحب نے کہا کہ ابا جان آپ بہت کہا کرتے تھے کہ اہل بیت کی محبت کا حسن خاتمہ میں بہت دخل ہوتا ہے تو فرمایا کہ میں دیکھ رہا ہوں اور پھر اس جگہ یہ شعر لکھا:

الٰہی بحق بنی فاطمہ
کہ برقول ایمان کنی خاتمہ

یہ ہمارا شعر ہے، ہم کسی قیمت پر بھی اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم خلفاء راشدین کو احق الناس بالخلافۃ اسی ترتیب کے ساتھ اور ان کی اولیت بھی اسی ترتیب کے ساتھ، پھر خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، دوسرے نمبر پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، تیسرے نمبر پر

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ۔ چوتھے نمبر پر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہیں۔ ہم اس ترتیب کے بھی قائل ہیں، ان کی افضلیت کے بھی قائل ہیں اور ان کی خلافت کی حقانیت کے بھی قائل۔ اس کے ساتھ ہم اہل بیت سے بھی محبت رکھتے ہیں اور ہم حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کے اقدام کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں۔

ہمارے تمام قابل اعتماد اور لائق استناد مجتہدین اور ائمہ سب متفق ہیں، یزید کے فعل کی شناعت اور یزید کے فسق پر امام احمد بن حنبلؒ کے متعلق صاف آتا ہے کہ ان کے صاحبزادہ نے کہا ابا جان کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ یزید کو پسند کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ بیٹا جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہو کیا وہ یزید کو پسند کرتا ہے؟ صاحبزادہ نے عرض کیا کہ پھر آپ لعنت کیوں نہیں بھیجتے یزید پر۔ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا کہ تم نے اپنے باپ کو کب کسی پر لعنت بھیجتے ہوئے سنا ہے۔

یہی امام ابن تیمیہ کا مسلک ہے، جب ان کا مکالمہ تاتاری قائد بولائی سے ہوا تو یزید کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کئے، اور اس نے اپنی برأت کا اظہار کیا اور اس کے فعل کی شناعت بیان کی۔

یہی مسلک تھا حضرت مجدد الف ثانیؒ ، شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ اور ہمارے تمام پیشواؤں کا یہی مسلک تھا۔ امام اہل سنت مولانا عبدالشکور رحمۃ اللہ علیہ کا، میں ان کو جانتا ہوں کہ ان کو اہل بیت سے کتنا تعلق تھا۔ اور حضرات حسنینؓ سے کتنا تعلق تھا۔ یہاں تک کہ ان کے منتسبین تک سے ان کا جو معاملہ تھا، وہ ہم سب جانتے ہیں، اس خصوصیت سے ہم کو بھی دستبردار نہیں ہونا چاہئے اور اس کے بارے میں کوئی سودا نہیں کرنا چاہئے، نہ عظمت صحابہ کے بارے میں، نہ خلفاء راشدین کی ترتیب کے بارے میں اور نہ حضرات حسنینؓ کے فعل کی صحت کے بارے میں، اور ان کے اقدام کے صحیح اور مبارک ہونے کے بارے میں۔

خوارج ایک طرف چلے گئے، روافض ایک طرف چلے گئے، بے توفیق تھے وہ، خدا کی نصرت، اس کی رہنمائی اور اس کی ہدایت سے محروم تھے وہ، خوارج نے حضرت علیؓ کی تکفیر کی اور روافض نے خلفاء ثلاثہ کی تکفیر کی اور ان کے ائمہ جو یہ بات کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی آنکھ بند ہونے کے بعد صرف تین آدمی دین پر قائم رہے، اور بقیہ تمام لوگوں نے ارتداد کا راستہ اختیار

کیا، معاذ اللہ اس سے بڑھ کر رسول کی ناکامی کا اعلان اور آپ کی رسالت اور آپ کی کیمیا اثر صحبت کی تاثیر کا انکار اور کیا ہوگا، یہ تو عیسائیوں اور یہودیوں نے بھی کیا، چنانچہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عمدہ بات لکھی ہے۔ اور اس سے بہتر بات نہیں ہوسکتی اور میں اسی پر اپنی تقریر ختم کروں گا۔

وہ لکھتے ہیں کہ یہودیوں سے پوچھا گیا کہ تمہاری امت میں، امت یہودیہ میں سب سے افضل اور سب سے اعلیٰ لوگ کون تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی، عیسائیوں سے پوچھا کہ تم اپنی امت میں سب سے افضل اور سب سے بہتر کسے سمجھتے ہو، اور امت عیسوی میں نمونہ کامل کون لوگ تھے، انہوں نے جواب دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری، روافض سے پوچھا گیا کہ امت اسلامیہ میں سب سے بدتر اور خراب لوگ کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے صحابی۔ بالکل الٹی بات ہے۔

ارے بھائی جن کا یہ سب فیض ہے اور یہ جو آج روشنی نظر آرہی ہے بقول شاعر:

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہیں کی لگائی ہوئی ہے

اس کا فیض اگر اس کے قریب ترین لوگوں میں نہ پہنچے تو پھر کیسا دعویٰ۔ اور میں نے تو کہا کہ اگر کسی مغربی ملک میں تقریر کر رہا ہوں اور تقریر زور و شور سے جاری ہو اور لوگ متاثر ہو رہے ہوں کہ ایک دم سے ایک عیسائی کھڑا ہوتا ہے اور مجھ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ مولانا صاحب! یہ جو آپ ہم کو دین کی دعوت دے رہے ہیں تو آپ ہم سے کیا امید رکھتے ہیں، آپ کے نبی کے تیار کئے ہوئے لوگ آپ کے نبی کی آنکھ بند ہوتے ہی پھر گئے تو پھر آپ ہم سے کیا امید رکھتے ہیں اور ہم پر کیوں محنت کرتے ہو۔ ہم اگر آج کلمہ پڑھ لیتے ہیں، مسلمان بھی ہو جاتے ہیں تو ہمارا کیا اعتبار۔ ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔ تو جب بقول بعض اثناء عشری علماء کے تین ہی ارتداد سے بچے اور اسلام پر قائم رہے۔ ۲۳ سال کی محنت شاقہ اور موثر تربیت جو خاک کے ذروں کو کیمیا بنادے، اور سونا کیا چیز ہے، اس کو آسمان تک پہنچادے، اس ۲۳ سالہ مشقت اور تبلیغ کے بعد نتیجہ صرف یہ ۳ آدمی ہیں، تو آپ ہم کو کس امید اور کس بھروسہ پر دین کی دعوت دے رہے ہیں؟

آپ اس چیز کو ہمیشہ قائم رکھیں، صحابہ کرام کی عظمت و عقیدت، ان کی افضلیت کا عقیدہ، ان کی خلافت کو برحق ماننا اور حضرات سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ دونوں کے اقدام کو بالکل صحیح سمجھنا اور ان کے لئے دعائے خیر کرنا، اور ان سے محبت کرنا، یہ ہمارا آپ کا شعار ہے، اور اس پر ہم کو فخر ہے، اور ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ہم اس پر زندہ رہیں، اور اسی پر دنیا سے جائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

دین ایمان کو جسم و جان پر ترجیح دینا ایمانی تقاضا ہے

ہندوستان کے موجودہ حالات میں اسلامی تہذیب و تمدن اسلامی تعلیم و تربیت' اسلامی امتیازات و تشخیصات کے لئے جو خطرات پیدا ہو گئے ہیں اور سیکولر اور مشرکانہ نظام تعلیم نے مسلمانوں کے دین و ایمان اور تہذیب کے لئے جو مسائل و مشکلات کھڑی کردی ہیں ان کے دفاع کے لئے تیاری اور بیداری و ہوشیاری کی جیسی ضرورت اس وقت ہے ویسی شاید کبھی نہ تھی۔

دین و ایمان کے لئے اس سیکولر اور مشرکانہ چیلنج کے جواب و دفاع کے سلسلے میں ہم مخدوم گرامی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی برحمہ اللہ کی یہ فکر انگیز' ایمان افروز اور دلپذیر تقریر (جو آپ نے دینی تعلیمی کونسل کے اجلاس عام منعقدہ 27 فروری 1983ء بمقام خیر انٹر کالج بستی) فرمائی۔ شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

حضرات! اتنی رات ہوگئی ہے اور میں خود اس حال میں ہوں کہ میرا جی چاہا کہ میں دعا پر جلسہ کو ختم کردوں لیکن مجھے ان لوگوں سے شرم آئی جو اس وقت تک بیٹھے رہے ہیں اور میں ان کے صبر کا زیادہ امتحان لینا مناسب نہیں سمجھتا اس لئے کہ اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور جو بات توجہ اور شوق کی حالت میں کہی جاتی ہے وہ شوق کے ساتھ سنی جاتی ہے۔ اور اس کا اثر بھی ہوتا ہے تو میں کوئی لمبی تقریر نہیں کروں گا اور آپ تقریریں سنتے رہے ہیں یعنی آپ کو شکایت نہیں ہوگی کہ آپ نے کوئی تقریر نہیں سنی۔ تقریبا ایک دو کو مستثنیٰ کر کے جو صاحب بھی تشریف لائے ہیں انہوں نے پوری پوری تقریر کی ہے۔ اس لئے اب میرا بہت سا کام بلکہ تقریبا چھیانوے اور اٹھانوے فیصدی کام اس سے پہلے ہو گیا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ واحسنوا ان اللہ

یحب المحسنین.

میں نے آپ کے سامنے قرآن کریم کی ایک آیت پڑھی ہے اس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اس کا واقعہ یہ ہے جو میں آپ کو پہلے سنادوں کہ ایک موقع پر بعض مسلمان ایسے تھے جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اور اپنے کو خطرہ میں ڈال کر اسلام کی خدمت کر رہے تھے۔ اور بالکل نتائج سے بے پروا ہو کر مسلمان تو قرآن پڑھتے ہوئے ہوتے ہی ہیں اور اس زمانہ کے لوگ اور زیادہ پڑھے ہوئے تھے ان میں کچھ لوگوں کو خیال ہوا کہ فتح مکہ کے بعد اسلام غالب ہو چکا ہے۔ اور اب انفاق مال اور جہاد کی ضرورت نہیں۔ اس لئے ہم لوگوں کو کھیتی باڑی اور تجارت وغیرہ میں لگنا چاہیے۔ اس موقع پر ایک بڑے جلیل القدر صحابی سیدنا حضرت ابوایوب انصاریؓ (جو میزبان رسولؐ اور بقول مولانا شبلیؒ کے میزبان عالم کے میزبان تھے یعنی حضورؐ جو دنیا کے میزبان ہیں۔ جن سے ہماری دنیا کو اسلام اور ہدایت کی نعمت ملی ان کو اللہ تعالیٰ نے آپ کا میزبان ہونے کا شرف عطا فرمایا تھا) وہ برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے کہا کہ لوگو! اس آیت کا مطلب ہم سے پوچھو ہم انصاریوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اور جتنا ہم اس کو سمجھتے ہیں اتنا دوسرا نہیں سمجھتا۔ اس لئے کہ ہم پر گزر چکی ہے اور ہم ہی اس کے اول مخاطب تھے قصہ یہ پیش آیا کہ جب اسلام مدینہ میں اور ہم لوگوں نے اس کے لئے قربانیں دینی شروع کیں اپنا سارا وقت اس کے نذر کیا اپنی ساری صلاحیت، توانائی سب کچھ اس کے سپرد کر دیا تو قدرتاً ہمارے کاروبار اس سے متاثر ہونے لگے باغوں کو پانی دینے کا وقت نہیں رہا دکان پر بیٹھنے کا وقت نہیں رہا۔ مکانوں کی تعمیر اور کاروبار کے بڑھانے کا وقت نہیں رہا۔ تو ہمارے ذہنوں میں یہ بات آئی کہ کچھ دنوں تک تو ہم نے آنکھ بند کر کے کام کیا اپنوں کو جھونک دیا لیکن جب مسلمانوں کی تعداد بڑھی اور خدا کے فضل سے ہر محاذ پر اسلام کے سپاہی پیدا ہو گئے تو ہم نے یہ سوچا کہ اب حضورؐ سے کچھ دنوں کی چھٹی لے لیں اور کہیں کہ اب ذرا ہم اپنے کاروبار کو سنبھال لیں۔ اس کے بعد پھر ہم آ گے رہیں گے ہم ہمیشہ کے لئے چھٹی نہیں لے رہے ہیں بس یہ خیال آنا تھا اور ابھی شاید زبان پر بھی یہ بات نہیں آئی تھی اور آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی نوبت تو کیا آئی ہوگی۔ اس خیال کا آنا تھا کہ قرآن شریف کی آیت نازل ہوئی کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور اس خرچ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف مال خرچ کرو بلکہ جان و

مال سے لے کر وقت اور صلاحیت و توانائی اور توجہ سب صرف کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور اپنے کو خندق میں نہ دھکیلو بلکہ پھانسی کے تخت پر نہ چڑھو۔ اور اپنے گلے میں پھانسی نہ ڈالو جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس نے ہم کو چونکا دیا۔ یہ آیت کیا تھی ایک کوڑا ایک تازیانہ تھا ہم تڑپ گئے اور بے قرار ہو گئے اور معلوم ہوا کہ اسلام کی خدمت میں اپنے کاروبار سے آنکھیں بند کر لینا خودکشی نہیں ہے بلکہ اسلام کی خدمت کے مقابلے میں اپنے کاروبار کو ترجیح دینا اور اپنے مادی تقاضوں کا زیادہ لحاظ کرنا اور اس سے اسلام کے جو تقاضے ہیں ان کے پورے ہونے میں فرق آئے تو یہ خودکشی ہے۔

اسلام میں انفرادی و اجتماعی دونوں خودکشی حرام ہیں

اور آپ کو معلوم ہے کہ فرد کی خودکشی بھی اسلام میں حرام ہے۔ یہ مسئلہ سب جانتے ہیں کہ اگر کوئی زہر کھا کر مرنا چاہے خواہ وہ کتنا ہی بیمار ہو اور خواہ اس کو کتنی ہی ناقابل برداشت اذیت اور تکلیف ہو رہی ہو جب اسلام میں اس کو حرام قرار دیا گیا ہے اور کوئی اس کی اجازت نہیں دے سکتا کسی فرد کی خودکشی کو خواہ وہ بہت ہی اضطراری حالت میں بھی ہو۔ جب بھی اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ تو ایک قوم اور ایک جماعت کی خودکشی کو کیسے جائز قرار دے سکتا ہے؟ اور پھر اس ملت کو جس سے دوسروں کی جان اور زندگی کا مسئلہ وابستہ ہے جو آخری امت اور آخری ملت ہے اور ساری انسانیت کے لئے بڑا سہارا ہے۔ اور اگر وہ ڈوبی تو سارا عالم ڈوب جائے گا اور وہ بچی تو پھر عالم اگر ڈوب رہا ہوگا تو بچ جائے گا اور آج ڈوبے گا تو کل نکل آئے گا اور اللہ تعالیٰ اسی طریقہ سے انسانیت کی گاڑی چلاتا رہے گا لیکن اگر اس امت کا بیڑا غرق ہوا اور اس امت نے اپنے گلے میں پھانسی ڈال کر خود اپنی زندگی ختم کر دی تو یہ اجتماعی خودکشی نہیں قومی خودکشی نہیں بلکہ انسانیت کی خودکشی ہے یہ پورے ملک کی خودکشی نہیں پوری دنیا کی خودکشی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی غیرت کا امتحان

تو میرے دوستو اور بھائیو! آپ نے تقریریں اور تجویزیں سنیں آپ نے خطرے سنے اور خطروں کا علاج سنا اب بات یہ ہے کہ کیا دنیا میں کوئی غیرت دار انسان تو الگ ہے کوئی انسان بھی اس کا تصور کر سکتا ہے کہ ایک پوری کی پوری ملت جس نے ہندوستان میں انسانیت اور

اسلام کا پیغام پہنچایا آدمی بنایا اور جس نے توحید کا سبق سکھایا اور جس نے آدمی بن کر زمین پر چلنا سکھایا وہ ملت محض اپنے موہوم خطروں کی وجہ سے اور حقیر فائدوں کی وجہ سے اجتماعی خودکشی اور ملی خودکشی کا ارتکاب کرے۔

ذاتی مفاد کی ترجیح کا رجحان خطرناک ہے

آج مسلمانوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ خطرے کو سمجھتے ہوئے بھی اپنے ذاتی مفادات او مصلحتوں کو اور آرام اور تن آسانی اور تھوڑی سی آمدنی کو اور تھوڑے سے کیری اور مستقبل کو ترجیح دیتے ہیں یعنی مسلمانوں کے ایمان کی کمزوری یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ یہ خطرہ نہیں برداشت کر سکتے کہ باپ جاکر کے اسکول میں کہہ دے کہ میرا بچہ اردو کے ذریعے سے تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے یا اردو پڑھنا چاہتا ہے اس کے اردو پڑھانے کا انتظام کیا جائے اس لئے کہ وہ خود تیار نہیں ہے اس کا ضمیر تیار نہیں ہے وہ کہتا ہے کہ میرا بچہ اگر ہندی چھوڑ کر اردو پڑھے گا تو اس کا مستقبل روشن نہیں ہے اور وہ اس کیریئر کو حاصل نہیں کر سکتا وہ اپنے ان ساتھیوں سے جو ہندی کے ذریعہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں یا ہندی ہی پڑھ رہے ہیں ان کے مقابلہ میں پیچھے رہ جائے گا او اس کو بڑی نوکری نہیں ملے گی۔ آپ بتایئے کیا ایمان کے ساتھ یہ بات جمع ہو سکتی ہے۔

غیرت ایمانی کا تقاضا

میں نے صبح کہا تھا کہ ایمان کا تو ادنیٰ تقاضا ہے کہ اگر مسلمان خواب میں بھی سوتے سوتے دیکھے کہ میرے بچے نے اسلامی اصطلاح کے بجائے غیر مسلموں کی کوئی اصطلاح استعمال کی ہے اور کوئی لفظ بول دیا ہے جیسے تبرک کے بجائے کہا پرشاد دیجئے اور میلاد نہیں سمجھتا۔ سیرت کے جلسے نہیں سمجھتا کتھا سمجھتا ہے اور فلاں کا انتقال ہو گیا کے بجائے دیہانت کا لفظ بولتا ہے تو اگر کوئی مسلمان سوتے سوتے بھی یہ خواب دیکھے اور خواب میں تو آدمی سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ او پروا بھی نہیں کرتا لیکن ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اگر وہ اپنے بچہ کی کوئی ایسی آواز سن لے تو چیخ کے اور رو کر کے وہ اٹھے بھاگے اور دوڑے اور سارا گھر پریشان ہو جائے کہ کیا بات ہے۔ یہ مصیبت آئی، سانپ نے کاٹ لیا بچھو کہیں اسکے بستر میں تھا اس نے ڈنک مار دیا کیا؟ تو مسلمان کہے کچھ نہیں ہوا۔ میں نے خواب میں دیکھا اور ظاہر ہے کہ خواب میں آدمی

سب کچھ دیکھتا ہے وہ ہوتا نہیں لیکن

عشق است و ہزار بدگمانی

جب کسی چیز سے محبت ہوتی ہے اور جب کسی چیز کی اہمیت ہوتی ہے تو آدمی اس کے خیال سے بھی پریشان ہو جاتا ہے اور کہیں اس کا وہم بھی آجائے تو اس سے بھی اس کی چیخ نکل جاتی ہے اور اس کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔

اسلام کے لئے کسی موہوم خطرے کو بھی گوارا نہیں کرنا چاہیے

یہ تھا اسلام کا ابتدائی درجہ کہ مسلمان اپنے بچہ کے لئے موہوم سے موہوم خطرہ بھی قبول کرنے کے کو تیار نہ ہو، یعنی کفر و شرک کا بت پرستی اور عقائد کی خرابی کا خطرہ، اگر یہ بات نہیں ہے تو سچ پوچھئے تو ہمارا ایمان قابل اطمینان نہیں ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جس شخص میں یہ بات ہوگی اس نے گویا کہ ایمان کا بڑا درجہ پایا تو اس تصور سے کہ وہ پھر کفر کی طرف چلا جائے گا اور اس کا امکان ہے وہ اتنا ڈرے جتنا کہ کسی آدمیکو آگ میں جھونک دیئے جانے سے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بہت بڑا الاؤ جل رہا ہو اور اس کے لڑکے کو کوئی لے کر اس میں پھینک دے اس سے کسی ماں باپ کو جو تکلیف ہوگی اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور ماں باپ چیخنے لگیں اور ممکن ہے کہ ان کا دم نکل جائے اتنا ہی صدمہ ایک مسلمان کو اپنے بچے کے بارے میں اس خیال اور اس تصور سے کہ یہ بچہ کبھی اسلام کی دولت سے محروم ہو جائے گا۔ اور کبھی ارتداد کے راستے پر پڑ جائے گا۔ ہونا چاہیے کہ یہ ایمان کا ادنیٰ درجہ ہے۔ اور اگر یہ بھی نہیں ہے تو بھائی اپنے اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے چاہے ہم کتنی نمازیں پڑھتے ہوں اور چاہے ہم کیسی ہی مسجدیں بناتے ہوں اور چاہے ہم کتنا ہی صدقہ خیرات کرتے ہوں اور بلکہ میں آگے بڑھ کر یہاں تک کہتا ہوں کہ چاہے ہم دس دس حج کر چکے ہوں صاف صاف سن لیجئے اگر ہم نے حج پر حج کئے اور اگر ہم نے کوئی بڑا عربی کا مدرسہ بھی قائمکر دیا ہے اور ہم بڑے علماء اور اپنے بزرگوں کے بڑے معتقد بھی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہم اس کو گوارا کرتے ہیں اور اس کا امکان ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا بچہ اسلام سے بالکل محروم ہو جائے گا کوئی حرج نہیں اس کو بڑی تنخواہ ملے گی وہ بڑے عہدے پر ہوگا تو دین کے ایک طالب علم کی حیثیت میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ یہ حج قیامت کے دن کام نہ آئیں گے اور آپ کو بخشوا نہیں سکیں گے۔

جسمانی موت کے بجائے روحانی موت خطرناک ہے

آپ فرض نمازیں پڑھیں آپ پانچوں وقت کی فرض نمازیں پڑھیں اور سنت مؤکدہ کو ادا کرلیں اور اگر آپ پر حج فرض ہے تو ایک مرتبہ آپ حج کرلیں اور اگر زکوٰۃ آپ پر فرض ہے تو آپ زکوٰۃ دے دیں اس کے بعد آپ سے کوئی نفلی کام نہ ہوتا ہو آپ کوئی تسبیح نہ پڑھتے ہوں صاف صاف کہتا ہوں اور دین کے ایک نمائندے کی حیثیت سے آپ سے کہتا ہوں لیکن آپ کے دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہو کہ سب کچھ گوارا ہے یہاں تک ایمان کے تقاضے پر لڑکے کی موت بھی گوارا ہے بہت مشکل سے بہت ہی ناگواری کے ساتھ یہ سخت الفاظ ادا کررہا ہوں لیکن مجھے دین کا جو تھوڑا سا فہم ہے وہ مجھ سے کہلوا رہا ہے اور وہ تھوڑی سی امانت جو میرے سینے میں ہے وہ بلوا رہی ہے تو میں کہتا ہوں کہ اسلام کی علامت یہ ہے کہ آدمی اپنے بچہ کی موت کو اس کی جسمانی موت کو اس کی روحانی موت پر ترجیح دے وہ کہے کہ چار مرتبہ اور دس مرتبہ اس پر جسمانی موت طاری ہو جائے لیکن ایک مرتبہ بھی اس پر اعتقادی موت' معنوی موت' انسانی موت طاری نہ ہو جس کی وجہ سے وہ ابدالآباد تک جہنم میں جلتا اور پھنکتا رہے گا اور اس پر عذاب ہوگا۔ بڑے سخت لفظ ہیں۔ بڑی مشکل سے میری زبان سے ادا ہوئے ہیں آپ سے معافی چاہتا ہوں بچوں والی ماؤں سے معافی چاہتا ہوں اور صاحب اولاد والدین سے معافی چاہتا ہوں۔ مگر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی یہ دعا کرے کہ اے اللہ اگر ایمان سلامت رہنا ہے اگر اس بچے کو اسلام کے راستے پر چلنا ہے اگر اس کو کل حشر کے دن اللہ کے رسول کے سامنے مسلمان بن کر کھڑا ہونا ہے اور ان کی شفاعت کا مستحق ہونا ہے تو اس کو زندہ رکھ ورنہ اس کو دنیا سے اٹھالے یہ ہے ایمان کا تقاضا۔

ہماری ایمانی حالت قابل تشویش ہے

مگر ہم کس حالت میں ہیں اتنا سا خطرہ ہم نہیں برداشت کر سکتے کہ ہمارے لڑکے کو دو ہزار تنخواہ کے بجائے ڈیڑھ ہزار تنخواہ ملے اردو سے ہم بیزار ہیں اردو سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ دینیات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ نماز روزے سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ بنیادی عقائد جو ہیں خدا کی وحدانیت اور توحید اور رسول کی رسالت اور قیامت اور حشر پر ایمان کسی چیز پر ہمیں

وابستگی نہیں ہے ہمیں اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ بس ہمارا بچہ پڑھ لکھ جائے کسی عہدے پر پہنچ جائے حالانکہ اس کے بعد وہ ماں باپ کی کتنی خدمت کرتا ہے اور اس نے کتنا سبق سیکھا تھا۔ ماں باپ کی خدمت کرنے کا آپ نے اس کے دین کو داؤ پر لگایا کہ ہمارے کام آئے اور وہ آپ کو ٹھوکر مارتا ہے اور لات مارتا ہے

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم!

نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

یاد رکھیے! اگر آپ نے اپنے لڑکے کی دنیا کو اس کے دین پر ترجیح دی تو اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کی زندگی میں دکھا دے گا کہ آپ ترسیں گے۔ اس کے ایک ایک پیسے کو آپ ترسیں گے اس کی روٹی کے ٹکڑے کو آپ ترسیں گے اس کے ایک سلام کو کہ وہ آپ کو سلام کرے یہ خدا کی طرف سے فوری اور پہلی سزا ہے جو دنیا میں ملتی ہے اور جو سزا وہاں ملے گی قرآن نے اس کی بھی وضاحت کردی ہے کہ وہ اولاد یہ کہے گی کہ:

ربنا انا اطعنا سادتنا و کبراءنا فاضلونا السبیلا ربنا اٰتهم ضعفین من العذاب والعنهم لعناً کبیرا۔

سورہ احزاب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قیامت کے دن ایک نسل کی نسل کھڑی ہوگی اولادوں کی' بچوں کی ایک پلٹن کیا معنی دنیا ہوگی وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے بڑوں کی' اپنے سرداروں کی' اپنے ماں باپ کی بات مانی بات ماننے کا کیا مطلب ہے؟ جس راستے پر لگایا ہم لگ گئے تو انہوں نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ ہم دین سے محروم ہو گئے' اے اللہ ان کو دوگنا عذاب دے اور اچھی طرح آسمان سے ان پر لعنت کی بارش برسا۔

صاف صاف آپ کو بتا رہا ہوں کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ بچے کی فاقہ کشی بچے کا کچھ نہ ہونا' بچے کی جیب کا بالکل خالی ہونا' اس کا کسی طرح کی عزت و دولت سے محروم رہنا گوارا بلکہ دل سے گوارا اور شکر کے ساتھ گوارا ہو۔ اور یہ گوارا نہ ہو کہ وہ ایمان کی دولت سے محروم ہو جائے اور وہ ارتداد کے راستے پر پڑ جائے دیومالا کے چکر میں پھنس جائے' صاف صاف شرک و بت پرستی پر اس کا یقین ہو جائے۔ اگر یہ نہیں ہے تو اپنے ایمان کی خیر منایئے اور پوچھئے عالموں اور مولویوں

ہے کہ ایمان رہا یا نہیں رہا؟

صحابہ کرامؓ کے ایمان و عمل کے اعلیٰ معیار کی ایک مثال

میں اپنی ماؤں اور بہنوں سے کہتا ہوں کہ حضرت خنساءؓ نے جن کے کئی کئی بیٹے تھے سب کو بلا کر کہا لڑائی اور جنگ ہو رہی ہے مسئلہ نوکریوں کا نہیں ہے مسئلہ کھانے پینے کا نہیں ہے مسئلہ ہے جان کا جن کے لئے راتوں کو مائیں نیندیں حرام کرتی ہیں اور لئے لئے پھرتی ہیں اور کھانا پینا بھول جاتی ہیں اس اللہ کی بندی اور مومنہ نے اپنے جوان لڑکوں کو بلایا اور کہا کہ دیکھو میں نے تم کو پالا تھا اس دن کیلئے اب وقت آگیا ہے کہ تم اسلام پر جان دو اللہ کا نام لو اور میدان میں جاؤ اس کے بعد ان لڑکوں کو رخصت کیا گویا کفن پہنا کے رخصت کیا۔ اس کے بعد خبر آتی ہے ایک ایک کی شہادت کی۔ جب آخری لڑکے کی شہادت کی خبر آئی تو کہا

الحمد لله الذی اکر منی بشہادتہم۔

میں اس خدا کی شکرگزار ہوں جس نے میرا مرتبہ بڑھایا ان کی شہادت سے اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھئے کس میں ہے یہ ہمت آج اس کا موقع نہیں آج یہ نہیں کہا جا رہا ہے کہ بچوں کو میدان جنگ کیلئے رخصت کیجئے کہاں ہو رہی ہے جنگ اور کہاں اس کا موقع لیکن یہ کیا کہا جا رہا ہے کہ بچوں کے ایمان بچانے کے لئے کچھ قربانی دیجئے کچھ ذرا سا ایمان کا مظاہرہ کیجئے کچھ ایمان کا وہ آپ ثبوت دیجئے کہ اگر چہ معاشی خطرہ ہو عزت کا خطرہ ہو اور اس ملک میں کون سی عزت اس ملت کو حاصل ہے کہ جس میں کوئی بڑا فرق پڑ جائے گا آج کون سا بڑے سے بڑا معزز فرد آپ کے یہاں معزز ہے۔ ملتیں عزت پاتی ہیں کسی اور چیز سے خالی ایک نائب صدر جمہوریہ ہو جائے اور کوئی کبھی صدر جمہوریہ بھی ہو جائے تو اس سے ملت کو عزت نہیں ملا کرتی۔ تو وہ کون سی عزت ہے جس میں فرق پڑنے کا اندیشہ ہے اور افراد کی عزت کوئی حیثیت نہیں رکھتی جب جماعت معزز ہوتی ہے تو افراد بھی معزز ہوتے ہیں انگریز یہاں جب صاحب اقتدار تھا تو اس کی فوج کے گورے جن کو ہم لوگ بچپن میں کہا کرتے تھے کہ یہ صاحب لوگ ہیں آج انہیں کوئی پوچھتا بھی نہیں کہاں گئے وہاں انگریز جن کا وہ کروفر تھا کچھ کروفر نظر نہیں آتا۔ لیکن جب یہاں ان کا اقتدار تھا تو ایک معمولی سا ایک تھوڑی سی تنخواہ پانے والا ایک گورا جس کو دو حرف انگریزی کے پڑھنے نہیں آتے تھے وہ بھی بادشاہ بنا ہوا تھا۔ ملتوں کو عزت ملتی ہے ان کے

کردار سے ان کی قربانیوں سے ان کی طاقت وحکومت سے وہ کون سی عزت ہے جس کو بڑا بٹہ لگ جائے یا بڑا فرق آ جائے گا یہ کہ لڑکا فورا کمپٹیشن میں آ جائے آئی اے ایس میں آ جائے۔ پولیس میں آ جائے اس خطرہ کو بھی اور اس میں ذرا سا بھی کچھ فرق پڑتا ہو اس کو اگر آپ نہ برداشت کر سکیں تو پھر وہ ایمان کہاں ہے؟ پھر تو ایمان خالی اس کے لئے ہے کہ آپ ایمان کا دعویٰ کرتے رہیں اور ایمان ایمان کہتے رہیں۔

کم ازکم ایمان کا ادنیٰ تقاضا پورا کریں

مسئلہ یہ ہے کہ اپنے بچوں کے ایمان کو بچانے کیلئے آپ کہاں تک ان تجاویز پر عمل کریں گے۔ اور کہاں تک آپ اس دینی تعلیمی کونسل اور اپنے اپنے ضلع کی انجمن تعلیمات دین کی دعوت بلکہ اس کی درخواست کو قبول کریں گے۔ بس یہ ہے اور میں اسی پر ختم کرتا ہوں زیادہ گنجائش نہیں ہے تقریر کی اور یہ بھی جو کچھ میں نے کہا یہ بھی ایک جذبے نے کہلوایا۔ ورنہ وقت میں نہ اس کی گنجائش ہے اور نہ میری صحت ہی اس کی متحمل ہے کہ ہماری مائیں، بہنیں اور خواتین جو پس پردہ ہیں وہ اور جو بھائی سامنے بیٹھے ہوئے ہیں وہ فیصلہ کریں اور یہ بات اپنے دل میں لے کر جائیں یہاں سے آج صبح سے جو کانفرنس ہو رہی ہے اور مجلسیں ہو رہی ہین ان سب کا پیغام یہی ہے کہ ایمان کی قدر کریں، ایمان کی قیمت پہچانیں ایمان کا بالکل ابتدائی اور ادنیٰ تقاضا پورا کریں وہ یہ کہ ہر قیمت پر اپنی اولاد کے ایمان کو بچانا ہے اور اپنی نسل کو مسلمان رکھنا ہے اس کے لئے جو بڑے سے بڑا مطالبہ ہو اسے ہر حال میں پورا کریں۔

سنت یعقوبی کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے

ایک بات جو اصل لب لباب اور نچوڑ ہے ساری باتوں کا وہ یہ ہے کہ ہر حال میں اپنی آئندہ نسل اور بچوں کی شکل میں اللہ نے آپ کو جو نعمت عطا فرمائی ہے اللہ کی اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ ان کو اسلام پر قائم رکھنے کی آپ پوری کوشش کریں۔ دعا کریں جدوجہد کریں، قربانی جو دینے کا وقت آئے تو قربانی دیں اور کم سے کم اپنے ارادے سے اور اپنی مرضی سے انہیں اسلام سے ناآشنا نہ ہونے دیں۔ اس کے بعد ان کی قسمت اور اللہ کا ارادہ وہ غالب ہونے والا ہے اور اللہ کا فیصلہ ہی اصل ہے جسے نہ آپ روک سکتے ہیں اور نہ ہم روک سکتے ہیں اور جب نبی نہیں

روک سکے وہ ایک اپنے والد کو راستہ پر نہ لاسکے اور ایک اپنے بیٹے کو اسلام کے سایہ میں نہ لا سکے تو ہم اور آپ کیا ہوتے ہیں یہ تو ہے اللہ تعالیٰ کا منشاء اور اس کی مرضی۔

لیکن ہمارے آپ کے کرنے کا کام یہ ہے کہ جو کچھ بھی ہم سے ہو سکے گا ہم اپنی پوری طاقت اس پر لگا دیں گے کہ ہمارے جیتے جی یہ خطرہ نہ ہو جیسے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے انتقال سے پہلے اپنے بچوں، پوتوں اور نواسوں کو جمع کیا اور کہا کہ اے میرے بیٹو! یہ بتاؤ کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟

ام کنتم شهداء اذحضر یعقوب الموت اذ قال لبنیه ماتعبدون من بعدی. قالوا نعبد الهک واله ابائک ابراهیم و اسمعیل واسحق الها واحدا ونحن له مسلمون.

کیا تم خود (اس وقت) موجود تھے جس وقت یعقوب علیہ السلام کا آخری وقت آیا (اور) جس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ تم لوگ میرے (مرنے کے بعد) کس چیز کی پرستش کرو گے۔ انہوں نے (بالاتفاق) جواب دیا کہ ہم اس کی پرستش کریں گے جس کی آپ اور آپ کے بزرگ (حضرت) ابراہیم واسماعیل واسحاق پرستش کرتے آئے ہیں یعنی وہی معبود جو وحدہ لاشریک ہے اور ہم اس کی اطاعت پر (قائم) رہیں گے۔ (البقرہ رکوع ۱۶)

دیکھو میرے بیٹو! اے میرے پوتو! اے میرے نواسو! میری پیٹھ قبر سے نہیں لگے گی زمین سے نہ لگے گی جب تک کہ مجھے یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ میرے بعد تم کس راہ پر چلو گے؟ اور کس کی تم عبادت کرو گے۔

ماتعبدون من بعدی؟قالوا نعبد الهک واله ابائک ابراهیم و اسماعیل و اسحٰق الها واحدا ونحن له مسلمون.

وہ نبی کی اولاد تھی۔ انہوں نے کہا کہ ابا جان، دادا جان، نانا جان آپ کیوں گھبرا رہے ہیں آپ نے جو ہمیں سبق پڑھایا ہے اس کو ہم لوگ بھولیں گے نہیں ہم آپ کے اور آپ کے والد حضرت اسحاق آپ کے چچا حضرت اسمٰعیل اور آپ کے دادا حضرت ابراہیم کے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں گے۔ اور اسی خدائے واحد کی ہم پرستش کریں گے۔ تب جا کر حضرت یعقوب علیہ السلام کو اطمینان ہوا کہیں انہوں نے یہ نہیں کہا کہ دیکھو بیٹو! فلاں جگہ میں نے پیسے

گار دیئے تھے فلاں پر میرا اتنا قرضہ ہے فلاں جگہ اتنی زمین چھوڑ کر جارہا ہوں اتنے کھیت چھوڑ کر جارہا ہوں یہ تم سب لے لینا یہ بھی نہیں کہا کہ محبت اور اتحاد کے ساتھ رہنا۔ جیسے بہت سے مشفق باپ کہتے ہیں کچھ نہیں کہا ایک بات کہی کہ ماتعبدون من بعدی؟ یہ نبی کا اسوہ ہے اور یہی ہمیں تعلیم دی گئی ہے بس میں اس پر ختم کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان کی قدر نصیب فرمائے اور ان خطروں کا احساس کہ جو اس کے نہ ہونے سے اللہ اور رسولؐ نے بیان کئے ہیں اور قرآن میں صاف صاف کہہ دیا گیا ہے۔

یاایھا الذین امنو اقوا انفسکم واھلیکم نارا وقودھا الناس والحجارة علیھا ملائکه غلاظ شداد لایعصون الله ماامر ھم ویفعلون مایومرون.

اے ایمان والو! تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو (دوزخ کی) اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن (اور سوختہ) آدمی اور پتھر ہیں جس پر تندخو (اور) مضبوط فرشتے (متعین) ہیں جو خدا کی (ذرا) نافرمانی نہیں کر سکتے۔ کسی بات میں جو ان کو حکم دیتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو (فوراً) بجالاتے ہیں۔ (پ۲۸ التحریم رکوع ۲)

اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جان کو بھی اور اپنے گھر والوں کو بھی ایسے دوزخ کی آگ سے کہ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو توفیق دے کہ ایمان کی جو دولت محض اپنے فضل اور بندہ نوازی سے اپنے نبیوں اولیاء اللہ اور اپنے مقبول بندوں کے ذریعہ بغیر محنت کے نصیب فرمادی ہے ہم اس کو قائم رکھیں اور اپنی زندگی میں بھی اور اپنی اولاد کے لئے بھی ہم اس کو محفوظ کر جائیں اپنی حد اور اپنی دانست تک اس کے بعد اللہ کو جو منظور ہے وہ ہوگا اللہ ہمارے ایمانوں کی حفاظت فرما اور ہمیں جب تک زندہ رکھ اسلام کے صراط مستقیم پر قائم رکھ اور جب اٹھا دنیا سے تو ایمان کے ساتھ اٹھا اور ہمارے بچوں کو بھی اے اللہ ایمان سے وابستہ رکھ اور اس راستے پر چلاتا رہ جو تیرے پیغمبرؐ نے بتایا اور جو تیرے نبیؐ لے کر آئے اور ایمان کے ساتھ ان کو دنیا میں بھی قائم رکھ اور ایمان کے ساتھ ان کو اٹھا بھی اور ایمان کے ساتھ ان کا حشر بھی فرما۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم.

ایمان اور اس کی قیمت

یہ تقریر تحتی مہاجرین نے ایک اجتماع میں ۱۳؍اکتوبر کو بعد نماز ظہر عیدگاہ میدان کی مسجد میں کی گئی۔ جس میں مسلمانوں کو ایمان کی حقیقت سے روشناس کرایا گیا ہے۔

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نو من به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سيا ت اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضلل الله فلا هادی له ونشهد ان لا اله الا الله وحد ه لاشريک له و نشهد ان سيد نا ومولانا محمداً عبده و رسوله صلى الله تعالىٰ عليه و علىٰ آله واصحابه اجمعين اما بعد فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم۔

فاستجاب لهم ربهم انی لا اضيع عمل عا مل منکم من ذکر او انثیٰ بعضکم من بعض فالذين هاجروا واخر جوا من ديار هم واوذو فی سبيلی و قتلوا و قتلوا لا کفرن عنهم سياتهم ولا دخلنهم جنت تجری من تحتها الانهار ثوابا من عند الله ، والله عنده حسن الثواب.

تو ان کے پروردگار نے ان کی توبہ قبول کرلی (اور فرمایا) کہ میں کسی عمل کرنے والے عمل کو مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کرتا، تم ایک دوسرے کی جنس ہو تو جو لوگ میرے لئے وطن چھوڑ گئے ،اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور لڑے اور قتل کئے گئے میں ان کے گناہ دور کردوں گا اور ان کو بہشتوں میں داخل کردوں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (یہ) خدا کے یہاں بدلہ ہے اور خدا کے یہاں اچھا بدلہ ہے۔

وطن مانوس چیزوں کا مجموعہ ہے

میرے عزیز بھائیو! مجھے بڑی خوشی ہے کہ میں آج اپنے مہاجر بھائیوں سے ایک جگہ مل رہا ہوں ،یہ ملاقات تمام سیاسی، معاشی، علمی اغراض ومفادات سے بالکل الگ ہوکر اللہ اور اس

کے رسول کی محبت اور اسلام کے رشتہ سے ہے اور یہ موقعے قسمت سے نصیب ہوتے ہیں۔
بھائیو! وطن کیوں وطن ہوتا ہے اور فارسی کے ایک شاعر نے کیوں کہا ہے؟

خاک وطن از ملک سلیمان خوشتر
خار وطن از سنبل و ریحان خوشتر

وجہ یہ ہے کہ وطن مانوس چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، جن جن چیزوں سے آدمی کو انس ہوتا ہے وہاں سب جمع ہوتی ہیں وہاں اس کا بچپن گزرتا ہے، جوانی کے دن بیتے ہوتے ہیں وہاں کی پیدائش ہوتی ہے، وہاں کی گلیوں میں وہ چلا پھرا ہوتا ہے، وہاں کے باغوں، اور وہاں کی گلیوں میں کھیلا ہوتا ہے وہ وہاں کے ذرہ ذرہ چپے چپے کو پہچانتا ہے اور اسے اس کو انس ہوتا ہے۔ اور پھر وہاں اس کے اسلاف دفن ہوتے ہیں، وطن اور پردیس میں یہی فرق ہے کہ وطن میں اسباب انس اور انس کے مرکز بڑی تعداد میں جمع ہوتے ہیں، اس لئے حضرت بلالؓ جب مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کر گئے، وہاں ان کے محبوب بلکہ محبوب رب العالمین موجود تھے اللہ نے ان کو ایسی عزت بخشی کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی مسجد کا مؤذن بنادیا لیکن کبھی کبھی وہ بھی کہہ اٹھتے تھے۔

الا لیت شعری ھل ابیتن لیلۃ
بواد وحولی اذخر و جلیل

(کیا کوئی ایسی رات بھی آئے گی کہ میں ایک ایسی وادی میں رہوں گا جہاں میرے گرد و پیش مکہ کی گھاس پھوس ہوگی)

ایمان کی حفاظت کیلئے ہر چیز کو قربان کرنے کی ضرورت

میرے بھائیوں خود حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ہجرت میں مکہ سے چلتے وقت بیت اللہ کی طرف سر اٹھا کر فرمایا کہ میں تجھ کو کبھی نہ چھوڑتا، لیکن یہاں کے لوگ مجھے نکالتے ہیں اور یہاں دین پر قائم رہنا مشکل ہے۔

لیکن اس کے باوجود اللہ کے بندوں نے دین کی خاطر ایسے عزیز وطن کو خیر باد کہا، بہت سے لوگوں نے عمر بھر کا جمع کیا ہوا سرمایہ اور زندگی بھر کی پونجی چھوڑی اور اپنے بال بچوں کو بھی خیر آباد کہا، حضرت ابوسلمہؓ جب ہجرت کرنے کیلئے نکلے تو ان کے ساتھ ان کی رفیقۂ حیات تھیں

(جو بعد میں امہات المومنین میں شامل ہوئیں) ام سلمہؓ کے قبیلہ بن المغیرہ نے حضرت ابوسلمہؓ کے اونٹ کی نکیل پکڑ کر کہا کہ تم کہاں جارہے ہو؟ تم نے اپنا دین بدلنے کا فیصلہ کرلیا ہے لیکن ہماری بچی کو تم کیسے لے جاسکتے ہو۔ یہ تو ہماری بیٹی ہے انہوں نے کہا کہ اگر میں اس کو چھوڑ دوں تو تم لوگ مجھے جانے دوگے؟ انہوں نے کہا ہاں جانے دیں گے، ابوسلمہؓ نے بیوی کو سلام کیا اور کہا خدا کے حفظ وامان میں تمہیں اور بچہ کو دیا، میں تو ایمان بچانے کیلئے جارہا ہوں مجھے ایمان تم سے زیادہ پیارا ہے، انہوں نے بھی خوشی سے کہا خدا حافظ! اگر اللہ کو بلانا منظور ہے تو پھر ملیں گے۔ حضرت ام سلمہؓ کی گود میں بچہ تھا، ابوسلمہ کے قبیلہ بنوالاسد کے لوگ آگئے، انہوں نے کہا کہ ہم اپنے قبیلہ کے بچہ کو ماں کے پاس رہنے نہیں دیں گے، انہوں نے اس معصوم کو اس زور سے چھینا کہ اس کا ہاتھ اتر گیا۔ اور وہ اس کو لے کر چلتے بنے، اس کے بعد ام سلمہؓ کا حال یہ تھا کہ جہاں سے ان کی جدائی ہوئی تھی، وہاں آکر اس واقعہ کو یاد کرکے روتی تھیں۔ اس پر ایک سال بیت گیا، آخر ان کے قبیلہ کے ایک شریف طبیعت آدمی کو ترس آگیا اس نے کہا کہ یہ بے زبان عورت یہاں آکر روتی ہے، آنسو بہاتی ہے، اپنے شوہر کو یاد کرتی ہے، آخر یہ کیا ظلم ہے یہ کیا سنگدلی ہے، ایک بھلا مانس اور خدا کا شریف بندہ تیار ہوا اور کہا کہ بہن ہم تمہیں مدینہ پہنچا دیں گے، بنوالاسد کو بھی رحم آیا اور بچہ کو ماں کے حوالے کیا وہ کہتی تھیں کہ ایسا شریف آدمی تھا کہ مجھ کو کوئی ضرورت ہوتی تھی تو خود پہلے اتر جاتا تھا اور الگ ہوجاتا تھا اس نے راستہ بھر میری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

اس کے بعد پھر صہیب رومی کا واقعہ یاد کیجئے وہ مکہ کے بہت بڑے کاریگر اور دستکار تھے جب وہ چلنے لگے تو کفار نے ان کا راستہ روک دیا، انہوں نے کہا کہ صہیب تم کہاں جارہے ہو؟ کہا بھائی ہم دین وایمان بچانے کیلئے جارہے ہیں جہاں اللہ کا نام آزادی کے ساتھ لے سکیں، وہاں ہم چلے جائیں گے ان لوگوں نے کہا اچھا تم مدینہ جاسکتے ہو، لیکن تم نے ہمارے شہر میں رہ کر جو کمائی کی ہے اس کو تمہیں لے جانے کا کیا حق حاصل ہے یہ ہمارا مال ہے تم نے یہاں رہ کر حاصل کیا اور کمایا اب تم تو جارہے ہو مگر ہم تم کو یہاں کا پیسہ لے جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ انہوں نے کہا تمہارا مال تم کو مبارک ہو، میں اپنی جھولی خالی کرکے سب تم کو دے جاؤں، تب تو تم خوش ہو؟ انہوں نے کہا ہاں، کہا یہ لو" لے جاؤ"! تمام پونجی دے کر اللہ کا شکر ادا کرتے

ہوئے وہاں سے چلے گئے جضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
نے فرمایا صہیب نے بڑی کمائی کی ،وہ نقصان میں نہیں رہے۔

راہ خدا میں سر دھڑ کی بازی لگانے کی ضرورت

آپ سب جانتے ہیں کہ دین وایمان کیلئے پہلے لوگوں نے جان دی، جان سے بڑھ کر کوئی چیز قیمتی نہیں اس کے بعد وطن چھوڑا، دولت چھوڑی، اور بہت سے لوگوں نے حکومت بھی چھوڑی ہے، ایسے اللہ کے بندے بھی گزرے ہیں جو ولی عہد تھے، شہزادہ تھے، ان کو امارات وریاست حاصل تھی ،لیکن ان کا دل مطمئن نہیں تھا وہ سمجھتے تھے کہ اس میں بہت غلط کام کرنے پڑتے ہیں، ہمیں آخرت کی جو تیاری کرنی چاہئے وہ تیاری یہاں رہ کر نہیں ہوسکتی، حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کا نام آپ نے سنا ہوگا ، وہ بھی ایسے ہی تھے اور کئی ایسے بزرگ تھے، رکن الدین علاء الدولہ سمنانی، سید اشرف جہانگیر سمنانی بھی ایران میں امرات وریاست کے مالک تھے ،اوراس کو لات مارکر آئے اور راہ خدا میں نکل کھڑے ہوئے ،اور کہا کہ ہم معرفت حاصل کریں گے اور اسکی رضا کیلئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔

بھائیو! آپ لوگوں نے اپنا وطن چھوڑا، آپ کو مبارک ہو، اللہ تعالیٰ اصل میں یہ دیکھتا ہے کہ میرے بندے نے کس چیز کو کس کیلئے چھوڑا ہے، چیزوں کو چھوڑنے والے تو دنیا میں بہت ہیں، ہم آپ صبح وشام روزانہ اخذ وترک کا یہ عمل کرتے رہتے ہیں، مثلاً آپ بازار گئے، آپ نے کوئی سودا خریدا، آپ نے کچھ پیسے چھوڑے ،لیکن آپ نے کچھ پیسے دیئے ترکاری لی، آپ نے دام دیکر کپڑا خریدا، دفتر جاکر کوئی کام کرایا یہ چھوڑنے اور لینے کا معاملہ تو انسان کی زندگی میں صبح شام ہوتا رہتا ہے۔لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کسکو چھوڑا اور کس کے لئے چھوڑا؟ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھتا ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی ہاجرۃ اور اپنے شیر خوار بچہ اسماعیل علیہ السلام کو مکہ میں چھوڑ کر چلنے لگے، حضرت ہاجرۃ نے کہا ہم کو کس پر چھوڑ کر جارہے ہیں؟ کہا اللہ نے حکم دیا ہے، حضرت ہاجرہ نے کہا کہ پھر ہمیں کوئی فکر نہیں ، اگر اللہ کے حکم سے ہم کو چھوڑ کر جارہے ہیں تو ہمیں کوئی ڈر نہیں ہے، دیکھئے اللہ نے اس عمل کو کیسا قبول کیا کہ ساری دنیا وہیں جاتی ہے، اور کتنے شوق سے جاتی ہے، اڑ کر جانا چاہتی ہے، چاہتی ہے کہ پر لگ جائیں اور ہم وہاں پہونچ جائیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنا وطن چھوڑ کر حضرت ہاجرہ علیھا السلام کو وہاں

لے گئے تھے، تو اللہ تعالیٰ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو وہاں لے جاتا ہے، اور وہاں دوڑاتا ہے، پھراتا ہے، حضرت ہاجرہ علیہا السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے پانی کی تلاش میں صفا سے مروہ تک اور مروہ سے صفا تک دوڑی تھیں، تو اللہ تعالےٰ بڑے بڑے سلطان وقت اور امام عصر کو بھی وہاں دوڑاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہاجرہ کی یہ ادا ہمیں پسند آئی، اس لئے تم بھی اسی طرح وہاں دوڑو، جہاں وہ تیز چلنے لگی تھیں، وہاں حکم ہوا کہ تیز چلو، جہاں وہ آہستہ چلیں تمہیں وہاں حکم ہوا کہ آہستہ چلو، آپ میں سے جو لوگ وہاں گئے ہیں، وہ یہ منظر دیکھ چکے ہیں۔

میرے بھائیو! دیکھنے کی اصل چیز یہ ہے کہ کیا چیز چھوڑی اور کس کے لئے چھوڑی؟ کیا چھوڑا، اس کی اہمیت تو ایسی نہیں ہے، لیکن کس کے لئے چھوڑا اس کی اہمیت بہت ہے، میری محبت میں چھوڑا، میرے نام پر چھوڑا، اللہ کو اس پر پیار آتا ہے، اگر سلطنت چھوڑی لیکن کسی اور مقصد کے لئے چھوڑی تو اللہ کے یہاں اس کی قدر نہیں، اگر پیسہ چھوڑا لیکن اللہ کے نام پر چھوڑا، اور اللہ کی محبت میں چھوڑا، تو اللہ کے یہاں اس کی بڑی قدر ہے، تو اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ آپ نے اپنا وطن کس چیز کے لئے چھوڑا؟ ہم کو جہاں تک معلوم ہے، آپ نے اپنا ایمان بچانے کے لئے چھوڑا، اور ایمان ایسی چیز ہے کہ آدمی کو دور سے بھی دھوکا ہو کہ ایمان کیلئے خطرہ ہے تو وہ چیخ مار کر رونے لگے، حدیث میں آتا ہے کہ تین باتیں وہ ہیں کہ اگر آدمی ان کو جمع کر لے تو اس نے ایمان کی صفات کو جمع کر لیا، اس میں سے ایک یہ ہے "من یکرہ ان یعود الی الکفر کما یکرہ أن یقذف فی النار" اس تصور سے کہ میں کفر کی طرف لوٹ جاؤں، اسے ایسی وحشت ہو کہ جیسے اس کو آگ میں ڈالے جانے پر وحشت ہوتی ہے۔

آئندہ نسل کی سلامتی کے لئے لائحہ عمل

میرے بھائیوں، دوستوں! ٹورنٹو، کناڈا میں میری ایک تقریر ہندوستانی، پاکستانی مسلمانوں کے اور عربوں کے اجتماع میں ہوئی تھی، میں نے اس میں کہا، دیکھو بھائیو! اگر تم کو یہ معلوم ہو جائے کہ آئندہ ہمارے نسل کا اسلام پر باقی رہنا مشکوک ہے، اور اس کا ایمان خطرہ میں ہے تو میں تم کو فتویٰ دیتا ہوں کہ چاہے تم کو اپنے وطن تک پیدل جانا پڑے تم کو یہاں سے چلا جانا چاہئے، ساری ملازمتیں، عہدے اور ساری ترقیاں چھوڑ کر تم کسی اسلامی ملک کی طرف کوچ کرو اور چلے جاؤ، ہم تو مسلمان ہیں، جیسے ہمارے عزیز نے بیان کیا، لیکن آئندہ نسلوں

کے بارے میں اطمینان نہیں، ہمارے بیٹے، پوتے بھی اسلام پر قائم رہیں گے، یا نہیں؟ اب اگر تم کو خطرہ ہو کہ تمہاری اولاد، خدانخواستہ ارتداد میں مبتلا ہو جائیں گی تو تمہارے لئے وہاں رہنا حرام ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

ان الذین توفٰھم الملئکة ظالمی انفسھم قالوا فیم کنتم قالوا کنا مستضعفین فی الارض، قالو ا ا لم تکن ارض اللہ واسعة فتھا جروا فیھا

جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں، جب فرشتے ان کی جان قبض کرنے لگتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے، وہ کہتے ہیں کہ ہم ملک میں عاجز وناتواں تھے، ن فرشتے کہتے ہیں کیا خدا کا ملک فراخ نہیں تھا؟ کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے

آگے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فائولٰئک مأوٰی ھم جھنم وسآء ت مصیراً (النساء۔۹۷)

ایسے لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ بری جگہ ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ میری اس بات کو انھوں نے آج تک یاد رکھا ہے، وہاں سے جو لوگ آتے ہیں، کہتے ہیں کہ آپ کی وہ تقریر ہمارے کانوں میں آج تک گونج رہی ہے، کسی نے سنایا کہ جنوبی افریقہ میں ہم موٹر پر جا رہے تھے، لوگوں نے ٹیپ ریکارڈ چالو کر دیا، ٹیپ پر آپ کی آواز تھی، اور آپ کہہ رہے تھے کہ "اگر یہاں تمہاری اولاد کا اور آئندہ نسل کا اسلام پر قائم رہنا مشکل ہو تو تمہارے لئے اس سرزمین پر رہنا ایک دن بھی جائز نہیں، چاہے تم پر آسمان سے سونا برسے، چاہے زمین سونا اگل دے"۔

تبتی مسلمانوں کیلئے ایک لمحہ فکریہ

اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کو اگر وہ دنیا میں نہیں ہیں تو جنت میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عنایت فرمائے، اور اگر زندہ سلامت ہیں، تو اللہ ان کی زندگی میں برکت دے، مجھے یقین ہے کہ انھوں نے تمہارے ایمان کو بچانے کے لئے اتنی بڑی قربانی دی ہے، اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی ہجرت کے عمل کو ایسا قبول کیا کہ اس کے نام سے مستقل جنتری (تقویم) قائم فرما دی، یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ کل ۱۴۰۲ھ کا پہلا دن تھا، اس سال کا پہلا دن ہمیں مہاجرین کے درمیان نصیب ہوا ہے، جو ہجرت سے شروع ہوتا تھا، میرا یہ مشورہ دینے کا جی چاہتا ہے کہ

ایک ''وصلی'' بنانے اردو یا تبتی رسم الخط میں اس پر خوش خط حروف سے لکھیں، ''ہم نے وطن کیوں چھوڑا؟'' ''ہم نے تبت (Tibbet) کو کیوں خیر باد کہا؟'' ایک سوالیہ نشان، تو جس شخص کی نظر اس پر پڑے گی وہ یاد کرے گا کہ ہمارا وطن ہم کو کاٹ نہیں رہا تھا، ہمارا وطن ایسا برا بھی نہیں تھا کہ وہاں رہنا دوبھر ہو، ہم نے وطن چھوڑا ایمان کی خاطر، سوالیہ نشان اس کے دل میں چبھے، اور اس سے پوچھے کہ تم نے وطن کیوں چھوڑا تھا؟ اس کا جواب دل و دماغ دیں کہ ہم نے ہجرت کی تھی، اپنا اور اپنے بچوں، عورتوں، بیٹوں، پوتوں، نواسوں، پوتیوں اور ان کی اولاد کا ایمان بچانے کے لئے، آپ یہ کبھی نہ بھولیں، ورنہ تھوڑے دنوں کے بعد لوگ بھول جاتے ہیں، بہت سے لوگ بھول گئے کہ ہمارے آباواجداد یہاں کیوں آنے تھے، ان کو کیا مجبوری پیش آئی تھی؟ پھر سب ایک ہی رنگ میں رنگ جاتے ہیں، کھانے کمانے میں لگ جاتے ہیں، پھر نمازیں بھی چھوٹ جاتی ہیں، اور دینی تعلیم کا بھی سلسلہ ختم ہو جاتا ہے، خدا کی یاد بھی فراموش ہو جاتی ہے، وہاں کے نظام میں ڈھلے ڈھلائے پرزوں کی طرح فٹ ہو جاتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ کوئی بات ایسی کیجئے کہ آپ ہمیشہ چونکتے رہیں اس کو دیکھ کر، وہ چیز آپ کو کاٹتی رہے، اور آپ کو غافل نہ ہونے دے، یا یہ کہ آپ وقتاً فوقتاً اجتماع کیجئے اس میں یہ بات یاد دلایئے، میں یہ نہیں کہتا کہ یہی ایک طریقہ ہے کہ کوئی چیز لکھ کر لگا دیں، کچھ دنوں کے بعد اس کی عادت پڑ جاتی ہے، پھر ایک اور چیز چاہئے، پھر وہ بھی مانوس ہو جاتی ہے، پھر اس کے لئے کوئی تیسری چیز چاہئے، آپ دیوار پر چاہے نہ لکھئے اپنے دل پر لکھئے کہ ہم نے تبت کیوں چھوڑا تھا؟ ہم نے اپنا محبوب اور عزیز وطن کیوں چھوڑا تھا؟ سب کچھ برداشت کیجئے، اپنے ایمان کا نقصان برداشت نہ کیجئے، جس کے لئے آپ نے اپنا وطن چھوڑا تھا۔

ان في ذلك لذكرى لمن كان له قلب او القى السمع وهو شهيد .

(ق۔۳۷)

جو شخص دل (آگاہ) رکھتا ہے، یا دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے، اس کے لئے اس میں نصیحت ہے۔

و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

انسانیت کی سب سے بڑی ضرورت

عقیدہ، عمل اور دعوت

مرکز اصلاح وتبلیغ کے زیر اہتمام ۱۱ فروری ۱۹۵۶ء کو میونسپل پارک لال باغ لکھنؤ میں ایک جلسۂ عام منعقد ہوا تھا جس میں غیر مسلم بھی موجود تھے، اس جلسہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ نے یہ چشم کشا اور موثر تقریر فرمائی تھی، افادۂ عام کی غرض سے ہم اس تقریر کو ہدیہ ناظرین کر رہے ہیں

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نو من به و نتو كل عليه و نعوذ بالله من شرر انفسنا و من سيات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضل الله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا الله وحد ه لاشريک له و نشهد ان سيد نا ومولانا محمداً عبده و رسوله صلى الله تعالىٰ عليه و علىٰ آله واصحابه اجمعين اما بعد فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم.

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں زندگی گزارنے کیلئے پیدا کیا اور اس کی ضروریات کو اس دنیا میں بڑی فیاضی اور فراوانی اور افراط کے ساتھ پیدا فرمایا، انسان کی ضروریات کیا ہیں اور ان کا سامان کس طرح کیا گیا ہے یہ ہم اور آپ سب جانتے ہیں جن لوگوں نے ذرا بھی اس دنیا پر غور کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جن چیزوں کی انسان کو سیکڑوں اور ہزاروں برس کے بعد ضرورت پیش آئی ان کا اہتمام دنیا کے ابتدا میں کر دیا گیا تھا انسانی ضروریات کے ہر شعبہ کو چلانے اور ترقی دینے کی صلاحیت اور محبت بھی انسان کی فطرت میں ودیعت کی اور اس کے لئے ایسے گروہ اور افراد پیدا کئے جو اپنے ان شعبوں اور پیشوں کو اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ حالانکہ ان میں بعض ایسے کام ہیں جن سے ہمیں وحشت ہوتی ہے لیکن ان کے کرنے والی ان پیشوں کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ اور اسی میں دنیا کے نظام کو چلانے اور ترقی دینے کا راز ہے۔

اس لئے کہ دنیا میں ہزاروں انقلابات کے باوجود ہر پیشہ اور ہر شعبہ موجود اور ترقی یافتہ ہے۔

زندگی کو خالق کے منشا کے مطابق گزارے!

انسان کی سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس زندگی کو اپنے پیدا کرنے والے کے منشا کے مطابق گزارے، انسان کے مقصد کو پہچاننے اور اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کیلئے بھی اللہ تعالیٰ نے کوئی انتظام فرمایا یا نہیں؟ زندگی کے اس سب سے اہم شعبے اور سب سے زیادہ ضروری کام کیلئے بھی کوئی سلسلہ یا گروہ دنیا میں جاری رہا یا نہیں؟ جو اپنے اس مقدس کام کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھے اور اس اہم خدمت کیلئے اپنی جان کی بازی لگائے۔

انسان کو جو اصل ضرورت ہے اس کے لئے کوئی انتظام نہ کرنا اللہ کی رحمت سے بعید ہے اس دنیا میں حکمت صلاحیت اور ہر شعبہ زندگی سے مناسبت سب کچھ موجود ہے جس کی بڑی دھوم دھام ہے انسانوں کے معمولی ذہن بھی اسے ماننے کیلئے تیار نہیں۔ کہ انسانوں کی اصل ضرورت اور حقیقی مقصد (کہ کس طرح زندگی گزارنا چاہئے کس طرح وہ اپنے پالنے والے کو راضی کرسکتا ہے) کوئی انتظام نہ کیا گیا ہو، خدا نے انسانوں کو اس اہم ضرورت اور خدمت کیلئے دنیا میں ایک ایسی بے غرض جماعت بھی پیدا کی جو انسانوں کو بتلاتی رہے کہ یہ زندگی تمہاری تابعدار ہے۔ لیکن تم کسی اور کے تابعدار ہو، اور انسانی زندگی حیوانیت سے بہت ممتاز اور ایک بڑے منصب کی مالک ہے دنیا میں گاڑیاں چلنے اور معمولی معمولی سفروں کیلئے طرح طرح کے انتظامات موجود ہیں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ زندگی کا سفر بھی کوئی اہمیت رکھتا ہے یا نہیں؟ میں اس کے ماننے کیلئے تیار نہیں کہ زندگی کا اتنا بڑا سفر بغیر کسی ادارے اور جماعت کے طے ہوسکتا ہے۔ جس میں طرح طرح کے خطرات، تضاد رقابتیں اور کشمکش موجود ہوں کو پورا کرنے کے لئے ایسی حالت ہے کہ نہ ہم رہیں نہ ہماری خواہشات، آپ سانپوں اور بچھوؤں کو جانتے ہیں لیکن انسانی زندگی میں جو سانپ اور بچھو جو شعلے اور کانٹے اور جراثیم ہیں وہ زندگی کے سفر کے لئے بڑے خطرناک ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی خاص رحمت اور فضل سے ان خطرات سے بچانے کا انتظام فرمایا۔ ہر زمانے میں وہ اپنے برگزیدہ بندے بھیجے جو انسانوں کو ان کے مالک سے متعارف کرائیں اور ان کی اصل فلاح اور حقیقی بہبود کا راستہ دکھائیں اگر یہ انتظام نہ ہوتا تو انسانیت حیوانیت میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ مگر اللہ کو یہ دنیا چلانی اور انسانی زندگی کو

اپنے معیار پر لاتا تھا۔ جس کیلئے اس نے ایسے انسان پیدا کئے جو اس کی خدمت کو انجام دیں اور ان کو ایسی خلوص اور ایسی لگن عطا کی کہ وہ انسانوں کی ہدایت اور فلاح کے لئے اپنی ہر عزیز چیز قربان کرتے رہے اور لوگوں کو ان پر شبہ ہوتا تھا کہ نہ معلوم دنیا سے یہ کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان برگزیدہ بندوں میں سے سب سے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا اور آپ نے ایک جماعت تیار کی جس کی بنیاد معاشرت، تمدن اور کلچر پر نہیں تھی اور جس کا دائرہ کسی قوم گروہ یا ملک تک محدود نہ تھا۔ بلکہ اس نے انسانیت کے سارے عالم کو اپنا پیغام دیا اور فرمایا کہ اگر میرے پاس وہ لوگ آئیں جو زندگی میں دوسروں کے مقابلے میں قناعت اور خود غرضی سے بجائے بے نفسی اور نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی کو ترجیح دیں جن کا مقصد حیات دنیا میں حشرات الارض کی طرح جینا، شکاری عقابوں اور درندوں کی طرح دوسروں کو چیر پھاڑ کھانا ہو بلکہ وہ اپنی زندگی سے انسانوں و انسانیت کا مقام اور اصل مقصد حیات یاد دلائیں اور ان کی حقیقت بتلائیں کہ وہ دنیا میں خدا کے نائب اور اس دنیا کی امین و متولی ہیں اور تمہارے لئے اللہ نے جو مقدر کیا ہے اس کی وسعتیں اس محدود دنیا سے بالاتر ہیں۔

اگر ضرورت تھی تو..........!

سردار انبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانے میں مبعوث ہوئے اس وقت دنیا میں سب کچھ موجود تھا۔ ملک تھے، قومیں تھیں، حکومتیں تھیں لیکن کوئی ایک جماعت ایسی نہ تھی کہ اپنی ذات اور اولاد کے علاوہ انسانیت کی فکر مند ہوتی۔ انسان بھیڑیوں کی خصلت اختیار کر چکا تھا۔ جس کا کام صرف اپنے بچوں کو پالنا اور دوسروں کو پھاڑنا تھا۔ کروڑوں انسانوں میں کوئی ایک آدمی ایسا نہ تھا جو دنیا کے اس نازک گھڑی کو محسوس کرتا۔ اس لئے لوگوں کو آپ کے مقصد کو سمجھنے میں بڑی دقت اور کشمکش ہوئی کیوں کہ اس وقت انسانیت دنیا کی ایک منڈی بنی ہوئی تھی ایک دوسرے کو اپنا گاہک سمجھتا تھا۔ انسانیت کی روح لرز رہی تھی بڑے بڑے فلسفی شاعر، اور حکماء اس اضطراب سے ناآشنا اور خطرات سے ناواقف تھے۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی اس ذہنیت کو بدلنے کیلئے ایک ایسی جماعت بنائی جس نے ایمان، یقین و عمل اور دعوت کے مجموعہ قوت سے اس بات کا فیصلہ کیا کہ

انسانیت کو ہلاکت اور تباہی سے کے سمندر میں ڈوبنے سے بچائیں گے۔ آپ نے ایسے بے لوث اور جاں باز گروہ کی تشکیل کی جو اس خطرے میں انسانیت کی کمر پکڑ لیں اور زندگی کے دھارے کا رخ موڑ دیں۔ اور دنیا کو چیلنج کریں اور زندگی کی پٹری پر اپنے آپ کو ڈال دیں کہ اب اس لائن پر نہیں چلنے دیں گے اور یہ وہ امت ہے جس نے اللہ کی طرف بلانے اور ہدایت کا راستہ دکھلانے کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا۔ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نازک وقت میں دنیا کی بڑی سے بڑی عزت، لذت اور بالاتری کی پیش کشوں کو ٹھکرا کر اپنے فیصلے سے انسانیت کے مستقبل کو روشن اور دنیا کی زندگی کو بامقصد بنایا اور دنیا کے سامنے ایک نیا نقشہ یا نظام حیات پیش کیا جس کی بنیاد پر چند خاص اصولوں پر رکھی، جن لوگوں نے ان کو اختیار کیا۔ ان کا امتیاز محض چند حقیقتوں کو تسلیم کر لینا محض ایک دھرم اور خاص طرز زندگی نہ تھی۔ حضرت کی نبوت اس پر قناعت نہیں کر سکتی تھی قرآن گواہ ہے اور بڑی ناانصافی اور زیادتی ہوگی جو یہ سمجھا جائے کہ آپ کا پیغام یا مشن محض ذاتی عقیدے اور عمل تک محدود تھا بلکہ آپ نے جو جماعت پیدا کی وہ اپنے عقیدے اور عمل کے ساتھ اس بات کا فیصلہ کر چکی تھی کہ اپنی تمام قوت اور صلاحیت اور ہر عزیز شے کو دنیا سے برائی روکنے اور نیکی پھیلانے کیلئے قربان کرے گی۔ اور مستقبل کیلئے انسانی ہدایت کا راستہ کھولے گی اس کا مقصد نیکی اور برائی میں محض امتیاز نہ تھا۔ بلکہ نیکی کو برائی پر غالب کرنے کا فیصلہ اور عزم بھی تھا۔ دنیا سے خدا فراموشی اور فحاشی کو ختم کرنا تھا انہوں نے بدی، ظلم، نفس پرستی اور خدا فراموشی کے خلاف ایک مورچہ قائم کیا اور اس کا فیصلہ کیا کہ ان کو آخر وقت تک اس مورچہ پر جنگ کرنی ہے۔ اور بدی کی طاقت کے خلاف گھٹنے ٹیک دینے ہیں اور حق کو دنیا پر غالب کرنا ہے انہوں نے اس کا بھی فیصلہ کیا کہ اس مقصد کے حصول کیلئے اگر ان کو اپنی تمام لذتوں، راحتوں، عزتوں کو قربان کرنا پڑے تو وہ تیار ہیں۔

صرف دھرم اور عقیدہ دنیا کے حالت میں کوئی انقلاب نہیں پیدا کر سکتا۔ اس کے ساتھ اگر عمل بھی ہو تب بھی دنیا سے برائی کو نہیں روک سکتا۔ عقیدے اور عمل کے ساتھ دعوت اسلام کا یہ اصل مشن ہے یہی وہ مجموعہ ہے جو پیغمبر اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور یہی وہ مجموعہ ہے جو ڈوبتی ہوئی ناؤ کو تیرا سکتا ہے۔ لیکن آج دنیا میں اس مجموعہ کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ وہ یقین جو زندگی پر اثر انداز اور اپنے خلاف چلنے پر مانع ہو، وہ عمل جس سے دنیا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی

ہواور وہ دعوت جومشرق میں خدا فراموشی کی آواز سن کر مغرب سے لڑ جانے کیلئے بے چین ہو، نظر نہیں آتی آج دنیا کو پھر اس کی ضرورت ہے کہ عقیدے اور عمل کے ساتھ دعوت کو اختیار کرکے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل مقصد کو اپنا جائے جو اس دور کی سب سے بڑی ضرورت ہے اللہ کے پیغمبر صحیح عقیدہ، صحیح عمل اور بے غرض دعوت لے کر آئے اسی بنیاد پر ایک جماعت قائم کی جو مسلمان کہلائی، آج اگر عقیدہ ہے تو عمل نہیں عمل ہے تو دعوت نہیں اور اگر دعوت ہے تو عقیدہ اور عمل نہیں۔ آج دنیا میں دعوتیں ہیں صرف تحریکیں، تحریریں اور تقریریں، خدا کی ہستی پر یقین مفلوج ہو کر رہ گیا ہے آج دنیا میں دعوتیں ہیں تو سب کی تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ ہماری ذات، ہماری اولاد اور اگر بہت ترقی کی تو ہماری قوم اور ہمارا ملک ان کی دعوت کی غرض سے ساری انسانیت اور اصل مسئلہ انسانی مسئلہ نہیں ہوتا آج ایمانی اور پاکیزہ اور خدا ترس زندگی کی دعوت کون دے رہا ہے، کون انسانیت کی تباہی کے درد سے بے چین ہے، زیادہ سے زیادہ صحت کی بربادی، یا سیاسی زوال یا ملکی مشکلات و مسائل پیش نظر ہیں ہمارے کان لگے رہتے ہیں کہ کسی گوشے سے ہم صحیح اور ٹھوس بات سنیں۔ ہم نے بار ہا بڑے اشتیاق اور توقعات کے ساتھ تقسیم اسناد کے خطبے اور بڑے بڑے مفکرین کی تقاریر اور مضامین پڑھے لیکن ہم بڑے مایوس ہوئے کہ کہیں انسانیت کے مقام، خدا کے یقین اور مرنے کے بعد کا ذکر تک نہیں ملتا، اور اخلاق اور سچی خدا ترسی کا یقین اور زندگی کے اس بگڑے ہوئے سانچے پر گہری تنقید نہیں ملتی۔

مسلمانوں سے اپیل:

ہم مسلمانوں سے خاص طور پر کہتے ہیں کہ جو زندگی وہ گزار رہے ہیں وہ ان کی تاریخ اور ان کے دعوے اور عقیدے سے مطابقت نہیں رکھتی، آج وقت کی پکار یہ ہے کہ تم اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھو، دنیا کے بڑے بڑے تجارتی شہر اور کارخانے اور مادی ترقی کا عروج دنیا کو تباہی سے بچانے سے قاصر ہیں۔ تم نے اپنی ذمہ داری کو بھلا دیا اور وہی طرز زندگی اختیار کیا جو دنیا کی خدا فراموش قوموں نے اختیار کر رکھا ہے آج دنیا میں اس کی ضرورت ہے تم اپنے عقیدے، عمل اور بے غرض دعوت کی زندگی پیش کرو۔

دنیا تمہاری طرف دوڑے گی اور اسی نظام حیات سے زندگی کی گاڑی دلدل سے نکل سکتی ہے۔ آپ اپنے اس منصب کو پہچانیئے اور انسانوں کو بتلائیے کہ اے دنیا کے مقصود اے دنیا کے

سرداروں کہاں بھٹک رہا ہے تو کس پست ہمتی اور کس خودکشی میں مبتلا ہے میں اپنے دوستوں اور وطنی بھائیوں سے کہتا ہوں کہ آج ہر شعبے کیلئے پلان اور ہر مقصد کیلئے منصوبہ بنایا جارہا ہے لیکن نیا زندگی کا کام اور حقیقی مقصد اس قابل نہیں کہ اس کیلئے بھی جدوجہد کی جائے آج ملک میں اس مقصد کیلئے کوئی سرگرم منظم جدوجہد اور تحریک نہیں پائی جاتی، زندگی کو تباہی کی دعوت دینے اور اخلاق کو بگاڑنے اور انسانیت کو کچلنے اور نفس کی خواہشات کو پورا کرنے کا سامان قدم قدم پر موجود ہے۔ اور اس کی ترغیبات کا جال بچھا ہوا ہے۔ لیکن انسانی خوبیوں کو ابھارنے اور باخبر زندگی گزارنے، ایمان و یقین اور نیک کردار پیدا کرنے کی کہیں دعوت موجود نہیں۔

میں مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ اگر تم خلوص ہمدردی اور بے غرضی کے ساتھ دعوت دو تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان اس کی قدر نہ کرے محبت کو کسی سفارش کی ضرورت نہیں سچائی، خود اپنا راستہ اور مقام پیدا کرلیتی ہے۔ مسلمانو! تمہاری زندگی کا راز اسی تجارت میں ہے تم وہ سودا بازار میں لاؤ جو دنیا میں نایاب اور انسانیت کیلئے آب حیات ہو، تم کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مقصد کیلئے مقرر کیا تھا۔ اور جو بھی یہ زندگی لے اٹھے گا وہ آنکھوں کا تارا اور سب کا دلارا ہے۔ مسلمانو! حضور کی لائی ہوئی پاکیزہ زندگی کو اپنا نمونہ اور آپ کی دعوت کو اپنا مقصد حیات بنایا اس وقت کی سب سے بڑی خدمت اور ہمارا اصلی پیغام ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ علیہ

کا پیغام

خواتین اسلام کے نام

> حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی الندوی کی یہ وہ تقریر ہے، جو انھوں نے ... امیر
> مولانا معین اللہ صاحب ندوی سابق نائب ناظم ندوۃ العلماء کی بیٹی ... ۲۸
> مئی ۱۹۹۸ء میں عورتوں کے بیچ فرمائی تھی۔

الحمد للہ رب العلمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین خاتم النبیین محمد وآلہ وصحبہ اجمعین ومن تبعھم باحسان ودعا بدعوتھم الی یوم الدین امابعد . فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم، ومن یعمل من الصالحات من ذکر او انثیٰ وھو مومن فلنحیینہ حیاۃ طیبۃ .

میری قابل احترام بہنو اور بیٹیو! میں سب سے پہلے تو آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا کیا، بلکہ صحیح العقیدہ گھرانے میں پیدا کیا، جو شرک وبدعت سے پاک ہے، اور بہت سی بری رسمیں جو اس دنیا میں ہوتی ہیں اس سے بھی اللہ نے محفوظ رکھا ہے، اس خاندان میں عالم پیدا کئے، مرد نہیں پیدا کئے بلکہ داعی الی اللہ اللہ کی طرف بلانے والے، مدرسے قائم کرنے والے، مسجدیں بنانے والے اور اللہ کے مقبول بندوں کی صحبت میں رہنے والے عطا فرمائے تو اس پر بہت شکر ادا کرنا چاہئے اور شکر خود بڑی عبادت ہے، لئن شکرتم لازیدنکم اللہ فرماتا ہے کہ تم نے شکر کیا تو ہم اور دیں گے، اس کے بعد یہ ہے کہ عقیدہ اپنا صحیح رکھیں، اللہ کا شکر ہے کہ صحیح العقیدہ خاندان ہے، اور جوار میں بھی شرک وبدعت وغیرہ کی گرم بازاری نہیں ہے، جو بعض دوسری جگہوں پر ہے تو صحیح عقیدہ رکھنے کا سب سے ضروری حصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کارساز حقیقی سمجھیں، اللہ تعالیٰ کو نفع وضرر کا مالک سمجھیں کہ فائدہ پہنچانے نقصان پہنچانے صحت وزندگی دینے اور روزی ورزق عطا کرنے

اور اولاد عطا فرمانے کی صرف اللہ تعالیٰ کو ہی قدرت ہے، جو نہ کسی ولی میں، نہ کسی قطب میں نہ کسی غوث میں، نہ کسی ابدال میں، نہ کسی پیغمبر میں ہے، یہ سب کام اللہ کرتا ہے، اور اللہ فرماتا ہے۔ الاله الخلق والامر اسی کا کام ہے پیدا کرنا، اسی کا کام ہے کارخانہ کا چلانا، کارخانہ بھی اسی نے بنایا اور چلا بھی وہی رہا ہے، اس کی اجازت وحکم کے بغیر نہ پتہ ہل سکتا ہے، نہ ذرہ ہل سکتا ہے، اپنے بچوں کو یہ تعلیم دیجئے، بچپن سے اللہ کا شکر ہے، جو خاندان معتبر خاندان تھے، جس سے اللہ تعالیٰ نے بہت فائدہ پہونچایا ہندوستان میں، وہاں بچوں کو شروع سے یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ خدا کے سوا کوئی کچھ نہیں کر سکتا، کوئی کچھ دے نہیں سکتا، چنانچہ بچے انکار کر دیا کرتے تھے، کبھی اگر ان سے کسی نے ایسی بات کہی کہ نہیں اللہ کے سوا کسی میں کوئی قدرت نہیں، ہم نہیں مانتے اس کو، اللہ ہی دیتا ہے لیتا ہے، خدا ہی روزی رساں ہے، وہی غذا اور خوراک سب عطا فرماتا ہے، آپ ان خاندانوں کے واقعات پڑھیں، شاہ ولی اللہ صاحب کا خاندان اور ان کے سلسلہ کے جو لوگ تھے، دیوبند کے بزرگوں کے خاندان حضرت رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، وغیرہ پھر حضرت سید احمد شہید سب میں سب سے بڑی چیز توحید کی تھی اس توحید کو آپ مضبوط پکڑ یئے اور دوسری اپنی بہنوں کو اور شہر کی رہنے والی بیبیوں کو بھی بتایئے، جہاں کہیں جانا ہو، شادی میں جانا ہو، تقریب میں جانا ہو، کسی نہ کسی عنوان سے توحید کی دعوت ضرور دیجئے کہ بیبیو، اللہ کے سوا اور کسی کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے، پورا کارخانہ اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہی اکیلا چلاتا ہے، وہی روزی دیتا ہے، وہی اولاد دیتا ہے، وہی صحت دیتا ہے، وہی بیمار کرتا ہے، وہی اچھا کرتا ہے، ایک بات یہ کہ عقیدہ اپنا صحیح رکھیے، بچوں کے کان میں ابھی سے ڈالئے، کان میں نہیں بلکہ دل میں بٹھا دیجئے دیکھو بیٹے دیکھو بیٹی اللہ کے سوا کوئی کچھ نہیں کر سکتا، ذرہ بھی نہیں ہل سکتا، وہی روزی دیتا ہے، اس سے مانگو، اور دعا کرنا سکھایئے بچپن سے۔

الحمد للہ ہماری والدہ مرحومہ نے بچپن سے ہم کو دعا سکھائیں اور جب ہم لکھنے کے قابل ہوئے تو کہا کہ بیٹا تم سب سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد یہ لکھا کرو "اللھم اتنی بفضلک ماتوتی عبادک الصالحین" یہ ہمیں بتایا شروع سے بالکل ہم جب قلم پکڑنے کے قابل ہوئے کہ جب بسم اللہ لکھو تو لکھو، اس وقت بتایا اے اللہ تو ہمیں اپنے فضل سے دے

جو بہتر سے بہتر عطا کرتا ہے، اپنے نیک بندوں کو اس وقت سے ہم نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔

اس طریقہ سے اپنے بچوں کو پڑھ کر سنایئے، جو معتبر علماء کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں، تعلیم الاسلام مفتی کفایت اللہ صاحب کی اور ہمارے والد صاحب کی، مولانا اشرف علی تھانوی کی بہشتی زیور پڑھنے کا دور شروع کیجئے، اور نمازوں کی تاکید رکھئے، جن پر نماز فرض ہوگئی ہے، وہ نماز شروع کر دیں، ان کی نماز قضا نہ ہو، سوتے سے اٹھایئے کہ نماز پڑھ لیں اور گھر میں ماحول ہو کہ لوگ دیکھیں کہ یہاں دین ہے اور دینداری ہے، اور خدا کا خوف ہے اور دینی باتیں ہیں، ان کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات، صحابہ کرامؓ کے واقعات بیان کیجئے، عقیدہ صحیح رکھئے اور کوشش کیجئے اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کیجئے، اللہ نے آپ کو بہت نعمتیں دی ہیں اور اچھے خاندانوں میں پیدا کیا۔

ہم نے اپنے بچپن میں سب سے پہلے دیکھا ہے کہ ہماری والدہ صاحبہ تہجد پڑھتی تھیں ہمیں اس وقت معلوم ہوا کہ تہجد بھی کوئی چیز ہے، تہجد کی نماز پڑی جاتی ہے اور ہمارے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ اتنی چھوٹی عمر میں اگر سو جائیں عشاء کی نماز پڑھے بغیر تو ضرور اٹھاتی تھیں، اور نماز پڑھاتی تھیں، اسی طریقہ سے دعا کرنا سکھایا، اور کتابوں کا شوق دلایا اور اس کے بعد اگر ان کے خطوط آپ دیکھیں، ان کی کتابیں منگوایئے ''ذکر خیر'' کے نام سے ہم نے کتاب لکھی ہے، ان کے حالات میں، اللہ تعالیٰ نے دعاؤں کا ان کو ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا کہ حضرت تھانوی کے ایک خلیفہ نے کہا کہ یہ تو عارفہ کا کلام ہے ایسی ایسی دعائیں اور مناجاتیں ان کی، ان کے پڑھنے کا رواج ڈالئے ان کے پڑھنے سے دل پر اثر پڑتا ہے، اب بھی اس عمر میں اثر پڑتا ہے، ان کی دعاؤں پر اتنا یقین تھا، ان کی سب سے بڑی خصوصیت ہم نے جو دیکھی وہ دعا ہے، یعنی ایسے بہت سے اونچے اونچے بزرگوں کے یہاں یہ بات دیکھی کہ ہر چیز میں دعا، جو کام پیش آنے جو مشکل پیش آئی، سب دعا کی طرف توجہ اور نماز، نماز اور دعا ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا، ہماری والدہ قرآن شریف کی حافظہ تھیں، پورا قرآن شریف تراویح میں ختم کرتی تھیں، علماء نے فتویٰ دیا تھا، فرنگی محل کے علماء کا فتویٰ، ہمارے بڑے چچا رابع کے دادا سید خلیل الدین صاحب حضرت گنگوہیؒ سے بیعت تھے کہ کیا عورتوں کی تراویح ہو سکتی ہے، یعنی عورتیں ہی عورتیں ہوں عورت ہی امام ہو اور مقتدی بھی عورت ہی ہے، اس لئے کہ پورا خاندان تھا، تو فرنگی محل کے علماء

سے مقتدی ہو یا کوئی عورت ہی امام ہو اور عورتیں ہی مقتدی ہوں تو وہ ہو سکتی ہے، تو گویا عورتوں کی جماعت ہوتی تھی۔

ہماری والدہ حافظہ تھیں، ہماری حقیقی خالہ حافظہ تھیں، اور ہماری حقیقی خالہ زاد بہنیں حافظہ تھیں، ایک پھوپھی حافظہ تھیں، ایک ممانی حافظہ تھیں، غرض یہ کہ مستورات حافظہ تھیں اور بعض ایسے خوش نصیب جوڑے تھے کہ میاں بیوی دونوں حافظ تھے، ہمارے ماموں بھی حافظ، ہماری ممانی بھی حافظہ، ہمارے ایک بھائی حافظ اور ان کی اہلیہ ہماری بھی خالہ زاد بہن حافظہ، ہمارا معاملہ یہ تھا کہ ہمارے والد عالم اور والدہ حافظہ اور والدہ بھی دینی کتب لکھنے پڑھنے کے قابل تھیں، ان کی کتاب ہے، آپ پڑھیں "تعلیم و بے رحمت" ایک کتاب لکھی، ان کی بڑی عمدہ ایک کتاب "حسن معاشرت" سب سے ضرور اس کو منگوائیے اور پڑھوائیے۔ اس میں سب کے حقوق بتائے ہیں، اسلامی زندگی گھر میں کیسے گذاری جائے، وہ سمجھایا ہے، وہ بتایا ہے "حسن معاشرت" کے نام سے، اللہ نے شاعری کی بہت قدرت عطا فرمائی تھی، خاص طور پر مناجاتیں بڑی متاثر ہیں، رقت طاری ہو جاتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عارفہ، کوئی اللہ کی نیک مقبول بندی اللہ سے مانگ رہی ہے، دعا کر رہی ہے۔

خزاں میں بھی شجر ہرے ہوں، پھول پھل لائے
ہو شہرت باغباں کی باغ کی پیڑوں کی پھولوں کی

اور بھی نظمیں ہیں کہ ہاتھ اٹھاؤ اللہ سے دعا، اللہ تعالیٰ سے ہاتھ اٹھائے پھر ہم نہیں رہتا، پورا دیوان چھپا ہوا ہے۔ پہلی بات یہ کہ اللہ کا شکر ادا کریں کہ اللہ نے آپ کو ایسے خاندان میں پیدا کیا ہے، یہاں توحید کا عقیدہ ہے، سنت کا اہتمام ہے، اور اللہ کا نام سکھایا جاتا ہے، لیا جاتا ہے، بچوں کو سلیقہ تہذیب اپنی جگہ پر ضرور سکھائیے، اس سے پہلے کان میں ڈال دیجئے، بلکہ ذہن میں بٹھا دیجئے کہ بیٹا مانگو تو اللہ سے مانگو، بچی مانگو تو اللہ سے مانگو، اللہ ہی دینے والا ہے، اللہ کے سوا کوئی چھڑانے والا نہیں ہے، کسی کے اختیار میں کچھ نہیں، چنانچہ جن کے دل میں بچپن میں بٹھایا گیا تھا، ان کا یہ حال ہوا کہ بڑے سے بڑے امتحان کے موقع پر بھی وہ توحید کے عقیدہ سے ہٹے نہیں، ہٹے نہیں ذرا سا بھی، بال برابر بھی کھسکے نہیں، بچپن سے ان کے دل میں بٹھا دیا گیا تھا کہ کارساز حقیقی اللہ ہے، وہی نافع و ضار ہے، نفع پہونچانے والا ہے، نقصان پہونچانے والا ہے، کسی

کی قدرت میں کچھ نہیں ہے۔

حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ نے ایسی مقبولیت عطا فرمائی تھی، کہ پوری دنیا میں شہرت غوث الاعظم اور پتہ نہیں کیا کیا، وہ کہلاتے ہیں، ان کی والدہ نے نصیحت کی تھی، کہ دیکھو بیٹا سچ بولنا جھوٹ نہ بولنا، چنانچہ جب وہاں سے بغداد پڑھنے کے لئے آرہے تھے، ابھی بچے تھے، پورا قافلہ تھا، راستہ میں ڈاکہ پڑا، ڈاکوؤں نے حملہ کیا اور ہر ایک سے پوچھا تمہارے پاس کچھ ہے، کہا کہ نہیں ہے، ہمارے پاس کچھ نہیں، جیب دیکھتے تو بہت کچھ نکلتا تھا تو لے لیتے تھے، ان کے پاس آئے ان سے پوچھا تمہارے پاس کچھ ہے بیٹے، انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس یہ ہے، انھوں نے اس کو لیا اور توبہ کی کہ یہ لڑکا سچ بولتا ہے، اور ہماری حالت ہے کتاب میں یہ واقعہ لکھا ہے، ان کا واقعہ ایک اور لکھا کہ بغداد میں ایک مرتبہ بڑا قحط پڑا، تو لوگ دریائے دجلہ کے کنارے جاتے تھے، وہاں سے جو لوگ ترکاریاں لے کر آتے تھے، عام طور پر ترکاری باہر سے آتی ہے، ترکاری لے کر آتے تھے تو ترکاری گرتی تھی، کوئی پتہ گر گیا، کوئی پھل گر گیا، کہیں آلو گر گیا، کہیں ٹماٹر گر گیا، تو لوگ اٹھا لیتے تھے، وہاں جاتے تھے کہ بڑی چیز کا اٹھانا ناجائز ہے، ان کے یہاں سیدنا عبدالقادر جیلانی کو بھی جب فاقہ پر فاقہ شروع ہوئے ابھی پڑھ رہے تھے، جوان تھے، انہوں نے کہا کہ ہم بھی چلیں اٹھالائیں، پکالیں گے، گئے تو دیکھا کہ لوگ اٹھا رہے ہیں، ان کو شرم آئی کہنے لگے کہ یہ اللہ کی مخلوق کے لئے ہے کمی ہو جائے گی، اگر اٹھالیں گے، ایک آدمی کا حصہ کم ہو جائے گا، یہ واقعہ سننے کے قابل ہے، تو وہ اس سے خالی ہاتھ آ گئے کہ ہم نہیں اٹھاتے، یہ ان کو مبارک ہو اٹھائیں، مسجد میں آ کر بیٹھ گئے، چلنے کی ہمت نہیں تھی، بہت تھکے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک صاحب آئے انھوں نے خوان بچھایا، اچھا اچھا کھانا رکھا، اور کھانے لگے، معلوم نہیں حضرت کا بے اختیاری میں منھ کھل گیا، یا کیا ہوا، یا اس نے دیکھا کہ ایک لڑکا بیٹھا ہوا ہے، بہت بھوکا معلوم ہوتا ہے، اس نے کہا کہ آؤ بیٹا کھانا کھاؤ، خیر اس کے بلانے پر بیٹھ گئے، اس نے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے، کہا عبدالقادر، کہاں سے آئے ہو، انھوں نے وہ جگہ بتائی، کہنے لگے کہ یہ تو تمہارا ہی کھانا ہے، ہم جب چلے تھے تو تمہاری والدہ نے کہا تھا کہ لو اس میں روپے رکھ لو، وہاں عبدالقادر کو تلاش کرنا، شاید اس کو ضرورت ہو، ہم نے تم کو بہت تلاش کیا نہیں ملے تو ہم نے کہا کہ یہ بیکار روپیہ جا رہا ہے، تو ہم نے سب خرید اتھا

تو ہم تمہارے مہمان ہیں۔

تو بزرگوں کے ساتھ عجیب وغریب واقعات پیش آتے ہیں، تو شروع سے بچوں کے دل میں ڈالئے کہ رزاق حقیقی روزی رساں اللہ تعالیٰ ہے، اسی کا دیا ہوا رزق ہم کھاتے ہیں اور کھائیں گے، اور جھوٹ نہ بولنا، دھوکہ کبھی نہ دینا، اور ظلم کبھی نہ کرنا، زیادتی کبھی نہ کرنا، بیوی کو تکلیف نہ دینا، کوئی بھولا بھٹکا مسافر ہو تو اس کو راستہ بتانا، کوئی تکلیف دہ چیز ہو تو اس کو اٹھا لینا کہ ٹھوکر نہ لگے، بچپن سے یہ تعلیم دینی چاہئے اور اپنے یہاں ایسی کتابیں پڑھنا چاہئے "زاد سفر" ہماری ہمشیرہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کی کتاب ہے، یہ "ریاض الصالحین" کا ترجمہ ہے جو بہت معتبر کتاب ہے، حدیث کی، اس کے ساتھ "ذکر خیر" پڑھئے اور امہات المومنین کے حالات میں "سیرت عائشہؓ" پڑھوا کر سنئے، یہ چیزیں اپنے گھروں میں ہونی چاہئے، اور ابھی تو اللہ تعالیٰ کو آپ کی اولاد سے انشاء اللہ بہت کام لینا ہے، اور اس علاقہ میں تو آپ ہی کا ایک چراغ ہے جو جل رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ہمیشہ جلتا رکھے اور دعا کریں نمازوں کے بعد اپنے لئے بھی اور جن کے حقوق ہیں، آپ پر ان کے لئے، رشتہ داروں کے لئے بھی اور سب سے بڑی دعا یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو صحیح العقیدہ مسلمان رکھے اور نیک صالح بنائے، اللہ تبارک برکت عطا فرمائے، ان گھروں میں ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اپنے خاندان میں بیٹھے ہوئے ہیں، اور اپنے بچیوں کو بھتیجیوں کو بہنوں کو پھوپھیوں کو خطاب کر رہے ہیں بس دعا فرمائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

قرآنی قصوں کی اہمیت وافادیت

مندرجہ ذیل تقریر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے ۲۶ فروری ۱۹۹۹ء مطابق ۹ ذیقعدہ ۱۴۱۹ھ کو بروز جمعہ رابطہ ادب اسلامی کے افتتاحی اجلاس منعقدہ بنگلور میں فرمائی تھی، صدر جلسہ نے دار العلوم سبیل الرشاد، جہاں یہ جلسہ ہو رہا تھا، قرآنی تعبیر سبیل الرشاد کی تشریح سے اپنے خطبہ شروع فرمایا، انھوں نے اس تعبیر کی فصاحت و بلاغت اور اس کے معانی کی وسعت و جامعیت، گہرائی و گیرائی، جغرافیائی اور مکانی حیثیت سے اس کی عمومیت و آفاقیت، طبقات انسانی، اور تغیرات زمانی پر اس کے انطباق کا تجزیہ کیا، مولانا نے لفظ ''الرشاد'' اور ''الہدایہ'' کے درمیان معانی کے نازک فرق کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ لفظ ''الہدایہ'' میں زیادہ اعتقادات و عبادات و فرائض اور اخلاق و معاملات، برتاؤ، متاثر کرنے کے ذرائع، صالح اور پاکیزہ احساسات و جذبات اور اچھی نیتیں داخل ہیں اس تعبیر میں زیادہ وسعت و عمومیت ہے، اس سبیل الرشاد کو دکھانے کے لئے اگر ادب کی ضرورت ہے تو وہ بھی ایک بہت بڑی خدمت، خدمت انسانیت ہی نہیں بلکہ عبادت الٰہی ہے، ہمارے نزدیک وہ دعوت الٰہی کا فریضہ انجام دیتا ہے، اس کے اندر حکایات، مفید مثالیں، جذبات و احساسات، تمنائیں، تجربات یہاں تک کہ مصلحانہ و مفکرانہ اور مثبت تعمیری دعوتی شاعری بھی شامل ہے۔

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم. اما بعد.

اس تمہید کے بعد مولانا مدظلہ نے ''اسلامی ادب اور قصہ نگاری'' کی اہمیت وافادیت اور اس کے بنیادی مقاصد کو قرآنی مثالوں سے واضح فرمایا، اس ضمن میں بامقصد اور پاکیزہ ادب کی تشریح کرتے ہوئے انبیاء علیہم السلام کی دعوتوں اور صحف سماوی کے دلکش اسالیب کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ قرآن مجید نے انسانی دل ودماغ میں توحید ورسالت کے مضامین کو اتارنے کے لئے جو وسائل وذرائع اختیار کئے ہیں ان میں قصص وحکایات کو مرکزی اہمیت حاصل ہے، دینی حلقوں میں قصے کہانیوں سے متعلق جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور جس طرح تحقیر کی نگاہ سے اس فن کو دیکھا جاتا ہے، اس میں واعظوں اور مصلحوں کے طرز عمل کا بڑا دخل ہے کہ وہ اس کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم نہیں کرتے، مولانا نے فرمایا۔

قصہ کہانیوں سے متعلق صدیوں سے ایک حقارت آمیز اور ایک احساس کمتری کا خیال چلا آ رہا ہے، ہمارے واعظوں نے قصوں اور حکایات کی کچھ ایسی تحقیر کی ہے یا کم از کم انھوں

نے اس کی افادیت اور معنویت کو تسلیم نہیں کیا ہے، بلکہ وہ اس کو ایک تفریحی چیز سمجھتے، کسی ثقہ و سنجیدہ مجلس میں جہاں لوگ اپنی اصلاح کے لئے بیٹھے ہوں، اگر کوئی قصہ کہنے لگے تو لوگ اس کو ایک بے محل بات سمجھیں گے، کہ یہاں تو خدا و رسول کی باتیں ہونی چاہئیں موعظت اور اعتقادات و ایمانیات کی باتیں ہونی چاہئیں۔ یہ قصہ کہانی کہاں سے شروع کر دیا، لیکن جب قرآن مجید نے قصہ کو جگہ دی ہے، ایسی کہ حیرت ہوتی ہے آپ دیکھیں کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیمؑ کے تذکرے واقعات اور قصے کتنے مقامات پر قرآن مجید نے ذکر کئے ہیں، ایک پوری سورۃ حضرت یوسف علیہ السلام سے متعلق ہے، یہ پوری سورۃ ان کے قصہ پر مبنی ہے، لیکن وہ اعلیٰ درجہ کی دانشمندانہ باتوں اور مواعظ پر مشتمل ہے، ایسے واقعات پر مبنی ہے کہ ان کے بغیر بہت سے حقائق سمجھ میں نہیں آسکتے، خود قرآن کریم کہتا ہے۔ **لقد کان فی قصصهم عبرة لاولی الالباب، ما کان حدیثا یفتری ولکن تصدیق الذی بین یدیه**، اس سے بڑھ کر قصہ کی منقبت یا قصہ کی توثیق کی ہی نہیں جا سکتی، کہ خود اللہ تعالیٰ اس قصہ کو احسن القصص فرمارہا ہے۔

مولانا مدظلہ نے اس موقع پر اپنے اس عربی مقالہ کا ذکر فرمایا، جس میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ سورۂ یوسف اور سورۂ کہف میں ذکر قصوں کا موازنہ تورات و انجیل سے کیا ہے، مولانا نے اس موقع پر سورۂ یوسف میں ذکر حضرت یوسف کی حکایت کا تجزیہ کرتے ہوئے اس سے بیش بہا دعوتی اور تربیتی نتائج نکالے، انھوں نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک خاص جمال عطا فرمایا تھا، وہ پیغمبر زادے تھے اور پیغمبر زادوں کے پیغمبر زادے تھے، دوسری بات یہ کہ ان کے حلیہ میں بڑا فرق تھا جو جمال اور رنگ کی صفائی شام و فلسطین میں ہے وہ مصر میں نہیں ہے، نہ پہلے تھا نہ اب ہے، حضرت یوسفؑ وہاں پیدا ہونے والے، وہیں کے پروردہ، پشتہا پشت سے جس خاندان میں پیغمبری کا سلسلہ چلا آرہا ہے، اس کے وہ فرزند تھے، پھر جب وہ مصر آئے تو قصر شاہی میں انھیں ایک آزمائش سے گذرنا پڑتا، ایک خاتون نے کوشش کی حضرت یوسف اس کے دل کی خواہش پوری کردیں لیکن حضرت یوسفؑ نے انکار کر دیا، وہ کامیاب نہیں ہوئی، اس کے بعد حضرت یوسفؑ کو جیل جانا پڑا، یہیں جیل کے دو قیدیوں نے خواب دیکھا، انھوں نے حضرت یوسف علیہ

السلام کو دیکھتے ہی یہ سمجھ لیا کہ اگر ہمارے خواب کی کوئی تعبیر دہ ہے تو وہ حضرت یوسفؑ ہیں، چنانچہ ان دونوں نے اپنا خواب بیان کیا حضرت یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر فائدہ اٹھایا اور توحید کا بڑا موثر، طاقتور لیکن جامع وعظ کیا۔

حضرت یوسفؑ نے سمجھ لیا کہ یہ دونوں ضرورتمند ہیں، اور ضرورت انسان کے اندر سننے اور اطاعت وانقیاد کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے، جو بات وہ سن نہیں سکتا، وہ سب سننے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، اس کے اندر ادب واحترام اور فروتنی کا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے، اس نازک اور قیمتی موقع سے حضرت یوسف علیہ السلام نے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرمایا:

یاصاحبی السجن أ ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القھار، ماتعبدون من دونہ الا اسماء سمیتمو ھا انتم وآبا کم، ما انزل اللہ بھا من سلطان. ان الحکم الاللہ امر الا تعبدوا الا ایاہ، ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لایعلمون.

حضرات: غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے وعظ کو اتنا رکھا جتنا اس موقع کے لئے مناسب تھا، اگر وہ لمبا وعظ کہہ دیتے تو کہتے کہ آپ کا وعظ ہم سننے کے لئے نہیں آئے ہیں، آپ تو ہمیں تعبیر دیجئے، اگر آپ تعبیر جانتے ہیں، ورنہ رخصت کر دیجئے لیکن حضرت یوسفؑ نے ایسے جچے تلے الفاظ ایسے غیر جارحانہ اور غیر ناقدانہ انداز میں وعظ کہا کہ اگر ادباء اور ماہرین بلاغت اس پر غور کریں تو اعجاز قرآنی کے قائل ہو جائیں، اس وعظ میں حکمت یوسفی بھی نظر آیا ہے، قیامت تک کے لئے یہ اسلوب داعیوں اور مبلغین کے لئے ایک نمونہ ہے، ہمیشہ ہمیں اس کو نمونہ بنانا چاہئے کہ کس موقع سے ہم اپنی بات کہیں اور کس بلاغت سے اس کی مقدار کیا ہونی چاہئے۔

اس احسن القصص کے دوسرے جز یعنی بادشاہ وقت کے خواب، اس کی تعبیر، پھر بادشاہ کی طرف سے جب دعوت آئی تو اس نازک موقع پر حکمت یوسفی اور جمال یوسفی کس طرح نمایاں ہوئی اور سیرت یوسفی نے کیا رہنمائی کی اس پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

جب بادشاہ نے اپنے خواب کی تعبیر درباریوں سے پوچھی کسی نے کہا کہ اس کی تعبیر تو حضرت یوسفؑ ہی دے سکتے ہیں اور وہ اس وقت جیل میں ہیں بادشاہ نے حضرت یوسفؑ کو

اپنے دربار میں طلب کیا، اس موقع پر اگر کوئی اور ہوتا تو وہ خوشی خوشی دربار جانے کے لئے تیار ہو جاتا لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے معاملہ میں تحقیقات کا مطالبہ کیا، فرمایا:

مابال النسوة التي قطعن ايديهن ان ربي بكيدهن عليم، کہ پہلے تحقیق کر لیجئے، ان عورتوں کے بارے میں جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، اس لئے کہ جب عزیز مصر کی بیوی نے دیکھا کہ اس کو اپنے مقاصد میں کامیابی نہیں ملی، اور لوگوں میں چرچا شروع ہو گیا کہ محل سرا کی بیگم فریفتہ ہو گئی ہیں، ایک معمولی انسان پر، تو اس نے تدبیر کی اور سب عورتوں کو بلا کر ان کے سامنے حضرت یوسفؑ کو پیش کیا، ان کو دیکھتے ہیں وہ ان پر ایسی فریفتہ ہو گئیں، کہ اپنی انگلیاں کاٹ لیں، ان حالات میں حضرت یوسفؑ نے یہ ضروری سمجھا کہ اس کی تحقیق پہلے کر لی جائے، یہ ہدایت الٰہی بھی تھی، اور نفسیات وخاصیت پیغمبری بھی تھی، انھوں نے کہا کہ اگر اس حالت میں شاہی دربار میں جاؤں گا تو سارے شہر میں چرچا ہو جائے گا کہ وہ تو مجرم تھے اور انھوں نے ڈورے ڈالے تھے، انھوں نے لالچ کی نگاہ ڈالی تھی، اور نہ معلوم کیا کرنے والے تھے، کہ اس کے بعد وہ جیل چلے گئے، پھر بغیر تحقیق کے شاہی دربار چلے گئے محض بادشاہ کی خصوصی نظر عنایت سے ایسا ہوا۔

حضرات: منصب نبوت کے لئے جو بلندی چاہئے، جو عفت، جو برأت اور جو پاکیزگی چاہئے پھر وہ نہ ہوتی، اگر بغیر تحقیق کے حضرت یوسفؑ محض بادشاہ کے بلاوے پر اس کے دربار میں چلے جاتے، اب حکمت خداوندی ہی نہیں، یہ خاص اعجاز قرآنی ہے کہ حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ ”**ارجع الى ربك فاسأله مابال النسوة التي قطعن ايديهن**“ پھر جب تحقیق ہوئی تو نتیجہ یہ سامنے آیا کہ **ماعلمنا عليه من سوء** ہم نے ان کے اندر کوئی کمزوری اور کوئی خرابی نہیں پائی، تب حضرت یوسفؑ پورے اعزاز اور پوری خودداری کے ساتھ بلکہ نور نبوت اور منصب نبوت کیساتھ دربار میں آئے اور وہاں رہے، یہ ساری چیزیں تورات میں موجود نہیں، اس طرح تورات ایک اور بات نظر انداز کرتی ہے، اور وہ ہے، **اجعلني على خزائن الارض اني حفيظ عليهم**، یہ وہی کہہ سکتا ہے، جس پر دعوت کا غلبہ ہو، جس کو انسانیت کے ساتھ برادرانہ نہیں مشفقانہ تعلق ہو، یہ کتنا بڑا خزانہ ہے اور کتنی بڑی مملکت ہے،

لیکن بے محل اس کی دولتیں صرف ہو رہی ہیں، حضرت یوسفؑ نے اس کا خیال نہیں کیا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ انھوں نے عہدہ طلب کیا، اس لئے کہ لوگوں کے مفاد اپنی ذات کے متعلق بد گمانیوں کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور زیادہ قابل ترجیح ہے، اگر کوئی ہمارے متعلق کہے گا کہ وہ لالچی تھے، کوئی حرج نہیں، لیکن ہزاروں ہزار انسانوں کے کام ہوں گے، غریبوں کو پیسے ملیں گے، بھوکوں کو روٹی ملے گی، جو اہل ہیں ان کو عہدہ ملے گا، اس لئے فرمایا'' **اجعلني علی خزائن الارض انی حفیظ علیهم** '' یہ خدا کے سوا کوئی نہیں کہہ سکتا تھا، کوئی سوانح نگار ہوتا تو حضرت یوسفؑ کی سیرت میں اس کا ذکر نہ کرتا کہ اس میں حضرت یوسفؑ کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے، قابل غور بات یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ حضرت یعقوبؑ کے بیٹے پیغمبر کے پوتے اور پر پوتے تھے، اس سے بہتر کیا ہے کہ ان پر حرف آئے، داغ لگے، لیکن لوگوں کو آرام پہونچے، یہ ہے نبوت کا مزاج، اور اس کی نفسیات، یہ صرف نبی کے اندر ہوتی ہے، تورات نے حضرت یوسفؑ کے وعظ اور ان کی حکیمانہ باتوں کو نظر انداز کر دیا ہے جبکہ قرآن نے اس قصے میں ان تمام عناصر کا ذکر کیا ہے، جن سے انسانوں کی رہنمائی ہوتی ہے، اور ان سے سیرت وکردار کی تشکیل میں مدد ملتی ہے۔

مولانا نے سورۂ کہف میں درج واقعات اور حکایتوں کا اختصار کے ساتھ تحلیل وتجزیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے اپنے عربی مقالہ اور کتاب معرکہ، ایمان ومادیت میں ذکر کیا ہے کہ ہر زمانہ میں ایمان ومادیت کے درمیان کشمکش پیش آئے گی، یہ کشمکش ایک خاص شکل میں اصحاب کہف کے زمانہ میں پیش آئی اصحاف کہف نے اپنے زمانہ کی مشرکانہ حکومت کا کس طرح مقابلہ کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو کیسا اعزاز بخشا، آخر زمانے میں کیا کیا واقعات پیش آئیں گے، قیامت تک پیش آنے والی ساری تحریکات، ترغیبات، مادی کشش اور رعنائی دلکشی کی طرف اشارے کئے گئے ہیں، یہ سب چیزیں حکایتوں کے ذریعہ ہمارے سامنے قرآں نے رکھی ہیں، تاکہ ہم ان سے نصیحت اور عبرت حاصل کریں، لیکن ان کہانیوں کو دین کے دائرے سے خارج کر دیا گیا، بس لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ صرف تفریح اور وقت گذاری کے لئے واقعات اور قصے پڑھ لئے جائیں، عربی میں کہانیوں کا بڑا ذخیرہ ہے، الف لیلۃ ہے، جس کی مثال دوسری زبانوں میں نہیں ملتی، اس طرح ابوالفرج اصفہانی کی کتاب بہت مقبول ہوئی لیکن ان

کہانیوں اور واقعات کو اصلاحی اور تربیتی مقاصد سے پڑھنے کے بجائے تفریحی طور پر پڑھا گیا لیکن اللہ کے بندے اپنے اپنے دور میں کام کرتے رہے۔

قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات کا تذکرہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے اندر افادیت ہوتی ہے پھر جس تفصیل کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھی گئی ہے، اور اس کا جتنا بڑا ذخیرہ اسلامی کتب خانہ میں ہے اس کی نظیر نہیں ملتی، نسل انسانی میں سے کسی بھی انسان کے بارے میں اتنی تفصیل کے ساتھ اور اتنی احتیاط، استدلال اور موزونیت کے ساتھ کوئی کتاب نہیں لکھی گئی جتنی کے خاتم النبیین سید المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لکھی گئی ہے۔

حضرات: ہمیشہ ادب کو دین کا معاون سمجھئے اور اس کو بچوں کی نفسیات اور ان کی عمر اور ذوق کے مطابق دین کے حقائق اور اصول وعقائد سے متاثر کرنے کا کام لیجئے اگر اس میں ذرا بھی تاخیر ہو جائے یا ذرا سے چوک ہو جائے تو بڑے سنگین نتائج نکلتے ہیں، مصر میں حکایات الاطفال کے نام سے جو کتابیں لکھی گئیں، اس میں بالتصویر کہانیاں، کتے بلیوں سے متعلق تھیں، یہ کتابیں ندوۃ العلماء میں پڑھائی جاتی تھیں، مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ نے اپنے رسالہ ''صدق'' میں لکھا، کہ جس ادارہ کے معتمد تعلیم مولانا سید سلیمان ندوی ہوں اور جس کے ناظم مولانا حکیم ڈاکٹر عبدالعلی ہوں اس ادارہ میں حکایات الاطفال پڑھائی جاتی ہو، جس میں گائے، بیل کی تصویریں ہوں، حیرت کی بات ہے اسوقت مجھے ایک دھکا سا لگا اور یہ احساس پیدا ہوا تو میں نے حکایات الاطفال کے بجائے قصص النبیین للاطفال کے نام سے ایک کتاب کا سلسلہ شروع کیا، جو الحمد للہ یہیں نہیں بلکہ بلاد عربیہ یہاں تک کہ روس وچین میں بھی پڑھائی جاتی ہے، اس کے ترجمے، انگریزی، ہندی، فرنچ اور اسپینی وترکی میں ہوئے، اس کتاب کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ بنیادی عقائد کو اس طرح بچوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے کہ وہ اس کو کوئی تعلیم وتلقین اور درسی چیز نہ سمجھیں بلکہ ایک بدیہی حقیقت سمجھیں، جیسے روزمرہ کی چیز ہو جیسے انسان کھانا کھاتا اور پانی پیتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ پانی تو پینا ہی چاہئے یہ فطرت کے عین مطابق ہے، اس طرح وہ آسانی سے بغیر کسی پیچیدگی کے عقیدہ توحید کو سمجھ لیتا ہے اور اپنے اوپر دباؤ بھی محسوس نہیں کرتا، نہ دلائل کی وہ تلاش کرتا ہے، قصص النبیین میں آسان کہانیوں کے

ذریعہ تمام بنیادی عقائد دلکش انداز میں بچوں کی نفسیات اور ان کی عمر کے تقاضوں کے مطابق آسان زبان میں بیان کردیئے گئے ہیں اور اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ یہ ان بچوں کو ذہن پر بار نہ ہوں اور ان کا معدہ بھی آسانی سے ہضم کر جائے اور ان کے قول وفعل اور سیرت وکردار میں یہ عقائد گھل مل جائیں۔

خطاب کے آخر میں صدر جلسہ نے جنوب کی سرزمین خصوصاً اس کے مایہ ناز سپوت سلطان کا ذکر کیا اور فرمایا کہ انھوں نے جو کردار ادا کیا وہ ناقابل فراموش کارنامہ ہے، مولانا نے سلطان ٹیپو کے خاندان کے ساتھ ان کے بزرگوں خصوصاً شاہ ابوسعید، شاہ ابواللیث سعید نعمان اور حضرت سید احمد شہید سے تعلق وروابط کا ذکر کیا، اور فرمایا کہ سلطان ٹیپو اور حضرت سید صاحب نے اس سرزمین کو آزاد کرانے کے لئے جو قربانیاں دیں وہ تاریخ کے انبار میں دبی ہوئی ہیں، ان کو ابھارنے کی ضرورت ہے، یہ بھی ادب کا ایک جز ہے کہ اپنے کوتے اور تناسب کے مطابق ہو، یہ چیزیں اس طرح ہماری ادب کی کتابوں میں آئیں کہ ذہن قبول کرے اور بچہ بھی محسوس نہ کرے کہ وعظ کیوں کہا جارہا ہے، ادب کے لئے جس نفسیات انسانی اور نفسیات صبیانی (بچوں کی نفسیات) کی ضرورت ہے، اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے، اور اس پر عمل کرنے کی بھی۔

مولانا نے رابطہ ادب اسلامی کے جلسہ کے بنگلور میں انعقاد پر مسرت ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں بڑی خوشی ہے کہ جنوبی ہند اس کام کو کر رہا ہے، جو بہت سی توانائیوں اور خصوصیتوں میں ممتاز ہے، اس ملک میں سب سے پہلے اس سرزمین نے جنگ آزادی شروع کی تھی، جس کا ایک نمونہ سلطان ٹیپو تھے، ہمیں امید ہے کہ اسلامی ادب کو انشاء اللہ اس سیمینار کے بعد ایک طاقت ملے گی اور اس میں ایک دلکشی پیدا ہوگی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعوت دین میں حکمت و وسعت اور ہر زمان و مکان کے لئے اس کی ہم آہنگی

نحمده و نصلي على رسوله الكريم اما بعد ! فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم ٥ بسم الله الرحمن الرحيم ٥

ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل:

اللہ تبارک و تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج آپ سے ایسے موضوع پر خطاب کرنے کا موقع مل رہا ہے جو میرے دل کی دیرینہ آرزو کی تکمیل ہے، بلکہ قرآن کریم کی اس آیت کو اپنے حسب حال پاتا ہوں۔

هذا تاويل رویای من قبل قد جعلها ربی حقاً (یوسف ۱۰۰)

یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے دیکھا تھا، میرے پروردگار نے اسے سچ کر دیا۔

ہم آپ آج دعوت و تبلیغ دین کے اصول و اسلوب اور اس کے طریق کار کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے جمع ہوئے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ موضوع اس ادارہ کی اصل روح ہے جو آج سے نو سال قبل قائم ہوا تھا۔

قرآن کریم کا اسلوب دعوت کیا ہے؟ یا یوں پوچھئے کہ قرآن کریم دین کی دعوت دینے والے مبلغ کو کیا ہدایت دیتا ہے؟ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے دعوت دین کس طریقے پر اور کن اصولوں پر پیش کی؟ قرآن داعی اور مبلغ کے لئے کیا اوصاف و خصوصیات پسند کرتا ہے؟ کیا دعوت کے متعین حدود اور طریقے مقرر ہیں، جن کا ایک مبلغ پابند ہو سکے، اور جنہیں ایک طالب علم تبلیغ کی درسگاہ میں سیکھ سکے؟

یہ موضوع بہت ہی اہم ہے، قرآن کریم سے اس کا براہ راست تعلق ہے، اور تبلیغ دین

کے موضوع سے بھی اسی طرح اس کا تعلق ہے، اور جب اس موضوع کے تحت اس کے دو تابناک اور ولولہ انگیز پہلو جمع ہو رہے ہوں تو اس کی اہمیت وعظمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

قرآن کریم کا موضوع دعوت وہدایت ہے:

قرآن کریم ہدایت ودعوت کی کتاب ہے، اور احکام وشریعت کی بھی کتاب ہے، لیکن اس کے اندر دعوت وہدایت کا پہلو دوسرے پہلوؤں پر غالب ہے، شریعت واحکام کی اہمیت سے انکار نہیں، اس کی عظمت سر آنکھوں پر، لیکن سوال اولیت واہمیت کا ہے، کونسا پہلو زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اور کس کو اولیت حاصل ہے، اس لحاظ سے اگر دیکھیں تو میرا حقیر مطالعہ یہ ہے کہ شریعت واحکام کے مقابلہ میں دعوت وہدایت کا پہلو قرآن کریم میں غالب ہے، کیونکہ ایمان کی بنیاد ہدایت پر ہے اور تبلیغ پر اس ایمان کے حصول کا دارومدار ہے، لہذا یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دوسرے تمام مضامین ومقاصد پر ہدایت ودعوت کا عنصر قرآن کریم میں نمایاں طور پر غالب ہے۔

دعوت وتبلیغ کا کام قوانین وضوابط کا پابند نہیں ہے:

قرآن کریم نے دعوت وتبلیغ کے کیا اصول بتائے ہیں؟ وہ کیا ضابطے ہیں جن کی پابندی کرنے کا قرآن نے حکم دیا ہے؟ کیا قرآن کریم میں ہمیں تبلیغ ودعوت کے متعین قوانین اور اس کے بے لچک حدود بتائے گئے ہیں؟

میرا خیال ہے دعوت کے طریق کار کو قانون وضابطہ کی زبان میں نہیں بیان کیا گیا ہے اور نہ ایسا کرنا قرین مصلحت اور مقتضائے حکمت ہے، دعوت وتبلیغ کا انداز ماحول اور گردوپیش کے حالات، مخاطبین کے طبائع اور دین کے مصالح کے مطابق متعین ہوتا ہے۔

چونکہ دعوت کو ''صورتحال'' کا سامنا کرنا ہوتا ہے اور ''صورتحال'' ہمیشہ بدلتی رہتی ہے، اس لئے دعوت کے کام میں ''حاضر کلامی'' اور حاضر دماغی دونوں کی ضرورت ہے، مزید یہ کہ دعوت پیش کرنے والوں کو انسانی نفسیات سے گہری واقفیت اور اس کی دکھتی رگوں اور سوسائٹی کے کمزور پہلوؤں پر انگلی رکھ کر بتانا ہوتا ہے، اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مبلغ کو یہ بات کرنی چاہئے، یہ نہیں کرنی چاہئے، اور یہ کام کرنا چاہئے، اور یہ نہیں کرنا چاہئے، اس کو ایسا اسلوب

اختیار کرنا چاہئے اور لوگوں کے سامنے دعوت کو اس طرح پیش کرنا چاہئے، اس کے یہ حدود و ضوابط ہیں، خواہ وہ قوانین کے مرکزی خطوط ہوں، کیونکہ بدلتے ہوئے معاشرے اور تبدیل شدہ صورتحال سے اس کو نمٹنا ہوتا ہے۔

اگر قوانین وضوابط میں اس کو جکڑ دیا جائے تو وہی حال ہوگا جو ایک صاحب کو اپنے ملازم کے ساتھ پیش آتا تھا، جو ایک لطیفہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی صاحب نے ایک ملازم رکھا، ملازم ضرورت سے زیادہ ''قانونی'' واقع ہوا تھا، اس نے مطالبہ کیا کہ مجھے میرے فرائض بتا او رنوٹ کرادیئے جائیں۔ چنانچہ ایک فہرست تیار ہوئی کہ فلاں وقت بازار سے سودا لانا ہے، فلاں وقت گھر صاف کرنا ہے، فلاں وقت یہ کام کرنا ہے اور فلاں وقت وہ کام کرنا ہوگا۔ ملازم نے ان خدمات پر اپنے آپ کو مامور سمجھا جن کی تفصیل اس کی فہرست میں درج تھی، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک بار وہ صاحب جنہوں نے ملازم رکھا تھا، گھوڑے پر سوار تھے، وہ اترنا چاہتے تھے، پاؤں رکاب میں پھنس گیا اور ان کی جان پر بن گئی، اب گھوڑا بھاگ رہا ہے اور یہ گھسٹتے ہوئے جا رہے ہیں۔ اسی حال میں ملازم پر نظر پڑی۔ چیخ کر آواز دی کہ جلد آ اور میری جان بچا۔ ملازم نے کہا۔ ذرا ٹھہریئے میں اپنی فہرست میں دیکھ لوں کہ آیا یہ خدمت بھی میرے فرائض میں ہے یا نہیں؟ اس وقت جب کہ آقا کی جان جا رہی ہے اور وہ موت وحیات کی کشمکش میں ہے، ملازم صاحب نے اپنے اصول وضوابط پر عمل کیا اور آقا اسی ضابطہ پرستی کی نذر ہو گئے اور ملازم ان کے کچھ کام نہ آیا۔ عربوں کو اللہ تعالیٰ نے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی بڑی صلاحیت بخشی ہے، اور ان کے اندر فطرتاً سلامت روی پائی جاتی ہے، ان کے کسی شاعر کا یہ خوب شعر ہے:

اذا کنت فی حاجة مرسلا

فأرسل حکیما ولا توصه

یعنی اگر تمہیں کسی کام سے کوئی آدمی کہیں بھیجنا پڑے تو اس کے لئے ایک عقیل وفہیم آدمی کا انتخاب کرلو اور اس کو (تفصیلی) ہدایتیں نہ دو، کیونکہ وہ خود اپنی سمجھ سے موقع محل کی مناسبت دیکھ کر وہ کام کرلے گا جو تمہارے حقیقی منشاء کے مطابق ہوگا۔

دعوت کے زمانی اور مکانی حدود:

دعوت دین بہت نازک کام ہے، اور اس کی وسعت کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، اس کے کچھ

حدود مکانی ہیں اور کچھ زمانی ، اور دونوں انتہائی وسیع اور پھیلے ہوئے۔ زمانے کے لحاظ سے دیکھئے تو اس کا زمانہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ کسی پیغمبر نے دعوت کا آغاز کیا یا غیر پیغمبر نے اس دعوت کی ابتداء کی اور اس کی انتہاء کوئی بھی نہیں ہے، اسی طرح اس کا مقام (مکانی حدود) بھی متعین نہیں کیا جاسکتا، ہوسکتا ہے کہ داعی مشرق میں ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مغرب میں ہو یا مشرق سے مغرب یا مغرب سے مشرق منتقل ہو جائے، لہٰذا اگر صرف اہل مشرق کو سمجھانے کا طریقہ اس کو معلوم ہے تو مغرب میں وہ افہام وتفہیم کا کام انجام نہیں دے سکتا، اور اگر وہ صرف اہل مغرب کے طبائع اور نفسیات سے واقف ہے تو مشرق میں اس کی دعوت برمحل اور بارآور نہیں ہوگی۔

آیت دعوت کا اختصار واعجاز اس کی وسعت اور گیرائی:

قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے دعوت کے طریق کار کے حدود مقرر نہیں کیے اور یہ کام داعی کی قوت تمیز اور عقل سلیم پر چھوڑ دیا ہے، اس بات کا فیصلہ کہ کب اور کس وقت کونسا طریق کار اختیار کیا جائے، اس کی طرف خود داعی کا ذوق اور عقیدہ رہنمائی کرے گا، اور اس کی دینی فکر جو اس کے احساسات واعصاب پر حکمراں ہے، وہ خود طریق کار کا انتخاب کرلے گی، قرآن کریم نے صرف ایک وسیع حصار قائم کردیا ہے، جس کے اندر دعوت دین کی پوری روح (اسپرٹ) سماگئی ہے، وہ آیت یہ ہے:

ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمة والموعظب الحسنة وجا دلهم بالتی هی احسن ان ربک هو اعلم بمن ضل عن سبیله وهو اعلم بالمهتدین O

(اے پیغمبر) لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ، اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو، جو اس کے رستے میں بھٹک گیا، تمہارا پروردگار اس سے خوب واقف ہے اور جو رستے پر چلنے والے ہیں انہیں بھی خوب جانتا ہے۔

اس آیت کریمہ کی رو سے دونوں باتیں پوری طرح عیاں ہیں، ایک داعی الی اللہ کو کتنی آزادی ہے اور کس درجہ پابندی ہے، کہاں تک وہ جاسکتا ہے، اور کس حد سے آگے قدم بڑھانا ممنوع ہے، جہاں تک دعوت کی وسعت اور داعی کی آزادی کا تعلق ہے، وہ اس تعبیر سے واضح ہے کہ ''ادع الی سبیل ربک'' (بلاؤ اپنے رب کی راہ کی طرف) اس آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا

کہ ایمان کی طرف دعوت دو، یا صحیح اور سچے عقیدہ کی طرف بلاؤ، یا نماز قائم کرنے کی دعوت دو یا اخلاق حسنہ اختیار کرنے کی ترغیب دو، انسانیت کے احترام کی تلقین کرو، یہ سب نہیں کہا گیا مگر یہ تمام باتیں ''سبیل ربک'' میں سمٹ آئی ہیں، اس لفظ نے فکر وعمل کے آفاق کھول دیئے ہیں، یہ آفاق بھی محدود نہیں ہیں، اس میں دوسرے ادیان سماوی، بشری ضروریات، انسانی زندگی میں پیش آنے والی حاجتیں سب داخل ہیں ''ادع'' (بلاؤ) کا لفظ بھی کس درجہ وسیع معانی پر حاوی ہے، اس میں نہ اس کی قید ہے کہ وعظ وتقریر کے ذریعے بلاؤ نہ یہ کہ تحریر کے ذریعے دعوت دو، یہ کہ وعظ وتلقین ہی کا ذریعہ اختیار کرو، یہ لفظ ''ادع'' تمام معانی اپنے جلو میں رکھتا ہے، اور حسب موقع داعی، دعوت کا فرض کبھی پند ونصائح سے کبھی وعظ وتقریر سے اور کبھی تحریر اور دوسرے ذرائع ابلاغ سے ادا کرسکتا ہے، اور بلانے کا ہر وہ وسیلہ اختیار کرسکتا ہے جو مشروع ہو، موثر اور نافع ہو، پھر فرمایا ''سبیل ربک'' اپنے رب کے رستے (کی طرف) اس کے علاوہ کوئی تعبیر ممکن نہیں جس میں اتنی جامعیت اور وسعت، گہرائی اور گیرائی بیک وقت موجود ہو۔

''حکمت'' کا لفظ بہت ہی بلیغ اور بڑے وسعتوں کا حامل ہے، دوسری زبان میں اس کا ترجمہ آسان نہیں ہے، اسی طرح ''موعظت'' بھی وسیع معانی پر حاوی لفظ ہے۔ ''حسنہ'' کا لفظ بھی لامحدود معانی پر مشتمل ہے، قرآن نے اس آیت میں آزادی بھی دی ہے اور حد بندی بھی کی ہے، ایجاز واختصار بھی اور بیان وشرح بھی۔

ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة .

اے پیغمبر! اپنے پروردگار کے رستے کی طرف دانش اور نیک نصیحت سے بلاؤ۔

یہ آیت کریمہ بعثت محمدی سے پیشتر کے سب سے بڑے داعی الی اللہ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں نازل ہوئی ہے، یہ پورا تذکرہ اس طرح ہے:

ان ابراهيم كان امة قانتاً لله حنيفاً ولم يک من المشركين O شاكراً الا نعمه اجتبه وهده الى صراط مستقيم O واتينه فى الدنيا حسنة وانه فى الاخرة لمن الصالحين O ثم اوحينآ اليک ان اتبع ملة ابراهيم حنيفاً وماكان من المشركين O

بے شک ابراہیمؑ (لوگوں کے) امام (اور) خدا کے فرمانبردار تھے جو ایک طرف کے

ہورہے تھے اور مشرکوں میں نہ تھے۔اس کی نعمتوں کے شکر گذار تھے،خدا نے ان کو برگزیدہ کیا تھا اور (اپنی) سیدھی راہ پر چلایا تھا اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبی دی تھی اور وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں ہوں گے۔ پھر ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ دین ابراہیم کی پیروی اختیار کرو جو ایک طرف کے ہورہے تھے،اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا ادع الی سبیل ربک۔الخ

لہذا یہ آیت کریمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت توحید سے مربوط ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات سے دعوت حق کا کیا تعلق ہے،اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ کے ضمن میں اس آیت کا آنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی دعوت میں اسی طریق کار کا ایک اعلیٰ نمونہ تھے،اور یہ کہ آپ کی دعوت ''حکمت وموعظت حسنہ'' کے اصول پر کاربند تھی۔

دعوت کا ایک اہم عنصر،واقعات اور مثالیں:

قرآن کریم نے دعوت کے لئے واقعات بیان کرنے اور مثالیں دینے کا اسلوب اختیار کیا ہے،دوسرے وسائل دعوت کی بہ نسبت یہ طریقہ زیادہ زوداثر اور دلنشین ہے،اور مقصد کے حصول میں یہ طریقہ زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوا ہے،ایک طرف قران کریم نے اگر تفصیلی ضابطے اور قانونی باریکیاں بتانے کو ضروری نہیں سمجھا ہے،تو دوسری طرف اس خلا کو (اگر اس کو خلا سمجھا جائے جو درحقیقت خلا نہیں ہے) انبیاء کرام کی سیرت اور ان کے مواعظ اور دعوت پر مکالموں کے نمونوں سے پر کیا ہے۔یہ نمونے دلوں پر اثر اندازی کی بے انتہا قوت رکھتے ہیں، ذہن وقلب پر ان کا سحر کی مانند اثر ہوتا ہے،کیونکہ عملی نمونوں کا جو اثر ہوتا ہے،وہ کسی دوسرے وسائل دعوت کا نہیں ہوسکتا،منطقی،نفسیاتی،علم کلام کے انداز کے جدلی اصول،دعوت دین کے لئے کارآمد عناصر نہیں ثابت ہوئے ہیں،تمام آسمانی صحیفوں نے شروع سے آخر تک عملی نمونوں پر اعتماد کیا ہے۔یہ نمونے اور مثالیں ادبی شہ پارے ہیں جو دلوں کو موہ لیتے ہیں۔

ان میں سے اکثر واقعات چار برگزیدہ پیغمبروں کی سیرتوں سے ماخوذ ہیں،وہ انبیاء کرام حضرت ابراہیم علیہ السلام،دوسرے حضرت یوسف علیہ السلام،تیسرے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آخر میں خاتم الانبیاء والرسل محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

ایک مومن کی دعوت کا نمونہ جو اپنا ایمان مخفی رکھے ہوئے تھا:

دعوت کے سلسلہ میں ایک اہم نکتہ ہے جس کو قرآن نے فراموش نہیں کیا ہے وہ یہ کہ دعوت کا کام صرف انبیاء کرام تک محدود نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل سکتا تھا کہ ہم کہاں اور اللہ کے پیغمبر کہاں، وہ لوگ اللہ کی نوازش خاص سے بہرہ مند تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے نبوت اور وحی سے نوازا تھا، روح القدس سے ان کی تائید وتقویت کا انتظام فرمایا گیا تھا، ہم عاجز بندے کس طرح ان برگزیدہ انبیاء کرام کی نقل کر سکتے ہیں، ان کے نقش قدم پر چلنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔

قرآن مجید نے اس سبب سے ایک مثال ایسے شخص کی دی ہے جو نبی نہیں تھا، اور نہ پیغمبروں کے ممتاز اور جلیل القدر ہم نشینوں میں تھا، ایک مومن تھا، فرعون کی قوم کا فرد تھا، قرآن کریم نے صرف اس قدر بتایا ہے۔

وقال رجل مؤمن من ال فرعون یکتم ایمانه .

اور فرعون کے لوگوں میں سے ایک مومن شخص نے (جو اپنے ایمان کو مخفی رکھتا تھا) کہا۔

یعنی اس کے حالات اور ماحول نے اس کو دین کے اعلان کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ خواہ وہ ایمانی قوت کے لحاظ سے جس قدر بھی بلند رہا ہو، مگر حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی طرح یا حضرت ابوذر کی طرح اپنے ایمان کا اظہار نہ کر سکا، لیکن وہ مومن تھے اور اپنے ایمان کو اب تک چھپائے ہوئے تھے، انہوں نے اپنے بھائی بندوں کے خلاف جنگ نہیں کی، اور ایک دوست، خیر خواہ اور اپنے دوستوں اور بھائیوں کا بھی خواہ بن کر انہوں نے دعوت دین کا فرض انجام دیا، ایک صاحب ادراک وبصیرت داعی کے لئے اس واقعہ میں ایک نمونہ ہے، اگر وہ اسی صورتحال سے دوچار ہو اور دینی مصلحت کا تقاضہ ہو، اور اس شخص کے لئے بھی نمونہ ہے جو اگر چہ ایسی صورتحال سے دوچار نہیں ہے، مگر کلام کے انداز اور حقیقت سے آگاہ کرنے کا اسلوب، ماضی کے عبرتناک واقعات اور انجام کار کے نتائج سے باخبر کرنے کا طریقہ اس واقعہ سے اخذ کر سکتا ہے:

وکلا وعد الله الحسنی .

اور اللہ نے ان دونوں طبقوں کے لئے بہتر نعمتوں کے وعدے کئے ہیں۔

وما علینا الا البلاغ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے دو نمونے

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم اما بعد ! فاعوذ بالله من الشیطان الرجیم ○ بسم الله الرحمن الرحیم ○

مناسب ہوگا کہ آج ہماری مجلس کا موضوع حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے دو نمونے ہمیں ملتے ہیں، اگر ہم ان دونوں نمونوں کو سامنے رکھیں اور ان کا باہمی موازنہ کریں تو محسوس ہوگا کہ ''حکمت'' (جو دعوت کا اولین عنصر ہے) کس درجہ کمال حسن کے ساتھ ان کی دعوت میں جلوہ گر ہے، اور پیغمبرانہ انداز تبلیغ کی مکمل نمائندگی ان کے طرز خطاب میں موجود ہے۔

ایک نمونہ تو وہ ہے، جبکہ انہوں نے اپنے والد کو دین حق کی دعوت دی، اور دوسرا نمونہ وہ ہے جس میں انہوں نے اپنی قوم کو مخاطب فرمایا، ان دونوں دعوتوں کے انداز بیان میں حکیمانہ تنوع پایا جاتا ہے، صرف انداز گفتگو اور پیرایہ بیان ہی میں فرق نہیں ہے بلکہ موقع کا لحاظ اور مخاطب کی نفسیات کا گہرا علم بھی جھلکتا ہے، اور یہ کہ کس طرح دل کی پہنائیوں میں بات اتاری جائے، آپ اگر ان آیات کو پڑھیں جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس گفتگو کو نقل فرمایا گیا ہے، جو انہوں نے اپنے والد کو دین کی طرف بلانے کے سلسلے میں کی، پھر اس خطاب کو ملاحظہ فرمایئے جو انہوں نے اپنی قوم سے کیا، تو آپ کو دونوں میں واضح فرق نظر آئے گا۔

ایک فرزند اپنے باپ کو دین کی دعوت دیتا ہے:

واذکر فی الکتب ابراهیم انه کان صدیقاً نبیاء إذ قال لأبیه یابت لم تعبد مالا یسمع ولا یبصرو ولا یغنی عنک شیئاً ○ یآبت إنی قد جآء نی من العلم مالم یاتک فاتبعنی اهدک صراطاً سویا ○ یابت

لاتعبد الشیطن ان الشیطن کان للرحمن عصیاً O یابت انی اخاف ان یمسک عذاب من الرحمن فتکون للشیطن ولیا O

اور کتاب میں ابراہیمؑ کو یاد کرو، بے شک وہ نہایت سچے پیغمبر تھے، جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں اور نہ آپ کے کچھ کام آ سکیں؟ ابا مجھے ایسا علم ملا ہے جو آپ کو نہیں ملا تو میرے ساتھ ہو جائیے، میں آپ کو سیدھی راہ پر چلا دوں گا۔ ابا شیطان کی پرستش نہ کیجئے، بے شک شیطان خدا کا نافرمان ہے، ابا مجھے ڈر لگتا ہے کہ آپ کو خدا کا عذاب آ پکڑے تو آپ شیطان کے ساتھی ہو جائیں۔

ان آیات میں حسب ذیل امور واضح طور پر نظر آئیں گے۔

(۱) پدرانہ شفقت کے جذبہ کو ابھارا گیا ہے۔

یا ابت کے طرز خطاب پر غور کیجئے۔ میرے باپ (یا میرے ابا جان اے میرے بابا جس طرح بھی آپ ترجمہ کریں) اس انداز خطاب میں بیٹے کی سعادت مندی، محبت اور فروتنی پوری طرح نمایاں ہے۔ اس انداز خطاب کے لطف کو سمجھنا ذوق سلیم پر موقوف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسماعیلؑ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی زبان سے آشنا کیا ہے۔

اذهب یاابن اخی فقل ماحببت فو اللہ مااسلمک ابداً (۱)

میرے بیٹے! تم اپنا کام کرتے رہو، جو جی چاہے کہو، میں اللہ کی قسم تمہیں کسی کے حوالے نہیں کروں گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دلائل کا حسن انتخاب:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے گفتگو کے وقت منطقی گرفت سے کام نہیں لیا اور نہ ایسی باتیں کہیں جن کو صرف بڑے ذہین لوگ ہی سمجھ سکیں۔ بلکہ روزمرہ کی، آئے دن کی اور جانی بوجھی باتوں سے ابتداء کی، ایسی بات کی جو ایک بچے کی بھی سمجھ میں آ سکے، اور واقعہ بھی یہی تھا کہ ان کے والد اگر چہ عمر رسیدہ تھے، مگر "عقل کا بچپن" ختم نہیں ہوا تھا لہذا ان سے کہا: ابا جان! آپ کیوں ایسی چیز کی پرستش کرتے ہیں جو نہ سنتی ہے نہ دیکھتی ہے اور نہ کسی کام آ سکے، پھر فرمایا کہ مجھ پر وہ حقیقت آشکارا ہو گئی ہے، جس کی آپ کو خبر نہیں، یہ بات بھی بجائے خود

[illegible]

ایک بات کو خوش کرنے والی ہے کہ اس کا بیٹا علم و فہم میں، سمجھ بوجھ میں اس سے بڑھ جائے، اور یہ کوئی اچنبھے کی، یا خرق عادت قسم کی بات نہیں تھی، بہت دیکھا گیا ہے کہ باپ ناخواندہ ہے، اور بیٹا پڑھ لکھ کر عالم فاضل ہوگیا ہے، یا باپ نے کم پڑھا ہے، بیٹا باپ سے بڑھ گیا ہے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ابا جان! مجھ پر وہ حقیقت آشکارا ہوگئی ہے، جس کی آپ کو خبر نہیں ہے، لہذا میری پیروی کیجئے، میں آپ کو صحیح راستہ بتاؤں گا، ابا جان! شیطان کی پرستش نہ کیجئے، شیطان، رحمان کا نافرمان ہے، ان آیات میں سے ہر آیت اپنے اندر بڑی گہرائی رکھتی ہے، معانی و حکمت کے خزانے اس کے اندر بند ہیں، شیطان کا نام تو لیا مگر اس کی ماہیت اور کوئی علمی باتیں نہیں کیں، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے والد جب اس درجہ سادہ لوحی کا کام کر سکتے ہیں کہ بت تراشی کو اپنا پیشہ بنالیں تو ان سے توقع بیکار تھی کہ وہ گہری اور نازک قسم کی بات سمجھ سکیں گے، لہذا ان کو صرف اس قدر بتانے پر اکتفا کیا کہ ابلیس کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ خدائے رحمان و رحیم کا نافرمان ہے، آخر میں کہا ابا جان! مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں (رحمان) سب سے بڑا رحم فرمانے والے کا عذاب نہ آپ پر آ جائے، جس کے نتیجہ میں آپ شیطان کے گروہ کا ایک فرد بن جائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنی قوم کو دعوت فطرت انسانی اور حقائق کی بنیاد پر گفتگو:

ایک انداز بیان یا دعوت کا اسلوب وہ ہوتا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کو مخاطب کرتے وقت اختیار کیا تھا، جو ابھی آپ نے سنا، اب دوسرا انداز بیان یا اسلوب دیکھئے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے اختیار کیا، دونوں کا فرق خود ظاہر ہو جائے گا۔

واتل عليهم نبا ابراهيم ○ اذ قال لابيه وقومه ماتعبدون ○ قالو نعبد اصناماً فنظل لها عكفين ○ قال هل يسمعونكم اذ تدعون ○ اوينفعونكم اويضرون ○ (الشعراء. ۶۹.۷۳)

اور ان کو ابراہیم کا حال پڑھ کر سنا دو، جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں

سے کہا کہ تم کس چیز کو پوجتے ہو؟ وہ کہنے لگے ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور ان کی پوجا پر قائم ہیں۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا وہ تمہاری آواز کو سنتے ہیں؟ یا تمہیں کچھ فائدے دے سکتے ہیں یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

ان آیات کریمہ پر غور کیجئے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیغمبرانہ فراست اور حکیمانہ بالغ نظری کا اندازہ کیجئے۔ انہوں نے اپنی قوم کے معبودان باطل کی کوئی ہجو نہیں کی، اور نہ ان کو برے نام سے یاد کیا، اگر ایسا کرتے تو عین ممکن تھا کہ ان کے مخاطب بھڑ جاتے اور سرے سے بات سننے ہی کے لئے تیار نہ ہوتے۔ لہذا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بجائے خود کچھ کہنے کے انہی کو مجبور کیا کہ وہ بولیں۔ فرمایا ''ماتعبدون''؟ کس چیز کی تم لوگ پرستش کرتے ہو؟

قالوا نعبد اصناماً فنظل لها عكفين O قال هل يسمعونكم اذا تدعونO او ينفعونكم اويضرون (الشعراء ۷۳۔۷۱)

وہ کہنے لگے ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور ان کی پوجا پر قائم ہیں۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا وہ تمہاری آواز کو سنتے ہیں؟ یا تمہیں کچھ فائدہ دے سکتے ہیں یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں منطقی دلائل سے کام نہیں لیا اور نہ فلسفیانہ موشگافی کی، صرف یہ سوال کیا کہ آیا جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری پکار سنتے ہیں؟ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ کیونکہ انسانی زندگی انہی دو بنیادوں پر قائم ہے، انسان کو جب پکارا جائے تو سنے، پھر نفع کی اس سے امید ہو یا نقصان کا خوف ہو۔ یہی وہ دوسرے ہیں، جن سے انسانی زندگی بندھی ہوئی ہے، ایک انسان کا دوسرے انسان سے، ایک سوسائٹی کا دوسری سوسائٹی سے تعلق انہی بنیادوں پر قائم ہے، نفع کی امید اور نقصان کا خوف، سچ یہ ہے کہ زندگی کی پوری گردش ان بنیادی نقطے سے مربوط ہے۔

قالوا : بل وجدنا ابآءنا كذالك يفعلون

کہنے لگے (یہ بات نہیں کہ وہ ہمیں فائدہ یا نقصان پہنچاتے ہیں) بلکہ بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔

یہی وہ بات تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے منہ سے کہلانا چاہتے تھے، کیونکہ یہ

جواب دراصل جہل و عاجزی کا اعتراف ہے، وہ کوئی جواب دے ہی نہیں سکتے تھی، یعنی یہ جو نام وہمی معبودوں کے رکھے ہیں، ان کا کہیں وجود بھی ہے؟ یہ ہاتھوں سے تراشے ہوئے اور پتھروں کے سہارے کھڑے کیے ہوئے بت، یہ وہمی اور افسانوی معبود جن کا کہیں وجود نہیں، ان کی زندگی سے کیا رشتہ ہے، اور انسانوں کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟ کس درجہ کا مداوا بن سکتے ہیں؟ کس مصیبت سے نجات دلا سکتے ہیں، کوئی علمی توجیہ، کوئی حقیقت اور علم پر مبنی بنیاد بھی ان کی ہے؟؟

ذہانت، قوت گفتار اور مخاطب کی مدافعانہ صلاحیت سے فائدہ اٹھانا:

ان آیات کریمہ کو بار بار پڑھیئے، آپ محسوس کریں گے کہ ان میں ایک جہان معانی آباد ہے، ایک معنی سے دوسرے معنی روشن ہوں گے، ایک بات سے دوسری کارآمد بات نکلے گی اور ان دونوں انداز بیان (والد کو دعوت دینے اور قوم کو مخاطب کرنے) کا فرق واضح ہوگا اور یہ اندازہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر برحق حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کس درجہ انسانی نفسیات پر عبور عطا فرمایا تھا اور ذہن وقلب کے باریک سے باریک سوتوں کو جگانے اور صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں مہارت انہیں حاصل تھی، اپنے مخاطبین سے کس طرح انہوں نے وہ سب کچھ اگلوالیا جو ان کے دل و دماغ میں محفوظ تھا، ان کی ذہانتیں، قوت گفتار، مدافعانہ صلاحیتیں سب ظاہر ہوگئیں، اور آخر میں ان کے ترکش کا آخری تیر بھی نکلوالیا (بل وجدنآ ابآئنا کذلک یفعلون) ''بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو اسی طرح کرتے پایا ہے۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ جواب کہلا کر گویا ان سب کی جھولی خالی کروائی، اب وہ دیوالیہ ہو چکے تھے، ان کے پاس کچھ کہنے کو رہ نہیں گیا۔

اب اس کے بعد اپنی دعوت شروع کی، اللہ تعالیٰ کی ذات اور توحید سے ان کو آشنا کرنا شروع کیا، فرمایا:

افرء یتم ماکنتم تعبدون O انتم واٰبآؤکم الاقدمون O فانھم عدولی الا رب العالمین O الذی خلقنی فھو یھدین O والذی ھو یطعمنی ویسقین O واذا مرضت فھو یشفین O والذی یمیتنی ثم یحیین O والذی اطمع ان یغفرلی خطیئتی یوم الدین O (الشعراء ۷۵۔۸۲)

تم نے دیکھا کہ جن کو تم پوجتے رہے ہو تم بھی اور تمہارے اگلے باپ دادا بھی، وہ میرے

دشمن ہیں، لیکن خدائے رب العالمین (میرا دوست) جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی مجھے رستہ دکھاتا ہے اور وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو مجھے شفا بخشتا ہے اور وہ مجھے مارے گا اور پھر زندہ کرے گا، اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہ بخشے گا۔

قرآن کریم کا طرز۔ اثبات مفصل اور نفی مجمل:

یہاں قرآن کریم کا ایک عجیب دل آویز نکتہ ہے جس کی طرف سب سے پہلے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے ایک جملہ سے توجہ ہوئی۔ وہ فرماتے ہیں، فلاسفہ یونان جب اللہ جل شانہ کی صفات کا ذکر کرتے (جس کو وہ اپنی فلسفیانہ زبان میں ''واجب الوجود'' یا ''مبدأ فیاض'' سے یاد کیا کرتے تھے) تو وہ ان صفات کی زیادہ تفصیل اور گہرائی میں جاتے تھے، جو ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے لئے مناسب نہیں ہیں، یعنی سلبی صفتیں (وہ ایسا نہیں ہے، اور اس بات سے مبرا ہے) اور جب اثباتی صفات کا ذکر ہوتا (اللہ ایسا ہے اور اس کی یہ صفت ہے) تو اس میں اجمال سے کام لیتے، اس طرح فلسفہ میں سلبیات کا بیان مفصل ہے، اور ایجابیات کا ذکر اجمالاً ملتا ہے، برخلاف قرآن کریم کے اس میں ایجابیات کی تفصیل ہے اور سلبیات کا اختصار ہے، دوسرے آسمانی مذاہب اور انبیاء کرام کی تعلیمات میں یہی مشترک وصف ملے گا کہ اثبات مفصل اور نفی مجمل ہے۔(۱)

اللہ تعالیٰ کی صفات کا اثبات بیان قرآن کریم کی ان آیات میں پڑھئے:۔

هو الله الذى لآاله الا هو علم الغيب والشهادة هو الرحمن الرحيم O هو الله الذى لآاله الا هو الملك القدوس السلم المؤمن المهيمن العزيز الجبار المتكبر سبحان الله عما يشركون O هو الله الخالق البارئ المصور له الاسماء الحسنى يسبح له مافى السموت والارض وهو العزيز الحكيم O

(الحشر ۲۲۔۲۴)

۔۔ وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا، وہ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے، وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، بادشاہ حقیقی، پاک ذات

---

(۱) کتاب النبوت از شیخ الاسلام ابن تیمیہ۔ (الفاظ مؤلف کے ہیں)

(ہر عیب سے) سالم، امن دینے والا، نگہبان، غالب، زبردست، بڑائی والا، خدا ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے، وہی خدا (تمام مخلوقات کا) خالق، ایجاد و اختراع کرنے والا، صورتیں بنانے والا، اس کے سب اچھے سے اچھے نام ہیں، جتنی چیزیں آسمانوں اور زمینوں میں ہیں، سب اس کی تسبیح کرتی ہیں اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

اور سلبی صفت کا ذکر پڑھئے:

لیس کمثله شیٔ وهو السمیع البصیر O (الشوریٰ ۱۱)

اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ دیکھتا سنتا ہے۔

امام ابن تیمیہؒ نے مزید فرمایا کہ سلبی صفات خواہ سینکڑوں کی تعداد میں ہوں، ان کا وہ اثر نہیں پڑ سکتا جو ایک اثباتی بیان کا ہوتا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے بالکل سچی بات کہی ہے، حقیقت یہی ہے کہ ہماری یہ زندگی اور گزری ہوئی نسلوں کی زندگیاں گواہ ہیں کہ انسانی زندگی اثبات پر قائم ہے، نہ کہ نفی پر، نفی کی نسبت انسانی زندگی اور تمدن میں بہت معمولی ہے۔

دلی جوش اور امنگ کے ساتھ اللہ کا تذکرہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس جواب کو سن کر کہ "ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں، اور انہی پر جمے بیٹھے رہتے ہیں، فرمایا کہ "کیا تمہاری وہ سنتے ہیں، جب تم ان کو پکارتے ہو، کیا تم کو فائدہ پہنچاتے ہیں، یا ضرر پہنچاتے ہیں؟" اس ارشاد میں "نفی مجمل" ہے، اور جب اللہ کا تذکرہ ہوا اور دعوت کی بات آئی تو اس میں وسعت و بیانی اور فراخ دامانی سے کام لیا، اور اثبات مفصل کا رنگ آ گیا، اور فرمایا:

فانهم عدولی الا رب العلمین O الذی خلقنی فهو یهدین O والذی هو یطعمنی ویسقین O واذآ مرضت فهو یشفین O والذی یمیتینی ثم یحیین O والذی اطمع ان یغفرلی خطیئتی یوم الدین O (الشعراء ۷۷، ۸۲)

وہ میرے دشمن ہیں لیکن خدائے رب العالمین (میرا دوست ہے) جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی مجھے رستہ دکھاتا ہے، اور وہ مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو مجھے شفاء بخشتا ہے، اور وہ جو مجھے مارے گا اور پھر زندہ کرے گا، اور وہ جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہ بخشے گا۔

ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی پانچ صفات کا ذکر ہے۔ (تخلیق، ہدایت، رزق، شفا اور موت وحیات پر قدرت) جبکہ بتوں کے سلسلہ میں جو سوال کیا اس میں صرف دو باتیں دریافت کی تھیں، کیا وہ دعا سنتے ہیں؟ اور کیا وہ نفع وضرر پر قدرت رکھتے ہیں؟ لیکن جب اللہ کا نام آیا اور اس کا ذکر شروع کیا تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس کی روح جھوم اٹھی ہو اور وجد سا آ گیا ہو۔ جوش اور امنگ کے ساتھ بیان کرنے لگے۔ فطری بات ہے کہ انسان جب کسی شے میں لذت محسوس کرتا ہے تو اگر وہ کھانے کی ہوتی ہے تو دیر تک منہ میں رکھتا ہے، کام ودہن کو زیادہ سے زیادہ مزہ لینے کا موقع دیتا ہے، لیکن اگر کوئی تلخ شے ہوئی، اور اس کا استعمال ضروری ہوا تو جلد سے جلد اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے، اور ایک ہی گھونٹ یا ایک ہی نوالہ میں اس کو حلق سے اتار لیتا ہے۔

چنانچہ انہوں نے جب اللہ تعالیٰ کا ذکر چھیڑا تو جذبات میں جوش اور ایمان میں حرکت آ گئی، اور فرمایا: ''یہ میرے لئے باعث ضرر ہیں، مگر ہاں رب العالمین! جس نے مجھے پیدا کیا اور پھر وہی میری رہنمائی کرتا ہے، اور جو کہ مجھے کھلاتا پلاتا ہے، اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھ کو شفا دیتا ہے اور جو مجھ کو موت دے گا، پھر مجھے زندہ کرے گا، اور جس سے مجھے امید ہے کہ قیامت کے روز میری غلط کاریوں کو معاف کر دے گا۔''

دل کی آواز موقع ومناسبت کی جستجو نہیں کرتی:

اتنا کہنے کے بعد بھی ان کی طبیعت سیر نہیں ہوئی، جیسے ہی اللہ کا نام زبان پر آیا دل امنڈ آیا، موقع ومناسبت سے بے نیاز ہو کر دل کی آواز دعا بن کر نکلنے لگی:

رب هب لی حکماً والحقنی بالصلحین O واجعل لی لسان صدق فی الاخرین O وجعلنی من ورثة جنة النعیم O (الشعراء ۸۳۔۸۵)

اے پروردگار، مجھے علم ودانش عطا فرما اور نیکوکاروں میں شامل کر اور پچھلے لوگوں میں میرا ذکر نیک کر اور مجھے نعمت کی بہشت کے وارثوں میں کر۔

اتنا عرض کرنے کے بعد باپ کی یاد آ گئی، کیونکہ وہ بت پرستوں کے قائد اور مندر کے بڑے پجاری اور مشہور کاہن تھے، اور فرمایا:

ولا تخزنی یوم یبعثون O یوم لاینفع مال ولا بنون O الا من اتی اللہ

بقلب سلیم O (الشعراء ۸۷۔۸۹)

اور جس دن لوگ اٹھا کر کھڑے کئے جائیں گے مجھے رسوا نہ کیجیو جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا اور نہ بیٹے، ہاں جو شخص خدا کے پاس پاک دل لے کر آیا (وہ بچ جائے گا۔)

ان آیتوں کے بعد یہ بھی پڑھئے:

ان ابراھیم کان امة قانتاً لله حنیفاً ولم یک من المشرکین O شاکرا لانعمه اجتبه وھده الیٰ صراطٍ مستقیم O واتینه فی الدنیا حسنةً وانه فی الاخرة لمن الصالحین O (النحل ۱۲۰۔۱۲۲)

بے شک ابراہیمؑ (لوگوں کے) امام (اور) خدا کے فرمانبردار تھے جو ایک طرف کے ہو رہے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے، ان کی نعمتوں کے شکر گزار تھے، خدا نے ان کو برگزیدہ کیا تھا، اور (اپنی) سیدھی راہ پر چلایا تھا، اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبی دی تھی اور وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں ہوں گے۔

وما علینا الا البلاغ المبین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت یوسف علیہ السلام کے طرز تبلیغ کا ایک نمونہ

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم اما بعد O فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم O بسم اللہ الرحمن الرحیم O

نبیاء کرام علیہم السلام کے طرز تبلیغ کی جو مثالیں گزشتہ دو خطبوں میں پیش کی گئی ہیں، آج کا خطبہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اور موضوع پر کل جہاں بات ختم کی گئی تھی، آج وہیں سے اس کی ابتداء کرتے ہیں، پیغمبرانہ طرز دعوت و تبلیغ کے دو حکیمانہ انداز ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں ملتے ہیں۔ دعوت کا ایک طرز تو وہ تھا، جو انہوں نے اپنے والد کو مخاطب ۔ ختیار کیا، جس کا ذکر سورۂ مریم میں ہے، اور دوسرا طرز وہ ہے جو انہوں نے اپنی پنے وال ۔ ساتھ مخاطب کرتے ہوئے اختیار کیا، جس کا ذکر سورۃ الشعراء میں ہے۔

آج ایک اہ نمو ۔ پیش کروں گا، یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے طرز دعوت کا نمونہ ہے، سب سے پہلے آئیے ہم ان آیات کریمہ کو پڑھیں، جن میں اس دعوت کا ذکر ہے:

ودخل معه السجن فتين قال أحدهما إني ارني اعصر خمرا وقال الاخر انی ارنی احمل فوق راسی خبزا تاکل الطير منه نبئنا بتا ويله انا نراک من المحسنين O قال لايأتيكما طعام ترزقنه الا نباتكما بتاويله قبل ان ياتيكما ذلكما مما علمنی ربی انی ترکت ملة قوم لايؤمنون بالله وهم بالاخرة هم كفرون O واتبعت ملة ابآء ی ابراهيم واسحق ويعقوب ماكان لنا ان نشرک بالله من شئ ذلک من فضل الله علينا وعلى الناس ولكن اكثر الناس لايشكرون O يصاحبی السجنء ارباب متفرقون خير ام الله الولد القهار O ماتعبدون من دونه الآ اسمآء سميتموهآ انتم وابآؤکم ماانزل الله بها من سلطن ان الحكم الا لله امر ان لاتعبدوا الا اياه ذلک الدين القيم ولكن اكثر الناس لايعلمون O يصاحبی السجن امآ احدكما فيسقی ربه خمرا واما الاخر فيصلب فتاكل الطير من

راسه قضی الامر الذی فیه تستفتین O (یوسف ۳۶ تا ۴۱)

اوران کے ساتھ دواور جوان بھی داخل زنداں ہوئے ،ایک نے ان سے کہا کہ (میں نے خواب دیکھا ہے) دیکھتا کیا ہوں کہ شراب کے لئے انگور نچوڑ رہا ہوں،دوسرے نے کہا کہ میں نے بھی خواب دیکھا ہے، میں یہ دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں،اور جانوران سے کھارہے ہیں،تو ہمیں ان کی تعبیر بتادیجئے کہ ہم آپ کو نیکوکار دیکھتے ہیں۔یوسف علیہ السلام نے کہا کہ جو کھانا تم کو ملنے والا ہے وہ آنے نہیں پائے گا کہ میں اس سے پہلے تم کو ان کی تعبیر بتادوں گا،یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھائی ہیں، جو لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے اور روز آخرت کا انکار کرتے ہیں، میں ان کا مذہب چھوڑے ہوئے ہوں اور اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق اور یعقوبؑ کے مذہب پر چلتا ہوں،ہمیں شایاں نہیں کہ کسی چیز کو خدا کے ساتھ شریک بنائیں، یہ خدا کا فضل ہے ہم پر بھی اور لوگوں پر بھی،لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ،میرے جیل خانے کے رفیقو! بھلا کئی جدا جدا آقا اچھے یا ایک خدائے یکتا وغالب؟ جن چیزوں کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو،وہ صرف نام ہی نام ہیں، جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں،خدا نے ان کی کوئی سند نہیں نازل کی،سو سن رکھو کہ خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے،اس نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو،یہی سیدھا دین ہے،اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ،میرے جیل خانے کے رفیقو! تم میں سے ایک جو پہلا خواب بیان کرنے والا ہے، وہ تو اپنے آقا کو شراب پلایا کرے گا،اور جو دوسرا ہے وہ سولی دیا جائے گا اور جانور اس کا سر کھائیں گے، جو امر تم مجھ سے پوچھتے ہو وہ فیصل ہو چکا ہے۔

ایک انوکھا ماحول جس میں حضرت یوسفؑ نے دعوت دی:

ان آیات کریمہ کی تشریح سے پہلے اپنے ذہن میں اس انوکھے ماحول کا ایک نقشہ سامنے لائیے ،جو اس دعوت کے وقت تھا،اوران حالات کو پیش نظر رکھئے ،جن میں حضرت یوسف علیہ السلام نے کار دعوت انجام دیا۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کون تھے؟ حضرت یوسف علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے ،حضرت اسحاق کے پوتے اور حضرت ابراہیم کے پڑپوتے ہیں،یہ وہی حضرت یوسف علیہ السلام ہیں،جن کے بارے میں رسول اللہ

ﷺ نے فرمایا، ''الکریم بن الکریم بن الکریم بن الکریم'' (ایک برگزیدہ، برگزیدہ کے صاحبزادے، برگزیدہ کے پوتے، برگزیدہ کے پڑپوتے) نسب دیکھئے تو سب سے اعلیٰ، خاندانی شرافت میں سب سے بلند، نبوت کی میراث دیکھئے تو کئی پشتوں سے اس کے حامل، اللہ تعالیٰ جل شانہ کی معرفت دیکھئے تو یہ بھی خاندانی ورثہ، سیرت اور اخلاق دیکھئے تو پشتہا پشت سے ان کے خاندان میں یہ دولت منتقل ہوتی آ رہی ہے، آسمانی صحیفوں میں ان کا ذکر ہے، دین و دانش، ادب و حکمت کی کتابوں میں ان کا قصہ موجود ہے۔ جمال ظاہری میں بے مثال تھے، اللہ تعالیٰ نے حسن صورت اور حسن سیرت کا جامع بنایا تھا، ظاہری شکل و وجاہت کا اگر وہ نمونہ تھے، تو دوسری طرف پاکیزہ اخلاق اور کردار کی بلندی کا بھی آئینہ تھے، ان کی ذات حسن صورت، حسن سیرت اور جمال عقل و فکر (اگر یہ تعبیر مناسب ہو تو) کی جامع تھی، اس کے ساتھ طبیعت میں گداز، احساس و جذبات میں لطافت اور فطری شرافت کا عنصر مستزاد تھا، وہ صحیح معنی میں حسن کامل کا پرتو تھے، یہ حسن ان کی ظاہری وجاہت کی طرح ان کے عادات و اطوار، طرز کلام اور طرز فکر سے بھی آشکارا تھا۔

ان آیات کریمہ کی ادبی شان اور بلاغت کا لطف لینے سے پہلے ہمیں اس ماحول کو بھی اپنے سامنے رکھنا چاہئے، جس میں حضرت یوسفؑ نے اپنی دعوت پیش کی تھی، ان آیات کریمہ کو پڑھئے:

وجآءت سيارة فارسلو واردهم فادلى دلوه (یوسف ۱۹)

اب خدا کی شان دیکھو کہ اس کنویں کے قریب ایک قافلہ وارد ہوا اور انہوں نے پانی کے لئے اپنا سقا بھیجا۔ اس نے کنویں میں ڈول لٹکایا۔

ثم بدا لهم من بعدما راو الايت لسجننه حتىٰ حين O (یوسف ۳۵)

پھر باوجود اس کے کہ وہ لوگ نشان دیکھ چکے تھے، ان کی رائے یہی ٹھہری کہ کچھ عرصے کے لئے ان کو قید ہی کر دیں۔

حضرت یوسفؑ کو جیل میں ڈال دیا جاتا ہے اور ایک ایسی تہمت لگائی جاتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا بری اور بے قصور ثابت کر دیا، جیسے خون ریزی کی تہمت سے وہ بھیڑیا بری تھا، جس پر حضرت یوسف علیہ السلام کو پھاڑ کھانے کا الزام ان کے بھائیوں نے لگایا

تھا۔(۱)

بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام جیل میں ایک تہمت کی بناء پر مجرم کی حیثیت سے داخل کیے جاتے ہیں، جیل خانوں میں حکام بالا کے احکام کی صرف تعمیل ہوتی ہے، جیل خانہ کے عملہ کو حق و ناحق سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، وہ عملہ تو قیدیوں کو اس طرح اپنی تحویل میں لیتا ہے، جیسے ہم لوگ ڈاک وصول کرتے ہیں، ڈاکیہ کو بھی اس سے مطلب نہیں کہ ان خطوط میں کیا ہے، اور لینے والا بھی بغیر کسی جرح قدح کے اس کو وصول کر لیتا ہے، اب خواہ اس میں کوئی تار ہو، جس میں اچانک کسی حادثہ کی خبر ہو یا کوئی خوشخبری ہو، غرض جیل خانے کا عملہ جمادات یا اشیاء منقولہ کی طرح قیدیوں سے بھی معاملہ کرتا ہے، انہوں نے حضرت یوسفؑ کا ہاتھ پکڑ لیا، اب انہیں کیا معلوم کہ کون ہیں اور کس خاندان کے چشم و چراغ ہیں، اور کس درجہ بلند اخلاق کے حامل ہیں، ان کو تو صرف یہ معلوم تھا کہ ان کے لئے جیل میں ڈالے جانے کا حکم صادر ہوا ہے، لہذا انہوں نے دوسرے قیدیوں کی طرح ان کو بھی داخل زندان کر دیا، جب حق و ناحق کا فیصلہ جیل کے باہر نہ ہو سکا تو پھر جیل کی چہار دیواری کے اندر کیونکر ممکن تھا؟ اس کے آہنی پھاٹک کے پٹ جب بند ہو گئے تو اس کے اندر جو بھی ہے، یکساں ہے، باہر کی صاف ہوا سے سب محروم کر دیئے جاتے ہیں۔ جیل خانہ کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے، اور قیدیوں کو باتیں کرنے کا وقت ہی وقت ہوتا ہے۔

احترام واعتماد کا مرکز:

باوجود اس کے کہ سب قیدی برابر ہوتے ہیں، حضرت یوسفؑ تھوڑے ہی دنوں میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئے، قیدیوں میں (ان کی شرافت وحسن اخلاق کا) عام چرچا تھا، ان کے ماحول پر چھائی ہوئی تاریکی، ان کے اخلاق کریمانہ کی نورانیت سے چھٹ گئی، سنجیدگی، وقار، کردار کی بلندی، سیرت کی پختگی، عبادت میں یکسوئی اور پھر ملنے ملانے میں خندہ پیشانی، عجز و انکساری، ہر ایک سے اخلاق و مروت کا برتاؤ، کوئی چیز ایسی نہ تھی، جس کا اثر نہ پڑتا، قیدیوں کے دل بے اختیار ان کی طرف کھنچنے لگے، اور وہ ان کا احترام کرنے پر مجبور ہو گئے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے منشاء و مصلحت کا مظہر تھا۔

---

(۱) یہ عربی کا ایک محاورہ ہے کہ فلاں شخص اس تہمت سے ایسا بری ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے خون سے بھیڑیا بری تھا۔ (مترجم)

اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ قیدیوں میں دو قیدی دو مختلف قسم کے خواب دیکھتے ہیں، خواب آئے دن کے خوابوں سے مختلف اور ذرا نرالی قسم کے تھے، ایک نے دیکھا کہ وہ شراب کشید کر رہا ہے، اس کے اعصاب پر (کابوس کی طرح) یہ خواب سوار ہو گیا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس خواب کی کیا تعبیر ہوگی، دوسرا شخص دیکھتا ہے کہ وہ سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہے، جس کو پرندے کھا رہے ہیں، یہ بھی عجیب وغریب قسم کا خواب تھا، اللہ نے ان کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام سے رجوع کریں، خوابوں کی تعبیر لینے کے لئے ان کا حضرت یوسف علیہ السلام سے رجوع کرنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کی انسانی فطرت مردہ نہیں تھی، اور ان میں مشاہدہ کی قوت باقی تھی، اور یہ ہوتا آیا ہے کہ لوگ علم ومنطق سے زیادہ اپنے مشاہدات وتجربات پر اعتماد کرتے ہیں، بہرحال ان دونوں نے اپنے اپنے خواب بیان کئے، ایک نے کہا کہ میں اپنے آپ کو شراب کشید کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، دوسرے نے کہا کہ میں اپنے سر پر روٹی دیکھتا ہوں، جس کو پرندے کھا رہے ہیں، براہ کرم اس کی تعبیر دیجئے، آپ ہمیں بہت بھلے انسان دکھائی دیتے ہیں۔ (ہم آپ کو ان لوگوں سے پاتے ہیں، جو احسان کرتے ہیں۔)

احسان کا مفہوم:

خواب کی تعبیر پوچھنے والوں نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا "انی ارٰک من المحسنین" یعنی آپ ہم کو ان لوگوں میں سے دکھائی دیتے، جو احسان کرتے ہیں، یہاں پر احسان کا کیا مفہوم ہے؟ کیا حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس کوئی دولت تھی، جسے انہوں نے چھپا کر رکھا تھا اور قیدیوں میں اس کو تقسیم کیا کرتے تھے، احسان کرنے کا لفظ سن کر ہمارے ذہن میں جو بات پہلے آتی ہے وہ یہی ہے، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام جس حالت میں تھے، اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات صرف نہ خلاف عقل بلکہ محال معلوم ہوتی ہے۔

احسان کا مطلب ہے کسی کام کو بہتر سے بہتر طریقہ پر انجام دینا، جو کمال کا درجہ ہے۔

جب رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ احسان کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

ان تعبدو اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ

اگر چہ تم اس کو دیکھ نہیں رہے ہو لیکن وہ تو تم کو دیکھ ہی رہا ہے۔

لہٰذا یہاں احسان کا مفہوم یہ ہے کہ ہم آپ کو عبادت میں درجہ احسان پر فائز پاتے ہیں، آپ کو گفتگو میں، معاملہ میں ہر چیز میں اس کمال کے درجہ پر پاتے ہیں جو احسان کا درجہ ہے، چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے گرد و پیش تہمت اور بدنامی کے ہالے پڑ چکے تھے (جمال ظاہری میں حضرت یوسف علیہ السلام ایک مہ تابندہ تھے، اس لئے ان کے گرد و پیش تہمت اور بدنامی کے ماحول کو ہالہ سے تعبیر کرنا مناسب ہوگا) لوگ کچھ کا کچھ گمان کرنے لگے تھے، چرچے ہو رہے تھے، قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں، کوئی کہتا آخر جیل میں کیوں ڈالے گئے، کسی نے کہا ضرور ایسا کیا ہوگا، کسی نے کہا۔ اس سے ایسا نہیں ہوسکتا، لیکن یہاں جیل میں یہ سب ہالے ختم ہوگئے، اور ایک دوسرا ہالہ اس صورت و سیرت کے "ماہ تاباں" کے گرد دکھائی دینے لگا، یہ تھا احترام اور تحسین و تعریف کا ہالہ۔

بھیانک خوابوں سے زیادہ قابل فکر بات:

حضرت یوسف علیہ السلام نے محسوس فرمالیا کہ جو چیز ان دونوں کو لائی ہے، اور جس کی وجہ سے یہ مجبور ہو کر آئے ہیں، وہ ان کے بھیانک خواب ہیں، اور یہی ان بیچاروں کا معیار علم ہے، اور یہ لوگ اسی طرح کی باتوں کو زندگی کا اہم ترین مسئلہ سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک رنج و راحت، کامرانی اور ناکامی کا تصور اس دو روزہ زندگی سے وابستہ ہے۔

مگر حضرت یوسف علیہ السلام آغوش نبوت کے پروردہ تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں بصیرت کی دولت عطا فرمائی تھی، رسالت خداوندی کے لئے ان کے مزاج کو ڈھالا گیا تھا، وہ سمجھ گئے کہ یہ دونوں قید و بند کے رفیق جس حقیقت کو فراموش کر رہے ہیں، وہ ان خوابوں سے کہیں زیادہ قابل فکر بات ہے، وہ حقیقت ہے، ایمان باللہ کی، یعنی اس ذات پاک پر ایمان جو اس کائنات کا خالق و مدبر ہے، اور وہ حقیت ہے توحید کی جس میں شرک کی آمیزش نہ ہو، اور کیا اس زندگی کی (خواہ کتنی ہی طویل ہو) حقیقت ایک خواب سے زیادہ ہے؟ ان دونوں رفیقان قید و اسارت کو اس طویل خواب کی تعبیر جاننا زیادہ ضروری تھا اور وہ اس کے زیادہ محتاج اور ضرورت مند تھے، ان کا بھولنا یا فراموش کر دینا زیادہ خطرہ اور سخت نقصان کی بات ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو جو اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر جذبہ ہمدردی اور لوگوں کی خیر خواہی کا ذوق عطا

فرمایا تھا، اس کا تقاضہ یہی تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام انہیں اصل خطرہ سے آگاہ فرمائیں اوران کوایسی بات بتائیں جوان کے لئے بنیادی طور پر نفع بخش ہو، اور خاص طور پر اس وقت جبکہ بات سمجھنے کے لئے ذہن تیار ہو چکا ہے، اوردماغ پرایک دھچکہ لگ چکا ہے، خواہ کسی معمولی ہی سبب کی بنیاد پر، بہر حال یہ ایک موقع پر بات سمجھانے کا اور ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد ایسا موقع نہ ملے، لہذا حضرت یوسف علیہ السلام نے مناسب سمجھا کہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے، اوران کے دماغ کی نرم مٹی میں ایک اچھا تخم ڈال ہی دیا جائے، خواب کی تعبیر نے ایک اچھی تقریب اور مناسب سلسلہ کلام پیدا کردیا ہے، اس کے ذریعہ اللہ کے دین کی طرف دعوت دی جائے، اوران کی فطرت سلیم کو بیدار کیا جائے کہ وہ واضح اور قابل فہم عقیدۂ توحید کو پاسکیں۔

آغاز گفتگو کا حسین پیرایہ:

گفتگو کا آغاز کس حسین پیرایہ سے کیا گیا ہے، اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے، ایک اعلیٰ درجہ کی بات کے لئے گفتگو کا پیرایہ بھی اعلیٰ درجہ کا ہونا چاہئے، آداب کلام میں اس کی بڑی اہمیت ہے، اگر ایسا نہ ہو تو بات کا حسن ختم ہوجاتا ہے، جس طرح ایک پرشکوہ اور حسین عمارت کے لئے ضروری ہے کہ اس کا پھاٹک بھی دیدہ زیب اور عالیشان ہو جس کو دیکھتے ہی عمارت کی اہمیت معلوم ہو اور آدمی اندر داخل ہونے میں سہولت ومسرت محسوس کرے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی گفتگو کا آغاز اس طرح فرمایا کہ پہلے تو ان کو مطمئن کیا کہ وہ ان خوابوں کی تعبیر دے سکتے ہیں، اور جس مقصد سے یہ لوگ ان کے پاس آئے ہیں، ان میں ان کو کامیابی ہوگی، انہوں نے انتخاب میں کوئی غلطی نہیں کی ہے، وہ صحیح منزل پر آگئے ہیں، جس شخص سے انہوں نے رجوع کیا ہے، وہ اس کام کا اہل ہے جس کی انہیں ضرورت ہے، اور جوان کو اس ذہنی الجھن سے نکال کر صحیح طریقۂ عمل بتاسکتا ہے۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ ایک ضرورت مند یہ چاہتا ہے کہ اس کی ضرورت جلد سے جلد پوری ہوجائے۔ ایک مریض جب کسی معالج کی پاس جائے کہ وہ اس کے مرض کی تشخیص کرکے دوا تجویز کرے اور وہ معالج ٹال مٹول کرنے لگے یا یہ کہنے لگے کہ میں کتابیں دیکھ کر بتاسکوں گا، ذرا میں فلاں ڈاکٹر، فلاں حکیم سے مشورہ کرلوں تو مریض کا دل ٹوٹ جائے گا، اور وہ مایوس ہوکر واپس چلا جائے گا، اور شاید دوبارہ کبھی اس معالج کی طرف رخ بھی ... لہذا گفتگو کا

پہلا جزو یہ ہوتا ہے کہ طالب حاجت کے دل میں اعتماد پیدا کر دیا جائے کہ وہ جس کے پاس آیا ہے، وہ کاربرآری کی صلاحیت رکھتا ہے، اور اس کی ضرورت پوری ہو جائے گی: "قال **لایأتیکما طعام ترزقنه الا نبأتکما بتاویله**" فرمایا: جو کھانا تم کو ملنے والا ہے وہ آنے نہیں پائے گا کہ میں اس سے پہلے تم کو اس کی تعبیر بتا دوں گا، یعنی ان کی ضرورت بلاتاخیر پوری کر دی جائے گی، اس طرح کہ وہ جو پوچھنا چاہتے ہیں، اس کا جواب ان کو بعجلت مل جائے گا، ظاہر ہے کہ وہ دونوں قیدی تھے، اور جیل خانہ کے قوانین کے پابند، زیادہ دیر تک حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے، لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہارا کھانا (جو آیا کرتا ہے) پہنچنے بھی نہ پائے گا کہ میں تم کو خواب کی تعبیر بتا کر رخصت کر دوں گا۔

اس آیت کی تفسیر دو طریقوں سے کی گئی ہے۔

پہلی تفسیر:

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: "**لایأتیکما طعام ترزقنه الا نبأتکما بتاویله**" یعنی قبل اس کے کہ تمہارا کھانا جو تم کو ملتا ہے، یہاں آ جائے، میں اس کی تفصیل بتا دوں گا، یعنی کھانے میں آج کیا آنے والا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا منشاء یہ تھا کہ ان کو باور کرا دیں کہ وہ کچھ غیب کی باتیں بتانے پر قادر ہیں اور اس طرح ان دونوں کو اطمینان دلا دیں کہ وہ خواب کی تعبیر بیان کرنے کے اہل ہیں۔

دوسری تفسیر:

پہلی تفسیر (جو اوپر بیان کی گئی) میرے نزدیک قابل قبول نہیں ہے، اولاً اس لئے کہ غیب میں کیا ہے، اس کی نشاندہی اس سے ثابت نہیں ہوتی ہے، جیل خانوں میں کھانے متعدد، اقسام وانواع کے نہیں دیئے جاتے، ایک ہی دو قسم کے کھانے الٹ پھیر کر دیئے جاتے ہیں، ہر قیدی آسانی سے قیاس کر سکتا ہے کہ کھانے میں کیا ملنے والا ہے، اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی کون سی غیر معمولی صلاحیت کا اظہار ہوتا؟ تورات میں مذکور ہے کہ حضرت یوسفؑ کے سپرد قیدیوں کے کھانے کا انتظام بھی تھا، اگر یہ صحیح ہے تو بات اور بھی معمولی ہو جاتی ہے، ایک شخص جو باورچی خانے کا منتظم ہے، وہ کسی کو بتا دے کہ آج کھانے میں کیا دیا جائے گا، اس میں کونسی

قابلیت ہے؟

میرا رجحان یہ ہے کہ اس آیت کی وہ تفسیر درست ہے (جو بعض تفسیروں میں ہے) جس میں اس آیت کا یہ مطلب بتایا گیا ہے کہ ''تمہارا کھانا آنے بھی نہ پائے گا کہ میں تمہیں خوابوں کی تعبیر بتادوں گا۔'' تاکہ ان خواب دیکھنے والے قیدیوں کو اطمینان ہوجائے کہ تاخیر نہیں ہوگی، اس کی نوبت نہیں آئے گی کہ جیل کا نگراں آکر ڈانٹے اور کہے کہ اپنی اپنی جگہ جاؤ، یہاں تم کیسے آگئے؟ کیوں آئے؟ مصر حضرت یوسف علیہ السلام کے وقت میں بھی خاصا متمدن ملک تھا، کھانے کے اوقات متعین تھے، کھانے کا وقت آچکا تھا، اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ کھانا جو آرہا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تم کو تعبیر بتاکر فارغ کردوں گا۔

مرغوب اور پسندیدہ چیز کے ذکر سے طبیعت میں نشاط پیدا ہوتا ہے:

ایک نکتہ ابھی سمجھ میں آیا کہ قیدیوں کے لئے کھانے کا ذکر بہت پسندیدہ ہوتا ہے، لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام نے کھانے کا ذکر فرماکر ان کے اندر ایک نشاط پیدا کردیا، کھانے کا ذکر ہر ایک کے لئے پسندیدہ ہے، چہ جائیکہ قیدیوں کے لئے، ان کے لئے تو اور بھی رغبت کی چیز ہے، لہٰذا جب حضرت یوسفؑ نے اس کا ذکر کیا تو ان کے دل کھل اٹھے، اور مزید باتیں سننے کے لئے کان آمادہ ہوگئے۔

پھر مزاج سبوت ابھر کر سامنے آتا ہے، تعبیر خواب کی صلاحیت کو اپنی قابلیت پر محمول نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا نتیجہ بتاتے ہیں، اور یہیں سے بات کا رخ پھیرتے ہیں، اس درجہ کے حکیمانہ ''گریز'' کی شاید ہی کوئی مثال ملے۔ ''ذلکما مما علمنی ربی'' یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھلائی ہیں، اور نصیحت کی جو بات کرنا چاہتے تھے، اس کا سرا ہاتھ آگیا۔

غور فرمایئے، خواب کی تعبیر سے پہلے کس درجہ حکیمانہ اسلوب میں دعوت وتبلیغ کا فرض انجام دیا، یہی بات اگر سیدھے سادھے بغیر گفتگو کا رخ موڑے ہوئے کہتے تو وہ قیدی سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے، کیونکہ وہ بھیانک خوابوں کی وجہ سے خوفزدہ تھے، وہ چاہتے تھے کہ جلد سے جلد کوئی ان کو اطمینان کی بات بتادے، وہ کہاں متحمل ہوسکتے تھے کہ طویل طویل باتیں سنیں۔ مگر حضرت یوسفؑ نے جب یہ فرمایا کہ اس تعبیر خواب کے بیان کرنے میں میرے علم وفضل،

ذہانت وذکاوت کا کوئی دخل نہیں ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جس نے مجھے یہ صلاحیت عطا فرمائی ہے اور اس بات سے ان کو دعوت الی اللہ کی بات کا سرا ملتا ہے، جو اس درجہ لطیف، سبک رو اور طبائع کے لئے قابل قبول ہے کہ کوئی انکار نہیں کرسکتا تھا۔

دعوت کے اس حکیمانہ اسلوب پر اس طرح غور کیجئے کہ اگر حضرت یوسفؑ ان خواب دیکھنے والوں کو اس طرح مخاطب فرماتے کہ ''میرے معزز ساتھیوں، ذرا صبر سے کام لو، میں آپ کے خواب کی تعبیر ابھی بتادوں گا، لیکن سنئے! اس دنیا میں اس خواب سے بڑھ کر بھی اہمیت اور فکر کے لائق ایک بات ہے، ظاہر ہے وہ لوگ دلجمعی سے ہرگز بات نہ سنتے، خاص طور پر ایسے موضوع پر گفتگو جس کے وہ عادی نہیں، اور نہ یہ سب سننے کے لئے آئے تھے، لہذا حضرت یوسف علیہ السلام نے گفتگو کا موضوع بغیر بدلے ہوئے، سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بلکہ ایک ہی سانس میں فرمایا:

ایک دلنشیں اور سبک پیرائے میں دعوت کی طرف روئے سخن کا پھیر دینا(۱)

ذلکما مما علمنی ربی (یوسف ۳۷)

یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائی ہیں۔

آپ اس ماحول کو اپنی نگاہ میں رکھئے جس میں یہ دعوت دی گئی ہے، اس حکیمانہ اسلوب میں جس کی مثال اگر کہیں ملتی ہے تو صرف رسول اللہ ﷺ کی دعوت میں جس کا ذکر بعد میں کروں گا، لیکن اس کے علاوہ دعوت دین اور داعیان دین کی طویل تاریخ میں مجھے اس سے زیادہ نازک ماحول نہیں نظر آتا اور نہ اس سے زیادہ لطیف پیرایہ بیان ملتا ہے، جہاں سے بات شروع کی ہے۔ ''**لایاتیکما طعام ترزقنه**'' سے آیت ''**ذلکما مما علمنی ربی**'' تک پڑھئے اور دیکھئے کس طرح رب کے لفظ سے توحید کے وعظ کا راستہ نکال لیا ہے، کیا اس سے زیادہ سہل،

---

(۱) یہ معجزانہ اور بلیغ ٹکڑا حضرت یوسف علیہ السلام کے ذکر میں صرف قرآن میں ہے، تورات میں اس کا سراغ نہیں ملتا، اس واقعہ کو قرآن کریم اور بائبل دونوں میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کریم نے وہی حصہ لئے ہیں، جن میں دعوت وتبلیغ، عبرت وموعظت کا عنصر ہے، اور تورات میں جو ذکر ہے، اس میں صرف تاریخیں، گنتیاں اور مسافتوں کا بیان ہے۔

لطیف، قابل قبول اور تیزی سے بات کا رخ بدلا جاسکتا ہے؟ گویا وہ فرمارہے ہیں، میری کیا حیثیت کہ آپ کے خوابوں کی تعبیر بتاؤں، میں کمزور ودرماندہ انسان، میرا اپنے اوپر بس نہیں چلتا، لوگوں نے مجھے جیل خانہ میں دھکیل دیا، اور میں ان کا مقابلہ نہ کرسکا، میرا جیسا کمزور و ناتواں جو قید میں ڈال دیا جائے اور اپنے آپ کو بے بس پاتا ہو، اس کی کیا مجال کہ اس بلند مقام پر اپنے کو فائز سمجھے کہ علم وبصیرت کی بات کرے، یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے مجھے علم عطا فرمایا۔

جادۂ صد سالہ کو حضرت یوسفؑ ایک لمحہ میں طے فرماتے ہیں:

یہاں ایک اور سوال اٹھاتے ہیں، میرے رب نے یہ علم مجھے کیوں دیا؟ دعوت الی اللہ کی طرف لوگوں کا ذہن منتقل کرنے کا ایک اور پیرایہ ان کو ملتا ہے، دراصل یہ طول طویل راہ تھی، جس کو حضرت یوسفؑ نے اپنی حکمت وبصیرت، تابناک روحانیت، روشن ضمیری اور اللہ کی عطا کردہ فکر رسا کے ذریعہ ایک لمحہ میں طے فرمالیا، یہ راہ جس کو جادۂ صد سالہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا اور جس کو حکماء وفلاسفہ برسہابرس میں طے کرتے، حضرت یوسف علیہ السلام کی پیغمبرانہ قوت نے چشم زدن میں طے کرلی، فرمایا۔

ذلکما مما علمنی ربی إنی ترکت ملة قوم الا یؤمنون باللہ وهم بالاخرة هم کفرون (یوسف۔ ۳۷)

یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھائی ہے، جو لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے اور روز آخرت کا انکار کرتے ہیں، میں ان کا مذہب چھوڑے ہوئے ہوں۔

اتنا کہنے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے محسوس فرمایا کہ وہ اب ایک محفوظ پوزیشن میں، ایک بلند مقام پر فائز ہیں، گویا وہ ایک پہاڑ پر یا ٹیلے پر چڑھ کر نیچے والوں کو مخاطب فرمارہے ہیں کہ:

یاصاحبی السجن ء ارباب متفرقون خیر أم اللہ الواحد القهار

میرے جیل خانے کے رفیقو! بھلا کئی جدا جدا آقا اچھے یا (ایک) خدا یکتا وغالب؟

اگر حضرت یوسف علیہ السلام یہ بات پہلے کہہ دیتے تو ان رفیقوں کے کان پر یہ بات گراں گزرتی، نہ اس کو ان کا قلب وذہن قبول کرتا، لیکن اب موقع آگیا تھا کہ کہیں، اور ان کا

حق تھا کہ کہیں ''اے جیل کے رفیقو! بھلا کئی جدا جدا آقا اچھے یا ایک خدا یکتا و غالب؟'' یہاں کلام کی ترتیب تقدیم وتاخیر اور قرآن کریم کی ترتیب کلام قابل غور ہے، اور اگر وہ سابق سلسلہ کلام جاری رکھتے تو خشک اور بے جان بات ہوتی، لیکن حضرت یوسفؑ نے اپنی بصیرت سے اندازہ کرلیا اور اپنے مخاطبین کے چہرے پر اطمینان کے آثار دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب یہ لوگ اس صدائے آسمانی کو سننے کے لئے گوش برآواز ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام ہے، جو اپنے پیغمبروں کے ذریعہ اپنے بندوں کو دے رہا ہے، فرمایا: **یاصاحبی السجن أأرباب متفرقون خیر أم اللہ الواحد القھار** اس لہجہ کو دیکھئے کس درجہ پہلے لہجہ سے مختلف ہے، پہلا لہجہ (جس میں **ذلکما مما علمنی ربی** کہا تھا، الخ) نرم تھا، اس میں گداز تھا، مگر یہ لہجہ جس میں وہ کہہ رہے ہیں ''کیا جدا جدا آقا اچھے یا ایک خدا یکتا و غالب'' قوت و اعتماد کا اظہار کر رہا ہے، اس سے بھرپور خوداعتمادی جھلکتی ہے، اور یہی لہجہ اور اسی انداز کی بات وہ آسانی سے سمجھتے تھے، اگر حضرت یوسفؑ یہاں پر منطق اور علم کلام کی زبان میں بات کرتے تو ان کی سمجھ میں خاک نہ آتا۔

ایک قرآنی معجزہ:

پھر فرمایا:

ماتعبدون من دونہ الآ اسمآءً سمیتموھآ انتم واٰبآؤکم ماأنزل اللہ بھا من سلطن (سورہ یوسف ۴۰)

جن چیزوں کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے وہ صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں، خدا نے ان کی کوئی سند نہیں نازل کی۔

یہ نام ہیں مگر ان کا کوئی مسمّٰی نہیں ہے، یہ نام ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے، کچھ نام یونانیوں نے تصنیف کر لئے ہیں، کچھ نام بت پرست قوموں نے رکھ چھوڑے ہیں، اور اسی طرح دوسرے لوگوں نے بغیر کسی وجود کے صرف اپنے اوہام کے بت بنائے اور ان کا نام رکھ دیا، اور دنیا میں ہر قوم کا ایک مستقل علم الاصنام تیار ہوگئی، قرآن کریم کا اعجاز یہ ہے کہ ان وہمی چیزوں کے لئے جن کا کبھی کوئی وجود نہیں تھا ''اسماء'' کا لفظ استعمال کیا ہے، جن لوگوں کی مذاہب عالم کی تاریخ پر نظر ہے، اور جو علم الاصنام کی تاریخ جانتے ہیں، وہی اس لفظ کی معجزانہ حیثیت کا اندازہ کر سکتے ہیں، یہ صرف نام ہی نام ہیں، یہ معبود کہاں اور کب پائے گئے؟ کہاں

اور کب بارش کا خدا اور جنگ کا خدا تھا؟ اور کس زمانہ میں اور کس جگہ، خدائے جمال اور خدائے محبت کا وجود تھا؟ یہ الٰہ کہاں اور کس صدی میں بستے تھی، ان کا وجود اوہام وظنون کی دنیا سے باہر کبھی پایا گیا؟ قرآن کریم نے بتایا کہ ''صرف نام ہی نام ہیں، جنہیں تم نے اور تمہارے اجداد نے اپنے دل سے گڑھ لیا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی کوئی سند نہیں ہے۔''

قرآن کریم کا یہ معجزہ رہتی دنیا تک کے لئے قائم ہے، بت پرستی بھی اسی طرح کے اسماء کا مجموعہ ہے، قرآن کریم نے ان کا پول ان دو لفظوں میں کھول دیا ''ان ھی الآ اسمآء'' یہ صرف نام ہی نام ہیں۔

ایک ایسے داعی کا طریقہ کار جو اللہ کی طرف سے الہام کی نعمت سے سرفراز ہے:

حضرت یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر محسوس فرمایا کہ ان کے دل و دماغ کا خلا پر ہو چکا ہے، اور اب حکمت کا تقاضا ہے کہ بات کو طول نہ دیا جائے اور توحید کا مضمون زیادہ پھیلا کر بیان نہ کیا جائے، ایک ماہر طبیب جانتا ہے کہ مریض کو کتنی غذا اور کس مقدار کی دوا درکار ہے، مریض کی ضرورت اور قبولیت کی صلاحیت وہ جانتا ہے، یہی ایک ایسے داعی کا طریق کار ہے، جو اللہ کی طرف سے الہام کی نعمت سے سرفراز ہے، اور جس کو اللہ تعالیٰ نے دعوت کی صلاحیت دی ہے، وہ جانتا ہے کہ ایک مرکز پر پہنچنے کے بعد اس سے تجاوز نہ کرنا چاہئے۔

یہی سبب ہے کہ جو شخص دعوت و تبلیغ کو اصول و قواعد کی حد بندیوں میں محصور کرتا ہے، وہ دراصل اس کی کارکردگی کو محدود کرتا ہے، دعوت، نشاط، جوش اور حرارت کی متقاضی ہے، داعی اور مبلغ پر بھی یہ ظلم ہے کہ اس کو ضوابط کا پابند کر دیا جائے۔ (۱)

آئندہ مجلس میں انشاء اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طرزِ دعوت کے مطالعہ کا نتیجہ پیش کیا جائے گا۔

---

(۱) مؤلف نے ۷ اربیع الثانی ۱۴۰۰ھ کو مدینہ منورہ کی اسلامی یونیورسٹی کے ہال میں ''حکمت دعوت'' کے موضوع پر ایک تقریر کی ہے، جا س کا عنوان تھا ''حکمۃ الدعوۃ وصفۃ الدعاۃ'' (دعوت میں حکمت کا پہلو اور داعی کے اوصاف) اس محاضرہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی دعوت کا ذکر تھا، اور اس میں ادبی نکات اور دعوت کے تابناک پہلو سامنے آ گئے تھے، لہذا اس خطبہ کو بھی سابقہ محاضرہ کے ساتھ ضم کر دیا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت موسیٰؑ کی دعوت اور پیغمبرانہ حکمت کے چند نمونے

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم اما بعد○ فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم○ بسم اللہ الرحمن الرحیم ○

پیغمبرانہ دعوت کا ایک اور نقش جمیل:

آج ہم پیغمبرانہ دعوت کا ایک اور نقش جمیل پیش کرتے ہیں، یہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا نمونہ، وہ دعوت جس کے لئے وہ مامور من اللہ تھے، اور فرعون جس کا مخاطب تھا، یہ طریق دعوت وتبلیغ اس طریق کار سے مختلف ہے جو ہم نے پہلے پیش کیا تھا اور آئندہ جو نمونے پیش کئے جائیں گے اس سے بھی یہ مختلف ہے، اس دعوت کی تین لحاظ سے نوعیت مختلف ہے۔ دعوت کا مزاج، داعی کی حیثیت اور جس کو دعوت دی جارہی ہے، اس کی صورتحال۔

یہ دعوت جو موسیٰ علیہ السلام نے دی، یہ دعوت جس پر وہ مامور کیے گئے تھے، انبیاء کرام کی دعوتوں سے ایک لحاظ سے مختلف کہی جاسکتی ہے، اس میں مرکزی اور بنیادی عناصر موجود ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت، توحید کی دعوت، آخرت پر ایمان کی دعوت، مرکر دوبارہ اٹھنے، اور آخرت کی زندگی، اور اللہ تعالیٰ کی صفات اور غیبی امور کی دعوت، مگر ایک دوسرے پہلو سے مختلف ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان بنیادی اور مرکزی مضامین دعوت کے علاوہ ایک اور مہم بھی دعوت میں داخل کردی گئی ہے، وہ مہم تھی بنی اسرائیل کو فرعون کے عذاب سے نجات دلانا اور عقائد کی بنیاد پر جو مصائب ان کو فرعون کی طرف سے اٹھانا پڑے تھے، ان سے گلوخلاصی حاصل کرنا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مہم دوسرے انبیاء کرام کی مہم سے قدرے مختلف ہے:

وہ خاص ماحول اور حالات جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی، اور جن میں انہوں نے پرورش پائی، اور گردوپیش کی صورتحال جن سے ان کو سابقہ پڑا، ان باتوں نے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کام کو دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کے کام سے ایک حد تک مختلف نوعیت دے دی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مامور کیا گیا کہ فرعون سے صاف صاف کہہ دیں کہ ''وہ ظالم و جابر ہے، اور وہ بنی اسرائیل پر مسلط ہے، وہ بنی اسرائیل جو انبیائے کرام کی اولاد تھے، اور جن کے آباء...... (اس وقت کی دنیا میں) ایمان باللہ اور عقیدہ توحید کے تنہا وارث تھے، یہاں معاملہ کسی خاص قوم کا یا کسی انسانی گروہ کا نہ تھا، جن سے دنیا کبھی خالی نہیں رہی اور اس طرح کے انسانی گروہ آج بھی پائے جاتے ہیں، اگر کسی ایسے گروہ کا معاملہ ہوتا، جس پر کوئی ظالم و جابر قابض ہو گیا ہو اور جن کو ظلم و بہیمیت کے ذریعہ غلام بنائے ہوئے تھا اور عقیدے کی بنیاد پر ان کو مصائب اٹھانا پڑ رہے تھے تو بات آسان اور معمول کے مطابق سمجھی جاتی، کیونکہ آئے دن اور ہر جگہ ایسا ہوتا رہتا ہے، اور تاریخ کے ہر دور میں ایسی مثالیں ملتی ہیں، اور آئندہ بھی اس طرح کی صورت حال سے انسانی آبادی کا دوچار ہونا بعید نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کی ان کے معاصرین کے مقابلہ میں جداگانہ نوعیت و خصوصیت:

صورتحال اس درجہ سادہ اور معمولی نہ تھی، صورت ہال یہ تھی کہ دینی و اخلاقی قدروں میں انحطاط، اور بہت سی کمزوریوں کے باوجود، یہی ایک باقی ماندہ قوم تھی، جسے ایمان باللہ صحیح معنوں میں حاصل تھا اور عقیدہ توحید کے وارث و امین تھی، تاریخ کی شہادت ہے کہ بنی اسرائیل اپنی اخلاقی و دینی کمزوریوں کے باوجود تاریخ کے ہر دور میں (کسی نہ کسی درجہ میں) عقیدۂ توحید پر قائم رہے، ایک زمانہ ایسا گزرا ہے کہ سوائے یہود کے کوئی عقیدۂ توحید کا شناسا بھی نہ تھا، مفسرین نے قرآن مجید میں دنیا کی قوموں پر فضیلت کا بار بار ذکر کرنے کی توجیہ یہی کی ہے کہ شرک و بت پرستی کی اس تاریخ میں وہ تنہا عقیدۂ توحید کا چراغ روشن کئے ہوئے تھے۔(۱)

صورت حال صرف اس قدر نہ تھی کہ بنی اسرائیل فرعون اور اس کی فوج کے گھوڑوں کی

---

(۱) اللہ تعالیٰ نے تاکید و تکرار کے ساتھ اس حقیقت کو یاد دلایا ہے۔

يابنى اسرائيل اذكرو نعمتى التى انعمت عليكم و انى فضلتكم على العالمين O (سورۂ بقرہ ۴۷)
اے یعقوب کی اولاد وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کئے تھے اور یہ کہ میں نے تم کو جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی۔

ٹاپوں سے روندے جارہے تھے، اور ایک ظالم و جابر حاکم وقت کے رحم وکرم پر پڑے تھے، بلکہ صورت حال یہ تھی کہ بنی اسرائیل عقیدۂ توحید کے حامل اور میراث نبوت کے امین تھے، یہ امانت کے حامل تھے، جو (اس دور میں) انبیائے سابقین علیہم السلام کی تعلیمات کا مجموعہ تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر دوہری ذمہ داریاں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نوعیت دوسرے انبیائے کرام سے جداگانہ ہے، کیونکہ آپ پر دوہری ذمہ داری تھی، ایک ذمہ داری تو پیغام حق پہنچانے اور فرعون کو اس خدائے واحد وقہار کی طرف متوجہ کرنے کی تھی، جس کا کوئی حکومت اور قانون سازی میں شریک نہیں، اور دوسری ذمہ داری یہ تھی وہ فرعون سے مطالبہ کریں کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد کردے، اور ان کے قیدیوں کو رہا کردے، چنانچہ قرآن مجید میں صاف صاف فرمایا گیا:

فاتیه فقولآ انا رسولا ربک فارسل معنا بنی اسرآئیل O ولا تعذبهم قدجئنک باية من ربک والسلم علیٰ من اتبع الهدیٰ O (سورہ طٰہٰ۔ ۴۷)

(اچھا) تو تم اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم اپنے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں، تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دیجئے، اور انہیں عذاب نہ کیجئے، ہم آپ کے پاس آپ کے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آئے ہیں اور جو ہدایت کی بات مانے اس پر سلامتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا یہی رخ ہے، جو ان کی دعوت کو دوسرے انبیائے کرام کی دعوتوں سے ممتاز کرتا ہے، لیکن ان کی پوزیشن نازک تھی، کیوں؟ اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت منفرد نوعیت کی تھی، ان کی زندگی کا نشیب وفراز دوسروں سے بہت مختلف تھا۔

فرعون کا منصوبہ اور انتظامات کی ناکامی:

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک انتہائی تاریک، صبر آزما، گھٹے ہوئے بلکہ مردم خور ماحول میں پیدا ہوئے، فرعون نے اپنے انٹیلی جنس کو (جیسا کہ موجودہ اصطلاحات میں کہا جاتا ہے) یا اپنے محکمہ پولیس کو ہدایت دی تھی کہ بنی اسرائیل میں کسی نومولود لڑکے کو زندہ نہ چھوڑے۔

ان فرعون علا فی الارض وجعل اهلها شیعاً یستضعف طآئفة منهم

یذبح ابنآء هم ویستحی نسآء هم انه کان من المفسدین O (القصص)

فرعون نے ملک میں سر اٹھار کھا تھا اور وہاں کے باشندوں کو گروہ گروہ بنا رکھا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ کو یہاں تک کمزور کر دیا تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتا، بے شک وہ مفسدوں میں تھا۔

فرعون نے اپنا پلان بہت باریک بینی سے تیار کیا تھا، جس طرح ترقی یافتہ، منظم حکومتیں اپنے پلان تیار کرتی ہیں، یہ پلان یہ تھا کہ بنی اسرائیل میں کوئی لڑکا نہ ہونے پائے، اور ایک نسل اس طرح گزر جائے تو بنی اسرائیل کی طرف سے ہمیشہ کے لئے بے فکر ہو جائے گا۔ صرف عورتیں رہ جائیں گے، ان سے ضرر نہیں، ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیا جائے، اور عورتوں کو زندہ چھوڑ دیا جائے، فرعون نے ایک مطلق العنان حکمراں کی طرح جس کے احکام کی کہیں اپیل نہ ہو سکے، اپنا فرمان نافذ کر دیا، اور یہ چاہا کہ بنی اسرائیل میں معمولی سطح کا بھی لڑکا زندہ نہ رہنے پائے، لیکن اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی تھی کہ ان میں ایک عظیم شخصیت پیدا ہو، فرعون کی یہ تدبیر تھی کہ بنی اسرائیل سے نجات حاصل کرے، اور بنی اسرائیل میں ایسا لڑکا نہ پیدا ہونے دے، جو اس کی سلطنت و عظمت کا خاتمہ کرنے والا ثابت ہو، اور اس کے پلان کو برباد کر دے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیئے، اور موسیٰ کی پیدائش مقرر کر دی، وہ موسیٰ جن کے خوف سے بچے ذبح کئے جا رہے تھے، فرعون کے کارندے، بچوں کو حضرت موسیٰ کی وجہ سے قتل کر رہے تھے، لیکن وہ نومولود جس سے فرعون کو خدشہ تھا، پیدا ہو کر رہا، اور اللہ کی مرضی پوری ہوئی، وہ پیدا ہوا، پلا بڑھا، جوان ہوا، لیکن کیسے پیدا ہوا، اور کیسے بچ گیا، کیوں کر پلا اور بڑھا، یہ انسانی تاریخ کے عجائبات میں سے ہے، اور قدرت الٰہی کا معجزہ ہے کہ وہ بچہ اپنے سخت ترین دشمن کی گود میں پلا۔

خرق عادت کا پورا ماحول:

اپنی نگاہِ تصویر میں اس پورے ماحول کو رکھئے، جس میں ایک ایک بات خرق عادت کا مظہر ہے، شروع سے آخر تک قدرت خداوندی کی معجزہ نمائی کا منظر ہے۔

فالتقطه ال فرعون لیکون لهم عدوا وحزنا ان فرعون وهامن وجنودهما کانوا خطئین O وقالت امراة فرعون قرة عین لی ولک لاتقتلوه

عسیٰ ان ینفعنا اونتخذہ ولدًا وھم لایشعرون O واصبح فؤاد ام موسی فارغاان کادت لتبدی بہ لولآ ان ربطنا علی قلبھا لتکون من المومنین O وقالت لاختہ قصیۃ فبصرت بہ عن جنب وھم لایشعرون O وحرمنا علیہ المراضع من قبل فقالت ھل الکم علیٰ اھل بیت یکفلوتہ لکم وھم لہ ناصحون O فرددناہ الیٰ امۃ کی تقرب عینھا ولاتحزن ولتعلم ان وعدہ اللہ حق ولکن اکثر الناس لایعلمون O (القصص ۸۰ تا ۱۳)

تو فرعون کے لوگوں نے اس کو اٹھالیا، اس لئے کہ نتیجہ یہ ہونا تھا کہ وہ ان کا دشمن اوران کے لئے موجب غم ہو، بے شک فرعون اور ہامان اوران کے لشکر چوک گئے اور رفرعون کی بیوی نے کہا کہ یہ میری اور تمہاری دونوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اس کو قتل نہ کر، شاید یہ ہمیں فائدہ پہنچادے۔ یا ہم اسے بیٹا بنالیں اور وہ انجام سے بے خبر تھے۔ اور موسیٰ کی ماں کا دل بے صبر ہوگیا، اگر ہم ان کے دل کو مضبوط نہ کردیتے تو قریب تھا کہ وہ اس قصے کو ظاہر کردیں۔ غرض یہ تھی کہ وہ مومنوں میں رہیں اور اس کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے چلی جا، تو وہ اسے دور سے دیکھتی رہی اوران لوگوں کو کچھ خبر نہ تھی اور ہم نے پہلے ہی سے دائیوں کے دودھ اس پر حرام کردیئے تھے، تو موسیف کی بہن نے کہا کہ میں تمہیں ایسے گھر والے بتاؤں کہ تمہارے لئے اس بچے کو پالیں اوراس کی خیر خواہی سے پرورش کریں تو ہم نے اس طریق سے ان کو ان کی ماں کے پاس واپس پہنچادیا کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غم نہ کھائیں اور معلوم کریں کہ خدا کا وعدہ سچا ہے، لیکن یہ اکثر آدمی نہیں جانتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام (فرعون کے گھر میں پرورش پانے اور پروان چڑھنے کے بعد) پھر وہاں سے بغیر اجازت نکل کھڑے ہوئے، ایک قطبی کو ہلاک کرنے کا واقعہ پیش ایا جو شاہی خاندان یا شاہی قوم میں سے تھا:

ودخل للمدینۃ علیٰ حین غفلۃ من اھلھا فوجد فریھا رجلین یقتتن ھذا من شیعتہ وھذا من عدوہ فاستغاثہ الذی من شیعتہ علی الذی من عدوہ فوکزہ موسیٰ فقضیٰ علیہ قال ھذا من عمل الشیطن انہ عدو مضل مبین O (القصص ۱۵)

اور وہ ایسے وقت شہر میں داخل ہوئے کہ وہاں کے باشندے بے خبر ہو رہے تھے، تو دیکھا کہ وہاں دو شخص لڑ رہے ہیں، ایک تو موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا ہے اور دوسرا ان کے دشمنوں میں سے ہے، تو جو شخص ان کی قوم میں سے تھا، اس نے دوسرے شخص کے مقابلے میں جو موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں میں سے تھا، موسیٰ علیہ السلام کی مدد طلب کی تو انہوں نے اس کو مکا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ ☆☆☆ یہ کام تو اغوائے شیطان سے ہوا، بے شک وہ انسان کا دشمن اور صریح بہکانے والا ہے۔

یہ ایک کھلا معجزہ تھا۔ قدرت خداوندی کا کھلا اظہار تھا۔ اللہ کی روشن نشانیوں میں سے روشن ترین نشانی تھی کہ اللہ دعوت و تبلیغ اور بنی اسرائیل کی نجات دہندگی کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب فرماتا ہے جس کی پوزیشن بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ کمزور و نازک تھی۔

ایمان اور قلبی قوتوں کی کاوشیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو (جن کا تذکرہ قرآن کریم نے سورۂ قصص میں تفصیل سے کیا ہے، اور دوسری سورتوں میں کہیں اجمال سے اور کہیں کہیں درجہ تفصیل سے) اللہ کے دین کی طرف بلائے جانے پر مامور کیا جاتا ہے، اور ساتھ ہی بنی اسرائیل کو آزاد کرانے کی مہم بھی سپرد کی جاتی ہے، اور یہ دونوں کام سخت ترین کاوش و کاوش چاہتے ہیں، دعوت الی اللہ کا کام سخت جاں کاہی کا کام ہے، اس میں ایمان، ضبط نفس، صبر اللہ پر بھروسہ اور یقین سبھی درکار ہیں اسی طرح ایک قوم کی آزادی کا حصول کوئی آسان مہم نہیں، سخت ترین کاوش چاہتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر ان دونوں گرانبار ذمہ داریوں کے احساس نے ایک تردد اور جھجک کی کیفیت پیدا کر دی تھی، جس کی طرف قرآن کریم نے انہی کی زبانی اشارہ کیا ہے:۔

ولهم علىٰ ذنب فأخاف أن يقتلون O (الشعراء ۱۴)

اور ان لوگوں کا مجھ پر ایک گناہ (یعنی قبطی کے خون کا دعویٰ) بھی ہے سو مجھے خوف ہے کہ مجھے مار ہی ڈالیں۔

یہ وہی بات ہے جس کی طرف فرعون نے اشارہ کیا تھا:

وفعلت فعلتک التي فعلت وانت من الكفرين

اور تم نے وہ کام کیا تھا جو کیا اور تم ناشکرے معلوم ہوتی ہو۔

اسی فرعونی آگاہی یا دھمکی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر یک گونہ جھجک سی پیدا کردی تھی، ایک ہچکچاہٹ کی کیفیت تھی، جس کا اظہار وہ کو دفرمار ہے تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان دونوں مہموں کے لئے ان کو منتخب فرمالیا تھا، اوران کاموں کے لئے ان سے بہتر اور موزوں کوئی دوسرا شخص نہیں ہوسکتا۔

قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت اور کار نبوت کی ادائیگی کا ایک وہ منظر پیش کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ایک صاحب وحی پیغمبر اور صاحب حکمت مبلغ وداعی اپنی بات پیش کرتا ہے، اور وہ کس طرح ایمانی غیرت وحمیت، دعوت الی اللہ کی نزاکتوں سے پوری واقفیت اور اس کے شعور کو ایک ساتھ لے کر چلتے ہیں، وہ ایک نبی برحق تھے، پوری امت کے لئے اسوہ اور مثال تھے، ان کے طریق خطاب سے واضح ہوجاتا ہے کہ وہ لوگ جن کو اللہ اپنے دین کی خدمت کے لئے منتخب فرماتا ہے، ان کا انداز کلام اور اسلوب خطاب کیا ہوتا ہے، اوران لوگوں کا انداز کیا ہوتا ہے جو خوشامد اور چاپلوسی کو اپنا شعار بناتے ہیں اور پیشہ وارانہ انداز میں دعوت کی انجام دہی کا دم بھرتے ہیں، اوراپنے آپ کو حقیقت پسند یا واقعی صورت حال کا اعتراف کر کے کام کرنے والا شمار کرتے ہیں۔

اللہ کا محبوب ترین بندہ......ایک مبغوض ترین بندہ کے پاس جاتا ہے:

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرماتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے پسندیدہ بندے اور نبی برحق ہیں، مگر کس کی طرف اور کہاں بھیجے جارہے ہیں، ایک ایسے دشمن کے پاس جو اللہ کا دشمن ہے، ایک محبوب ترین فرد، ایک انتہائی قابل نفرت مخلوق کی طرف بھیجا جارہا ہے، ایک اس کنارے پر ہے، دوسرا اس کے برعکس دوسرے کنارے پر کھڑا ہے، ایک دوسرے کے بالکل متضاد ہیں، دو عام انسانوں میں اس درجہ تفاوت نہیں ہوتا، یہ تفاوت ایسے دوافراد کے درمیان پایا جاتا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں، اپنے وقت کا سب سے بڑا پیغمبر اس شخص کے پاس بھیجا جارہا ہے جو قدرت حق کو چیلنج کرتا ہے، عظمت خداوندی کو چیلنج کرتا ہے، حدیث قدسی میں جس عظمت عظمت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عظمت میری چادر ہے، جو اس کو مجھ سے چھینے گا اس کو پیس کررکھ دوں گا۔) فرعون نے اس عظمت خداوندی کو چیلنج کیا تھا، اس کی جرأت، بے باکی اور دریدہ دھنی

اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ وہ:

انا ربکم الاعلیٰ

تمہارا سب سے بڑا مالک میں ہوں۔

کا اعلان کررہا تھا، ایسے شخص کے پاس جو صرف کفر وانکار کا مرتکب نہیں تھا، بلکہ خود خدائی کا دعویدار بن بیٹھا تھا، ایک مجرم اور قابل نفرت ولعنت وجود کے پاس ایک محبوب شخصیت کو بھیجا جارہا ہے، اوران کو ہدایت کیا دی جاتی ہے؟

فقولا له قولاً لینا لعله یتذکر اویخشی (طٰہٰ ۴۴)

اوراس سے نرمی سے بات کرنا شاید وہ غور کرے یا ڈرجائے۔

اس ہدایت الٰہی کے بعد کسی داعی ومبلغ کے لئے اس امر کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ دعوت کے کام میں سخت کلامی یا لہجہ کی ترشی سے بات کرے اوراس کی کوئی بھی تاویل کرسکے کیونکہ بے باکی، انکار، سرکشی میں فرعون سے سبقت وفوقیت لے جانے والے شخص کا تصور بھی مشکل ہے، جو یہ کہے ''انا ربکم الاعلیٰ'' لیکن اس سے بھی بات کرنے کے لئے جب پیغمبر وقت کو بھیجا گیا تو یہ ہدایت کی گئی کہ نرم لہجہ میں بات کرنا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اوران کے ساتھ حضرت ہارون علیہ السلام کو جب یہ حکم ملا کہ فرعون کے دربار میں داخل ہوکراس کے سامنے کلمہ حق کہیں تو:

قالا ربنا اننا نخاف ان یفرط علینا اویطغیٰ (طٰہٰ ۴۵)

دونوں کہنے لگے کہ ہمارے پروردگار، ہمیں خوف ہے کہ وہ ہم پر تعدی کرنے لگے یا زیادہ سرکش ہوجائے۔

چونکہ حضرت موسیٰ کے ساتھ ایک نزاکت تھی، اوران کی پوزیشن میں کمزوری تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لاتخافآ اننی معکمآ اسمع واری O فاتیه فقولآ ان رسولا ربک فارسل معنا بنی اسرائیل ولا تعذبهم قدجئنک بایة من ربک والسلم علیٰ من اتبع الهدیٰ O انا قد اوحی الینآ ان العذاب علیٰ من کذب وتولیٰ O قال فمن ربکما یموسیٰ O قال ربنکا الذی اعطیٰ کلّ شیٔ خلقه ثم هدیٰ O

(طٰہٰ ۴۶، ۵۰)

ڈرو مت! میں تمہارے ساتھ ہوں اور سنتا اور دیکھتا ہوں، پاس جاؤ! اور کہو کہ ہم آپ کے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں، تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دیجئے اور انہیں عذاب نہ دیجئے۔ ہم آپ کے پاس آپ کے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آئے ہیں، اور جو ہدایت کی بات مانے اس کی سلامتی ہے، ہماری طرف سے یہ وحی آتی ہے کہ جو جھٹلائے اور سر پھیرے اس کے لئے عذاب (تیار) ہے۔ (غرض موسیٰ اور ہارون علیہ السلام فرعون کے پاس گئے) اس نے کہا، تمہارا پروردگار کون ہے؟ کہا ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر شے کو شکل وصورت بخشی، پھر راہ دکھائی۔

فرعون کی ترکش کا ایک زہریلا تیر:

فرعون کا شیطانی دماغ تیزی سے کام کرنے لگا، اور اس نے اپنے ترکش کا ایک ایسا زہر میں بجھا ہوا تیر نکالا جو کبھی خطا نہیں کرتا، ایسا تیر جو کسی بھی ذہین سے ذہین، زیرک اور دانا و بینا مبلغ پر پھینکا جائے تو بغیر اپنا کام کئے نہ رہے، خواہ وہ مبلغ دین بڑے سے بڑا افاضل روزگار ہو، اور اس نے تبلیغ کے فلسفہ کا مطالعہ کیا ہو، نفسیات کا ماہر ہو، علم الاجتماع (سوشیولوجی) اور فن مناظرہ میں یکتا ہو، جو بھی ہو، اس تیر سے اس کا گھائل ہونا یقینی ہے، وہ تیر یہ ہے کہ فرعون نے یہ پوچھا:

فما بال القرون الاولیٰ ۝ (طٰہٰ ۵۱)

تو پہلے گزرے ہوئے لوگ کا کیا حال ہے؟

فرعون کی شیطانی عقل وذہانت کا ایک نادر سوال تھا، وہ چاہتا تھا کہ اس کے دربار میں جو لوگ موجود تھے، ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف سخت اشتعال اور جذباتیت پیدا کردے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس طرح نجات بھی حاصل کرلے، اس طرح ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا، ایک تو یہ کہ دعوت توحید کو نظر انداز کردے، کیونکہ یہ دعوت اس کے لئے انتہائی بھیانک چیز تھی، توحید کا عقیدہ دلوں کے تار ہلا دیتا ہے، فطرت انسانی کے اندر چھپا ہوا ایمان اس سے ابھر آتا تھا، فرعون کے حاشیہ نشین بھی تو آخر بشر ہی تھے، اور ان میں سمجھدار اور ہوشمند لوگ بھی تھے، ایسے بھی ہوں گے جن کا ضمیر مردہ نہیں ہوا ہوگا، لہذا ممکن تھا کہ دعوت توحید ان کے اندر کا جذبہ ایمان ابھار دے، لہذا فرعون کی یہ کوشش ہوئی کہ وہ کسی طرح اس

سوال کو ٹال جائے، اور لوگوں کی نگاہ سے اس سوال کو اوجھل کردے، اس لئے کہ یہ فرعون کی دکھتی رگ تھی، اور وہ اس عقیدہ سے انتہائی درجہ خائف تھا، اس لئے اس نے ایک ایسا سوال کر دیا، جس سے اس کے حاشیہ نشین اور مصاحب سب کے سب چوکنے ہو جائیں، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ محسوس کرنے لگیں کہ یہ ان کے آباؤ اجداد کے راستہ سے برگشتہ کرنا چاہتے ہیں، لہذا اس نے سوال کیا، تو پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا کیا حال ہے؟ اس کے جواب دو ہی ہوسکتے تھے یا تو صاف اور صریح جواب بغیر کسی لاگ لپٹ کے دے دیتے کہ وہ لوگ جہنم میں ہیں:

انکم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم انتم لها واردون (الانبیاء ۹۸)

تم اور جو کچھ پوجتے ہو اللہ کے سوا، جھونکنا ہے دوزخ میں، تم کو اس پر پہنچنا ہے۔

یہ کہتے تو ظاہر ہے بات کا راستہ ہی بند ہو جاتا، سب غیظ و غضب میں بھر جاتے اور ان کی رگ حمیت جو در اصل جاہلیت کی رگ تھی، ابھر آتی، سب یا تو وہاں سے خفا ہو کر نکل جاتے یا سب مل کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ٹوٹ پڑتے، یا شور و ہنگامہ برپا ہو جاتا، موسیٰ تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ ہمارے آباؤ اجداد کی توہین کرتے ہو، اور ہمارے احساسات کو پامال کرتے ہو؟

حکمت پیغمبرانہ اور مکمل معجزہ:

دوسری صورت یہ ممکن تھی کہ حضرت موسیٰ خاموش رہ جاتے، یا سیاست و حکمت سے کام لیتے۔ مثلاً کہتے کہ جہاں تک بزرگان سلف کا تعلق ہے، ان کا احترام ہمارے دل میں بھی ہے اور وہ لوگ بلاشبہ بڑے عالم و بزرگ تھے، اور اس طرح کی منہ دیکھی بات کرتے، اگر ایسا کرتے تو فرعون یہیں پر ان کو پکڑ لیتا اور کہتا کہ اگر وہ عالم و بزرگ تھے اور قابل احترام تھے، تو ہمارا عقیدہ بھی بعینہ وہی ہے جو ان کا عقیدہ تھا:

قال فما بال القرون الاولی ۝ قال علمها عند ربی فی کتب لا یضل ربی ولا ینسی ۝ (طٰہٰ ۵۱.۵۲)

کہا تو پہلی جماعتوں کا کیا حال ہے؟ کہا: ان کا علم میرے پروردگار کو ہے جو کتاب میں (لکھا ہوا) ہے۔ میرا پروردگار نہ چوکتا ہے نہ بھولتا ہے۔

لیکن انہوں نے یہاں سے روئے سخن پھر اس موضوع کی جانب پھیر دیا جو پہلے سے

چل رہا تھا، جیسے بات سے بات نکلتی ہے، یہ ممکن تھا کہ وہ فرماتے، ان کے متعلق معلومات تاریخ میں ملیں گی، لیکن اگر ایسا کہتے تو صورت حال بدل جاتی، پھر تو فرعون بولنے اور تقریر کرنے لگتا، اور لوگوں کے تصنیف کردہ افسانے جن کو تاریخی روایات کا درجہ دے دیا جاتا ہے، اور جن کو اس کے زمانے اور عہد حکومت میں ''تاریخی حقائق'' کی طرح تعلیم و تلقین کی جاتی ہوگی، ان سے استدلال کرتا، لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسی بات کہی جس کا کوئی جواب ہی نہ تھا، اور جس سے کوئی مفر نہیں ہو سکتا تھا:

قال علمها عند ربی فی کتب

کہا: اس کا علم میرے پروردگار کو ہے، جو کتاب میں لکھا ہے۔

ذرا ان الفاظ اور ان کی سادگی اور گہرائی کو ملاحظہ کیجئے، کتنی جچی تلی بات کیسے نپے تلے لفظوں میں کہہ دی، یہ ہے حکمت نبوت، دعوت کا اعجاز کامل، اگر ہم میں سے کوئی ایسی آزمائش میں پڑ جائے تو ایک نہیں ہزاروں طریقے پر اپنا مقصد ادا کر سکتا ہے، اور مشکل سے نجات پا سکتا ہے، مثلاً کہتے اس کو چھوڑو، یہ بات علیحدہ ہے۔ میرا مطلب گزشتہ زمانے سے نہیں بلکہ مجھے تو آج کی فکر ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

دعوت میں پختگی کے ساتھ جمار ہنا اور کسی حال میں اس مقصد کو فراموش نہ کرنا:

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعوت کی بات ترک نہیں کی، اور گفتگو کا جو سرا ان کے ہاتھ تھا اس کو نہیں چھوڑا، اور بہت تیزی سے اصلی موضوع پر آ گئے، اس تیزی سے جس سے زیادہ سرعت و بلاغت کا تصور نہیں ہو سکتا، اور وہ حکمت اختیار کی جس سے زیادہ گہری حکمت دیکھی نہیں گئی۔ ایک لفظ میں سارا مسئلہ حل کر دیا۔ "**علمها عند ربی**" اور یہ کہتے ہی اپنے موضوع پر آ گئے "**علمها عند ربی فی کتب لایضل ربی ولاینسی**" (کہا ان کا علم ہمارے پروردگار کو ہے جو کتاب میں لکھا ہوا ہے، میرا پروردگار نہیں چوکتا اور نہ بھولتا ہے)۔ اور اپنی بات کا تسلسل ٹوٹنے نہیں دیا، اور اللہ تعالیٰ کی انہی صفات کا ذکر کرنے لگے، جس سے فرعون بھاگنا چاہتا اور بات کا رخ پھیرنا چاہتا تھا، ایسی مختصر آیت کو پڑھتے ہی ادبی ذوق کو وجد

آنے لگتا ہے، ادب و بلاغت کے اس حسین شاہکار سے روح جھوم اٹھتی ہے، اور عقل سر نیاز خم کر دیتی ہے۔

علمها عند ربی فی کتب لایضل ربی ولا ینسی الذی جعل لکم الارضط مهدا وسلک لکم فیها سبلاً وانزل من السمآء ماء فاخرجنا به ازوجاً من نبات شتی O کلوا وارعوا انعامکم ان فی ذلک لایت لاولی النهر O

(طٰہ ۵۲.۵۴)

ان کا علم میرے پروردگار کو ہے جو کتاب میں لکھا ہوا ہے، میرا پروردگار نہ چوکتا ہے، نہ بھولتا ہے، وہی تو ہے جس نے تم لوگوں کے لئے زمین کو فرش بنایا اور اس میں تمہارے لئے رستے جاری کئے، اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس نے انواع واقسام کی مختلف روئید گیاں پیدا کیں کہ خود بھی کھاؤ اور اپنے چارپایوں کو بھی چراؤ، بے شک ان باتوں میں عقل والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

فرعون کی فکری پینترابازی (۱) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی استقامت اور کامیابی:

دوسری مثال سورۂ شعراء میں ملتی ہے:

قال فرعون وما رب العلمین O قال رب السموت والارض وما بینهما ان کنتم موقنین O قال لمن حوله الا تتمعون O قال ربکم ورب ابائکم الاولین O قال ان رسولکم الذی ارسل الیکم لمجنون O (الاشعراء ۲۳.۲۷)

فرعون نے کہا کہ تمام جہاں کا مالک کیا؟ کہا کہ آسمان اور زمین اور جو کچھ ان دونوں میں ہے سب کا مالک، بشرطیکہ تم لوگوں کو یقین ہو، فرعون نے اپنے اہالی وموالی سے کہا کہ تم سنتے نہیں ہو؟ (اس نے) کہا کہ تمہارا اور تمہارے باپ دادا کا مالک (فرعون نے) کہا کہ (یہ) پیغمبر جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے باؤلا ہے۔

---

(۱) عربی میں حضرت مصنف مدظلہ نے (مواوغہ) کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کا مقصد پینترا بدلنا، آگے بڑھ کر پیچھے مڑنا، اور اچانک حملہ کرنا، جس سے کھلاڑی بھی کام لیتا ہے۔ انگریزی میں ڈاج کا لفظ بھی اس سے قریب مفہوم رکھتا ہے، اردو میں پینترابازی سے مفہوم ایک حد تک ادا ہو جاتا ہے۔ (مترجم)

فرعون کی یہ فکری پینترا بازی تھی اور گفتگو کا رخ بدلنے کی انتہائی چالاک کوشش، وہ چاہتا تھا کہ اصل موضوع سے لوگوں کی توجہ ہٹادے، اپنی قوت گفتار، انسانی وقوی نفسیات سے واقفیت (جو ایک تجربہ کار حکمران کو حاصل ہوتی ہے) اور سیاسی داؤ پیچ سے بات کو "ٹال دے" اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نمٹ لے، ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کمال یہ تھا کہ وہ موضوع سے ذرا بھی ٹلنے کے لئے تیار نہیں تھے، فرعون کے کہا **"ومنا ربک العلمین"** (سارے جہانوں جہانوں کا پروردگار کیا؟) وہ چاہتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوئی ایسا جواب دیں جس سے بات دوسرا رخ اختیار کرلے اور مناظرہ چل پڑے۔لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر وہی دکھتی رگ پکڑی **"قال رب السموات والارض وما بینهما ان کنتم موقنین"** (فرمایا وہ جواب ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان کا جو ان دونوں کے درمیان ہے...... بشرطیکہ تم یقین کرو) اس کا مطلب یہ تھا کہ خود فرعون کا تخت سلطنت ایسا ہے، جس کے کوئی پائے نہیں ہیں، مگر انہوں نے یہ کہا نہیں، اور صرف اس پر اکتفا نہیں کیا کہ **"رب السموات والارض وما بینهما"** بلکہ یہ بھی ساتھ ساتھ کہہ دیا **"ان کنتم موقنین"** (بشرطیکہ تم یقین کرو) اس طرح چیلنج کردیا اور اصل مرض کی نشاندہی فرمادی (اگر تم یقین کرتے ہو) یعنی تم ایمان سے محروم ہو، اگر ایمان ہوتا تو دیکھ سکتے تھے کہ سارے جہانوں کا پروردگار وہی ہے جو آسمان اور زمین اور ان دونوں کے درمیان ہر شے کا مالک اور پروردگار ہے۔

فرعون کے ترکش میں ایک ہی تیر تھا جس کو اس نے آزمالیا:

فرعون کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان بندی اور لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکانے کا ایک ہی ذریعہ تھا، جس کو وہ بار بار استعمال کررہا تھا، قرآن کریم نے اس کو متنوع پیرایوں میں ذکر کیا ہے۔ **"قال لمن حوله"** اپنے ہالی موالی سے کہا **"الاتتمعون"** سنتے نہیں؟ یہ کیا کہہ رہے ہیں!! یعنی کیا تمہاری رگ حمیت نہیں بھڑکتی؟ تمہیں غیرت نہیں آتی؟ تم کو میری طرف سے جواب دینے اور منہ بند کرنے کی ہمت نہیں ہوتی؟ سنتے نہیں یہ کیا کہہ رہا ہے!! لیکن قبل اس کے کہ وہ بولتے، ان میں جوش پیدا ہوتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بات پوری کردی **"ربکم ورب ابآؤکم الاولین"** (تمہارا اور تمہارے آباؤ اجداد کا پروردگار ہے) فرعون نے ایک بار پھر کوشش کی کہ ان کی بات کو ہوا میں اڑادے، اور تحقیر کے انداز میں مذاق

اڑانے کا اسلوب اختیار کیا۔ "ان رسلو کم الذی ارسل الیکم لمجنون" یہ تمہارا پیغمبر جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، پاگل ہے! فرعون سمجھتا ہوگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس بات کے جواب میں اپنی مدافعت کریں گے اور کہیں گے کہ نہیں میں پاگل نہیں ہوں۔

فرعون کی ترکش کا آخری تیر:

فرعون اس انسانی کمزوری سے واقف تھا کہ اگر کسی شخص کی ذات پر حملہ کیا جاتا ہے تو وہ اشتعال میں آ جاتا ہے، اس سے اپنی توہین برداشت نہیں ہوتی، قرآن کریم نے اس ماحول اور مناظر کی وہ منظر کشی کی ہے جسے ہم دیکھ اور سن رہے ہیں، فرعون سمجھتا تھا کہ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بپھر پڑیں گے اور کہیں گے کہ کون کہتا ہے کہ میں پاگل ہوں، بلاؤ کسی ڈاکٹر، حکیم کو، کسی ماہر امراض کو، میرا معائنہ کرے۔ فرعون نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو باؤلا اور پاگل کہا تو اس کا مقصد یہی تھا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سب سنی ان سنی کر کے اپنی ہی بات جاری رکھی۔

قال رب المشرق والمغرب وما بینهما ان کنتم تعقلون O (الشعراء ۲۸)

کہا کہ مشرق اور مغرب اور جو کچھ ان دونوں میں ہے سب کا مالک بشرطیکہ تم کو سمجھ ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی بابت کچھ نہیں کہا۔ نہ اپنی مدافعت میں ایک لفظ بولے، وہ اللہ کے فرستادہ پیغمبر برحق تھے، ان کے سپرد یہ مہم تھی کہ اللہ کے دین کی ان کو دعوت دیں، یہ سب باتیں (باؤلا، پاگل کہنا) ان کو یہ افروختہ نہیں کر سکتی تھیں اور ان کی دعوت حق کے مقابلے میں اس کی حیثیت ہی کیا تھی، اور ایسے ماحول میں جس میں شرک چھایا ہوا ہو، جس میں بت پرستی عام ہو، جس میں جرائم اور معاصی کی پرورش ہو رہی ہو، جہاں آبرو باختہ، باعزت افراد کی پگڑیاں اچھالنے کے درپے ہوں، جس ماحول میں معصوم بچے اور بے گناہ افراد قتل کیے جاتے ہوں، ایسے ماحول میں مجنون اور پاگل کی پھبتی اور چوٹ کوئی بڑی بات نہ تھی، لہذا انہوں نے سنی ان سنی کر کے فرمایا کہ وہ رب وہی ہے جو مشرق و مغرب اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے، سب کا پروردگار ہے، اس پر مزید ایک لفظ بڑھا دیا۔ "**ان کنتم تعقلون**"

یہ تیر فرعون کے جگر کو چھلنی کر گیا، وہ تو سمجھتا تھا کہ مصر میں وہی رب المشرق والمغرب ہے، اس کی سمجھ یہی تھی کہ سارا عالم مصر سے عبارت ہے اور وہ چونکہ مصر کا مالک ہے، لہذا سارا

عالم اس کے قدموں کے نیچے ہے، حضرت موسیٰ نے مشرق و مغرب اور ان دونوں کے درمیان دنیا کا ذکر کر کے اسی کے غرور حکمرانی پر ضرب لگائی اور بنیاد ہی ڈھا دی جس پر فرعون کی جھوٹی خدائی کی عمارت قائم تھی، اور جس پر اس کو بڑا ناز تھا۔

پیغمبرانہ دعوت و حکمت کا یہ ایک نمونہ تھا، اس نمونہ میں دعوت دینے والا اور جس کو دعوت دی گئی ہے دونوں کی نوعیتیں مختلف اور جداگانہ نظر آتی ہیں، دعوت کا موضوع پیچیدہ اور نازک تھا اور داعی کی پوزیشن بڑی نازک اور کشمکش والی تھی۔ جس کو دعوت دی جا رہی تھی وہ ایک شہنشاہ اور حکمران مطلق العنان تھا، اسی لئے اس نمونہ دعوت کا مطالعہ ہماری خصوصی توجہ کا طالب ہے، اس سے دور رس نتائج نکل سکتے ہیں، اور اس سے طریق دعوت کے واضح اصول و ہدایات اخذ کی جا سکتی ہیں، جن سے دعوت کی فکری تعمیر اور عملی خاکہ بنانے میں بیش قیمت مدد مل سکتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم بنی اسرائیل

گزشتہ خطبہ میں یہ ذکر کیا گیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے وقت کے سخت ظالم و جابر حکمران فرعون کو دعوت دینے میں کیا رویہ اختیار کیا تھا، آج اس موقعہ پر اس امر کا جائزہ لینا ہے کہ ان کا خود اپنی قوم کے مقابلہ میں کیا موقف تھا؟

اندرونی کشمکش بسا اوقات سخت ابتلا کا باعث بن جاتی ہے، جب ایک خاندان یا قبیلہ کے افراد آپس میں دست و گریبان ہوتے ہیں، قلب و دماغ پر اس کے اثرات کچھ کم نہیں ہوتے، بلکہ بیرونی دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کے مقابلہ میں یہ بات صبر آزما ہوتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم بنی اسرائیل سے جو سابقہ پڑا تو ان کا کیا موقف رہا؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چار واضح اور فیصلہ کن مواقف:

یہ سوال اپنی جگہ معقول ہے (یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم بنی اسرائیل کے مقابلہ میں بحیثیت ایک داعی اور مصلح کے کیا رویہ رہا؟) اور اس کا جواب ہمیں قرآن کریم سے جو ملتا ہے اس کو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمیں چار نہایت صریح اور قطعی مواقف نظر آتے ہیں، اور ان کے مطالعہ سے ہم ایسے نتائج اخذ کر سکتے ہیں، جن کے ذریعہ دعوت دین کے اصول سمجھ سکیں، اور ساتھ ہی داعی کے مختلف مواقف کا اندازہ کر سکیں، مثلاً یہ کہ ایک داعی الی اللہ اپنی اقوم کے افراد سے، اپنے قبیلہ یا خاندان کے افراد سے یا اپنے عزیزوں سے کس طرح مخاطب ہو، اور اگر کسی دشمن کو مخاطب کرتا ہو تو اس کا پیرایہ بیان کیا ہونا چاہئے، اس مطالعہ سے ایک بات جو بہت کھل کر سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ ایک داعی الی اللہ کا موقف ہمیشہ داعی ہی کا موقف رہتا ہے، خواہ وہ دشمن کو مخاطب کر رہا ہو یا عزیز ترین فرد خاندان کو، دعوت کا رنگ اس پر غالب رہے گا، اور داعی کی شان اس میں جھلکتی رہے گی، خواہ صورتحال کچھ بھی ہو، اور مخاطب جو بھی ہو، اس کی زبان دعوت کی زبان ہوگی، اس کے سامنے مقصد

دعوت ہوگا، اور ہمیشہ اسی نغمہ کا تار چھیڑتا رہے گا اور انداز بیان خواہ جو بھی ہو مگر اس کی نظر اس پر ہوگی کہ کس طرح دعوت کی بات دل میں اتار دے اور کس طرح دلوں کو قبول حق کے لئے تیار کرے، دعوت کے منافی جو بات ہوگی، اس کو وہ ہاتھ نہیں لگائے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سپرد جو مہم تھی، وہ اپنے ماحول اور گرد و پیش کے حالات کی بنا، پر ایک خاص نوعیت کی مہم تھی، اس کا تعلق ان خاص حالات اور فضاء سے بھی ہے جس میں وہ پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔

منصب نبوت اور سیاسی قیادت کا فرق:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس ضمنی مہم کو سمجھنے میں کسی حد تک غلط فہمی اور خلط ملط کا امکان ہے، جس کے لئے وہ اللہ کی طرف سے مامور تھے، اور جس کا مقصد بنی اسرائیل کی آزادی کا حصول تھا، میں چاہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں آپ کا ذہن صاف رہے، بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جو کام تھا (بنی اسرائیل کو آزادی دلانا) وہ ایسا کام تھا کہ جو بھی اس کو لے کر اٹھتا اس پر سیاسی رنگ غالب آجاتا، اور وہ سیاست کی زبان میں بات کرتا، قومی جوش سے پر ہوتا "حقوق" اور دلیل کی بات کرتا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ بنی اسرائیل کو فرعون نے غلام بنا رکھا تھا اور وہ سخت مظالم کا شکار تھے، ایسے مظالم جن کی صحیح تصویر کشی صرف قرآن ہی کی بلیغ آیتوں میں ممکن تھی:

واذ نجینکم من ال فرعون یسومونکم سوء العذاب یذبحون ابنآء کم ویستحیون نسآء کم وفی ذلکم بلآء من ربکم عظیم O (البقرہ ۴۹)

اور ہمارے ان احسانات کو یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون سے مخلصی بخشی، وہ (لوگ) تم کو بڑا دکھ دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی سخت آزمائش تھی۔

سورۂ قصص میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ان فرعون علا فی الارض وجعل اهلها شیعاً یستضعف طآئفة منهم یذبح ابناء هم ویستحی نسآء هم انه کان من المفسدین O (القصص ۴)

کہ فرعون نے ملک میں سر اٹھا رکھا تھا اور وہاں کے باشندوں کو گروہ گروہ بنا رکھا تھا، انہی

میں سے ایک گروہ کو (یہاں تک) کمزور بنا رکھا تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کرڈالتا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتا، بے شک وہ مفسدوں میں تھا۔

جس کی قوم پر یہ بیت رہی ہو، وہ جب اپنی قوم کی مدافعت میں اٹھ کھڑا ہوگا، اور ان کو آزاد کرنے کا بیڑا اٹھائے گا، اور ایسے ظالم کے چنگل سے چھٹکارا دلانا چاہے گا جو اس کو ہر طرح سے کچل رہا ہو، طرح طرح سے ذلیل کررہا ہو تو یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ غیرت قومی سے سرشار ہوگا، اور قومی نفسیات اس کے اندر ابھر آئے گی، وہ سیاست اور ''مطالبات'' اور ''حقوق'' کی زبان میں بات کرے گا اور جیسا کہ سب جانتے ہیں، حقوق و مطالبات کی زبان خاص ہوتی ہی اور طرز تعبیر بھی مختلف ہوتا ہے۔

مگر جس پہلو کی طرف آپ کی نظر ملتفت کرانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کی طرح ایک نبی مرسل تھے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنا مخاطب بنانے اور بات کرنے کا شرف عطا فرمایا تھا، ان کی اولین حیثیت یہ تھی کہ وہ دین حق اور ایمان وعقیدہ کے داعی تھے، لہٰذا ان آیات پر آپ غور کریں اور دیکھیں کہ کس طرح حضرت موسیٰ علی السلام نے اللہ تعالیٰ کی مدد و تائید سے اپنی داعیانہ شخصیت کو آگے رکھا اور احتجاج و مطالبات اور قومی نخوت اور جوش کو بیچ میں آنے نہیں دیا، موقع ایسا تھا کہ اس میں انسان سب کچھ بھول جایا کرتا ہے، اس کے اندر ''حمیت جاہلیہ'' (غیر دینی قومی حمایت وفخر) جوش مارنے لگتی ہے، اور جذبہ وطنیت وقومیت اپنا کام کرنے لگتا ہے، اور قوم پرست سیاسی کارکنوں کی زبان میں وہ بات کرنے لگتا ہے، لیکن دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کس طرح رہنمائی فرمائی کہ ان کے جذبہ قومی کی رگ ایمانی قوت پر غالب نہ آسکی اور فرعون کو جو دعوت دی وہ اللہ پر ایمان کی دعوت تھی، اس کو دینی حقائق بتائے اور اللہ تعالیٰ کا جو معاملہ اپنی مخلوق کے ساتھ ہے، اور جو قوموں اور نسلوں کے ساتھ رہا ہے، اس کو یاد دلایا، اب میں ان آیات کی تلاوت کرتا ہوں۔

فرعون کے وزراء ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے:

وقال الملأ من قوم فرعون اتذر موسیٰ وقومه ليفسدوا في الارض ويذرک والهتک قال سنقتل ابنآء هم وتستحي نسآء هم وانا فوقهم قاهرون (الاعراف ۱۲۷)

قوم فرعون میں جو سردار تھے، کہنے لگے کہ کیا آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑ دیجئے گا کہ ملک میں خرابی کریں اور آپ سے اور آپ کے معبودوں سے دست کش ہو جائیں۔ وہ بولے کہ ہم ان کے لڑکوں کو تو قتل کر ڈالیں گے اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیں گے۔ اور بے شبہ ہم ان پر غالب ہیں۔

ان لوگوں نے ایک تیز سے دو شکار کرنا چاہا۔ ایک تو فرعون کو خود شکار کرنا چاہا (اگر اسکو شکار کہا جا سکتا ہو) اور دوسرے اس کی قوم کو، فرعون سے وہ بات کہی جو اس کو بھڑکا دے اور غیظ میں لے آئے۔

''یہ ملک میں خرابی اور بگاڑ پیدا کرنا چاہتے ہیں'' یہ بات صنم پرستوں اور گوسالہ پرستوں کو بھڑکانے والی تھی۔ وہ ان کا کہنا کہ ''ویذرک والھتک'' (یہ چاہتے ہیں کہ اہل ملک آپ سے اور آپ کے معبودوں سے دشت کش ہو جائیں) ان لوگوں نے اپنی بات میں فرعون اور اس کی قوم دونوں کو ایک ساتھ برافروختہ کر دیا۔

پیغمبرانہ روح کا تابناک نمونہ:

اس دہشت ناک موقع پر جبکہ انسان نخوت اور جوش سے بھر جاتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اس اسلوب کلام کو فراموش نہیں کیا، جس کے وہ ہمیشہ سے پابند تھے، اور نہ اس پیغام کو بھولے جس کا انہیں اللہ تعالیٰ نے حامل بنایا تھا۔

تصور کیجئے، اگر یہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ کوئی عالم، مبلغ یا سیاسی لیڈر ہوتا تو وہ قدرتاً فرعون کو مخاطب کرتا، فرعون کی قوم سے لڑتا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کیا، کیونکہ ان کی دعوت کے اولین مخاطب وہی تھے، اور وہی ان کا اصل سرمایہ تھے، اور ان ہی سے یہ توقع تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ صورت حال تبدیل فرما دے گا۔

ایک راہ شناس مبلغ جس کو اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی مہم سر کرنے کے لئے تیار کیا تھا:

قال موسیٰ لقومه استعینوا بالله واصبروا ان الارض لله یورثها من یشآء من عباده والعاقبة للمتقین (الاعراف ۱۲۸)

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو، زمین تو خدا کی ہے (اور) وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا مالک بنادیتا ہے، اور آخر بھلا تو ڈرنے والوں کا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں "خدا سے مدد مانگو" یہ نہیں کہتے کہ تمہاری تعداد کافی ہے، اس پر بھروسہ رکھو، اپنی عقل و ذہانت پر بھروسہ کرو، جو خدا نے تم کو دے رکھی ہے اور اس میں شک نہیں کہ بنی اسرائیل کے افراد اپنی ذہانت اور دماغی صلاحیت میں ہر دور میں ممتاز رہے ہیں، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کسی ایسی بات کو نہیں چھیڑا جس سے قومی غرور کا جذبہ پروان چڑھے۔ اگر وہ چاہتے تو ان باتوں کا ذکر کر سکتے تھے، کیونکہ وہ خود انہیں میں سے تھے اور انہیں تمام خصوصیات کا علم تھا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو ان کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کسی مسجد کے منبر پر کھڑے ہوئے خطبہ دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں "استعینوا باللہ واصبرو" اللہ سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو۔ "ان الارض للہ یورثھا من یشآء من عبادہ" زمین تو خدا کی ہے اور وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا مالک بنادیتا ہے "والعاقبۃ للمتقین" اور انجام کار کی خوبی اور بھلائی تو خدا سے ڈرنے والوں کے لئے ہے۔

یہ ہے ایک حامل رسالت، جادۂ حق پر گامزن، اور راہ شناس مبلغ وداعی کا رویہ جس کو اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم مہم کے لئے تیار کر رکھا تھا۔

یہ دعوت تھی اللہ کی طرف سے، دعوت تھی کہ اللہ پر بھروسہ کو اپنا شعار بنائیں، دعوت تھی کہ سارے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیئے جائیں، دعوت تھی کہ پامردی اور استقلال و ہمت کے ساتھ فرعون کی ان دھمکیوں کا مقابلہ کریں جو اس کے اس جملہ سے ظاہر تھے۔ "سنقتل ابناء ھم ونستحیی نسآء ھم وانا فوقھم قاھرون" (یعنی ہم ان کے بیٹوں کو قتل کرڈالیں گے، اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیں گے، اور بلاشبہ ہم ان پر غالب ہیں) اور فرعون کا یہ عمل کوئی ہنگامی یا وقتی نہیں تھا بلکہ دائمی طور پر اس نے اپنا اصول بنا رکھا تھا "انا فوقھم قاھرون" (بلاشبہ ہم ان پر غالب ہیں) یہ مستقل غرور تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا "خدا سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو، زمین تو اللہ کی ہے۔" اس جملہ نے فرعون کے

دل ودماغ پرسخت ضرب لگائی ہوگی، فرعون کے دربار میں یہ کہنا آسان نہ تھا کہ زمین تو اللہ کی ہے، یعنی فرعون کی نہیں ہے، اور نہ بنی اسرائیل ہی کی ہے، اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کوئی سیاسی لیڈر یا قومی رہنما ہوتے تو کہتے کہ یہ زمین ہماری ہے، ہم اس کے مالک ہیں، یہ انداز بیان جو خاص قوم پرست لیڈروں کا ہوا کرتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے کہ یہ ملک انگریزوں کا نہیں ہندوستانیوں کا ہے، امریکہ، امریکہ والوں کا ہے، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے روبرو کہا کہ زمین اللہ کی ہے، یہ نہیں کہا کہ یہ ہمارے آباؤ اجداد کی میراث ہے، اگر وہ ایسا کہتے تو حق بجانب ہوتے، کیونکہ وہ صدیوں سے اس میں آباد چلے آرہے تھے، اور اس سرزمین پر ان کا حق تھا، اور وہ لوگ وہاں کے شہری تھے، ان کے بھی وہی حقوق تھے، جو قبطیوں کے تھے، یا شاہی خاندان کے افراد کے ہوسکتے تھے، مگر یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انداز بیان ہی کچھ اور تھا، اپنے لوگوں سے فرمایا اللہ کی مدد چاہو اور ثابت قدم رہو، زمین صرف اللہ کی ہے، جس کو چاہتا ہے اس کا مالک بنادیتا ہے، اس کا یہ مطلب بھی واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو باور کرار ہے ہیں کہ اگر فرعون اس ملک سے نکل بھی گیا اور تم کو تخت وحکومت مل بھی گئی تو یہ کوئی ابدی اور ہمیشہ رہنے والی چیز نہ ہوگی، یہ بات اللہ تعالیٰ کی سنت کے خلاف ہے، اور اس کے عدل کے منافی ہے، اللہ جس کو چاہتا ہے اس کو زمین کا مالک بنادیتا ہے، اور انجام کار کی بھلائی خدا سے ڈرنے والوں کے حصہ میں آتی ہے، یعنی یہ زمین کسی خاص فرد اور خاندان کی ملکیت نہیں ہوسکتی، کوئی قوم ہمیشہ کے لئے اس پر قابض نہیں رہ سکتی، البتہ انجام کار کی خوبی خداترس لوگوں کے حصہ میں آتی ہے، جیسا کہ سورۂ یونس میں آیا ہے:۔

ثم جعلنکم خلئف فی الارض من بعدھم لینظر کیف تعملون O

(یونس ۱۴)

پھر ہم نے ان لوگوں کے بعد تم کو خلیفہ بنادیا، تاکہ دیکھیں تم کیسے کام کرتے ہو۔

ہمت شکن اور دل توڑنے والی بات:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سب سے زیادہ اذیت جس بات سے پہنچی ہوگی وہ میرے خیال میں بنی اسرائیل کا ان سے یہ کہنا تھا کہ:

اوذینا من قبل ان تاتینا ومن بعد ماجئتنا (الاعراف ۱۲۹)

تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم کو اذیتیں پہنچتی رہیں اور آنے کے بعد بھی۔

یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے فرعون کی اس بات سے زیادہ دل توڑنے والی اور حوصلہ شکن تھی، جبکہ اس نے کہا تھا کہ "ہم ان کے بیٹوں کو قتل کرڈالیں گے اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیں گے اور بلاشبہ ہم ان پر غالب ہیں۔"

کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے مبعوث فرمایا تھا کہ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی اور ذلت کی زندگی سے نجات دلائیں، اور اللہ کی طرف ان کی رہنمائی کریں، لیکن انہوں نے اس احسان کا بدلہ کیا دیا؟ کہا کہ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہمیں اذیتیں پہنچتی رہیں، اور تمہارے آجانے کے بعد بھی یہی صورتحال ہے، یہی نہیں بلکہ جیسا کہ سورۂ یٰسین میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا قول نقل کیا ہے، جن کے پاس خدا کے کئی کئی پیغمبر اور ہدایت کے قاصد آئے تھے۔

قالوآ انا تطیرنا بکم (یٰس ۱۸)

وہ بولے ہم تم کو نامبارک سمجھتے ہیں۔

اسی زبان اور لہجہ میں گویا بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنا چاہتے تھے کہ تم ہمارے لئے منحوس ثابت ہوئے (کہ تمہاری وجہ سے ہمارے سینکڑوں ہزاروں بچے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے) یہ کس درجہ جگرخراش اور دل توڑنے والی بات ہے کہ جس قوم کے لئے انسان جان دے، قربانیاں دے، عیش و آرام کی زندگی تج دے، زندگی کو خطرہ میں ڈالے، وہ لوگ اس سے احسان فراموشی، ناشکری اور ناقدری کا معاملہ کریں، اگر وہ احسان کا اعتراف نہیں کرسکتے تھے، تو کم سے کم درجہ یہ تھا کہ خاموش ہی رہتے، مگر وہ تو یہ کہہ رہے تھے کہ ہمیں مصائب آپ کے آنے سے پہلے بھی جھیلنا پڑے اور وہی مصائب آپ کے آنے کے بعد بھی جھیلنا پڑ رہے ہیں، اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو نحس سمجھ رہے تھے، اور کہہ رہے تھے کہ آپ کا وجود ہماری مصیبتوں کا سبب ہے، جب سے آپ آئے ہیں، ہم مصائب میں اس طرح گرفتار ہیں جس طرح آپ کی آمد سے پہلے مبتلائے رنج و آلام تھی، مصائب کا ایک تسلسل ہے جو ختم نہیں ہوتا۔

داعی ہر حال میں داعی ہی رہتا ہے:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کا کیا جواب دیا؟ یہ ایک دوسرا موقف ہے، ایک نبی برحق اور صاحب وحی داعی الی اللہ کا، انہوں نے اپنی قوم کی اس دل آزار بات کا نوٹس نہیں لیا اور نہ غضبناک ہوئے، گویا اس حقیر بات کو انہوں نے سنا ہی نہیں، اور جو بات اس کے جواب میں کہی اس سے پیغمبرانہ وقار اور منصب نبوت کے شایان شان حلم و بردباری کا اظہار ہوتا ہے:

قال عسیٰ ربکم ان یهلک عدوکم ویستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعملون O (الاعراف ۱۲۹)

کہا، قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور اس کی جگہ تمہیں زمین میں خلیفہ بنا دے، پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

ایک داعی کی شان ہی نرالی ہوتی ہی، وہ ہر حال میں اور ہر جگہ داعی رہتا ہے، یہاں تک کہ آپ کہیں تو غلط نہیں ہوگا کہ وہ کھانے پینے میں بھی داعی دکھائی دیتا ہے، اپنے گھر میں، اپنے افراد خاندان کے ساتھ، اپنے بال بچوں کے ساتھ زندگی گزارنے میں، رنج وغم کے موقع پر اس کے داعی ہونے کی شان اس سے جدا نہیں ہوتی، ہمیں رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ میں بھی یہی بات نظر آتی ہے کہ ہر حال میں آپ ﷺ داعی نظر آتے تھے، یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت میں بھی یہی نقشہ نظر آتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناشکری اور ناقدری کی بات نے ان پر اثر ہی نہیں کیا، اور اس کو نظر انداز کر کے کہنے لگے ''قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمنوں کو ہلاک کر دے اور اس کی جگہ تمہیں زمین کا خلیفہ (مالک) بنا دے۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ بھی سمجھانا چاہا کہ ''ہوش میں رہنا، کہیں پھر تمہارا نفس تم کو دھوکہ میں نہ ڈال دے اور دوبارہ پھر کہیں انہیں غلطیوں کا ارتکاب نہ کر بیٹھو جو پہلے تم سے سرزد ہو چکی تھیں۔'' اس لئے بات کو اس طرح مکمل فرمادیا۔ "**فلینظر کیف تعملون**'' پھر دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو، یعنی ایسا نہ ہو کہ تم قبطیوں کی طرح دنیا سے لطف اندوزی میں پڑ جاؤ، یا فرعون اور اس کے بالی موالی کی طرح دنیاوی عیش و آرام کو اپنا شعار بنالو، اللہ تعالیٰ تمہیں ایک موقع دینے والا ہے کہ وہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو، تمہارا کیا طرق عمل رہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے جس طرح قبطیوں کو زمین کا وارث بنایا ہے تمہیں بھی بنا سکتا ہے۔

ان الارض للہ یورثھا مایشآء من عبادہ والعاقبة للمتقین (الاعراف. ۱۲۸)

بلاشبہ زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں جس کو چاہتا ہے اس کو مالک بنا دیتا ہے اور انجام کار کی بھلائی خدا سے ڈرنے والوں کے لئے ہے۔

اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکلر ان الارض یرثھا عبادی الصلحون

(الانبیاء ۱۰۵)

اور ہم نے نصیحت (کی کتاب یعنی توریت) کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا کہ میرے نیکوکار بندے ملک کے وارث ہوں گے۔

یہاں جو بات واضح کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ داعی الی اللہ کے اعصاب پر دعوت کی روح غالب رہتی ہے، لہذا جو بات اس کی زبان سے نکلتی ہے اور جو عمل بھی اس سے صادر ہوتا ہے اس سے دعوت کی روح جھلکتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کچھ اور چاہا اور اللہ تعالیٰ نے کچھ اور کر دیا:

ایک دوسری صورت اور سامنے آتی ہے، جو بہت ہی نازک اور کشمکش کی صورت ہوئی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر فرعون کی حدود مملکت سے باہر لے جانے لگے، تا کہ اس سرزمین سے آزاد کرادیں، جہاں وہ ذلت اور رسوائی میں دن کاٹ رہے تھے، اور جہاں ظالم و جابر حکمران کی حکمرانی تھی، اور جہاں مذہب اور قومیت کی وجہ سے ان پر مصائب کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فیصلہ کیا کہ ان کو سینائے کے جزیرہ نما میں لے جائیں گے جو فرعون کی شہنشاہیت سے باہر تھا، یہاں عجیب بات سامنے آئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خواہش تو صرف اس قدر تھی کہ ان لوگوں کو فرعون کی حدود سلطنت سے باہر ایک جائے امن تک پہنچا دیں، بنی اسرائیل کچھ اور امید باندھے ہوئے تھے، مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رات کی تاریکی میں سفر شروع کیا۔ جزیرۂ عرب اور صحرائے

افریقہ کے درمیان ایک ہی خشکی کا راستہ تھا، جو افریقہ اور ایشیاء کو ایک دوسرے سے جوڑتا تھا اور وہ مصر کے شمال مشرق جانب تھا، لیکن رات کی تاریکی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام راستہ بھول گئے، یہ بھول کوئی اتفاقی بات نہ تھی بلکہ قضاء وقدر کا فیصلہ تھا، اور اللہ تعالیٰ کی ایک طے شدہ تدبیر تھی، وہ بجائے خشکی کے راستہ کے بحری راستے چل پڑے، اگرچہ خشکی کی طرف نکلنے والا راستہ مختصر تھا، مگر رات کی تاریکی میں وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے، جب صبح کی پو پھٹی تو دیکھا کہ سمندر سامنے ہے، اور پیچھے پیچھے فرعون کا لشکر ہے، لوگ چیخ اٹھے کہ اب کیا چارۂ کار ہے، ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بدگمانی ہونے لگی، جو پہلے ہی کچھ کم نہ تھی، کہنے لگے آپ ہم کو ایسی جگہ لے کر آئے ہیں، جہاں ہم فرعون کے چنگل میں پھنس جائیں، آگے دریا، پیچھے دشمن ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' اب کیا کریں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہاں بھی پیغمبرانہ اور داعیانہ شان نمایاں ہوتی ہے، سورۂ شعراء میں اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے:

فلما تراء الجمعن قال اصحب موسیٰ انا لمدرکون O (الشعراء ۶۱)

جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں تو موسیٰ علی السلام کے ساتھی کہنے لگے کہ اب تو ہم پکڑ لئے گئے۔

اس موقع پر کسی سیاسی لیڈر کا جواب کیا ہوسکتا تھا؟ یہی نا کہ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر اور باریک بیں پلان بنایا ہی، اور ہم بالکل ٹھیک ٹھاک اپنی پلاننگ کے مطابق لل رہے ہیں، اور ہم کامیابی حاصل کرکے رہیں گے، ہمیں اس کا بالکل یقین ہے۔

ہرگز نہیں، میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ مجھے راستہ بتائے گا:

لیکن ایک صاحب علم وامانت پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا جواب دیا، فرمایا:

کلا ان معی ربی سیھدین O (الشعراء ۶۲)

ہرگز نہیں! میرا رب میرے ساتھ ہے وہ مجھے راستہ بتائے گا۔

یہ بات انہوں نے پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ فرمائی، پورے اطمینان قلبی اور انشراح صدر سے کہی، اس جملہ کا ہر لفظ بتا رہا ہے کہ ان کو اپنے مالک پر کس درجہ اعتماد تھا اور اللہ کی قدرت وعظمت پر کس درجہ یقین تھا، اور انہیں پورا یقین تھا کہ یہ راتوں رات کا سفر محض اللہ رب العزت کے حکم سے ہوا، وہ رب کریم جو اپنے بندے کو مایوس نہیں کرتا، اس کا وعدہ کبھی خطاء

نہیں کرتا، لہذا بحر بیکراں کا کیا خوف اور لشکر جرار سے کیا ہراس؟

اس بات کا خوف کہ وہ اپنے ماننے والوں کو دشمن کے لئے لقمہ تر بنا دے گا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ورافت سے بہت بعید ہے، یہ تو کسی نیک خو حکمران سے، کسی شفیق باپ سے، کسی صاحب مروت اور شریف انسان سے بھی توقع نہیں کی جا سکتی، چنانچہ اگر چہ صورت حال بہت سے بھیانک اور ظاہری آنکھوں سے خطرات میں لوگ گھر گئے تھے، پھر بھی ان کو ذرہ برابر شک وشبہ نہیں تھا، آخر وہ نبی برحق تھے، اللہ تعالیٰ کے ایماء ہی سے وہ بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات چل پڑے تھے، اور جب اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہر شے ہے، کائنات سب اس کی ملکیت ہے، لہذا کوئی ایسی بات سامنے نہیں آ سکتی، جس سے خوف و ہراس کو دل میں جگہ دی جائے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پورے یقین اور جوش سے فرمایا، ہرگز نہیں! اللہ میرے ساتھ ہے، وہ میری رہنمائی فرمائے گا۔

اس واقعہ کو جسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے، ایک دوسرے واقعہ سے ملا کر دیکھئے، اس کا بھی قرآن کریم ہی نے ذکر کیا ہے، اور وہ واقعہ حضرت خاتم الرسل محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے:

ثانی اثنین اذهما فی الغار اذ یقول لصاحبه لاتحزن ان الله معنا (التوبہ ۴۰)

(اس وقت) دو میں سے دوسرے جب وہ دونوں (غار ثور) میں تھے، اس وقت اپنے ساتھی کو کہہ رہے تھے غم نہ کرو۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔

اس کی تفصیل صحیح بخاری میں پڑھئے، جس کو تمام سیرت کی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے رفیق سفر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں تھے کہ حضرت ابو بکرؓ کو مشرکین قریش کی آہٹ محسوس ہوئی اور کہنے لگے، یا رسول اللہ! اگر ان میں سے کوئی اپنے پیر کی طرف دیکھ لے تو ہمیں دیکھ سکتا ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔ ''تم ان دو کے بارے میں سوچتے ہو جن کا تیسرا خود اللہ تعالیٰ ہے؟'' **''ماظنک باثنین الله ثالثهما''**

ان دو عظیم پیغمبروں کے واقعات میں کس درجہ مماثلت ہے۔ اس پر غور کیجئے، ان دونوں پیغمبروں کے درمیان قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں منصب نبوت پر فائز تھے، اور ان کے اندر وہ پختہ یقین تھا جو آج بھی کروڑوں انسانوں کے ایمان و یقین کا باعث ہے، ان دونوں پیغمبران برحق کا یقین اللہ کی قدرت پر اعتماد، ان کی رحمت ورافت پر بھروسہ اس درجہ کا تھا، جس کو بڑے

سے بڑا فلسفی، حکیم وقت، ذہانت وذکاوت کے پتلے چھو نہیں سکتے تھے، بلاشبہ اللہ کی دین ہے جسے وہ چاہتا ہے، مرحمت فرماتا ہے۔

پھر کیا ہوا!!

پھر کیا ہوا، اس کا جواب ان آیات کریمہ میں موجود ہے۔

فاوحینآ الی موسیٰ ان اضرب بعصاک البحر فانفلق فکان کل فرق کالطور العظیم O وازلفنا ثم الاخرین O وانجینا موسیٰ ومن معه اجمعین O ثم اغرقنا الاخرین O ان فی ذلک لایة وما کان اکثرهم مؤمنین O وان ربک لهوالعزیز الرحیم (الشعراء ۶۳ تا ۶۸)

اس وقت ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ اپنی لاٹھی دریا پر مارو تو دریا پھٹ گیا اور ہر ایک ٹکڑا یوں ہوگیا کہ گویا بڑا پہاڑ ہے، اور دوسروں کو ہم نے قریب کردیا۔ موسیٰ اور ان کے ساتھ والوں کو بچالیا، پھر دوسروں کو ڈبو دیا، لیکن یہ اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں، اور تمہارا پروردگار تو غالب اور مہربان ہے۔

ارادۂ الٰہی اور اسباب مادی

مادی اسباب کے سلسلے میں انبیاؑء اور ان کے مخالفین کا فرق

نحمده و نصلي علی رسوله الكريم اما بعدo فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم o بسم الله الرحمن الرحيم o

قرآن کا...... جو وہ واحد کتاب ہے جس نے انبیاء کی تاریخ، ان کے حالات زندگی، اور پیمبرانہ خبروں کو محفوظ رکھا ہے...... پڑھنے والا تسلسل اور وضاحت کے ساتھ یہ دیکھے گا کہ انبیاؑء کی بعثت ہمیشہ بڑے تاریک مخالف ماحول میں ہوئی ہے...... مادی لحاظ سے بھی وہ کمزور اور بے سروسامان تھے، اور ملک و مال، دوست اور ساتھی اور دوسرے وہ تمام مادی اسباب جن پر انسانوں کو ناز ہوتا ہے ان کے مخالفین کے پاس تھے، اور ان کے ماتحت تھے انبیاؑء کا سرمایہ وہ مضبوط ایمان ہوتا ہے جس تک شک کی رسائی بھی نہیں اخلاص کامل ہوتا ہے جس میں طمع و نفاق کی ذرا بھی آمیزش نہیں ہوتی، اللہ پر بھروسہ، اس کی طرف رجوع، اس کی چوکھٹ پر افتادگی، عمل صالح تقویٰ، حسن سیرت، اخلاق فاضلہ ہوتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر (مذکورہ صفات کی اہمیت برقرار رکھتے ہوئے) وہ صحیح ایمانی دعوت ہوتی ہے، جس کی کامیابی کی ضمانت خود خدا نے لی ہے۔

انا لننصر رسلنا والذين آمنوا في الحيواة الدنيا و يوم يقوم الا شهادo

ہم اپنے پیمبروں اور ان کی جو ایمان لائے دنیا کی زندگی اور اس دن جب گواہ کھڑے ہوں گے ضرور مدد کریں گے۔

كتب الله لاغلبن انا ورسلي ان الله قوی عزيز

اللہ نے طے کر رکھا ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب آئیں گے اللہ یقیناً قوی اور غالب ہے۔

ولقد سبقت كلمتنا لعبادنا المرسلين۔ انهم لهم المنصورون وان

جندنا لهم الغالبون.

ہماری بات طے ہو چکی ہے اپنے بندوں اور رسولوں کے لئے کہ وہی کامیاب ہوں گے اور ہماری فوج ہی غالب ہوگی۔

متعین و مقصود موضوع:

قرآن کے پڑھنے والے کے سامنے یہ بھی آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے نبیوں اور رسولوں کے جو قصے، ان کی دعوت کی خبریں، اور اس سلسلے میں پیش آنے والے مقابلوں، جنگوں، سازشوں اور قوم کی متفقہ دشمنی اور متحدہ محاذ آرائی کا جو نقشہ کھینچا ہے، اور اس خطرناک لڑائی کا جو نتیجہ بیان کیا ہے، وہ ہمیشہ ایک نہتے مرد فقیر اور ایک سرمایہ دار اور ذی اثر قوم کے درمیان یا کسی جابر بادشاہ سے ہوئی اور پھر نبوی دعوت اور اس کے علمبردار اپنے فقر و کمزوری کے باوجود کامیاب اور ذی اثر سرمایہ دار اور جابر بادشاہ اپنی قوت و سطوت کے باوصف ہمیشہ ناکام رہے یا اس دعوت کو ماننے پر مجبور ہو گئے ۔۔ وہ ایک مقصود مطلوب چیز ہے، یہ ایک مشترک حقیقت محض ایک اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ ایک دائمی سنت الٰہی اور ایک طے شدہ بات ہے، اور ظاہر ہے کہ اللہ کی قدرت کاملہ اچانک حادثات اور بخت اور اتفاق سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی جو نادانوں اور بے عملوں کی منطق اور تسکین کا سامان ہے۔

اور یہ واقعات بار بار دہرائے گئے ہیں، ان کے ذریعے اس قدرت کاملہ پر ایمان کی دعوت دی گئی ہے جس نے اسباب کو پیدا کیا اور جو اسباب کی مالک، ان میں اپنی مرضی سے تصرف کرنے والی اور انہیں موثر یا غیر موثر کر دینے والی ہے، اور وہ قدرت...... جیسا کہ ہم نے سابقہ خطبہ میں کہا۔۔ کہ اسباب کو پیدا کر کے خود معطل اور کمزور نہیں ہوئی، اور اپنے ارادے سے دوسروں کو دینے کے بعد خود اس سے محروم نہیں ہوئی اور نہ وہ تخلیق و ایجاد، اور غلبہ و کامرانی کے لئے ان اسباب کی محتاج ہی ہے۔

یہ واقعات حق کی قوت، اس کے باقی رہنے کی صلاحیت اور باطل کی کمزوری اور اس کی سست بنیادی پر دال ہیں اور ایمان کی دعوت دیتے ہیں۔

کل جاء الحق وما يبدئ الباطل وما يعيد

آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ حق آ گیا اور باطل نہ اب شروع ہوگا نہ اس کی بازگشت ہوگی۔

بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغه فاذا هو زاهق و لکم الویل مماتصفون

بلکہ ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں اور وہ اس کی سرکوبی کرتا ہے، اور پھر وہ مٹ جاتا ہے اور تمہارے لئے اس میں جو تم کہتے ہو ہلاک ہے۔

فاما الزبد فیذهب جفاء اواما ماینفع الناس فیمکث فی الارض کذلک یضرب الله الا مثال

جھاگ یونہی ختم ہو جاتا ہے اور، جو لوگوں کو نفع دیتا ہے، وہ زمین پر باقی رہتا ہے، اس طرح اللہ مثالیں دیتا ہے۔

تجربہ اور اللہ کی رحمت کی ترغیب:

اس طرح کے قرآنی قصے اللہ اور اس کی مدد پر توکل کی...... زمانہ کے تمام اختلافات کے باوجود...... دعوت ہیں، اور تمام ناسازگار و مخالف فضا اور حالات میں بھی دعوت حسن سیرت اور عمل صالح پر اعتماد بحال کر دیتے ہیں، خدائی نصرت کے معجزانہ کارنامے، اور قدرت الٰہیہ کے عجائبات کے تذکرے قرآن میں بہ تکرار آتے رہتے ہیں جب قرآن کسی نبیؑ کو خدائی مدد فتح مبین قبولیت دعا، اور دشمن پر غلبہ کا ذکر کرتا ہے، تو وہیں، اس نبیؑ کے ماننے والوں اور اس کی دعوت کے حمایتیوں کو اس تجربہ کی دعوت بھی دیتا اور انہیں رحمت الٰہی سے پرامید کر دیتا ہے، جیسے ایوبؑ نبی پر خدا کے عطیے کے ذکر کے بعد ارشاد ہوا۔

رحمة من عند نا و ذکریٰ للعا بدین

یہ ہماری رحمت سے ہوا اور عبادت گزاروں کے لئے تنبیہ ہے۔

حضرت یونسؑ کے بارے میں فرمایا گیا۔

فاستجبنا له و نجیناه من الغم و کذالک نخبی المو منین

ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے غم سے نجات دی اور ہم ایسے ہی مومنین کو نجات دیتے ہیں۔

سلام علی موسیٰ وها رون انا کذالک نجزی المحسنین

موسیٰ و ہارون پر سلامتی ہو ہم اسی طرح نیکوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

سلام علیٰ الیاسین انا کذالک نجزی المحسنین

الیاس پر سلام ہو ہم اسی طرح نیکوکاروں کو بدلہ دیتے ہیں۔

قصہ لوط کے ذکر کے بعد فرمایا گیا۔

نعمۃ من عندنا کذالک نجزی من شکر

یہ بطور ہماری نعمت کے ہوا جو شکر کرتا ہے اسے ہم ایسے ہی بدلہ دیتے ہیں۔

اس لئے قرآن کے بڑے حصے پر مشتمل یہ قصے تفریحی قصے یا تاریخی کہانیاں نہیں، بلکہ وہ ذکر و موعظت، ترغیب، دعوت و ارشاد، رہنمائی اور تقویت و تشجیع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الا لباب ماکا ن حدیثا یفتری ولکن تصدیق الذی بین یدیہ و تفصیل کل شی ء وھدی و رحمۃ لقوم یومنون ۔

ان کے قصوں میں عقل والوں کے لئے سامان عبرت ہے، یہ کوئی گڑھی ہوئی بات نہیں بلکہ اپنے سے پہلے واقعہ کی تصدیق، ہر چیز کی تفصیل اور ایمان لانے والی قوم کے لئے ہدایت و رحمت ہے۔

وکلا نقص علیک من انباء الرسل مانثبت بہ فؤادک وجاءک فی ھذہ الحق وموعظۃ وذکری للمؤمنین ۔

اور ہم انبیاء کی تمام خبریں آپ ﷺ کو دیتے ہیں جس کے ذریعہ آپ ﷺ کے دل کو تقویت دیتے ہیں اور آپ کے پاس اس بارے میں حق آ چکا جو نصیحت اور مومنین کے لئے یاد کرنے کی چیز ہے۔

تمام انبیاءؑ کے ساتھ اللہ کا طریقہ:

اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ تمام انبیاء کے ساتھ رہا ہے، مثلاً حضرت نوحؑ کی قوم نے جب ان سے کہا۔

انومن لک واتبعک الارذلون

کیا ہم تم پر ایمان لائیں حالانکہ ذلیل لوگ تمہاری پیروی کرتے ہیں۔

حضرت نوحؑ نے اللہ تعالیٰ سے عجز کے ساتھ اپنے ضعف کی شکایت کی۔

انی مغلوب فانتصر

میں شکست کھا رہا ہوں میری مدد کر!

اور حضرت لوطؑ نے قوم سے کہا:

لو ان لی بکم قوۃ او آوی الی رکن شدید

کاش تمہارے مقابلہ کی مجھے طاقت ہوتی یا کسی مضبوط چیز کا سہارا لیتا۔

اور حضرت شعیبؑ کی قوم نے ان سے کہا:

مانفقه كثيرا مما تقول وانا لنراک فینا ضعیفا ولولا رهطک لرجمناک وماانت علینا بعزیز .

جو تم کہتے ہو اس کا بیشتر حصہ ہم نہیں سمجھ جاتے اور ہم تمہیں اپنے درمیان کمزور پاتے ہیں ،اور اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر چکے ہوتے اور تم ہم پر غالب آنے والے نہیں۔

اور فرعون اپنے اور حضرت موسٰیؑ کے بارے میں صراحت اور بے شرمی کیساتھ کہتا ہے۔

ونادیٰ فرعون فی قومه قال یقوم الیس لی ملک مصر وهذه الانهار تجری من تحتی افلا تبصرون ام انا خیر من هذا الذی هومهین ولا یکاد یبین فلولا القی علیه اسورة من ذهب او جآء معه الملائکة مقترنین .

اور فرعون نے اپنی قوم میں اعلان کی اور کہا کہ اے قوم کیا میرے پاس مصر کی سلطنت نہیں؟ اور یہ نہریں میرے قدموں کے نیچے بہہ رہی ہیں کیا تم غور نہیں کرتے؟ کیا میں اس سے بہتر نہیں جو ذلیل ہے، اور بولنے پر بھی قادر نہیں اور اگر وہ سچا ہے تو اس کے پاس سونے کے کنگن کیوں نہیں آئے یا اس کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں آئے۔

انبیاءؑ جن قوموں کی طرف بھیجے گئے تھے، وہ بڑی قوت وقدرت والی بڑے ساز وسامان کی مالک اور بڑی خوشحال قومیں تھیں، حضرت ہودؑ کا قول اپنی امت کے بارے میں گذر چکا۔

واتقوا الذی امدکم بما تعلمون O امدکم بانعام وبنین وجنت وعیون

ڈرو اس سے جس نے وہ کچھ تمہیں دیا جو تم جانتے ہو تمہیں جانور دئے اولادیں دیں باغ دئے اور چشمے۔

اور حضرت صالحؑ نے اپنی امت سے اس طرح فرمایا۔

فاتقوا الله واطیعون. وما اسئلکم علیه من اجرٍ ان اجری الا علی رب

العلمین O اتتر کون فیما ھھنآ امنین O فی جنت وعیون. وزروع ونخل طلعھا ھضیم و تنحتون من الجبال بیوتا فارھین.

تو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو، اور میں اس کا تم سے بدلہ نہیں مانگتا، میرا بدلہ (خدا) رب العالمین کے ذمہ ہے، کیا جو چیزیں (تمہیں یہاں میسر) ہیں ان میں تم بے خوف چھوڑ دیئے جاؤ گے؟ یعنی باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور کھجوریں جن کے خوشے لطیف و نازک ہوتے ہیں، اور تکلف سے پہاڑوں میں تراش خراش کر کے گھر بناتے ہو۔

اور شعیبؑ نے اپنی قوم سے کہا" **انی اراکم بخیر**" میں تمہیں خوشحال دیکھ رہا ہوں۔

لیکن خدا کی عطا کردہ اس خوش حالی کا نتیجہ کیا ہوا؟ اس کا جواب قرآن کی زبان سے سنئے۔

الم یرو اکم اھلکنا من قبلھم من قرن مکنا ھم فی الارض مالم نمکن لکم وارسلنا السماء علیھم مدرارا وجعلنا الانھار تجری من تحتھم فاھلکنھم بذنوبھم وانشأنا من بعدھم قرنا آخرین.

کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا جنہیں زمین میں ہم نے وہ طاقت دے رکھی تھی، جو تمہیں نہیں دی، اور ہم نے ان پر آسمان کے دہانے کھول دیئے اور ان کے نیچے نہریں بھی بہائیں پھر ان کے گناہوں کے سبب انہیں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد دوسری نسل کو کھڑا کر دیا۔

مادیت کے لئے سب سے بڑا چیلنج اور اسباب کی خدائی کے خلاف سب سے بڑی بغاوت:

حضرت ابراہیمؑ کا قصہ جو قرآن میں بار بار بیان ہوا ہے، وہ مادی اسباب کی ذاتی تاثیر کے خلاف سب سے بڑا چیلنج، ان اسباب اور انکے ماننے والوں کی قوت کا مذاق اڑانے والا اور ان کی کمزوری اور غیر مفید ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے، گویا حضرت ابراہیمؑ مادیت اور اس کے حاملین کے استخفاف واستہزاء پر مامور ہو کر آئے تھے، جو اس کی تقدیس کرتے، اس کا کلمہ پڑھتے، اور اس پر ہر طرح بھروسہ کرتے تھے، ان کو حقیر سمجھنے، اور خدا کی مدد سے ان پر فتح پانے، اور ان کی تذلیل میں خاص لذت قلبی تسکین، اور روحانی غذا حاصل ہوتی تھی، اور گویا وہ

اپنے ایمان وتوحید کے طویل اور بابرکت سفر میں ہر قدم پر مادیت کو اپنے قدموں سے روندنے ،اپنے عزم سے اسے مسخر کرنے کا التزام کر کے شک پر ایمان کی، مادہ پر روح کی، نظام شرک پر توحید کی نئی فتح کا سروسامان کررہے تھے۔

اپنی طویل زندگی میں انہوں نے اپنے ماحول کی قوت و بادشاہت، مادہ اور معدہ کی عبادت، باطل خداؤں اور دھمکانے والی طاقتوں کے خلاف ہمیشہ علم بغاوت بلند رکھا، اس کا راز یہ تھا کہ ان کے وقت کی دنیا مادی اسباب کی شدت سے قائل اور اس پر حد سے زیادہ اعتماد کر بیٹھی تھی حتیٰ کہ وہ اسے مستقل اور ذاتی طور پر موثر سمجھنے لگی تھی، اور اسے خدا کے ساتھ ایک خدا کی حیثیت دیدی تھی۔

مادیت کی یہ غلامی، تقدس، اور اس پر اعتماد نے ان کی بت پرستی کے پہلو میں ایک نئی بت پرستی کی شکل اختیار کر لی تھی جس میں وہ پہلے سے ڈوبے ہوئے اور ان کی بندگی میں پھنسے ہوئے تھے حضرت ابراہیمؑ کی زندگی دونوں بت پرستیوں کے خلاف بغاوت اور اعلان جنگ، خالص توحید کی دعوت، اور اللہ کی بسیط و محیط قدرت کا اعلان اور اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ عدم سے چیزوں کو وجود میں لاتا ہے، اور وہ اسباب کا خالق بھی ہے، اور ان کی زمام کار بھی اسی کے ہاتھ میں ہے، وہ اسباب سے تاثیر سلب کر سکتا، اور اشیاء کی خاصیت وافادیت کو روک سکتا، اور ان کا الٹا اثر پیدا کر سکتا اور ان کو جس کا چاہے تابع فرمان بنا سکتا ہے۔

لوگوں نے اس "بغاوت" کے جرم میں آپ کا الاؤ تیار کیا اور یہ تجویز پاس کی کہ

حرقوہ وانصروا آلھتکم ان کنتم فاعلین.

اسے جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو۔

حضرت ابراہیمؑ کو یقین کامل تھا کہ آگ، اللہ کے ارادے کی تابع ہے، اور جلانا اس کی ایسی صفت نہیں جو اس سے الگ نہ ہو سکے، بلکہ یہ اس میں بطور امانت رکھی ہوئی ایک خاصیت ہے جس کی لگام کبھی ڈھیلی چھوڑ دی جاتی، اور کبھی کھینچ لی جاتی ہے، اور سے ٹھنڈک اور سلامتی بنا دیا جاتا ہے، چنانچہ آپؑ اس نار نمرود میں مومنانہ شان کے ساتھ مطمئن اور پراعتماد انداز میں کود پڑے اور نتیجہ آپ کے یقین کے تابع ہی رہا۔

قلنا ینار کونی بردًا وسلامًا علیٰ ابرٰھیم و ارادوا بہ کیدًا فجعلنٰھم

لاخسرین.

ہم نے حکم دیا اے آگ ابراہیم کے لئے ٹھنڈک اور سلامتی بن جا، اور وہ لوگ اسے نقصان پہنچانا چاہتے تھے تو ہم نے انہی کو نا کام کر دیا۔

لوگوں کا یہ خیال بھی تھا کہ زندگی بغیر سرسبزی، خوشحالی اور پانی کی فراوانی کے ممکن نہیں، اس لئے وہ اپنی آل واولاد اور اپنے رہنے سہنے کے لئے ایسی زرخیز زمین حاصل کرتے تھے، جن میں پانی کی افراط اور شادابی کی فراوانی ہو اور جہاں صنعت وتجارت کی سہولتیں حاصل ہوں حضرت ابراہیمؑ نے اس چلی ہوئی عادت اور عام رسم ورواج، اور اسباب پر تکیہ کرنے کے خلاف بھی قدم اٹھایا اور اپنے چھوٹے سے خاندان کے لئے۔ (جو ایک ماں اور بیٹے پر مشتمل تھا)۔ ایک بے آب وگیاہ وادی پسند کی جس میں نہ زراعت ممکن تھی نہ تجارت اور جو دنیا اور اس کی تجارتی منڈیوں سے بالکل کٹی ہوئی اور سرمایہ کے مرکزوں سے بہت دور تھی۔

آپؑ نے اللہ سے رزق میں وسعت کی دعاء کی کہ وہ دلوں کو اس وادی کی طرف مائل کر دے او ریہاں تک پھل اور میوے بغیر کسی معروف طریقے کے پہنچائے، آپ نے کہا۔

ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلاۃ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات لعلھم یشکرون.

اے رب میں نے اپنے خاندان کو ایک نا قابل کاشت وادی میں تیرے معزز گھر کے قریب بسایا ہے، اے رب تا کہ وہ نماز قائم کریں تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر اور انہیں پھل میسر کر شاید وہ شکر ادا کریں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول کی اور انہیں رزق، امن وعافیت کی ضمانت دی اور ان کے شہر کو ہر قسم کے پھلوں اور خیر وبرکت کے خزانوں کا مرکز بنا دیا:۔

اولم نمکن لھم حرما آمنا یجبی الیہ ثمرات کل شیء رزقاً من لدنا ولکن اکثرھم لایعلمون.

کیا ہم نے ان کے لئے ایک پرامن حرم مہیا نہیں کر دیا جس کی طرف ہر قسم کے پھل لائے جاتے ہیں اور جو ہماری طرف سے بطور رزق کے تھے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

فلیعبد وارب ھذا البیت الذی اطعمھم من جوع و آمنھم من خوف
تو انہیں اس گھر کے خدا کی عبادت کرنا چاہئے جس نے انہیں بھوک کے بعد کھانا کھلایا اور خوف کے بعد امن نصیب کیا۔

حضرت ابراہیمؑ نے انہیں ایسی خشک زمین پر اتارا تھا جہاں پیاس بجھانے اور حلق تر کرنے کے لئے پانی کا نام ونشان تک نہ تھا، لیکن ریت کے ذروں سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا ، اور وہ اس وقت سے اب تک اس طرح جاری ہے کہ لوگ اسے جی بھر کر پیتے اور اپنے ملکوں کو لے جاتے ہیں، حضرت ابراہیمؑ نے اپنے گھر والوں چٹیل میدان میں لا چھوڑا تھا، مگر وہ ایسا مرکزی مقام بن گیا جس کے لئے اطراف عالم کے لوگ عزم سفر کرتے اور رخت سفر باندھ کر آتے ہیں دنیا کے گوشہ گوشہ سے منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے پہنچتے ہیں، اور دور دراز علاقوں سے آتے ہیں۔

اس طرح حضرت ابراہیمؑ کی زندگی اپنے زمانہ کی پھیلی ہوئی اور حد سے بڑھی ہوئی مادیت، اسباب کی عبادت، اور ان کی بندگی کے لئے چیلنج اور اس کی قدرت مطلقہ اس کے غالب ارادے پر ایمان کی زندہ مثال تھی اور اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ رہا کہ اس نے ان کے سامنے اسباب کو جھکا دیا اور ان پر حیرت انگیز نوازشیں کیں۔

حضرت موسیٰ کا واقعہ تنگ اور محدود مادی ذہنیت کے لئے چیلنج:

قصہ ابراہیمؑ کے بعد حضرت موسیٰؑ کا قصہ بھی اس عقل مادی کے لئے ایک کھلے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے جو اسباب وحوادث کو خود مختار ابدی اور جامد قانون سمجھتی ہے۔ اور ایسی قاہر طاقت خیال کرتی ہے جو حاکم ہیں محکوم نہیں۔

یہ قصہ ان لوگوں کو بڑی آزمائش میں ڈال دیتا ہے جن کی فکر ونظر ماورائے اسباب یا اسباب سے اوپر نہیں جاتی، یہاں میں اپنے ایک سابق مقالے سے مدد لوں گا جس میں حضرت موسیٰؑ کے قرآنی قصے اور اس کی عبرت وبصیرت کا جائزہ لیا گیا تھا، اس میں کہا گیا تھا۔

حضرت موسیٰ مصر کے ایک تاریک اور گھٹے ہوئے ماحول میں پیدا ہوتے ہیں، جو بنی اسرائیل کو پورے طور پر گھیر چکا اور ان کے لئے نجات کے تمام راستے بند کر چکا تھا۔ حال مایوس کن مستقبل تاریک، تعداد تھوڑی وسائل معدوم، قوم بے عزت دشمن بالا دست حکومت ظالم یہ

چیزیں ان کی راہ میں حائل تھیں نہ کوئی ان کا دفاع کرنے والا تھا نہ کوئی بچانے والا بنی اسرائیل کی حیثیت اس قوم کی سی تھی جس کا انجام بد معلوم و طے شدہ ہو اور وہ بدبختی اور فنا کے لئے پیدا ہوئی ہو۔۔۔ ان حالات میں حضرت موسیٰؑ پیدا ہوتے ہیں اور ان کی ولادت و زندگی فلسفہ اسباب اور وقت کے نظام کے لئے سراپا چیلنج ثابت ہوتی ہے، فرعون نے چاہا کہ وہ پیدا نہ ہوں مگر وہ پیدا ہو کر رہے، اس نے خواہش کی کہ زندہ نہ رہیں، مگر وہ زندہ بھی رہے، اور لکڑی کے ایک بند صندوق میں، نیل کے گہرے پانی میں، معجزانہ طور پر زندہ رہے، آپؑ دشمن کی گود میں پرورش پاتے اور قاتل کی حفاظت میں پروان چڑھتے ہیں، آپؑ بھاگتے اور نجات پاتے اور ایک درخت کے سائے میں محزون ولاچار ہو کر جا بیٹھتے ہیں، اور پھر معزز مہمانی، اور پسند کی شادی سے متمتع ہوتے ہیں، اہل وعیال کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں، راستے میں ناواقفیت اور رات کی تاریکی سے واسطہ پڑتا ہے، اس کے ساتھ ہی بیوی کو ولادت پیش آتی ہے، اور ان کے لئے آگ کی تلاش ہوتی ہے اور وہ ایسا نور پالیتے ہیں، جس کے ذریعہ بنی اسرائیل کی قسمت چمک جاتی اور ایک عالم راہ یاب ہوجاتا ہے۔ نبی ایک عورت کی ضرورت اور مدد کا سامان ڈھونڈتا ہے تو وہ پوری انسانیت کی مدد اور ضرورت کا سامان پالیتا ہے اور نبوت وپیمبری سے سرفراز کردیا جاتا ہے۔

وہ فرعون کے خدم حشم سے بھرے ہوئے دربار میں داخل ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ کل تک مفرور وملزم کی حیثیت میں تھے جس پر فرد جرم لگ چکی اور مقدمہ دائر ہو چکا تھا، اور ان کی زبان میں لکنت اور ارادوں میں تذبذب تھا لیکن آج وہ فرعون اور فرعونیوں کو اپنی دعوت و ایمان اور حجت وبیان سے مغلوب کر لیتے ہیں، اور فرعون ساحروں کی مدد سے اعجاز موسوی کو دبانا چاہتا ہے، جسے وہ ایک کرتب اور جادو کہتا ہے لیکن ساحر عاجز اور قائل ہوجاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں۔

امنا برب العلمين رب موسىٰ وهارون

ہم رب العالمین رب موسیٰ وہارون پر ایمان لائے۔

وہ بنی اسرائیلیوں کو لے کر راتوں رات ظلم کی سرزمین سے نجات کی سرزمین کی طرف کوچ کا حکم ملتا ہے، فرعون اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ ان کا پیچھا کرتا ہے، صبح جب ہوتی ہے تو حضرت موسیٰ

سمندر کو اپنے سامنے ٹھاٹھیں مارتے دیکھتے اور دشمن کو اپنے پیچھے یلغار کرتے دیکھتے ہیں اور سمندر میں گھس پڑتے ہیں سمندر دو ٹکڑے ہو جاتا اور ٹکڑا ایک بڑے پہاڑ کی طرح ہو جاتا ہے، حضرت موسیٰ اور قوم سمندر پار کر لیتی ہے، ان کے دیکھا دیکھی فرعون بھی اپنی فوج کے ساتھ سمندر میں اترتا اور غضب ناک سمندر کا لقمہ بن جاتا ہے اس طرح فرعون اور اس کی قوی جماعت ہلاک ہوتی اور بنی اسرائیل کی محتاج اور کمزور قوم ان کی جگہ لیتی ہے۔

وَاورثنا القوم الذين كانوا يستضعفون مشارق الارض ومغاربها التي باركنا فيها وتمت كلمة ربك الحسنىٰ علي بني اسرائيل بما صبروا ودمرنا ما كان يصنع فرعون وقومه وما كانوا يعرشون.

اور ہم نے اس قوم کو زمین کے مشرق و مغرب کا جس میں ہم نے برکت دی ہے، مالک بنا دیا جو کمزور بنا دی گئی تھی اور آپ ﷺ کے رب کی بہترین بات بنی اسرائیل کے لئے پوری ہو کر رہی، ان کے صبر کے نتیجے میں، اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کی کارستانیوں کو مٹا کر رکھ دیا اور جو کچھ وہ انگور کی بیلیں چڑھاتے تھے۔

قصہ حضرت یوسفؑ اور معروف طریقوں سے اس کی دوری:

حضرت یوسفؑ کا قصہ بھی اپنی ندرت وغرابت اور حوادث کے متعین طبعی اسباب، قانون اور علت ومعلول کے عام قانون کی کارفرمائی کے خلاف ایک تاریخی شہادت ہے، انہیں بھائیوں کے حسد اور فریب، کنویں کی اندھیاری میں ایک مدت تک قیام، قافلہ والوں کی غلامی سے سابقہ پڑا جس میں ہلاکت، تکلیف، اور بے عزتی قوی اندیشہ تھا، لیکن وہ ان سب سے صحیح سالم بچ نکلتے اور زندہ رہتے ہیں۔

انہیں عصمت وعفت، وفاداری اور شرافت کا ایک سخت امتحان دینا پڑتا ہے جس میں وہ قوی محرکات اور ہیجانات، حسن وشباب اور فریق ثانی کی طرف سے طلب واصرار (جسے اقتدار بھی حاصل تھا، اور جس کا ان پر احسان بھی تھا) سے دوچار ہوتے اور سنگین الزام اور اخلاقی جرم میں اس زمانہ میں جیل میں داخل ہوتے ہیں جبکہ وہ جرم کی علامت تھی اور جہاں اخلاقی مجرم ہی رکھے جاتے تھے۔ وہ قیاس آرائی اور شہر میں پھیلی ہوئی افواہوں کا پسندیدہ موضوع بھی بن جاتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ سب اپنے شہر سے دور اس جگہ ہوتا ہے، بلکہ ان کا اس

قوم سے تعلق ہے، جس سے مصری شدید نفرت وحقارت کا برتاؤ کرتے تھے، اور اسرائیلی ہونے کے معنی تھے کہ عزت واقتدار میں اس کا کوئی حصہ نہیں ان پر ایک ایسی نسل سے ہونے کا جنم داغ ہے، جس کے لئے غلامی مقدر ہوچکی ہے، یہ سب حادثات ان کی گم نامی وبدنامی اور ہر عزت و اعتماد سے محرومی، اور مصری معاشرے کے کسی بھی معزز ومحترم مقام (چہ جائیکہ حکومت وسیادت ومنصب جلیل جس کے حقدار صرف شرفا ہی تھے) محرومی کا سبب ہوسکتے تھے، نہ کہ اس کے بعد وہ مصر کے بادشاہ ہوتے اور ان کے فیصلے نافذ ہوتے اور لوگوں پر ان کا رعب وداب ہوتا، لیکن اس کے برعکس لوگوں نے کھلی آنکھوں سے حضرت یوسفؑ کو مصر کے تخت حکومت پر بیٹھتے اور اقتدار سنبھالتے دیکھا۔

وكذالک مكنا ليوسف فى الارض يتبوع منها حيث يشاء نصيب برحمتنا من نشاء ولا نضيع اجر المحسنين.

اور اس طرح ہم نے زمین پر یوسف کے قدم جمائے کہ وہ جہاں چاہے رہ سکے ہم جسے چاہتے ہیں، اپنی رحمت پہنچادیتے ہیں اور نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

قصہ یوسفؑ اور سیرت نبویؐ میں مماثلت:

خاتم النبیینؐ اور قریش کے وہ افراد جو ان پر ایمان لائے، اور جنہوں نے ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے تھے، وہ بھی ایسے ہی تاریک حالات ومشکلات سے دوچار تھے، اور انہیں بھی، تعداد کی کمی، موقف کی کمزوری، اسباب کی نایابی، خاندان کی ملامت، اور قوم کی شدید مخالفت و مقاطعہ، گھراؤ، دباؤ اور راہ خدا سے بندش، اور مومنین کی مظلومیت (جنہیں وہ دبد دین، اور احمق کہتے تھے) رسول ﷺ کے قتل کی سازش، مستقل خوف وخطرہ کا سامنا تھا جس کا قرآن سے زیادہ معنی خیز بیان اور اس سے بہتر تصویر کشی ممکن نہیں۔

واذكر واذانتم قليل مستضعفو فى الارض تخافون ان يتخطفكم الناس.

وہ وقت یاد کرو جب بہت تھوڑے اور زمین میں کمزور وضعیف تھے اور تمہیں یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ لوگ تمہیں کہیں اچک نہ لیں۔

رسول اللہ ﷺ کو مدد غیبی اور عظیم مستقبل کی بشارت:

ان تاریک حالات میں جو نہ کوئی امید بندھاتے اور نہ کسی مستقبل کی بشارت دیتے ہیں، اور نہ جن میں روشنی کی کوئی کرن ہی دکھائی دیتی ہے..... اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ سے حضرت یوسفؑ کا قصہ بیان کیا، رسولؐ اللہ کی سیرت قصہ یوسفؑ سے بہت ہی مشابہ ہے قبیلہ قریش کے معاملات برادران یوسف کے معاملات کے ہم شکل نظر آتے ہیں یہاں بھی شروع میں حسد اور جنگ سے آغاز ہوتا ہے اور آخر میں اس کی انتہاء اعتراف تعظیم اور امت پر ہوتی ہے ابتدا ردوری اور قطع تعلق سے اور جور وستم سے ہوتی ہے اور انتہاء تسلیم اور التجائے رحم پر ہوتی ہے۔

حضرت یوسف کے سلسلہ میں کنویں کی تاریکی اور ہجرت نبوی میں غار ثور کا مرحلہ اور ابن یعقوب کی داستان میں قید و بند کا باب ابن عبدالمطلب کی سیرت کے شعب ابی طالب والے باب ایک دوسرے کے بہت مشابہ ہیں۔ دونوں کے دشمنوں کی طرف سے یہ اعلان و اظہار یکساں ہے کہ:

تا للہ لقد اثرک اللہ علینا و ان کنا لخٰطئین۔

بخدا اللہ نے آپ کو ہم پر فضیلت دی اور ہم ہی خطاوار تھے۔

اور دونوں سرداروں نے قوم کو یکساں اور نرم و شریفانہ جواب ہی دیئے۔

لاتثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم وھو ارحم الرا حمین۔

آج تم پر کوئی ملامت نہیں اللہ تمہیں معاف کرے اور وہ رحم کرنے والوں میں سب زیادہ رحم والا ہے۔

قرآن نے اس عظیم قصے کو اس طرح شروع کیا ہے۔

نحن نقص علیک احسن القصص بما اوحینا الیک ھذا لقرآن وان کنت من قبلہ لمن الغفلین۔

ہم آپ سے ایک بہترین قصہ کہنے جا رہے ہیں اس سبب سے کہ ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے اور اگرچہ آپ اس اس سے پہلے غافلوں میں تھے۔

اور قصہ کو ختم اس طرح کیا گیا ہے:۔

لقد کان فی قصصهم عبرة لا ولی الالباب. ما کان حدیثا یفتری ولکن تصدیق الذی بین یدیه وتفصیل کل شیء وهدی و رحمة لقوم یومنون

ان کے قصہ میں اہل عقل کے لئے عبرت ہے یہ کوئی گڑھی ہوئی بات نہیں، بلکہ اپنے سے سابق قصہ کے تصدیق اور ہر چیز کی تفصیل اور مومن کے لئے ہدایت ورحمت ہے۔

اس طرح یہ سورہ مکہ کے بوجھل اور تاریک ماحول میں اتر کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک عظیم وتابناک اور شاندار مستقبل کی بشارت ثابت ہوئی گویا حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ آپ کا قصہ ہے، اور مخالف ماحول میں کنایہ،صراحت سے ہمیشہ بلیغ مانا گیا ہے۔

انبیاء کی کامیابی امت کی کامیابی:

پھر اللہ نے آنحضرت ﷺ سے حضرت موسیٰؑ اور فرعون اور اس کے ساتھیوں کا قصہ بیان کیا ہے، جو قصہ سورۂ قصص میں آیا اس میں حضرت موسیٰ کی کامیابی اور فرعون کی چالوں سے آگاہی اور سلامتی اور رسالت عظمیٰ اور نبوت سے سرفرازی (جبکہ وہ صرف اپنی زوجہ کے تاپنے کے لئے آگ کی تلاش میں تھے) دشمن کی ہلاکت اور بنی اسرائیل کی نجات کا بیان ہوا ہے، یہ حضرت یوسف کے قصہ سے اس کے سوا بالکل مشابہ ہے کہ اس میں بنی اسرائیل کی نجات، ان کی کامیابی، اور سیادت کا قصہ زائد طور پر بیان ہوا ہے۔

اس قصہ کا افتتاح ایک بڑی معرکہ آرا تمہید کے ساتھ ہوا ہے جس میں قریشی مخالفین کے دل دہلا دینے اور اس کمزور مومن جماعت کے مستقبل کے تصور سے مرعوب کر دینے کے لئے کافی سامان ہے، جسے قریشی خاطر میں نہیں لاتے تھے، اور اسے نگل جانے کی فکر میں تھے، فرمایا گیا۔

طسم. تلک آیت الکتب المبین. نتلو علیک من نبا موسیٰ و فرعون بالحق لقوم یؤمنون انّ فرعون علا فی الارض وجعل اهلها شیعا یستضعف طائفة منهم یذبح ابنا ء هم و نستحییٰ نساء هم انه کان من المفسدین ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلهم ائمة و نجعلهم الوارثین ونمکن لهم فی الارض ونری فرعون وها مان و جنود هما منهم ما کانوا یحذرون.

یہ کھلی کتاب کی آیتیں ہیں، ہم آپ کو موسیٰ وفرعون کا ٹھیک ٹھیک قصہ مومن قوم کی خاطر بتا رہے ہیں، فرعون نے زمین (مصر) میں بڑا بننے کی کوشش کی اور اس کے باشندوں کو تقسیم کر دیا، اور ایک طبقہ کو اس نے کمزور کرنا شروع کر دیا، وہ ان کے لڑکوں کو قتل کر دیتا اور لڑکیوں کو چھوڑ دیتا تھا، وہ مفسدوں میں سے تھا ہم خاص طور پر ان لوگوں پر احسان کرنا چاہتے ہیں جو زمین میں کمزور بنا دیئے گئے ہیں اور انہیں امام اور وارث بنا دینا اور زمین پر ان کے قدم جما دینا چاہتے ہیں اور فرعون وہامان اور ان کے لاؤ لشکر کو جس انجام بد سے وہ ڈرتے تھے اسے دکھا دینا چاہتے ہیں۔

داعیوں اور مومن وصالح کام کرنے والوں کے لئے قوت واعتماد کا سرچشمہ:

یہ بلیغ وموثر قصے قلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقویت وتسلی کے لئے ہوتے تھے، جیسا کہ فرمایا گیا:۔

وکلانقص علیک من انباء الرسل مانثبت به فؤادک وجاءک فی هذه الحق وموعظة وذکریٰ للمؤمنین .

اور رسولوں کی خبروں میں سے ہم ہر وہ خبر آپ کو دیتے ہیں جس سے آپ کے قلب کو تقویت دیں اور آپ کے پاس اس سلسلہ میں حق اور مومنین کے لئے نصیحت اور یاد دہانی آچکی ہے۔

یہ سچے قصے داعیوں اور منہاج نبوت پر کام کرنے والوں، اور ایمان وعمل صالح اور تقوی کی طرف بلانے والوں مصیبت پر صبر کرنے والوں جہاد پر قائم رہنے والوں اور اللہ کے راستہ میں جاگنے والوں کے لئے ہمیشہ قوت وثابت قدمی کا اور روشنی پیدا کرنے والی امید، فوز وفلاح اور مخالفوں کے مقابلہ پر فتح وظفر کے قوی یقین کا سرچشمہ وخزانہ رہے ہیں۔

وتمت کلمة ربک الحسنیٰ علی بنی اسرائیل بماصبروا ودمرنا ماکان یصنع فرعون وقومه وما کانوا یعرشون .

اور بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کے نتیجہ میں آپ کے رب کی اچھی بات پوری

ہوئی اور جو فرعون اور اس کی قوم کر رہی تھی اور جو وہ بیلیں چڑھاتے تھے اسے ہم نے نیست و نابود کر دیا۔

اور یوسفؑ نے اللہ تعالیٰ کی عنایت کردہ نمایاں کامیابیوں کی توجیہ کرتے ہوئے فرمایا۔

قال انا یوسف وھذا اخی قدمن اللہ علینا انه من یتق ویصبر فان اللہ لایضیع اجر المحسنین.

کہا میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے اللہ نے ہم پر احسان کیا جو بھی تقویٰ اور صبر اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

یہ جان لینا چاہئے کہ یہ اللہ کی وہ سنت ہے جس میں کبھی استثناء نہیں ہوتا اور انبیاء کے منہاج وطریقہ پر دعوت اور کوشش، ایمان وعمل صالح، صبر وطاعت اور اچھی و پاکیزہ سیرت ایسا مبارک درخت ہے، جو خدا کے حکم سے ہمیشہ سدا بہار اور ثمر دار رہتا ہے، اور ایک کمزور ترین فرد بھی ان صفات کے ذریعہ قوی ہو جاتا ہے، اور کوئی بھی اقلیت، اگر ان اخلاق فاضلہ کی حامل ہو تو وہ اکثریت ہے۔

کم من فئته قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن اللہ و اللہ مع الصابرین .

کتنی ہی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب آ گئیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے:

و لا تھنوا و لا تحزنوا و انتم الا علون ان کنتم مؤمنین .

نہ ہمت ہارو اور نہ غمگین ہو تمہیں سر بلند ہو گے اگر تم مومن ہو۔

قصے نسل در نسل قوت وعبرت کا سرچشمہ، اپنے ایمانی طرز، اور اس کی دلیل ہونے کی وجہ سے بنے رہے کہ انبیاء کی دعوت ہی کو فتح وظفر ملتی ہے، اور اللہ کی پسندیدہ سیرت وصفات ہی کے ساتھ فوز وفلاح وابستہ ہیں، خواہ اس کے اسباب کتنے ہی مخالف، اس کی مخالف قوتیں کتنی سی نبرد آزما اور مادی طور پر اس دعوت کے حامل کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہوں۔

قدکان لکم آ یة فی فئتین التقتا فئة تقاتل فی سبیل اللہ واخریٰ کافرة یرونھم مثلھم رای العین، و اللہ یؤید بنصرہ من یشآء ان فی ذلک لعبرة لاولی الابصار .

تمہارے لئے ان دو جماعتوں میں نشانی تھی ایک جماعت تو اللہ کے راستے میں جہاد کر رہی تھی اور دوسری کافر تھی اور وہ مسلمانوں کو چشم دید طور پر اپنے سے دوگنا دیکھ رہی تھی اور اللہ اپنی مدد سے جس کی چاہتا ہے تائید کرتا ہے، اس میں عقل والوں کے لئے بڑی عبرت ہے۔

انبیاء کی دعوت پر ایمان یا پھر ہلاکت وتباہی:

انبیاء کی سیرت جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کبھی تفصیل اور کبھی اجمال کے ساتھ بیان کیا ہے، اور بہ تکرار اس کا ذکر کیا ہے، اس کے درمیان ایک ایسا متفقہ نقطہ پایا جاتا ہے جس میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا اور وہ ہے ان کا تمام رکاوٹوں کے باوجود کامیاب اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں کامراں ہونا، اور اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں یا تو یہ مخالفین ایمان لے آتے اور ان کی دعوت قبول کر لیتے اور اس کے مخلص فدائی بن جاتے ہیں یا پھر ہلاک اور تباہ و برباد کر دیئے جاتے ہیں۔

فقطع دابر القوم الذين ظلموا والحمدلله رب العلمين .

پھر کٹ گئی جڑ ظالموں کی اور سب تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لئے۔

انفرادی اور قومی مصالح کی کوئی قیمت نہیں:

جو دعوت، انسانیت کی سعادت ونجات کا مدار ہے، اس کی عند اللہ یہ قیمت ہے کہ اس کے لئے نوامیس فطرت اور قوانین قدرت بھی توڑ دیئے جاتے ہیں اور اس کے لئے وہ کچھ کیا جاتا ہے جس کا گمان بھی نہیں ہوتا، اور فردی یا اجتماعی مصلحتیں یا سیادت وغلبہ کی خواہش اور وہ بے معنی قیادتیں جو نہ خیر کو اٹھاتیں اور نہ شر کو گراتی ہیں اور ان سے اسلام وانسانیت کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، اور ان کا شر وفساد اور کفر وفسق کی طاقتوں سے کوئی جھگڑا نہیں ان کی ساری دوڑ دھوپ اور لڑائی اس کے لئے ہوتی ہے کہ ہونے والے تمام گناہ اور فساد ان کے نگرانی سرپرستی اور ان کے سایہ اقتدار میں ہوں جن کا فائدہ انہیں پہنچے تو ایسی انفرادی واجتماعی کوششوں کی اللہ کے یہاں کوئی قیمت اور مچھر کے پر کے برابر بھی حیثیت نہیں، اور اللہ کو اس کی کچھ پروا نہیں کہ وہ کس وادی میں مرتی اور کون سا دشمن ان پر غلبہ پاتا ہے، اور ان کا خاتمہ کب ہوتا ہے۔

ایسی ہی کوششوں کے مقابلے میں سرکش وجابر اور بے رحم بغاوتیں اٹھ کھڑی ہوتی اور

ایسے مشکلات ومسائل سامنے آجاتے ہیں جن کی ابتداء وانتہا معلوم نہیں ہوتی۔

ایک پھیلا ہوا غلط خیال:

آج مسلم قوموں اور عالم اسلامی میں یہ خیال مقبول ومروج ہے اور اس پر سب کا ایمان راسخ ہے کہ سیرت واخلاق کے مقابلے میں مادی طاقت ہی فیصلہ کن میزان اور معیار ہے بہت سے اچھے اچھے دینداروں حتیٰ کہ دین کے داعیوں کا بھی یہ نعرہ ہوگیا ہے کہ ''مادی طاقت سب سے پہلے۔''

یہی وہ طریقہ فکر ہے جس کا ابطال وتردید انبیاء ومرسلین کی سیرت ان کے سات پیش آنے والے حوادث اور ان کے ہاتھ سے ظاہر ہونے والے عجائب ومعجزات، ان پر اللہ کی نصرت فتح کے انعام اور ان کے دشمنوں سے انتقام میں موجود ہے۔

یہاں ایک بار پھر اپنے رسالہ ''ثورۃ فی التفکیر'' سے ایک اقتباس مستعار لیتا ہوں۔

''ایک طویل مدت سے ہم اپنی ذات، اپنی قیمت وحیثیت کو (دنیا کے نقشہ میں) مادی طاقت صلاحیت، وسائل'' خام مواد'' ملکی پیداوار'' عددی طاقت'' جنگی پوزیشن'' سے تولنے اور ناپنے کے عادی ہوگئے ہیں اور ہم کہیں اپنا پلڑا بھاری اور کہیں ہلکا پاتے ہیں' اور اس سے خوش یا افسردہ ہوتے ہیں۔''

ایک عرصہ سے مغرب کی قیادت وسیادت پر ہمارا ایمان سا ہوگیا ہے، اور گویا ہم نے مان لیا ہے کہ یہ تقدیر مبرم، امر محکم اور اٹل قانون ہے جس میں کوئی تبدیلی اور انقلاب نہیں آسکتا اور اس طرح وہ قدیم مثل پھر زندہ ہوگئی کہ اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاریوں نے کہیں شکست کھائی تو کبھی اس کو باور نہ کرنا ہم اب مغربی اقتدار اور مغرب کی قائدانہ صلاحیت کو چیلنج کرنے کے بارے میں کبھی سوچتے بھی نہیں اور اگر کبھی علم وتحقیق سے آنکھ بچا کر اور عقل وفہم کو نظر انداز کر کے سوچتے بھی ہیں تو ہم اپنے وسائل وامکانات جنگی طاقت اسلحہ کی پیداوار اور ایٹمی طاقت کی پوزیشن کا جائزہ لیتے ہیں، تو ہم کو ناامیدی اور بدفالی گھیر لیتی ہے اور ہمیں یقین ہوجاتا ہے کہ ہم محکومی وغلامی زندگی کے دھارے سے دور رہنے، مغرب کا دست نگر، اور دو بڑی طاقتوں میں سے کسی ایک سے وابستہ رہنے ہی کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

ایمان واطاعت' مومن کا ہتھیار اور کامیابی کی کنجی:

لیکن اللہ نے قرآن میں انبیاء کی سیرت اور ان کے دشمنوں کا جو انجام بتایا اور جس کی ہم نے اپنے مقابلے میں کچھ درخشندہ مثالیں پیش کی ہیں' وہ اس اندازفکر سے پوری طرح ٹکراتی ہیں اور ہم پر یہ واضح کرتی ہیں کہ انبیاء کی کامیابی کا راز اور جن کامیاب ہتھیاروں سے انہوں نے اپنے مخالفین کا مقابلہ کیا اور ان کی چھوٹی سی کمزور جماعت کامیاب اور دنیا کی امامت وہدایت کے منصب پر فائز ہوگئی وہ ''ایمان'' اطاعت'' دعوت الی اللہ'' تھی۔

وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لماصبروا وكانو اباٰيتنا يوقنون.

اور ہم نے ان میں سے امام بنائے جو ہمارے حکم کے مطابق ہدایت کرتے تھے' یہ ان کے صبر اور ہماری آیتوں پر یقین کے سبب ہوا۔

واوحينآ الى موسٰى واخيه ان تبوأ القومكما بمصر بيوتا واجعلوا بيوتكم قبلة واقيموا الصلوة وبشر المؤ منين.

اور ہم نے حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی کو وحی کی کہ تم دونوں اپنی قوم کو مصر میں بساؤ اور اپنے گھروں کو مسجدوں کی شکل دو اور نماز قائم کرو اور مؤمنوں کو بشارت دے دیجئے۔

يايها الذين آمنوا ان تنصروا الله ينصركم ويثبت اقدامكم.

اے وہ جو ایمان لائے ہو اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا، اور تمہارے قدم جمادے گا۔

فلا تهنوا وتدعوا الى السلم و انتم الا علون و الله معكم ولن يتركم اعمالكم.

تو کمزور نہ پڑو اور امن کی طرف بلاؤ تمہیں غالب رہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال میں کوتی نہیں کرے گا۔

امت مسلمہ کا مستقبل انبیاءؑ کی سیرت سے وابستہ:

ان سچے حکیمانہ قصوں کا یہ پیغام اور سبق ہے، جو ہمیں انبیاء کی زندگی اور ان کی پاکیزہ سیرت سے ملتا ہے' یہی وہ سیدھا اور صحیح راستہ ہے' جس پر بلا استثناء تمام انبیاءؑ چلتے رہے' اور

قرآن نے جس کے نقوش محفوظ رکھے ہیں

کمزور قوموں کے لئے اگر کوئی امید کا راستہ ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے، اور صاحب دعوت وعقیدہ قوموں کا مستقبل اسی طور طریق سے وابستہ ہے، اور اللہ ہی حق کہتا اور وہی راستہ دکھاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اجتماعی ذہن اور قربانی وایثار کا جذبہ

نحمده ونصلي علىٰ رسوله الكريم. امابعد

محترم سامعین! (کہنے کی باتیں بہت سی ہیں لیکن اس وقت ہم یہ اہم اور ضروری بات کہیں گے کہ آپ اپنے) ذہن کو اجتماعی بنایئے ،صرف اپنے مفاد کو سوچنا کہ ہمیں فائدہ ہو جائے دین پر کچھ گزر جائے ،ملت پر جو کچھ گزر جائے ہم سب کی فکر کیا کر سکتے ہیں ،اس ذہن نے بڑا نقصان پہونچایا ہے ،دیکھئے تو قرآن شریف میں آتا ہے" ولا تلقوا بايديكم الى التهلكة" اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔اس کو بہت سے لوگ ایسے پڑھ لیتے ہیں جیسے " ولا تقربوا الصلوة، ولاتقربوا الصلوٰة" نماز کے قریب نہ جانا" بعض بے حیا ناخدا ترس لوگ اس طرح پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں صاحب! قرآن شریف میں تو ہے نماز کے قریب نہ جاؤ۔"لاتقربوا لصلواة" اس طرح بدنیتی کے ساتھ تو نہیں لیکن بعض ناواقفیت کی وجہ سے سمجھتے ہیں کہ ان کو ہر خطرہ کے کام سے بچایا گیا ہے۔ان کو جہاں کہئے ذرا تبلیغ میں چلئے کچھ خطرہ مول لیجئے اپنی تجارت کے لئے کہتے ہیں "ولاتلقوبايديكم الى التهلكة" قرآن شریف میں ہے اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو،کوئی کام ایسا نہ کرو، جان بوجھ کر جس میں تمہیں نقصان پہنچے، حالانکہ اس آیت سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ بلکہ اس آیت کا تقاضا بالکل اس کے برخلاف ہے چنانچہ سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک موقع پر ایسا ہی سنا تھا فرمایا ٹھہرو ٹھہرو تم نہیں جانتے یہ آیت تو ہم انصاریوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی اس کی تفسیر تو ہم سے پوچھو،تم کیا جانو ،قصہ یہ ہے کہ جب اسلام مدینہ میں آیا کمزور تھا کوئی اس کا ساتھ دینے والا نہ تھا تو ہم انصاریوں نے اس کا ساتھ دیا اور اپنی جان و مال سے ساتھ دیا اور اپنے تقاضوں سے آنکھیں بند کر لیں ،بس ہر وقت اسلام کے لئے جان ہتھیلی پر لئے پھرتے

تھے میدان جنگ میں کہا جائے تو وہاں تبلیغ کے میدان میں کہا جائے تو وہاں اور مال خرچ کرنے کو کہا جائے تو ہم حاضر، غرض کہ ہم نے پھر مڑ کر نہ دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے، ہمارے کھیتوں اور ہمارے باغوں کا کیا حال ہے، ہماری دوکانوں کا کیا حال ہے کچھ عرصہ گزرنے کے بعد جب ہم نے دیکھا کہ اب اللہ کے فضل سے مسلمانوں کی تعداد خاصی ہوگئی ہے اور اب اسلام ایسا گھرا ہوا اور میدان میں نہتا اور بے یار و مددگار نہیں ہے اور دوسری طرف ہم نے دیکھا کہ ہمارے مالوں پر، ہماری جائدادوں پر بہت اثر پڑ گیا ہے اور تجارتیں ماند پڑ گئی ہیں، کساد بازاری میں ہم مبتلا ہو گئے ہیں، دوکانوں کے دیوالے نکلنے لگے ہیں، اور باغات خشک ہونے لگے ہیں، فرصت ہی نہیں ہم کو، تو ہم نے کہا اب ہم تھوڑے دن کی چھٹی لیں، مستقل آزادی یا مستقل چھٹی نہیں، بلکہ تھوڑے دن کی چھٹی لے لیں، سپاہی کو چھٹی ملتی ہے، طالب علم کو چھٹی ملتی ہے، استاد کو چھٹی ملتی ہے، ہم بھی چھٹی لے لیں۔ بس یہ خیال آنا تھا کہ یہ آیت نازل ہوئی، ابھی شاید کہنے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ آیت نازل ہوئی، ارے کیا کرتے ہو؟ اس وقت جب دین کو تمہاری مدد، تمہاری خدمت کی اور تمہاری جاں نثاریوں کی ضرورت ہے تم چھٹی کا نام لیتے ہو، یہ چھٹی سم قاتل ہے، یہ چھٹی خودکشی کے مترادف ہے فرمایا گیا۔

وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ و احسنوا ان اللہ یحب المحسنین . یہ پوری آیت ہے۔ اب لوگوں نے فتووں تک میں لکھنا شروع کر دیا۔

حج ایک زمانہ میں ہندوستان میں مشکل ہو گیا تھا، دریائی سفر، بادبانی کشتیاں اور بدوؤں کی لوٹ مار دیکھ کر بعض علماء نے فتویٰ دیدیا کہ حج ہندوستانی مسلمانوں کے ذمہ سے ساقط ہے اور استدلال کیا اس آیت سے کہ **ولا تلقوا بایدیکم التھلکۃ** جان بوجھ کر ہلاکت میں نہیں پڑنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اور درجے بلند فرمائے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اور ان کے شاگردوں اور ان کے خلفاء کے، کہ انہوں نے اس کے خلاف مہم شروع کی اور فتویٰ لکھا اور پھر ان کے بعض خلفاء نے ان کے بھتیجے اور عزیزوں نے ایسی دھوم دھام سے حج کیا کہ پھر یہ خیال ہی لوگوں کے دلوں سے نکل گیا، ورنہ خدانخواستہ ہندوستان میں اس کی عادت پڑ جاتی کہ بھائی سمندر کا سفر خطرناک ہے اور حج ہمارے ذمہ سے ساقط ہے تو آج حج اور کل زکوٰۃ اور پرسوں روزہ صحت پر برا اثر ڈالتا ہے **ولا تلقوا بایدیکم الیٰ التھلکۃ**

اور پھر اس کے بعد نماز کہ اس سردی میں ٹھٹھر جائیں اور ٹھنڈے پانی سے وضو کریں یا اس گرمی میں، چھوٹی سی رات میں ہم نکلیں اور رات خراب کریں **ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ** تو سارا دین ہی معطل ہو کے رہ جائے تو مسلمانوں کا ذہن انفرادی ہے اجتماعی ہونا چاہئے یعنی ملت کے تقاضوں کو دیکھنا چاہئے اگر ہر شخص صرف اپنے اپنے تقاضوں کو دیکھنے لگے تو دین کی خدمت کہاں سے ہوگی۔ میں اس ادارہ کے متعلق نہیں کہتا، الحمد للہ ادارہ کے متعلق کہنے کے لئے یہ جلسہ ہوا ہی نہیں اور جو مدرسہ کا کام ہو رہا ہے۔ تعارف اور دینی خدمات وہ الگ، لیکن یہاں یہ نہیں ہے کہ فلاں ادارہ اور فلاں چراغ بجھ رہا ہے ہم یہ کہتے ہیں کہ دین کا تقاضا ہے ہم یہ کہتے ہیں اپنے اپنے علاقہ کی خبر لیجئے، اپنی اپنی جگہ کی مسجدوں کی خبر لیجئے۔ مدرسوں کی خبر لیجئے اپنی اپنی جگہ کی دینی تعلیم کی خبر لیجئے، اپنی اپنی جگہ کے مسلمانوں کی عادتوں اور ان کے برے اخلاق کی خبر لیجئے، جن کی وجہ سے رحمت الٰہی رکی کھڑی ہے، گھنگھور گھٹا تلی کھڑی ہے لیکن برستی نہیں کہ مسلمانوں میں تو یہ یہ عیب ہیں، مسلمانوں میں تو یہ جرائم ہیں، ان ان چیزوں کے مرتکب ہو رہے ہیں، ان چیزوں کی خبر لیجئے یہ دین کا اجتماعی تقاضا اگر آپ پر طاری نہ ہوا تو ہندوستان جیسے ملک میں دین کا باقی رہنا مشکل ہے اور ہندوستان کا کیا ذکر ہے ہندوستان تو خدا کے فضل وکرم سے بہت بہتر ہے اور بھی ملکوں میں جہاں نام کی اسلامی حکومتیں ہیں، مسلمان حکومتیں ہیں وہاں کی نہ حکومت کچھ کر سکتی ہے نہ جامع ازہر جیسا ادارہ کچھ کر سکتا ہے جس کا اگر آپ کو بجٹ اور اس کی شان وشوکت معلوم ہو اور اس کے شیخ کے اختیارات اور ان کی تنخواہ آپ کو معلوم ہو تو آپ حیران رہ جائیں، کیا کسی ملک کے صدر جمہوریہ کی وہ شان ہوگی وہ تنخواہ ہوگی لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتے، اگر اجتماعی ذہن نہ ہو تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا، کسی کو کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے، سب اپنے اپنے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ ہماری اولاد پڑھ جائے، اور جلدی سے کام سے لگ جائے، اور جلدی سے بڑی آسامی اس کو مل جائے اس کے علاوہ کسی چیز سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے، یہ بہت خطرناک ذہنیت ہے، اس ذہنیت نے قوموں کے چراغ گل کر دیئے ہیں، جہاں یہ ذہنیت طاری ہوئی وہاں کوئی سر پٹک کر رہ جائے کوئی بڑے سے بڑا مصلح اپنی پوری زندگی صرف کر دے کوئی اثر نہیں ہوتا، یہ ذہنیت ہمارے ملک میں پیدا ہو رہی ہے اور موجود ہے کسی کو کسی سے کوئی مطلب نہیں رہا، بس اپنا مفاد دیکھنا، اپنی خوشحالی کی، اپنے گھر کی، کاروبار کی،

ترقی اور کامیابی کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہیں ساری وقت اس وجہ سے پیش آ رہی ہے کہ ذہن اجتماعی اور ملی نہیں ہے بلکہ ذہن انفرادی ہے، ذہن بالکل شخصی ہے ایک تو اس کی اصلاح ہونی چاہئے کہ ملت کے مسائل اور دین کے تقاضوں کا درد آپ اپنے دل میں پیدا کریں۔ اگر یہ نہیں ہے تو پھر بہت بڑا خطرہ ہے، نہ کوئی انجمن کچھ کر سکتی ہے نہ کوئی ادارہ کچھ کر سکتا ہے اور نہ کوئی اعلی سے اعلیٰ مصنف اور واعظ اور مقرر کچھ کر سکتا ہے، خدا کرے آپ اتنی بات سے آگے کی بات سمجھ گئے ہوں۔

وما علینا الا البلاغ المبین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تبلیغ دین کے لئے ایک اصول

الحمد للہ و کفی وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ. اما بعد.

حضرات سامعین! دین کا جو حصہ ہم تک پہنچا ہے اس کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں۔ ایک تو وہ حصہ ہے جو اپنی خاص ہیئت وشکل کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے اور اس کی ہیئت وشکل مطلوب ہے۔ اس کو ہم ''منصوص بالوضع'' کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ دینی امور ہیں جو اپنی خاص ہیئت وصورت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ (مثلاً) ارکان دین اور بہت سے ایسے فرائض جن کو نہ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے بتایا بلکہ ان کی شکلیں زبانی بھی بتائیں۔ اور خود کر کے بھی دکھلائیں۔ (مثلاً) نماز، حج، وضو وغیرہ۔ دین کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں نفس شئی مطلوب ہے، لیکن بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں کی بناء پر (اور زمانہ کے تغیر اور امت کے لئے وسعت کا خیال کر کے آپ نے ان کی شکلیں متعین نہیں کیں، صرف شے بتلادی کہ یہ مقصود ہے، یہ چیزیں خود منصوص ہیں، لیکن ان کی کوئی خاص وضع وہیئت منصوص نہیں (مثلاً) جہاد فی سبیل اللہ، دعوت الی اللہ، علم و دین کے سلسلہ کو چلانا اور احکام کا امت تک پہنچانا، یہ سب امت سے مطلوب ہے اگر امت ان کو چھوڑ دے اور بالکل ترک کر دے تو وہ گنہگار ہوگی، لیکن صرف یہ اعمال مقصود ہیں۔ ان کی کوئی خاص شکل اور طریقہ متعین نہیں کیا گیا بلکہ اس بارے میں امت کی عقل سلیم پر اعتماد کیا گیا ہے اور ان فرائض کی ادائیگی کو اس کی صلاحیتوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

غیر منصوص بالوضع کی واضح مثال لباس کا مسئلہ ہے۔ لباس ساتر ہو، ٹخنوں سے اونچا ہو، گھٹنوں سے نیچا ہو، تفاخر اور تکبر کا لباس نہ ہو، کوئی حرام و ناجائز (مثلاً) مردوں کے لئے ریشم نہ ہو۔ پس لباس بھی منصوص اور اس کی یہ شرائط بھی منصوص ہیں۔ لیکن لباس کی شکل، لباس کا رنگ اور اس کی قطع وغیرہ غیر منصوص ہیں، اسی میں امت کے لئے بہت سی سہولتیں ہیں ان کو امت کی

تمیز اور عقل عام پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

دوسری مثال مساجد کی ہے۔ مساجد بھی مطلوب ہیں اور مساجد کی نظافت بھی مطلوب ہے اور یہ بھی مطلوب ہے کہ ان میں ذکر اللہ ہو اور وہ دوسرے مقامات سے ممتاز ہوں۔ مگر ان کی کوئی خاص طرز تعمیر مطلوب نہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عالم اسلام میں مساجد مختلف وضع کی پائی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ مینارے اور گنبد بھی مساجد کے لئے شرائط میں نہیں تھے۔

ہندوستان کی مسجدوں میں دو میناروں کا رواج ہے الجزائر و مراکش کی مساجد میں ایک مینارہ ہوتا ہے اور دنیا کی سب سے بڑی اور پہلی مسجد (بیت اللہ) کا کوئی مینار نہیں۔

اب دعوت الی اللہ کی مثال لیجئے اللہ کی طرف اور اس کے دین کی طرف بندوں کو بلانا فرض ہے۔ انفرادی ہو یا اجتماعی، تقریر سے ہو یا تحریر سے، علانیہ ہو یا خلوت میں، اس میں کوئی شکل معین نہیں۔ نوح علیہ السلام کی زبان سے قرآن پاک میں واضح کر دیا گیا ہے کہ دعوت کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں **قال رب انی دعوت قومی لیلا و نهارا** (حضرت نوحؑ نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا اے میرے رب میں نے اپنی قوم کے سامنے رات میں بھی دین کی اور توحید کی دعوت رکھی اور دن میں بھی) **ثم انی اعلنت لهم واسررت لهم اسرارا** (پھر میں نے بالاعلان بھی آپ کا پیغام ان کو پہنچایا اور چھپ چھپ کر تنہائیوں میں بھی ان سے آپ کی بات کہی) لہذا دعوت دین کا کام کرنے والے ہر فرد و جماعت کو اختیار ہے کہ وہ جس ماحول میں اپنے لئے جو طریقہ صحیح جانے وہ مقرر کرے اور اپنی سعی و جہد کا جو طرز مناسب اور مفید سمجھے وہ اختیار کرے، اس میں کسی کو جائز اور ناجائز کہنے یا کوئی روک ٹوک لگانے کا حق حاصل نہیں ہے جب تک کہ اس میں کوئی ایسا عنصر شامل نہ ہو جائے، جو شرعی طور پر منکر یا مقاصد دینیہ کے لئے مضر ہو۔

بعض عوامی حلقوں میں اس وقت ان دونوں حصوں کو خلط ملط کر دیا جاتا ہے، منصوص کو غیر منصوص کا درجہ دے دیا جاتا ہے اور غیر منصوص کو منصوص کے مقام پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں اور مختلف اداروں اور دعوتوں میں اکثر تنازعہ کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ہم ان چیزوں میں فرق سمجھ لیں تو بہت سی مشکلات حل ہو جائیں گی، سینکڑوں تنازعوں کا سدباب ہو جائے گا اور بہت سی ذہنی الجھنیں ختم ہو جائیں گی۔

چیزوں کی اصلی ہیئت سمجھنے اور ان کو ان کے صحیح مقام پر رکھنے کا یہ پیمانہ ہمارے ہاتھ آ گیا۔ اس کے بعد صحیح اصول پر چلنے والی اور مخلصانہ دینی دعوتوں، دینی اداروں اور حلقوں کے درمیان تقابل، تصادم اور اختلاف کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ فرق جو رہ جاتا ہے وہ صرف اپنے اپنے تجربوں اور حالات کے مطالعہ کا ہے کہ کام کی کونسی شکل اور طریقہ زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہے اور کس سے وہ نتائج ومقاصد حاصل ہوتے ہیں جو اس کام سے مطلوب ہیں؟

دعوت الی اللہ کی مخصوص شکل اور طرز کی افادیت وتاثیر کی وضاحت کی جاسکتی ہے لیکن کسی کو اپنے تجربہ اور مطالعہ کا اس طرح پابند نہیں کیا جا سکتا، جیسے احکام قطعیہ اور نصوص قرآنیہ کا، دین کی خدمت کرنے والی کوئی جماعت اگر کسی خاص طریقہ کار کو اختیار کرتی ہے (بشرطیکہ وہ دین کے اصول اور سلف صالحین کے متفقہ مسلک اور طرز فکر کے مخالف نہ ہو) تو وہ اپنے فیصلہ میں حق بجانب ہے۔ ہم اپنے مخصوص طرز کار کو دوسری دعوتوں اور دین کی خدمت کرنے والے دوسرے حلقوں کے سامنے بہتر سے بہتر طریقہ پر پیش کر سکتے ہیں، لیکن اگر صرف طرز کار کے فرق کی وجہ سے ہم ان کو غلط کار سمجھیں یا ان کی دینی مساعی اور مشاغل کی نفی کریں جن کو انہوں نے اپنے تجربہ اور مطالعہ اور زمانہ کے تقاضوں کے پیش نظر اختیار کیا ہے اور ان کی افادیت واقعات اور برسوں کے تجربہ سے ان پر واضح ہو چکی ہے اور کتاب وسنت اور سیرت نبوی اور حکمت دینی کے وسیع دائرہ میں اس کے لئے ان کے پاس شواہد ودلائل پائے جاتے ہیں، تو یہ ہماری غلطی اور زیادتی ہوگی۔ ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ ان سے دوبارہ غور کرنے اور نتائج کو دیکھنے اور انکا موازنہ کرنے کی درخواست کریں لیکن ان کی تحقیر وتردید کرنا اور ان کو غلط کار اور گمراہ سمجھنا غلط ہے اور خدمت دین اور دعوت الی الخیر کے دروازے کو محدود اور تنگ بنانے اور امور دین کے رشتہ کو زمانہ اور ماحول سے منقطع کرنے کے مترادف ہوگا۔

دعوتوں اور طریق کار میں بعض چیزیں وہ ہوتی ہیں جن کی ہمیں شریعت نے سختی کے ساتھ تاکید کی ہے۔ بعض انتظامی امور ہوتے ہیں جو حدیث وقرآن سے استنباط کئے جا سکتے ہیں۔ وہ اصولی طور سے صحابہ کرام کی زندگی میں ملیں گے لیکن خاص اس ہیئت میں نہیں ملیں گے۔ یہ سب چیزیں اجتہادی اور تجرباتی ہیں۔ ان چیزوں پر یا ان خاص شکلوں پر ہر جگہ اور ہر شخص سے منصوص چیزوں کی طرح اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

سب سے مشکل چیز اعتدال ہے انبیاء علیہم السلام میں اعتدال بدرجۂ اتم ہوتا ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ پچاس برس کے بعد اللہ کے کچھ بندے پیدا ہوں، جو صاحب نظر بھی ہوں اور اللہ کے ساتھ ان کا تعلق ہو اور دعوت کے طریقہ سے زمانہ کی ضرورت اور تقاضے کے لحاظ سے تبدیلیاں کریں۔

اس وقت اگر ایک جامد طبقہ اس کی مخالفت محض اس بناء پر کرے کہ ہمارے بزرگ ایسا کرتے تھے تو اس کا رویہ غلط ہوگا، اس کا اصرار ہٹ دھرمی ہوگا، کبھی کبھی ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ایک طبقہ یہ سمجھنے لگا ہے کہ یہی طریقہ کار اور یہی طرز، دین کی خدمت اور احیاء کے لئے ہمیشہ کے واسطے اور ہر جگہ کے لئے ضروری ہے اور اس کے علاوہ سب غلط ہے جب تک اس مخصوص طریقہ پر کام نہ ہو تو سمجھا جاتا ہے کہ ساری جدوجہد رائیگاں گئی اور جو کچھ ہوا سب فضول ہوا۔ یہ بے اعتدالی ہے اور یہ رویہ خطرناک ہے۔ اسی طرز فکر کے نتیجے میں مختلف مذاہب اور فرقے امت میں پیدا ہوئے۔ اصل حقیقت صرف اتنی ہے کہ اب تک غور اور تجربوں نے ہمیں یہاں تک پہنچایا اور ہم نے اس کو مفید پایا ہے، پس جب تک یہ چیزیں فائدہ مند معلوم ہوتی ہیں ہمیں اس وقت تک ان کو جاری رکھنا چاہئے لیکن اگر کوئی خاص طریقہ ایک رسم بن جائے تو یہ ایک مذہب بن جائے گا اور ایک بدعت قائم ہو جائے گی اور اس وقت کے ربانی مصلحین کا فرض ہوگا کہ اس کی اصلاح کے لئے جدوجہد کریں اور ان رسومات کو مٹائیں، بہت سی چیزیں صحیح مقاصد اور دینی مصلحتوں سے شروع ہوتی ہیں لیکن آگے چل کر غلط صورت اختیار کر لیتی ہیں ایسے موقع پر حقیقت و رسم، سنت و بدعت، فرض و مباح میں تمیز کرنا تفقہ فی الدین ہے اور کہنے والے نے کہا ہے کہ:

گر حفظ مراتب نکنی زندیقی!

انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تربیت اور انکی مساعی جمیلہ کے لئے (جن کی پشت پر تائید ربانی اور ارادۂ الٰہی ہوتا ہے) جہاں مضر اور ایک طرح سے حریف و رقیب کفر، الحاد، غفلت و معصیت ہے جو ان کے پیروؤں کو ان کی دعوت کے برکات اور ان کی تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت کے اثرات سے محروم کرنے کا کام انجام دیتی ہے وہاں بے روح رسمیت بھی ہے۔ اول الذکر طاقتیں اگر بیرونی دشمن کی حیثیت رکھتی ہیں، جو باہر سے حملہ آور ہوتا ہے تو یہ اندرونی

بیماری ہے جو گھن کی طرح اس جماعت کو لگ جاتی ہے (جو ان کی تعلیم ودعوت سے پیدا ہوتی ہے) اور اس کو اندر اندر کھوکھلا کر دیتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں عقائد بے اثر اور اعمال وعبادات بے روح اور بے نور بن جاتے ہیں، وہ ایک رسم کی طرح ادا کئے جاتے ہیں، ان میں نفس و ماحول کی ترغیبات اور شیطان کی تسویلات کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رہتی اور ان کی کیمیا اثری اور انقلاب انگیزی جاتی رہتی ہے، یا بہت کمزور ہو جاتی ہے۔ یہ عموماً نتیجہ ہوتا ہے مؤثر وصحیح دعوت وتربیت کے فقدان یا انقطاع کا، یا موثر اصلاحی وتربیتی شخصیتوں سے محرومی کا، یا ایسے مواقع اور میدانوں کے صدیوں تک پیش نہ آنے کا جن میں شرکت سے ایمان میں تحریک، پیدا ہوتی ہے، دلوں کے زنگ دور ہوتے ہیں اور نفس کی طاقت اور ایثار وقربانی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ اسی وقت کوئی ایسی دعوت وتحریک (الہام ربانی اور انتظام خداوندی سے جو اس دین کا ہمیشہ سے رفیق رہا ہے) سامنے آتی ہے جو اس ''رسمیت'' پر ضرب لگاتی ہے، دلوں کا زنگ دور کرتی ہے، امت کو صورت سے حقیقت اور ''رسمیت'' سے ایمان واحتساب کی کیفیت کی طرف لاتی ہے، اسلام میں تجدید واصلاح کی تاریخ اور مجددین، مصلحین کے مستند تذکروں کے مطالعہ سے اسی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ان کا نشانہ یہی ''رسمیت'' تھی جو مسلم معاشرہ میں سرایت کر چکی ہوتی ہے اور دیمک کی طرح اس کے سرسبز وشاداب درخت کو چاٹ چکی ہوتی ہے اور امت بعض اوقات:

واذا رايتهم تعجبک اجسامهم وان يقولوا تسمع لقولهم كانهم خشب مسندة.

اور جب تم ان (کے تناسب اعضاء) کو دیکھتے ہو تو ان کے جسم تمہیں (کیا ہی) اچھے معلوم ہوتے ہیں اور جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو تم ان کی تقریر توجہ سے سنتے ہو (مگر فہم وادراک سے خالی) گویا لکڑیاں ہیں جو دیوار سے لگائی گئی ہیں کا ایک حد تک نمونہ بن جاتی ہیں۔ وہ ہدایت خداوندی اور کتاب وسنت کے عمیق ومخلصانہ مطالعہ کے اثر سے کوئی ایسی دعوت یا طریق کار پیش کرتے ہیں جس سے اس رسمیت کا پنجہ ڈھیلا ہو جاتا ہے، جسم امت میں ایک نئی روح ایک نئی ایمانی کیفیت، رضاء الٰہی کے حصول کا ایک زندہ وتازہ جذبہ پیدا ہوتا ہے، اس کی قوت عمل بڑھ جاتی ہے، اس کو بڑی سے بڑی قربانی آسان معلوم ہونے لگتی ہے اور بعض اوقات

قرون اولی کی یاد تازہ کرنے والے واقعات سامنے آتے ہیں اور ایمان کی روح پرور یاد بہاری کے جھونکے آنے لگتے ہیں۔

لیکن یہ بھی تاریخ اصلاح ودعوت کا واقعہ والمیہ ہے اور فطرت انسانی کی کارفرمائی کہ خود اس اصلاح ودعوت اور اس طریق کار میں مرور زمانہ سے ''رسمیت'' دبے پاؤں داخل ہو جاتی ہے اور جو چیز رسم کو مٹانے اور دل ودماغ کو جگانے کو آئی تھی وہ بھی اپنی روح، اندرونی جذبہ اور تازگی کھودیتی ہے اور ایک ''رسم'' ضابطہ اور routine بن کر رہ جاتی ہے اور اسی کو خود ایک نئی اصلاحی دعوت اور ایک طاقتور شخصیت کی ضرورت پیش آجاتی ہے جو اس خواب آلودہ اور لکیر کے فقیر کے نظام اور طریق کار کی اصلاح کرے اور اس میں جو بدعات، مفاسد، غلو اور جمود پیدا ہو گیا ہے اس کو توڑے اور اس معاشرہ میں کسی اور طریقہ سے جو کتاب وسنت سے ماخوذ اور اصول ومقاصد کے مطابق ہو معاشرہ کی رسمیت کو دور کرے اور ایمان وایثار اور قوت عمل پیدا کرے۔

اس صورت حال کو سمجھنے کے لئے مثال پیش کی جاتی ہے جو ایک لطیفہ کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس سے بڑا سبق حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بندہ کے ایک فاضل دوست نے بتایا کہ دریا کے کنارے پر واقع ہونے کی وجہ سے ان کے کتب خانہ میں جلد جلد دیمک لگ جاتی تھی اور قیمتی کتابیں تلف ہو جاتی تھیں، وہ پریشان تھے کہ اس کا کیا علاج کریں۔ ایک تجربہ کار دوست نے بتایا کہ اگر اونٹ کی ہڈی اس کتاب خانہ میں رکھ دی جائے تو دیمک نہیں لگے گی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اونٹ کی ہڈی حاصل کی لیکن ان کی حیرت وپریشانی کی کوئی حد نہ رہی جب انہوں نے ایک دن دیکھا کہ اونٹ کی اس ہڈی میں خود دیمک لگ گئی۔

یہاں ایک باریک بات سمجھ لیں وہ یہ کہ ایک نبی ہوتا ہے اور ایک مجدد، اور ایک مصلح ہوتا ہے۔ نبی کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے بتائے ہوئے طریقہ کے بغیر نجات ہی نہیں ہو سکتی اور اس کی ہدایت حاصل کئے بغیر اللہ کی رضا اور کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس میں کسی قسم کی مداہنت یا تساہل کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن مجددین اور مصلحین کا معاملہ یہ نہیں ہے ہر مجدد اور ہر ربانی مصلح کی پیروی سے دین کو اور دین کے طالبوں کو نفع پہنچتا ہے مثلاً کسی مجدد کے طریقہ سے قربانی کے جذبات بڑھتے ہیں۔ لہذا اس کے طریقہ کی پیروی سے قربانی کے جذبات بڑھیں

گے اور ایک دوسرے مجدد کے طریقہ سے انفاق فی سبیل اللہ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں لہذا اس کے اثر سے انفاق وایثار کے جذبات پیدا ہوں گے۔ ایک دوسرے مجدد کے طریقہ سے اخلاق کی اصلاح اور صفائی معاملات کا اہتمام پیدا ہوتا ہے تو اس سے تعلق ووابستگی خاص طور سے اس میں موثر ہوگی۔

بہرحال نبی کے طریقہ پر نجات کا انحصار ہوتا ہے اور بالکل اسی طریقہ پر چلنا لازم لیکن کسی مجدد ومصلح کا معاملہ یہ نہیں۔ خاص خاص ترقیاں تو ان کی اتباع اور وابستگی سے ہوتی ہیں، لیکن نجات اس پر منحصر نہیں ہوتی۔

ایک بات یہ بھی جاننی چاہئے کہ امت میں طبقات کا اتنا اختلاف ہے اور اذہان کا اتنا تفاوت ہے اور حالات ایسے مختلف ہیں کہ کوئی دعوت وتحریک اور کوئی اصلاحی جدوجہد یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ وہ تمام طبقات کو متاثر کرسکتی ہے اور ان کی تسکین کا سامان کرسکتی ہے اور ان کی استعداد کے مطابق دینی غذا فراہم کرسکتی ہے۔ کوئی ذہن تقریر سے متاثر ہوتا ہے کسی پر لٹریچر اثر انداز ہوتا ہے اور کوئی کسی دوسرے ذریعہ سے متاثر کیا جاسکتا ہے اسی طرح واحد طریقہ کار سے ہر جگہ ماحول میں اور ہر حالت میں کامیابی مشکل ہے اس حقیقت کو نہ سمجھنے اور اس کے مطابق نہ چلنے سے لوگوں سے بڑی غلطیاں ہوتی ہیں، بہت سے لوگ قابل قدر اور بڑے مخلص ہیں لیکن ان لوگوں کا اس وقت تک دل خوش نہیں ہوتا جب تک کہ ہر شخص اسی مخصوص طرز پر کام نہ کرے جس کو اس نے اختیار کیا ہے حالانکہ عمومی اصلاحی وانقلابی تحریکوں اور دعوتوں کا معاملہ یہ نہیں ہوتا۔ وہاں ہر چیز اس کے صحیح مقام پر رکھی جاتی ہے اور ٹھیک چوکھٹے میں بٹھائی جاتی ہے ہر شخص سے وہی کام لیا جاتا ہے جس کا وہ زیادہ اہل ہو اور اس میں دوسروں سے ممتاز ہو اور جس کو دوسروں سے بہتر طریقہ پر انجام دے سکتا ہو۔

یہ اللہ کی طرف سے انتظام سمجھنا چاہئے کہ کچھ لوگ اس راستہ سے دین تک آجائیں اور کچھ اس راستہ سے آجائیں، اپنے طریق کار کو مناسب طریقہ سے ان کے سامنے اکثر بیشتر کرتے رہنا چاہئے لیکن اس طرح نہیں کہ اس میں دین کے دوسرے کاموں اور دینی واصلاحی مساعی کی نفی اور تحقیر ہوتی ہو اور اخلاص سے کام کرنے والوں کی ہمت شکنی اور انہیں مایوسی اور بددلی پیدا ہو اس طرح امت کے مختلف طبقات اور جماعتوں میں تعاون علی البر والتقویٰ کی روح

بیدار ہوگی جو عرصہ سے مفقود ہو چکی ہے اور جس کی اس زمانہ میں جبکہ باطل مختلف شکلوں میں اور نت نئے حربوں کے ساتھ حملہ آور ہے اور اہل باطل من کل حدب ینسلون (ہر ٹیلے اور ٹاپو سے ابلے چلے آ رہے ہیں) سخت ضرورت ہے۔

و ماعلینا الا البلاغ المبین